

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM



READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

ایمل رضا کے ناول
پیکل سارہ
کی تصنیف

سحر

بانی و مدیر اعلیٰ: محمود ریاض

مدیر: رخصتہ جمیل

مدیر تنظیم: اقدار ریاض

مدیر اداری: امت الصبور

فہرشی: شاہین رشید

اشہار: کمالہ جیلانی

خط و کتابت: خلیفہ

ماہنامہ سحر

37 - اردو بازار، کراچی





- 202 شہرِ خطا، نایاب جیلانی
156 خواہشوں کا موسم، سدرہ حیات



- 237 پسِ مرگ، صباحتِ عمران
116 کینز الہ کے نام، بنتِ سحر
148 حیاتِ نبض، امیر خالہ
59 تیری اک نظر، آسمانِ طاہر
186 اک ذرا انتظار، ثناءِ عمرات
66 چمنی، نادیہ جہانگیر
245 گلابی دنیا، نورین ثوری



- 260 غزل، شعیب بن عزیز
260 غزل، شکیل بدایونی
261 غزل، میثم علی آقا
261 غزل، اعتبار ساجد

- 10 رضیہ جمیل، پہلی شعاع
11 نصیر الدین نصیر، حمد
11 اقبال عظیم، نعت
12 احار، نجات کی باتیں



- 24 عاصمہ بیگم، بندھن
18 فاطمہ صفیٰ قادر، جب تجھ سے تانا
21 ن. ق، جب تجھ سے تانا
31 شاہین رشید، دستک
282 احار، شعاع کے ساتھ



- 36 عفت بھٹو، خواب شیشے کا
192 نبیلہ عزیز، رقصِ بیل



- 122 ایل رضا، پیال ساڑا
70 صبح علی، حاصلِ کشت و خون

انتباہ: ہر شاعر و شاعری کے حقوق محفوظ ہیں۔ پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر کسی رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ویب سائٹ پر ڈراپ اور نہ کسی اور سلسلہ اور قطع کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 7000 روپے

رکن آل پاکستان تعلیمی و سماجی
رکن کونسل آف پاکستان تعلیمی و سماجی

MEMBER
APNS
CPNE



277	امت الصور	تاریخ کے جھوٹے	269	رضیہ جمیل	خط آب کے
288	خالہ جیلانی	نومبر کے پیکواں	262	ادارہ	مُسکراہٹیں
290	ادارہ	خوبصورت بننے	286	واصفہ سہیل	ایک نئے خالے میں
			266	شگفتہ جاہ	بالوں سے خوشبو لے
			265	خالہ جیلانی	کھلتا کسی پہ

نومبر 2016

جلد 31 نمبر 3

قیمت 60 روپے

مخطوط کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل فلائین حصہ ہر شنگ پریس سے چھپا کر شائع کیا - مقام ۲۰/۱۱/۱۹۶۱ء سی ای ریح الیسا و سائی کلوچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com



شعاع نومبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں

مقصد تخلیق کائنات انسان ہے اور انسان کی تخلیق کا مقصد انسانیت کا شعور ہے۔ شعور احساس ہے، سماعت ہے، گفتگو ہے، گفتگو انسان کی انسانیت کی پہچان ہے۔ الفاظ انسان کے اخلاق، اس کی تربیت، اس کے خاندان کی پہچان ہوتے ہیں۔ ہمارے الفاظ کسی کی زندگی لے سکتے ہیں اور کسی کو زندگی دے بھی سکتے ہیں، حوصلہ افزائی کا ایک لفظ کبھی کبھی پوری زندگی بدل دیتا ہے۔ کڑی تنقید کبھی کبھی زندگی سے بھی دور کر دیتی ہے۔ ایسے سخت الفاظ جو کسی کا دل توڑ دیں، اس کی ہمت پست کر دیں۔ اس کو زندگی سے بیزار کر دیں تو اس سے بڑا ظلم کیا ہو سکتا ہے۔

ہم خواہ کتنے ہی بلند مقام پر کیوں نہ ہوں اگر ہماری زبان سے کسی کو ذرا سا بھی نقصان پہنچ جائے تو یہ ہمارے لیے عمر بھر کا خسارہ ہے۔ کیونکہ کچھ نقصانات ایسے ہوتے ہیں جن کی تلافی ممکن نہیں رہتی۔

بشری سعید کو صدمہ

حساس دل رکھنے والے لوگ دنیا کا بوجھ زیادہ دیر نہیں جھیل پاتے۔ اسی لیے جلد ہی دل مار جاتے ہیں اور عدم کی راہ لیتے ہیں۔ اپنے پیچھے وہ کتنے ملال چھوڑ جاتے ہیں، کتنے لوگوں کو دکھی کر جاتے ہیں۔ زندگی اس قدر گراں مایہ اور اس طرح حالات کی نذر ہو جائے۔

بشری سعید کے نوجوان بھائی عمر سعید راہی ملک عدم ہوئے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَاَنَا اِلٰیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ عمر سعید ایک فطری تخلیق کار تھے۔ بہت چھوٹی عمر میں جب بشری سعید لکھتی تھیں تو عمر سعید ان کی ادھوری کہانیاں خاموشی سے مکمل کر کے پوسٹ کر دیتے۔ کبھی انہیں کہانیوں کا موضوع بتاتے، بشری مصروفیت کی بنا پر لکھ نہ پاتیں تو خود ہی لکھ کر پوسٹ کر دیتے۔ بشری نے ہمیں بتایا کہ ”رقص جنوں“ عمر کی تخلیق تھی۔ ”سفال گر“ کا بنیادی آئیڈیا بھی عمر سعید کا تھا۔ بشری علالت کی بنا پر لکھ نہیں پاری تھیں۔ چار سال اسی طرح گزر گئے۔ پھر اس بار بشری نے عمر سے خود کہا کہ وہ یہ کہانی لکھ دیں اور یوں ”سفال گر“ جیسا ناول لکھا گیا۔

عمر سعید کا ارادہ تھا کہ اب وہ سنجیدگی سے لکھنے کی طرف توجہ دیں گے اور اپنے نام سے لکھیں گے۔ انہوں نے دونوں ناولوں کا آغاز بھی کیا تھا، لیکن شاید یہ قدرت کو منظور نہ تھا۔

عمر سعید کی وفات ادب کے لیے، قارئین کے لیے بہت بڑا نقصان ہے۔ ادارہ شعاع عمر سعید کے اہل خانہ کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے اللہ انہیں صبر جمیل سے نوازے۔ عمر سعید کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے میں

- ☆ مصباح علی کا ناول۔ حاصل کشت و خون ☆ ایمل رضا کے ناول پیال سا کی آخری قسط
- ☆ سدرہ حیات اور نایاب جیلانی کے ناول ☆ عفت سحر طاہر اور نبیلہ عزیز کے ناول
- ☆ صباحت عمران، بنت سحر، ثامن، اسماء طاہر، نادیہ، جمالیہ، نورین غوری اور امیر خالد کے افسانے ☆ عاصم شیرازی اور مدثر کا بندھن معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک ☆ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احارث کا سلسلہ
- ☆ جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے، خط آپ کے اور دیگر سلسلے شامل ہیں، شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا۔؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔



کس سے مانگیں کہاں جائیں کس سے کہیں
اور دنیا میں حاجت روا کون ہے

ہر وقت تصور میں مدینے کی گلی ہے
اب درد بدی ہے نہ عزیز الوطنی ہے

سب کا داتا ہے تو سب کو دیتا ہے تو
تیرے بندوں کا تیرے سوا کون ہے

اس شہر میں بک جاتے ہیں خود آگے خریدار
یہ مصر کا بازار نہیں، شہر تہی ہے

جو ہے سارے جہانوں میں جلوہ نما
اس احد کے سوا دوسرا کون ہے

اس ارض مقدس پہ ذرا دیکھ کے چلنا
اے قافلے والو یہ مدینے کی گلی ہے

کس کے ہاتھوں میں کبھی ہے مقصوم کی
مسند آرائے بزم عطا کون ہے

نظروں کو جھکائے ہوئے خاموش گزر جاؤ
بے تاب نگاہی بھی یہاں بے ادبی ہے

اہل فکر و نظر جانتے ہیں تجھے
کچھ نہ ہونے پہ بھی مانتے ہیں تجھے

اقبال میں کس منہ سے کروں مدح محمدؐ
منہ میرا بہت چھوٹا ہے اعدا بات بڑی ہے

اے نصیر اس کو تو فضل باری سمجھ
ود نہ تیری طرف دیکھتا کون ہے

سید اقبال عظیم

نصیر الدین ترائی

WWW.PAKSOCIETY.COM



زیادہ مال رکھنے والے

فائدہ :

1- سخاوت سے اس شخص کو فائدہ ہو سکتا ہے جس کی کمائی حلال ہو، لہذا حرام کمائی سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”زیادہ مال والے زیادہ نیچے ہوں گے، مگر جس نے اس طرح، اس طرح اور اس طرح خرچ کیا۔“ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے) تین بار (اشارہ) فرمایا۔

سخاوت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اگر میرے پاس احد پہاڑ جتنا سونا ہو تو میں نہیں چاہوں گا کہ مجھ پر تیسری رات آئے اور (اس وقت بھی) اس میں سے کچھ میرے پاس (بچا ہوا) موجود ہو، مگر اتنی چیز جسے میں قرض کی ادائیگی کے لیے سنبھال رکھوں۔“

فوائد و مسائل :

1- اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت کا بیان اور امت کے لیے ترغیب ہے۔

2- احد ایک بڑا پہاڑ ہے، اتنا سونا دو تین دن میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہی تھی کہ اگر اتنا مال بھی ہو تو وہ بھی دو تین دن میں مکمل طور پر تقسیم کر دیا جائے۔

3- قرض کی ادائیگی قرض خواہ کا حق ہے، اس کی ادائیگی سخاوت سے اہم ہے۔

4- قرض ایمان کا جز ہے لیکن قرض لیتے وقت یہ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”زیادہ مال رکھنے والوں کے لیے ہلاکت ہے مگر جس نے مال کو اس طرح، اس طرح، اس طرح اور اس طرح (خرچ) کیا۔“

یہ فرماتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے چاروں طرف (ہر ایک بار) اشارہ فرمایا۔

فوائد و مسائل :

1- مال حرص اور بخل کے ذریعے جمع ہوتا ہے اور یہ دونوں مذموم خصوصیات ہیں۔

2- جائز طریقے سے کمایا ہوا مال بھی اللہ کی راہ میں اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا ضروری ہے۔ اپنی ذاتی آسائشات اور تعیشات پر مال صرف کرنا درست نہیں۔

3- سخاوت کرنے والا ہلاکت سے محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا مال اس کے لیے نیکیوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ جس قدر زیادہ خرچ کرے گا، اتنا ہی جنت میں بلند درجات کا مستحق ہوگا۔

درجات

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”زیادہ مال والے قیامت کے دن (دوسروں سے درجات میں) نیچے ہوں گے مگر جس نے مال کو اس طرح اور اس طرح خرچ کیا اور اس کی کمائی پاک (اور حلال ذرائع) سے ہوئی۔“

دل کے کو بھی۔“
حضرت نقاہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے کہا جو اسے لے کر آیا (اس کے لیے بھی برکت کی دعا فرمائیں۔) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”اور جو اسے لے کر آیا (اللہ اسے بھی برکت دے۔)“

پھر آپ کے حکم سے اسے دیا گیا اس نے بہت دودھ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پہلے شخص کے بارے میں جس نے انکار کر دیا تھا فرمایا:
”یا اللہ! فلاں کامل زیادہ فرما۔“ اور جس نے اونٹنی بھیجی تھی اس کے حق میں فرمایا:
”یا اللہ! اس کو روزگار نیک روز دے۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”ہلاک ہو جائے (تباہ ہو جائے) کو بتا رہا کہ بندہ درہم کا بندہ کبیل کا بندہ اور چادر کا بندہ۔ اگر اسے دیا جائے تو خوش رہتا ہے اگر نہ دیا جائے تو (بیعت والا) وعدہ پورا نہیں کرتا۔“
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
ہلاک ہو جائے و بتا رہا کہ بندہ درہم کا بندہ اور چادر کا بندہ۔ ہلاک ہو جائے، اوندھا ہو جائے اسے کاٹنا لگے تو نکالنا نہ جائے۔“
فوائد و مسائل :

1۔ دنیا کا لالچ مذموم ہے۔ جب محبت و نفرت کی بنیاد محض دنیوی مفاد پر ہو جائے تو خلوص باقی نہیں رہتا۔ اس صورت میں خلیفۃ المسلمین یا اس کے نائب سے بیعت بھی اللہ کی رضا کے لیے اور اسلامی سلطنت کی حفاظت اور خدمت کے لیے نہیں ہوتی اس طرح یہ عظیم نیکی بھی تمام برکات سے محروم ہو کر برائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

2۔ دینی جماعتوں اور تنظیموں سے تعلق اللہ کی رضا اور ثواب کے لیے ہونا چاہیے۔ اسی نیت سے عہدہ اور ذمہ داری قبول کی جائے اگر محسوس ہو کہ محنت

نیت ہوئی چاہیے کہ جلد از جلد ادا کر دیا جائے گا۔
5۔ سنبھال کر رکھنے کی ضرورت تب پیش آ سکتی ہے جب ادائیگی کا مقررہ وقت آنے میں کچھ وقفہ باقی ہو تاکہ جب قرض خواہ مطالبہ کرے تو ادائیگی کا اہتمام کرتے ہوئے ادائیگی میں تاخیر نہ ہو جائے۔

6۔ اگر قرض خواہ قریب موجود ہو تو مقررہ وقت سے پہلے خود جا کر ادائیگی کرونا افضل ہے لیکن اگر اس سے رابطہ مشکل ہو تو رقم سنبھال کر رکھنا مناسب ہے تاکہ ادائیگی جلد از جلد کی جاسکے۔

مسلمان کے لیے دعا

حضرت عمرو بن غیلان ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”یا اللہ! جو شخص مجھ پر ایمان لایا، میری تصدیق کی اور اس نے (دل سے) جان لیا کہ میں جو (شریعت) لے کر آیا ہوں وہ تیری طرف سے حق ہے تو اسے کم مال اور اولاد دے، اور اسے اپنی ملاقات کی محبت نصیب فرما اور اسے جلدی موت عطا فرما۔ اور جو مجھ پر ایمان نہ لایا، میری تصدیق نہ کی اور یہ یقین نہ کیا کہ میں جو (شریعت) لے کر آیا ہوں وہ تیری طرف سے حق ہے اس کو بہت مال اور اولاد دے، اور اس کی عمر طویل فرما دے۔“

برکت

حضرت نقاہ (بن عبد اللہ) اسدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک آدمی کی طرف بھیج کر اس سے ایک اونٹنی طلب فرمائی۔ اس شخص نے (اونٹنی دینے سے) انکار کر دیا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک آدمی کی طرف بھیجا۔ اس نے ایک اونٹنی بھجوا دی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی کو دیکھا تو فرمایا:

”یا اللہ! اس میں برکت عطا فرما اور اسے بھیجے۔“

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہوئی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قیامت کے دن ہر دولت مند اور نادار کی خواہش یہی ہوگی کہ اسے دنیا میں صرف (زندہ رکھنے کے قائل) تھوڑی سی روزی ملی ہوگی۔“

پوری دنیا

حضرت عبید اللہ بن محصن انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کی صبح اس حال میں ہوئی کہ اسے بدن میں عافیت اپنے بارے میں امن اور دن بھر کی خوراک حاصل ہو، اسے گویا پوری دنیا جمع کر کے دے دی گئی۔“

فوائد مسائل :

- 1۔ جسے کوئی بیماری اور خوف نہ ہو اور دن بھر کی ضرورت کا سامان موجود ہو تو یہ بہت بڑی نعمت ہے۔
- 2۔ ہم زیادہ کی خواہش میں ان نعمتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے جو ہمارے پاس موجود ہوتی ہیں جس کی وجہ سے دل میں شکر کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔
- 3۔ جس شخص کے پاس ایک دن کی ضروریات موجود ہیں، اسے اس دن کا شکر ادا کرنا چاہیے اور یہ امید رکھنی چاہیے کہ جب کل کا دن آئے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات بھی مہیا فرمادے گا۔

اپنے سے کمتر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”(دنیا میں) اپنے سے نیچے والے (کم مال) کو دیکھو، اپنے سے اوپر والے کو نہ دیکھو اس سے یہ ہوگا کہ تم اللہ کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو گے۔“

فوائد مسائل :

- 1۔ نیچے والے سے مراد وہ شخص ہے جو کسی نعمت میں

کرنے کے باوجود جماعت میں اہمیت تسلیم نہیں کی جا رہی تو اکابر سے ناراض ہو کر جماعت سے الگ نہ ہو جائے ہاں، اگر یہ محسوس کیا جائے کہ جماعت یا تنظیم کے عہدے دار صحیح انداز سے کام نہیں کر رہے اور توجہ دلانے کے باوجود اصلاح پر آمادہ نہیں تو خاموشی کے ساتھ تنظیم سے الگ ہو جائے۔

- 3۔ درہم و دینار کے بندے سے مراد وہ شخص ہے جو دنیا کے بل دولت کی اتنی خواہش رکھتا ہے کہ اس کی تمام سرگرمیوں کا محور حصول دولت بن کر رہ جاتا ہے۔ اس طرح وہ دولت سے خدمت لینے کی بجائے دولت جمع کرنے اور سنبھالنے میں مصروف رہتا ہے، گویا دولت اس کا آقا یا معبود ہے اور وہ غلام یا پجاری۔
- 4۔ دولت کے پجاری کے لیے بددعا کی گئی ہے کہ وہ تباہ ہو جائے۔ منہ کے بل گرنے اور سر کے بل اونڈھا ہو جانے سے یہی مراد ہے۔ کائنات نہ نکالے جانے سے مراد یہ ہے کہ وہ مشکلات میں پھنسا رہے اور اس کی مدد اور نجات کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

قناعت کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”امارت سلمان کی کثرت سے نہیں ہوتی بلکہ امیری تولد کی امیری ہے۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یا اللہ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھروالوں کو ضروری حاجات کے مطابق رزق عطا فرما۔“

فوائد مسائل :

- 1۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے گھروالوں کے لیے بھی اچھی عادات و خصائل کی خواہش رکھے۔
- 2۔ ضرورت کے مطابق رزق کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ نہ ملے جسے جمع کر کے رکھا جائے۔
- 3۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زہد و قناعت امت کے لیے بہترین نمونہ ہے۔

ہم سے کم ہے اور اوپر والے سے مراد وہ شخص ہے جو کسی نعمت میں ہم سے بڑھ کر ہے۔

2۔ اپنے سے زیادہ نعمت والے کو دیکھنے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مجھے یہ نعمت کم حاصل ہے اس کمی کو شیطان اس انداز سے پیش کرتا ہے گویا یہ نعمت حاصل ہی نہیں۔ اس طرح محرومی کا احساس پیدا ہوتا ہے جس سے شکر کے بجائے اللہ سے شکوہ کرنے کو جی چاہتا ہے جو ناشکری کی ایک بڑی صورت ہے۔

3۔ اپنے سے کم تر پر نظر ڈالنے سے حاصل شدہ نعمت کی قدر معلوم ہوتی ہے جس سے شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

4۔ ہر نعمت کے بارے میں یہ کیفیت ہے کہ ایک فرد کو وہ نعمت کسی سے کم ملی ہے تو وہی نعمت اسے کسی دوسرے سے زیادہ بھی ملی ہے اس معاملے کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ اگر ایک فرد کو ایک نعمت کسی سے کم ملی ہے تو کوئی دوسری نعمت اسے زیادہ بھی ملی ہے۔

جس طرح ایک شخص کسی سے کم دولت رکھتا ہے اور کسی سے زیادہ دولت مند بھی ہے۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر وہ اس سے دولت میں کم ہے تو صحت یا قوت میں اس سے بڑھ کر ہے۔ اگر حسن صورت میں کم ہے تو علم و فضل یا حسن سیرت میں اس سے زیادہ بھی ہے لہذا احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ نہیں اور اللہ سے شکوہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

عمل اور دل

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے عملوں اور دلوں کو دیکھتا ہے۔“

فوائد و مسائل :

1۔ خوب صورت یا بد صورت ہونا بندے کے ہاتھ میں نہیں بلکہ یہ اللہ کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ عمل اچھے ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ

2۔ اللہ کے ہاں مال دار اور بے زر برابر ہیں۔ مال دار کو محض دولت مند ہونے کی وجہ سے معافی نہیں مل سکتی اور نادار کو محض اس کی مفلسی کی بنا پر مجرم نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

3۔ مال دار ہونا بھی اللہ کی آنائش ہے اور مفلس ہونا دوسری طرح کی آنائش۔ اگر مال دار شکر کرے تو اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے اور ناشکری کرے تو نا پسندیدہ ہے۔ اسی طرح نادار آدمی صبر کرے تو اللہ کا پیارا ہے اور بے صبری کرے اور حرام کمائی کی کوشش کرے تو اللہ کے قرب سے محروم ہے۔

4۔ انسان اگر نیکی کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کی نیت اور خواہش ضرور رکھنی چاہیے۔ ایسی نیت پر بھی ثواب ملتا ہے۔

آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی گزران

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

انہوں نے فرمایا:

”ہم آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم، مہینہ مہینہ اس حال میں گزار دیتے تھے کہ آگ نہیں جلاتے تھے (ہمارا کھانا) صرف کھجوریں اور پانی ہوتا تھا۔“

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زہد، استغنا، قناعت اور سادگی کا بیان ہے۔

2۔ حیات مبارکہ کے آخری سالوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سال بھر کے خرچ کے لیے کھجوریں اور جو وغیرہ اکٹھے دینا شروع کر دیے تھے لیکن اہمات المؤمنین سخاوت سے کام لیتے ہوئے جلد ہی خرچ کر دیتی تھیں اس لیے اکثر روٹی، سالن اور گوشت وغیرہ کے بغیر گزارا ہوتا تھا۔ بعض اوقات کھجوریں بھی میسر نہیں ہوتی تھیں۔

پورا مہینہ

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

ہمارے ہاں تشریف لائے تو (ہماری یہ حالت تھی کہ) ہمیں تین رات تک کھانا میسر نہ ہو سکا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گرم کھانا حاضر کیا گیا۔ آپ نے تناول فرمایا۔ جب فارغ ہوئے تو فرمایا:

”اللہ کا شکر ہے، میرے پیٹ میں اتنے دن سے (تازہ اور) گرم کھانا نہیں گیا۔ (مجبور وغیرہ پر گزارہ رہا۔)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروالوں کا بستر

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر چمڑے کا تھا جس میں مجبور کی چھال بھری ہوئی تھی۔

فوائد و مسائل :
1۔ مطلب یہ ہے کہ بستر عمدہ کپڑے کا نہیں تھا جس میں اون یا روئی بھری ہوئی ہو بلکہ چمڑے کا بستر بنایا ہوا تھا اس میں مجبور کے درخت کی چھال بھری ہوئی تھی جو سخت اور ناہموار ہوتی ہے۔ لیکن چمڑے کی وجہ سے اس کی سختی زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ لہٰذا عرب چمڑے کو سادہ انداز سے تیار کرتے تھے جو نہ زیادہ قیمتی ہوتا تھا نہ خوب صورت۔ اس لحاظ سے چمڑے کا بستر انتہائی سادگی کی مثال ہے۔

آخرت

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں حاضر ہوا تو آپ ایک چٹائی پر تشریف فرما تھے میں بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ نے صرف تہ بند پہن رکھا ہے۔ وہ مرا کوئی کپڑا زیب تن نہیں۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے پہلو پر چٹائی سے نشان پڑ گئے ہیں۔ ایک طرف

روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ”حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروالوں پر مہینہ بھر اس طرح گزر جاتا تھا کہ آپ کے کسی گھر میں بھی دھواں نظر نہیں آتا تھا۔“

(حضرت ابو سلمہ رحمۃ اللہ نے بیان کیا:) میں نے کہا۔ ”پھر وہ لوگ کیا کھاتے تھے؟“

ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ”وہ سیاہ چیزیں: کھجوریں اور پانی، البتہ ہمارے کچھ انصاری ہمسائے تھے، وہ مخلص ہمسائے تھے، ان کے گھروں میں پلنے والی کچھ بکریاں تھیں (جنہیں چرنے کے لیے چراگاہ میں نہیں لے جایا جاتا تھا، گھرا کر چارہ دیا جاتا تھا)۔ وہ ان کا دودھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف (ہمارے ہاں) بھیج دیا کرتے تھے۔“

(راوی حدیث) محمد بن عمرو رحمۃ اللہ بیان کرتے ہیں وہ نو گھر تھے۔

فائدہ :
عورتوں کو چاہیے کہ حلال آمدنی میں گزارہ کریں اور خاوند کو حرام ذرائع اختیار کرنے پر مجبور نہ کریں۔
بھوک کی وجہ سے

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ”میں نے ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھوک کی وجہ سے کروٹیں بدلتے دیکھا کیونکہ آپ کو معمولی سی کھجوریں بھی میسر نہ تھیں جن سے پیٹ بھر لیتے۔“

فائدہ :
1۔ اس میں امت کے لیے سبق ہے کہ وہ تنگ دستی کی حالت میں صبر اختیار کریں، حرام کی کمائی کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

تازہ کھانا

حضرت سلمان بن صدور رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا:

”جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا) رخصت ہو کر میرے گھر آئیں اس رات ہمارا بستر صرف ایک مینڈھے کی کھال پر مشتمل تھا۔“

کدو کا بیان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کدو پسند فرماتے تھے۔ (احمد)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا:

میری والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے میرے ہاتھ کھجوروں کا ایک ٹوکرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ آپ مجھے (گھر میں) نہ ملے آپ قریب ہی اپنے ایک آزاد کردہ غلام کے ہاں تشریف لے گئے تھے اس نے آپ کو دعوت دی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کھانا تیار کیا تھا۔ میں حاضر خدمت ہوا تو آپ کھانا تناول فرما رہے تھے آپ نے مجھے بھی اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دی۔ ان صاحب نے کدو اور گوشت ڈال کر ٹرید بنا رکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کدو اچھا لگتا ہے تو میں اس (کدو) کے ٹکڑے (برتن کے اطراف

میں سے) جمع کر کے آپ کے قریب کرنے لگا۔ جب ہم لوگوں نے کھانا کھالیا تو آپ واپس گھر تشریف لے گئے۔ میں نے (کھجوروں کا) ٹوکرا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھ دیا۔ آپ نے کھجوریں کھانا اور تقسیم کرنا شروع کر دیں حتیٰ کہ ختم کر کے فارغ ہو گئے۔ (احمد)

صرف تمبوڑے سے جو تھف غالباً ایک صاع ہوں گے اور کیکر کے تے تھے (جو چڑے کی دباغت میں کام آتے ہیں) اور بغیر دباغت کھال لٹکی ہوئی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ابن خطاب! آپ کیوں روتے ہیں؟“

میں نے کہا: اللہ کے نبی! میں کیوں نہ رھوں؟ اس چٹائی سے آپ کے پہلو میں نشان پڑ گئے ہیں (کوئی نرم بستر بھی نہیں)۔ اور آپ کے سلمان رکھنے کی جگہ میں کچھ نظر نہیں آتا سوائے اس (ایک صاع جو) کے جو میں دیکھ رہا ہوں۔ ادھر کسریٰ اور قیصر یا غول اور میووں میں (پیش کر رہے) ہیں۔ آپ اللہ کے نبی اور اس کے برگزیدہ ہیں اور یہ آپ کا توشہ خانہ ہے (جو خالی پڑا ہے)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”خطاب کے بیٹے! کیا تو اس بات سے خوش نہیں

کہ ہمیں آخرت مل جائے اور ان (قیصر و کسریٰ) کو دنیا میں نے کہا: کیوں نہیں! (میں خوش ہوں)۔“

فوائد و مسائل :

1۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کا مال جمع نہیں کیا بلکہ زہد اختیار فرمایا۔

2۔ گھر میں ایک دو وقت کی خوراک موجود ہونا زہد کے منافی نہیں۔

3۔ بے تکلف ساتھیوں میں صرف تہ بند پہن کر، یعنی قیص پہنے بغیر بیٹھنا جائز ہے۔

4۔ صحابہ گرام رضی اللہ عنہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید محبت رکھتے تھے۔

5۔ کافروں کو ان کی نیکیوں کا معاوضہ دنیا ہی میں دنیوی سامان یا عیش و عشرت کی صورت میں مل جاتا ہے۔

6۔ مسلمان پر دنیوی تنگ دستی آخرت میں درجات کی بلندی کا باعث ہے۔

جب تجھ سے نانا جوڑا ہے

فاطمہ صغریٰ قلدز

میرے سر کی تایا ابا کے ساتھ کلج لاف کے
نہانے سے بہت پکی دوستی تھی۔ بہادر آباد سوسائٹی
میں ہمارے گھر پر ہر چاند کی پندرہویں شب مشہور
قوال منظور احمد نیازی کی قوالی ہوا کرتی تھی۔ کلام اردو
کے علاوہ زیادہ تر فارسی کے مشہور شعرا۔ مثلاً
فردوسی، طوسی، عمر خیام، حضرت خواجہ معین الدین

چشتی، نظام الدین اولیاء، سعدی شیرازی اور طوطی بہند
حضرت امیر خسرو وغیرہ محفل کا ایسا رنگ جسا کہ سبحان
اللہ! کیونکہ صوفیانہ شاعری کا فارسی کلام اردو سے
کیس زیادہ خوب صورت ہے، من موہ لیتا ہے۔ اس
تقرب کے لیے خاندان کے لڑکے لڑکیوں کو شروع ہی
سے ایسی محفلوں میں نشست و برخاست آداب و
اطوار کی تربیت دی جاتی تھی اور یوں ہمیں فارسی کے
کلام سے بھی شناسائی اور دلچسپی ہو جاتی۔

ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ تایا ابا کے عزیز ترین
دوست جناب سید غوث محی الدین کے داماد سید بشیر
الدین صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے ایک گلابی
رنگ کا لفافہ تایا ابا کی خدمت میں پیش کیا کہ یہ غوث
پاشا کی طرف سے ہے۔ تایا ابا نے بڑے شوق سے لیا۔
اس میں ایک گلابی ہی رنگ کے کاغذ پر حضرت امیر
خسرو کے شعر کا ایک مصرعہ لکھا تھا۔

”کہ دارو جز تو دوست آنکہ باشد“ نیچے بریکٹ میں
لکھا تھا

(آپ کی بھتیجی کا ہاتھ اپنے بیٹے کے لیے چاہتا
ہوں۔)

جواب میں تایا ابا نے اسی لفافے میں ”بہ سرو چشم
قول کردم“ لکھ کر بھیج دیا۔

عنوان دلچسپ تھا سوچا، چلو قلم اٹھاتے ہیں
س : خواتین اور شعل کب پڑھنا شروع کیا؟
ج : شادی کے بعد اس وقت جب میری بڑی بیٹی
نے میٹرک کیا۔ دوسری ساتویں جماعت میں تھی میں
کراچی کے مشہور ترین سینٹ جوزف کالج میں پڑھایا
کرتی تھی کہ بے انتہا چاہنے والے شوہر کا اچانک
انتقال ہو گیا۔ تب سے یہ دونوں رسالے میرے رفیق
ہیں۔

س : شادی سے پہلے کیا مشاغل تھے؟
ج : شادی سے پہلے صرف حصول علم کا جنون تھا
چنانچہ بی۔ اے میں فرسٹ ڈویژن ملی اور ایم۔ اے میں
فرسٹ پوزیشن ملی تھی۔ اس کے علاوہ ڈرائنگ، آئل
پینٹنگ، ٹیکسٹائل کے خلاف، کشن کورز اور ٹیکسٹائل
پرائمر انڈری کرنے کا شوق تھا اردو اور انگریزی کے
مشہور ناولز کے مطالعے کا شوق تھا۔

س : اس رشتے میں آپ کی مرضی تھی یا گھر والوں
کی مرضی تھی جس پر آپ نے سر جھکا دیا تھا؟

ج : ایک انوکھی بات بتاؤں کہ میری شادی حضرت
امیر خسرو کے شعر کے صرف ایک مصرعے پر طے ہو
گئی تھی، کیسے؟ اس کا جواب ذرا تفصیل طلب ہے
لیکن بہت دلچسپ!

دراصل جب میں ساڑھے تین سال کی اور بھائی
سال بھر کا تھا تب ہی ہماری امی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس
وقت سے ہی ہم لوگ تایا ابا کے اصرار پر ان لوگوں کے
ساتھ رہنے لگے۔ ان کا گھر بہت ہی کشادہ اور ہوادار
تھا۔ جہاں میری بڑی تایا زاد بہن بہنوئی اور ان کے
بچے تھے، پھر ہم چلے گئے تو سب کے بھائی بہن کی طرح
رہنے لگے۔

شام کو اباجان آفس سے لوٹے تو بھائی بھانج کو منتظر پایا۔

مبارک ہو۔ آپ کی صاحبزادی کی شادی کی بات طے پائی۔ ”تائی اماں نے ہنس کر کہا۔
ابا جان کہاں تو جناح کیپ اتار کر بیٹھنے لگے تھے۔
تھا اکر زکریا، لمحہ بھر کو ہکا بکا سے رہ گئے، پھر جب بھائی
بھانج کے مسکراتے چہرے دیکھے تو جا کر بھانج کا ہاتھ
موندنا اس کی پشت پر بوسہ دیا، فرمایا۔
”خیر مبارک“

”غوث پاشا نے اپنے داماد کے ہاتھ حضرت امیر
خسرو کا ایک مصرعہ لکھ کر آپ کی بیٹی کا ہاتھ مانگا، تو ہم
نے بھی اپنی رضامندی میں سعدی شیرازی کا شعر لکھا
اور نیچے بریکٹ میں لکھ دیا، ”بہرو چشم قبول کردم“
اباجان مسکرانے لگے۔

مارے حیا کے ہم کو جو منظر سے غائب ہونے کا
موقعہ ملا، کمرے کی طرف لپکے۔ گھر والوں کی خوشی
سے بھرپور آوازوں نے پیچھا کیا۔ کمرے میں تکیا زاد
بسن اختر تپا کی پیشیاں تھیں۔ سب نے زندہ باد کے
نعرے لگائے۔ رات تک میکے کے سب لوگوں کو
اطلاع پہنچ چکی تھی فون پر۔ چنانچہ سب خالہ زاد
بہنیں پہنچ گئیں، والد اوس کے سبک ڈھول لے کر۔
ہمارے آباؤ اجداد حیدر آباد کن سے ہجرت کر کے
آئے تھے اب بھی ہمارے گھر کے طور طریقے وہی
تھے خانہ ماں نے فوراً ”حیدر آبادی ہرے سالے
والی بریانی“ بکھارے، بیگن، شکر قندی کی کھیر بنائی تھی۔
دستر خوان بچھ گیا۔ ہنسی خوشی کی رونق تھی۔ چنانچہ
رات ڈھولک کے ساتھ محفل جمی، بیاہ والے چند
گیت یہ تھے۔

ارے بنو بولت کیوں نا ہی نہرے سے

اری لاؤ دو۔

اری بنو جھومر جوا نکا ہے گھونگھٹ میں (دوبارہ)
وہ ہر حالہ وہ میا پیارا۔ چھڑائے گا چاہت سے
بڑے ارمانوں سے۔ اری بنو۔

اری بنو نکلتا جوا نکا ہے آچل میں
وہ ہر حالہ وہ میا پیارا۔ چھڑائے گا چاہت سے
بڑے ارمانوں سے۔ اری بنو۔

شہزادہ دولہا آئیوری چلو دیکھ لو
بھائیوں کا پیارا۔
پھولوں کی لڑکیوں کا سرو سجائے
بنوں کا پیارا آئیوری چلو دیکھ لو
بینڈ اور باجے سے دھوم مچائے
گھوڑے پر بیٹھا آئیوری۔ چلو دیکھ لو

آیا بنا آیا ہر حالہ بنا آیا۔ راج دلار بنا آیا
حورو ملک نے گایا، ہر حالہ بنا آیا، راج دلار بنا آیا

میں تو نظر کے ڈر سے
دیکھی نہ آنکھ بھرے، جی دیکھی نہ آنکھ بھر کے
مویں مکھ پایا۔ ہر حالہ بنا آیا، راج دلار بنا آیا
تن من میں وار ڈالوں
تیری بلا کو ٹالوں رے، تیری بلا کو ٹالوں
جگ سارا جگمگایا۔ ہر حالہ بنا آیا، راج دلار بنا آیا
س : ذہن میں جیون ساکھی کے حوالے سے کوئی
تصور تھا؟ وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ ان میں دیکھنا
چاہتی تھیں؟

ج : ذہن میں صرف یہ تصور تھا کہ جیون ساکھی اعلا
اخلاق و کردار کے حامل ہوں۔ اعلا تعلیم یافتہ اور بہت
بہت چاہنے والے ہوں۔ اللہ کا کرم ہے کہ وہ بالکل
اس کا نمونہ تھے۔ مزاج میں شگفتگی اتنی تھی کہ میکے
میں سب سے زیادہ مقبول داماد ہی تھے۔

س : منگنی کتنا عرصہ رہی، شادی سے پہلے کوئی بات
ہوئی یا ملاقات؟

ج : بس چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات تھی۔ فون بھی
کبھی نہ کیا کہ بیویوں کے فیصلے ان کے تجربے مشاہدے
پر مبنی ہوتے ہیں اور فون پر کیوں بات کروں کہ ہونے

والی سسرال میں میرا ہی اسٹج خراب ہو جائے۔

س : شادی سے پہلے آپ کے سسرال والوں کے بارے میں کیا خیالات تھے؟ کیا وہ ان پر پورے اترے؟

ج : قوالیوں کے موقعوں پر زنانے کے لیے ہال کے درمیان میں برنڈل جارحٹ کا پردہ ہوتا تھا اور ہر ماہ ہونے والی سسرال کی خواتین آتیں، سب بڑھی لکھی شائستہ اطوار تھیں۔ دکنی اعلیٰ تہذیب کا نمونہ۔ نیک امیدیں تھیں سب پوری ہوئیں۔

س : شادی کے لیے کوئی قربانی دینی پڑی؟ یا کوئی اور؟
ج : میں نے ایم لے کیا تھا کہ شادی ہو گئی۔ سسرال میں تین نندیں تھیں۔ ان کا ایک اکلوتا بھائی تھا تو میرا استقبال انتہائی محبت سے کیا گیا تھا۔ دوسرے دن تیار ہو کر گھر سے باہر آئی۔ سر صاحب آرام کرسی پر بیٹھے کتاب پڑھ رہے تھے، اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑھ کر سر پر ہاتھ رکھا اور پکار کر کہا ”لی لی“ آئیں یہ دیکھیں۔ آپ کی بہو آپ کو سلام کرنے آئی ہے۔ میں نے سر صاحب کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا، پٹلی تو ساس صاحبہ نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔

ان ہی دعاؤں کے سائے میں اللہ نے ہر مقام پر خوشیاں اور رحمتیں عطا کیں۔ ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا۔
س : شادی کی رسموں کے دوران یعنی لین دین کے معاملے پر کوئی بد مزگی ہوئی؟

ج : بالکل بھی نہیں بلکہ خلد آشیاں ساس صاحبہ نے کھلوا دیا تھا کہ ہمیں صرف بڑھی لکھی اچھے خاندان کی بہو چاہیے تھی۔ نہ آپ لوگ فرنیچر میں نہ چیز نہ ہی دولہا کے لیے کپڑوں وغیرہ کا اہتمام کریں۔ لیکن تیا جان، تانی جان نے کہہ دیا کہ یہ تو ہمارے گھر کی پہلی شادی ہے، پہلی خوشی ہے۔ آپ شادی کے دن کے لیے شیروانی کا اور ولیمہ کے کوٹ پینٹ سوٹ کا ٹاپ بھجوا دیں۔ چنانچہ خوش دلی اور باہمی رضامندی سے سارے معاملات ہو گئے۔

س : شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟
ج : یہ بہت ہی پرسنل سوال ہے۔

س : شادی کے بعد آپ میں کیا تبدیلیاں آئیں؟
ج : جہاں جوائنٹ فیملی سسٹم ہو، وہاں یقیناً مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن خوش دلی اور افہام و تفہیم سے کام لیا جائے۔ اگر آپ اچھی تعلیم یافتہ ہوں تو یہ بنیادی جوہر ہوتا ہے۔ خود اعتمادی، تحمل، درگزر اور صبر سے کام لے کر خود مسائل کا حل فراخ دلی سے نکالیں تو اللہ رب العزت کی مدد شامل ہو جاتی ہے۔

س : سسرال میں کن باتوں پر تنقید ہوئی؟
ج : اس ناچیز نے موقع ہی نہیں دیا کہ تنقید کی جائے۔ بڑی نندا اپنے بھائی کی عاشق زار تھیں۔ انہوں نے مجھے آنکھوں کا تارہ بنا کر رکھا۔ ساس سسراتنے قدر دان تھے کہ حد نہیں۔ سر محترم کے شکاریات کے قصے سنتا میرا شوق تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کو بتا ہے، آپ کے شوہر نے اٹھارہ سال کی عمر میں پہلا شیر مارا تھا۔ پھر اٹھ کر گئے اور چاندی کی ایک ڈبیہ میں روٹی میں رکھے شیر کے ناخن دیے کہ سنبھال کے رکھیں۔ بھی اس کا فیکلس بنوایا جاسکتا ہے کسی اچھے جوہری سے!

س : شادی کے کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟
ج : برسوں بعد جب ہم نے بیٹیاں ہونے کے بعد الگ گھر میں رہائش شروع کی۔
س : سوال نمبر ۳۳ سے نمبر ۳۴ کے جوابات کا گزشتہ جوابات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ میکہ اور سسرال کبھی ایک جیسے تو ہو ہی نہیں سکتے۔ کامیابیاں اور محبتیں جہد مسلسل سے حاصل ہوتی ہیں۔ اور خواتین اور شعل عصبی رسالوں کی رہبری سے ورنہ زندگی پھولوں کی بیج تو ہوتی ہی نہیں! اس کی گواہ پیاری امت الصبور اور عزیز سائہ غلام نبی ہیں۔ جن کو میں نے کالج کے آخری تدریسی دور میں طالبات کے درمیان ہونے والے ”مقابلہ سبزی“ میں بحیثیت مہمان گرامی بلایا تھا اور جس کے مہمان خصوصی ”مصور پاکستان“ کے خطاب یافتہ عظیم مصور تھے۔



یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناؤلز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

✓ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

✓ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

جب تجھ سے نانا جوڑا ہے

ن۔ ق

ن۔ ق۔ راولپنڈی

میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں، صرف بیچ کلاس تک پڑھا ہے۔ اس میں بہت غلطیاں ہوں گی مگر شائع ضرور کریں۔ شعلع میری بہن منگواتی ہے، خواتین ڈائجسٹ میں بیچیں کریں صرف یہ ساٹھ روپے اپنے اوپر لگاتی ہوں۔

س : شادی کب ہوئی؟

ج : تاریخ یاد نہیں آتا پتا ہے کہ 28 سال ہو گئے ہیں۔

س : شادی سے پہلے کے مشاغل؟

ج : مشاغل کیا تھے۔ بے فکری کے دن تھے۔ کسی کام کا کچھ پتا نہیں تھا۔ سولہ سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ کسی کام کا کچھ پتا نہیں تھا نہ ماں نے سکھایا۔ ایک آٹا گوندیتی تھی۔ وہ بھی ابو نے سکھایا تھا۔ میرے ابو کی گھر کے ساتھ دکان تھی۔ ابو بہت نرم دل تھے اور انی بہت سخت بہم دو بہنیں اور دو بھائی ہیں۔

س : رشتے میں مرضی؟

ج : بس ابو کے دوست کے بیٹے تھے۔ مجھ سے عمر میں پندرہ سولہ سال بڑے، باتوں ہی باتوں میں انہوں نے ابو سے میرا رشتہ مانگ لیا۔ ابو نے کہا ابھی میری بیٹی بہت چھوٹی ہے لیکن انہوں نے بہت اصرار کیا اس لیے میرا نکاح ہوا پہلے اس وقت میری عمر چودہ سال تھی اور دو سال بعد میری شادی ہوئی، ہم بہت غریب تھے اور سرال والے تھوڑے امیر تھے یہ گیارہ بہن بھائی تھے۔ بس گھرے دوست ہونے کی وجہ سے رشتہ ہوا۔

س : منگنی کتنے عرصے رہی؟

ج : میں نے بتایا نا کہ میرا نکاح پہلے ہوا چودہ سال رہا پھر شادی ہوئی۔

س : شادی کے لیے قربانی؟

ج : قربانی کیا دینی بے اس امی بہت غیرت والی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ابو سے ہر وقت لڑائی کرتیں، مجھے ابو پر بہت ترس آتا اور اچھے کپڑے پہننے کا بہت شوق تھا۔ غریب تھے۔ اس لیے کبھی اتنے اچھے کپڑے نہیں پہنے، سوچا شادی ہوگی تو اچھے اچھے کپڑے پہنیں گے۔ یہ نہیں پتا تھا کہ شادی نام کس چیز کا ہے۔

س : رسموں کے لین دین پر کوئی جھگڑا ہوا؟

ج : نہیں کوئی نہیں۔

س : شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟

ج : کچھ نہیں انہوں نے بچپن میں مجھے دیکھا ہوا تھا۔

س : شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج : یہ نہ پوچھیں کہ کیا تبدیلی آئی۔ سولہ سال کی عمر میں آنکھیں کھل گئیں کہ شادی کے بعد کی زندگی کتنی مشکل ہے۔ ساس، سرمنڈیں، دیور، جیٹھ جیٹھانیاں ان کے نیچے شکر کہ وہ الگ تھے۔ اف کیا لکھوں بہت ہی مشکل وقت گزارا اور اب تک گزار رہی ہوں۔

س : کتنے عرصے بعد کام کلج سنبھالا؟

ج : سات، آٹھ دن بعد اور 28 سالوں سے کام اور بس کام۔ اب تو ہر وقت کمر میں درد رہتا ہے۔ کام سے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ دو منڈوں کی شادی مجھ سے پہلے ہوئی تھی۔ تین ابھی تک کنواری ہیں۔ بہت عمر کی ہیں۔

کہتی ہیں کہ ہم پر کٹا علم ہوا ہے جس سے ہمارا رشتہ نہیں ہوتا جبکہ فارغ بیٹھ بیٹھ کر وہ بہت مہنت مہنت کرتی ہیں اور ہر رشتے پر شرط رکھتی ہیں پچھلی کم ہو اور امیر ہو جس اللہ کو لگتا ہے ان کی بات پسند نہیں۔ اس لیے اب رشتے نہیں آتے۔

س : میکے اور سسرال کے کھانوں کے ذائقے میں فرق؟

ج : جی بہت زیادہ ہم غریب ضرور تھے مگر ابو بہت لذیذ کھانا بناتے تھے اور سسرال میں ایک لہسن سے تین ہاتھریاں بنتیں۔ ساس کے مرنے کے بعد تو مندوں نے حد ہی کر دی کتنی خوشی کی بس سر پر کھڑے ہو کر کھانا بنواتا۔ مجھے تو شادی سے پہلے کچھ بھی نہیں آتا تھا بس دیکھ دیکھ کر سیکھا۔ ہر بات یہ طعنہ کہ ماں نے تمہیں کیا سکھایا حالانکہ یہی پہلے کہتی تھیں کہ نہیں آتا تو نہ سہی ہم شادی کے بعد اسے سب کچھ سکھا دیں گے نہ

مجھے کھانا بنانا آتا تھا نہ ہی سلائی نہ ہی کچھ اور کام۔ بس اگر میں نے کچھ سیکھا تو ان کے طعنوں سے۔ یہ غیر تھے اب میں نے اپنی بھابھی سے بہت کچھ سیکھا اور بہت اچھا بنالیتی ہوں۔

س : سسرال میں کن باتوں پر تعریف / تنقید ہوتی؟
ج : تعریف تو اٹھائیس سال کے بعد بھی کسی نے نہیں کی اس لیے کہ مجھے گھر کے کسی کام کا پتا تھا نہ چالاکی تھی۔ کاش میرے امی ابو میری شادی جلدی نہ کرتے۔ پہلے گھر کے کام سکھاتے سالن بنانا، روٹی، چاول سب کچھ تاکہ سسرال میں میری عزت ہوتی۔ میری ہر ماں سے گزارش ہے کہ شادی سے پہلے اپنی بیٹی کو کچن کے کام ضرور سکھائے پڑھائی بھی میری بہت کم ہے۔ صرف پانچ تک پڑھا اپنی بیٹیوں کو اعلا تعلیم دلوائی میری دو بیٹیاں کالج میں پڑھتی ہیں اور دو بیٹے بھی پڑھ رہے ہیں۔ بیٹیوں کو کہتی ہوں کہ ساتھ کچن کا بھی کیا کریں۔

س : سسرال سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟

ج : کیا توقعات کرتی ہیں اگر وہ مجھے طعنہ نہ دیتے، اگر آرام سے ہر کام سکھاتے کیونکہ میں بہت ہی چھوٹی فیملی سے بڑی فیملی میں گئی تھی۔ دو سرامیری عمر صرف سولہ سال تھی۔ میں آج تک مندوں کے ساتھ ہوں میں نے اپنی ہم درواپنی بہن کو بتایا یعنی دیورانی وہ دیور میرا ٹھیک تھا اور سسرال والوں نے نہ دیکھا کہ بڑی بہن نے آج تک ہمارے آگے نہ نہیں کی چلو ایک اور نوکرانی لے آتے ہیں۔ میں بھی نہیں بولی۔ کہا، ٹھیک ہے بہن آئے گی تو میرا بوجھ ہلکا ہو گا۔ میری بہن نے میرا سارا کام اپنے سر لے لیا پھر اس سے چھوٹی دیورانی آئی۔ وہ میرے دیور کی پسند سے تھی اور امیر گھر سے تھی۔ آتے ہی اس نے پہلے مندوں کو قابو کیا۔ مندریں اس کے آگے جی جی کرتی ہیں۔ اس سے اتنا ڈرتی ہیں۔ پہلے ہم مندوں کی نوکرانیاں تھیں۔ اب دیورانی کی بھی ہیں۔ مجھ سے اب اتنا کام نہیں ہوتا، مگر میں در در رہتا ہے۔ سارا کام بہن کرتی ہے۔ اب اس پر بہت ترس آتا ہے کہ کاش اس کی شادی ادھر نہ ہوتی۔ میں تین ٹائم کچن کا کام کرتی ہوں اور باقی سارا کام بہن کرتی ہے۔ میرے خاوند بھی بہت سخت ہیں۔ ان سے کہتی ہوں کہ اب الگ ہو جائیں مگر وہ نہیں مانتے۔

س : پہلے بچے کی پیدائش؟
ج : پہلے بیٹا ہوا، سنبھالنا بہت مشکل تھا۔ بس اللہ نے ہمت دی اور سنبھال لیا۔
س : سسرال میں مقام؟
ج : اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی نہیں ملا۔ بہت قربانی دی مگر غربت سے آئی تھی، آج تک وہی یاد کرتے ہیں۔ بہت دل دکھایا سسرال والوں نے مگر اب اور بھائیوں کی عزت کا خیال کیا اور آج تک کر رہی ہوں۔

س : میکے اور سسرال میں فرق؟
ج : امی بہت سخت تھیں۔ بچپن میں بہت مار بھی کھائی۔ مگر اب سوچتی ہوں کہ یہ کتنی اچھا لگتا ہے۔

ایک ابوساس مسرورقات پاگئے ہیں مگر سسرال کی زندگی بہت بہت کٹھن ہے۔ خدا ہر لڑکی کو اچھا سسرال دے۔

س : جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ؟

ج : میں اب تک جوائنٹ فیملی میں ہی ہوں لیکن اب مجھے پسند نہیں۔ ساری زندگی میں ننڈوں کی محتاج رہی۔ پکایا ان کی مرضی سے۔ آج تک کبھی اپنی مرضی سے نہیں پکایا۔ کیا میرا دل نہیں؟ شوہر جس دن نہ اچھا بنا ہوا اپنے لیے اور بچوں کے لیے باہر سے لے آتے ہیں۔

س : شوہر سے تعلقات؟

ج : میرا تو شوہر نے بہت دل دکھایا۔ کبھی ان کو میرا خیال نہیں آیا نہ کبھی میری پسند کا پوچھا۔ بات بات پہ گالی دیتا نہ کبھی اپنے دل کی بات مجھ سے کہتا نہ کبھی میری سنی۔ لیکن میرے منہ سے ان کے لیے دعا ہی نکلتی کہ اللہ ان کو صحت دے میں پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہوں اور ان کی صحت کے لیے دعا کرتی ہوں۔ اب

بہت بیمار رہتے ہیں لیکن مزاج میں نرمی بالکل نہیں۔ پڑھنے والی سب نہیں دعا کریں۔ اللہ ان کا دل میرے لیے نرم کرے۔ آمین۔ پتا نہیں میرے شوہر اتنے سخت کیوں ہیں۔ بہت خدمت کرتی ہوں مگر ان کے دل میں میرے لیے نرمی نہیں ہے۔ ساری زندگی میں نے اپنے سسرال والوں کے لیے وقف کر دی مگر ذرا بھی عزت نہیں ملی۔ اب تو ذرا سی بات پر رونے لگ جاتی ہوں۔ بس ایک بہن ہے جس سے بات کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرتی ہوں اور وہ مجھ سے۔

آج کے دور میں کون سی لڑکی کسی کی بات برداشت کرتی ہے۔ محلے والیاں بھی اپنے گھر میں ہم دونوں بہنوں کی باتیں کرتی ہیں اور ہماری مثالیں دیتی ہیں کہ اگر کسی نے سسرال میں وقت گزارا ہے تو ان بہنوں نے ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ بس اتنی اپنے اللہ سے دعا ہے کہ شوہر کے دل میں نرمی ہو وہ مجھے پیر کی جوتی نہ سمجھیں بلکہ اپنا لباس سمجھیں۔ میں نے آج

تک اپنے لیے کچھ نہیں مانگا جو مانگا بچوں کے لیے مانگا۔ اب تو بچے بھی تنگ آگئے ہیں۔ باپ کے روپے سے۔ بس اللہ ان پر رحم کرے بس میری ساری زندگی دکھوں میں گزری۔ پتا نہیں میری زندگی میں کبھی سکون ہے بھی کہ نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ بچے بہت نیک ہیں اور میرا خیال رکھتے ہیں۔ میں اب نماز پڑھتی ہوں اللہ سے دعا کرتی ہوں اللہ ہی مشکلیں آسان کرنے والا ہے۔ بس ایک بار پھر میری تمام ماؤں سے گزارش ہے کہ اپنی بیٹیوں کو ہر کام سکھا کر شادی کریں کیونکہ ہر لڑکی کی اصل زندگی ہی شادی کے بعد شروع ہوتی ہے۔



خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ماہی

دستِ کزدر

فوزیہ یاسمین



قیمت - 750 روپے

32735021

Downloaded From Paksociety.com



بندھن

عاصمہ شیرازی ہمارے مُدثر

شاہین رشید

فیصلوں کے آگے بے بس ہوتا ہے۔
عاصمہ شیرازی صحافت کی دنیا کا ایک بڑا نام
معروف اینکو جن کی اپنی ایک خاص پہچان ہے۔
اس بار ”بندھن“ کے سلسلے میں ہمارے ساتھ ہیں۔
”کیسی ہیں عاصمہ؟“
”الحمد للہ۔۔۔“

”آج کل آپ کو ”آج“ چینل پر دیکھ رہے ہیں۔
گزشتہ دو تین سالوں میں آپ نے تین چار چینلز
بدلے۔۔۔ وجہ؟“

”جی میں آج کل ”آج“ ٹی وی چینل سے وابستہ
ہوں۔ اس سے پہلے چینل ”2“ میں تھی جہاں
میں نے ایک سال کام کیا۔ اس سے بھی پہلے ”بول“

میڈیا سے وابستہ لوگوں کے لیے لوگوں کی یہی
سوچ ہے کہ ان کی شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں۔ مگر
ایسا نہیں ہے۔ میڈیا سے وابستہ لوگ بھی ہماری اور
آپ کی طرح انسان ہی ہوتے ہیں جو ایک پرسکون اور
خوش گوار زندگی گزارنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اور
پھر پڑھے لکھے لوگ اپنی زندگی کا جو بھی فیصلہ کرتے ہیں
بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ شوبز کی دنیا میں ضرور
”اٹھانچ“ ہوتی رہتی ہے مگر صحافت سے وابستہ لوگوں
میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ ہماری نانچ میں بہت سے ایسے
جوڑے ہیں جو ماشاء اللہ کئی سال بیت جانے کے باوجود
بہت ہی خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔ باقی یہ
آسمانوں پر لکھے گئے فیصلے ہوتے ہیں اور انسان ان



میں تھی اور ”بول“ کے نہ آنے کی وجہ سے ہماری پروفیشنل لائف پہ کافی اثر پڑا لیکن اب میں آج میں ہوں اور الحمد للہ یہاں کام کر کے بہت مطمئن ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ ”صحافت“ کرنے کا موقع مل رہا ہے جیسا کہ پروفیشنل آرگنائزیشن میں ہوتا ہے۔“

”شادی کو کتنا عرصہ گزر گیا اور بچوں کے بارے میں بھی بتائیے گا۔“

”ہماری شادی کو ماشاء اللہ آٹھ سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے اور ماشاء اللہ سے ہمارے دو بیٹے ہیں، میرا بڑا بیٹا علی، آیان عباس اور علی حسین عباس۔ بڑا

بیٹا سات سال کا ہے اور چھوٹا تقریباً دو سال کا ہے۔ اور اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے کہ میں ایک بہت ہی اچھی اور خوش حال زندگی گزار رہی ہوں۔“

”ارنج میرج ہے یا لو اور آپ مدثر صاحب کو کیسے جانتی تھیں؟“

”ہم دونوں بہت اچھے دوست بھی تھے اور بہت اچھے کو لیک بھی اور ہماری شادی کی وجہ ہماری دوستی ہی ہے۔ نہ ہمارا افریقا اور نہ ہی کوئی محبت والا سین تھا۔ ہاں مدثر یہ چاہتے تھے کہ ہماری شادی ہو جائے۔ چنانچہ میرے گھر والوں کو بھی یہ بہت اچھے لگے اور ہماری شادی ہو گئی تو میں اپنی شادی کو مکمل طور پر ارنج میرج کہوں گی۔ ہماری تو سہیلیوں جیسی دوستی تھی اور شادی کی کامیابی کی وجہ بھی محبت سے زیادہ دوستی ہوتی ہے اور پھر محبت تو ہو ہی جاتی ہے۔“

”شادی کے بعد مدثر میں کوئی تبدیلی آئی۔ عموماً“

”لڑکے شادی کے بعد بدل جاتے ہیں۔“

”مدثر میں کوئی خاص تبدیلی تو نہیں آئی۔ ہماری ملگنی دو ماہ رہی تھی اور ملگنی کے فوراً بعد شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو گئی تھیں اور میں ساتھ ساتھ کام بھی کر رہی تھی تو کافی مصروف رہتی تھی میں۔“

”شادی کی شاپنگ سرال والوں کے ساتھ کی تھی؟ اور یقیناً آپ بہت حسین دلہن لگ رہی ہوں گی؟“

”شادی کی شاپنگ میں نے سرال والوں کے ساتھ مل کر کی تھی اور بہت انجوائے کر کے شاپنگ کی تھی کیونکہ ادھر سے میرے میکے والے اور ادھر سے سرال والے تو ہم سب نے بہت مزے کیے تھے۔ اور بالکل میں بہت حسین لگ رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک مکمل عورت بنایا ہے اور بڑے پیار سے بنایا ہے تو دلہن کے روپ میں میں سب کو تو اچھی لگ ہی رہی تھی۔ مجھے بھی اپنا آپ بہت پیارا لگ رہا تھا اور یہ ایک یادگار اور نایاب لمحے ہوتے ہیں تو پھر جوج بھی ضروری ہوتی ہے۔“

”کیا نکاح پہلے ہو گیا تھا؟ اور نکاح نامہ آپ نے پڑھا تھا۔ اور یہ کہ شادی کی رسمیں دونوں نے مل کر انجوائے کی تھیں یا علیحدہ علیحدہ رسمیں ہوئی تھیں؟“

”نکاح ہمارا پہلے ہو گیا تھا، رخصتی سے تقریباً آٹھ دن پہلے اور چونکہ نکاح پہلے ہو گیا تھا تو ہم نے رسمیں بھی انجوائے کی تھیں۔ خاص طور پر ”مہندی“ کی رسم اور اس موقع پر ہم نے ”قوالی“ کا اہتمام بھی کیا تھا اور شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی اور رشتے داروں کے علاوہ میڈیا کے لوگ بھی کافی تعداد میں آئے تھے اور ویڈیو ریسریشن میں میڈیا کی بہت بڑی تعداد آئی تھی

”شادی کے بعد لڑکیاں اپنے نام کے ساتھ اپنے شوہر کا نام لگاتی ہیں، مگر آپ نے؟“

”اس لیے کہ میرے شوہر نے مجھے نہیں کہا کہ نام بدلو اور ویسے بھی میرے نام کی ایک پہچان تھی اور اس پہچان کی وجہ سے بھی نام نہیں بدلا۔ بہت سے ممالک ہیں جہاں نام نہیں بدلا جاتا اور نہ ہی بدلنا چاہیے۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے اور ہماری زندگی ماشاء اللہ بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ کے ساتھ گزر رہی ہے۔“

”زندگی میں کبھی ایسا موڑ آیا جہاں آپ کو شادی کر کے پچھتاوا ہوا ہو؟ یا سسرال میں کسی نے کہا ہو کہ جاب چھوڑ دو؟“

”محمد شفیع ایسی نوبت کبھی نہیں آئی۔ اللہ نے بہت پیاری اولاد دی ہے۔ بہت اچھا لائف پارٹنر ملا ہے۔ زندگی بھر پور ہو گئی ہے، زندگی میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اس لیے راستہ جدا کرنے کا نہیں سوچا اور کسی نے جاب چھوڑنے کو نہیں کہا۔ کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ میں کیئریر اور منتقل ہوں، تھی اور رہوں گی۔ مجھے کبھی نہ سسرال نے اور نہ مدثر نے فورس کیا، جاب چھوڑنے کے لیے۔ تو اس طرح کی ڈسکشن ہمارے درمیان کبھی نہیں ہوئی۔“

”ایک خطرناک سوال سب سے کرتی ہوں کہ اگر آپ کے میاں صاحب کو کوئی اور لڑکی پسند آگئی تو؟ اور ہمارے مذہب میں اس کی اجازت بھی ہے۔“

”دوسری شادی کے لیے موثر کو اجازت ہے، مگر اس کے بعد مجھ سے ملنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس معاملے میں میں بھی ایک روایتی بیوی ہوں۔ شراکت تو برداشت ہی نہیں ہے۔“

”لڑائیاں ہوتی ہیں آپ دونوں میں؟ اور گھر کا نظام کس کے ہاتھ میں ہے، آپ کے یا مدثر صاحب کے؟“

”جی لڑائیاں ہوتی ہیں، مگر مجھے یاد نہیں آ رہا کہ کوئی بہت بڑی لڑائی ہوئی ہو، چھوٹی موٹی ہوتی ہیں اور پھر ہم دس پندرہ منٹ میں ٹھیک بھی ہو جاتے ہیں، زیادہ دیر

اور کچھ سیاست دان بھی تشریف لائے تھے اور اتنی آرگنائزڈ طریقے سے ہماری شادی ہوئی کہ ہفتوں ہماری شادی ڈسکس ہوتی رہی اور اسلام آباد میں ہی ہوئی تھی۔ میں نے اور مدثر نے تو بہت چاہا کہ شادی ساوکی سے ہو۔ مگر آپ کو پتا ہی ہے کہ ایسے موقعوں پر نہ لڑکی کی سنی جاتی ہے اور نہ ہی لڑکے کی، تو دونوں فیملیوں نے دل کھول کر پیسہ خرچ کیا۔“

آپ کے سوال کا دوسرا حصہ نکاح نامہ میں نے پڑھا تھا اور اس میں یہ شق پہلے سے موجود تھی کہ لڑکی کو طلاق کا حق حاصل ہے۔ اس لیے کچھ ترمیم کرانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ نکاح نامہ ضرور پڑھنا چاہیے اور دستخط کرانے سے پہلے میری رضامندی بھی پوچھی گئی۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ نکاح نامہ ایک بہت بڑا سوشل کنٹریکٹ ہوتا ہے اپنے لائف پارٹنر کے ساتھ اور صرف نکاح نامہ ہی نہیں ہر ڈاکومنٹ کو پڑھ کر ہی دستخط کرنے چاہئیں۔“

”منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون منایا تھا؟ اور کیا یہ ضروری ہے؟“

”منہ دکھائی میں بڑا ہی خوب صورت برہنہ سلٹ مجھے مدثر نے دیا تھا اور ہنی مون کے لیے ہم ”ملائیشیا“ اور ”سری لنکا“ گئے تھے اور یہ بالکل بھی ضروری نہیں ہے، مگر اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو نئے نئے لائف پارٹنر بنے ہوتے ہیں انہیں ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملے اور ایک دوسرے کی پسند ناپسند کو سمجھ سکیں، ایک دوسرے کو

سمجھ سکیں اور ایسا اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ کچھ ٹائم ایک دوسرے کے ساتھ فیملی کے بغیر گزار سکیں۔“

”جوائنٹ فیملی یا شروع سے ہی علیحدہ رہیں اور میکے اور سسرال میں کیا فرق پایا؟“

”میں اپنے میکے میں بھی بہت لاڈلی تھی۔ سسرال میں بہت زیادہ رہنے کا اتفاق اس لیے نہیں ہوا کہ وہ اسلام آباد میں نہیں رہتے لیکن مجھ کو آپریشن ہر جگہ ملا محبت ہر جگہ سے ملی۔“

خواتین ڈائجسٹ

نومبر 2016ء
کے شمارے کی ایک جھلک



- ”آب حیات“ عمیرہ احمد کا ناول تکمیل کے مراحل میں،
- ”نمل“ نمرہ احمد کا مکمل ناول،
- ”دشت جنوں“ آمنہ ریاض کا ناول،
- ”محبت، خواب، جزیرہ“ عمیرہ سید کا مکمل ناول،
- ”تھینک یو سلجوق“ راشدہ رفعت کا مکمل ناول،
- ”اچھی بہو“ سمیرا عثمان گل کا ناول،
- سائرہ رضا، سمیرا حمید، میونہ صدف، عاصمہ فرحین،
- قرۃ العین سکندر اور ہاجرہ ریحان کے افسانے،
- ”کرن کرن کرن روشنی“ احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،
- ”جاوید شیخ“ سے ملاقات،
- ”علیڑے“ سے باتیں،
- ”حرف سادہ کو عنایت ہوا اعجاز کا رنگ“ مصنفین سے سروے،

خواتین ڈائجسٹ کا نومبر 2016 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

Downloaded From Paksociety.com



اللہ تعالیٰ نے اس آزمائش میں نہیں ڈالا کہ ہم ایک دوسرے سے وقتی طور پر الگ ہوں تو پتا چلے کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں یا نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ ہمیں نظریہ سے بچائے۔ ہم بالکل دوستوں کی طرح بات کرتے ہیں تو میرا بڑا بیٹا بھی بہت حیران ہوتا ہے کہ آپ دونوں ایک ساتھ جاتے ہیں اور ایک ساتھ آتے ہیں اور دوستوں کی طرح رہتے ہیں اور دوستوں کی طرح انجوائے کر رہے ہوتے ہیں۔“

”جوائنٹ فیملی بہتر ہوتی ہے یا علیحدہ گھر؟“
”اگر وہ افورڈ کر سکتے ہیں علیحدہ رہنا تو الگ ہی رہنا چاہیے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ ہر عورت مرد کا دل چاہتا ہے کہ اس کا اپنا گھر ہو جسے وہ اپنی مرضی سے چلائے۔“

”طلاق اور علیحدگی کیوں ہوتی ہیں؟“
”اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جب توقعات بڑھ جاتی ہیں ایک دوسرے سے تب مسائل جنم لیتا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب آپ شادی کرتے ہیں تو آپ کو خویہوں، خامیوں سمیت شادی کرنی پڑتی ہے۔ یا خویہوں، خامیوں سمیت کرتے ہیں تو پھر اس پر آپ کو کھپڑا ہونا بھی کرنا چاہیے اور لو میرج میں ایسا ہوتا ہے

تک ہم ایک دوسرے سے ناراض نہیں رہ سکتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دونوں میں انڈر اسٹینڈنگ بہت ہے۔ اور میں تھوڑی غصے کی تیز ہوں تو جب مجھے غصہ آرہا ہوتا ہے تو مدثر خاموش ہو جاتا ہے اور جب مدثر کو غصہ آتا ہے تو میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ اس طرح بات جلدی ختم ہو جاتی ہے اور گھر کا نظام میرے ہاتھ میں ہے۔ ظاہر ہے کہ میں خاتون خانہ ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ کیا چیز ختم ہو گئی ہے۔ کیا چیز لانی ہے۔ البتہ شاپنگ (گھر کی چیزوں کی) ہم دونوں مل کر ہی کرتے ہیں۔ حساب کتاب میرے پاس ہی ہوتا ہے۔ نوکروں سے ڈیلنگ بھی میری ہی ہوتی ہے۔ مگر مدثر کی نانج میں سب باتیں ہوتی ہیں۔ میرے بینک اکاؤنٹ کے بارے میں مدثر کو پتا ہے۔ میرے پاسپورٹ بھی ان ہی کے پاس ہوتے ہیں۔ اللہ کا کرم ہے کہ محبت اور دوستی سے بہت اچھی زندگی گزار رہی ہے۔“

”شادی کے اتنے عرصے کے بعد محبت میں کمی ہوئی ہے یا اضافہ ہوا ہے آپ دونوں میں؟“

”نہ کمی ہوتی ہے نہ اضافہ ہوا ہے۔ جس طرح پہلے تھے اسی طرح اب بھی ہیں۔ ہر چیز میں ہم زیادہ تر ایک دوسرے کے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ شکر ہے کہ



کہ پہلے کی صورت بعد کی صورت حال سے بہت مختلف ہوتی ہے تو میں تو یہی کہوں گی کہ توقعات کم کرنی چاہیے اور شادی کو خوابوں کی دنیا نہ سمجھیں بلکہ پریکٹیکل سوچیں کہ زندگی کیا ہے اور میاں بیوی دوست بن کر رہیں تو مسائل کم جنم لیں گے۔
”بچوں کی تربیت میں کس کا ہاتھ ہے اور ٹائم زیادہ کون دیتا ہے آپ یا مدثر صاحب؟“

”میرے پاس ہفتے میں تین دن ایسے ہوتے ہیں جن میں میں ریلیکس ہوتی ہوں تو ان تین دنوں میں میں بچوں کو بھرپور ٹائم دیتی ہوں۔ مدثر کی ذمہ داریاں آفس میں بہت بڑھ گئی ہیں تو میں زیادہ ان لچ رہتی ہوں بچوں کے ساتھ بھی اور دیگر باتوں کے ساتھ بھی۔ لیکن جہاں کہیں میں پھنس جاتی ہوں جیسے میٹنگ میں یا آفس کے کسی اور کام میں تو میں مدثر کو کہتی ہوں کہ آپ کچھ کر لیں یعنی بچوں کو دیکھ لیں۔ ہم بچوں کے ساتھ بہت زیادہ ان لچ رہتے ہیں اور میرے بیٹے کی جو نیچرز ہیں وہ کہتی ہیں کہ میں نے ایسے ماں باپ نہیں دیکھے جو اتنے مصروف رہنے کے باوجود بچوں کو بھرپور ٹائم بھی دیتے ہیں۔ ہماری زندگی کا محور ہمارے بچے ہی ہیں۔ اس لیے بچوں کی ہر جائز فرمائش کو پورا کرتے ہیں۔ ان کو مووی دکھانے بھی

لے جاتے ہیں انہیں پارک بھی لے جاتے ہیں اور ہفتے میں ایک دو بار بچوں کو باہر مختلف جگہوں پر ضرور لے جاتے ہیں اور الحمد للہ ہم بہت انجوائے کرتے ہیں اور بہ حیثیت ایک ماں کے مجھے زیادہ توجہ دینی پڑتی ہے اور ہر چیز کو دیکھنا پڑتا ہے۔“

”کھانا کھانے اور کھانے کا کتنا شوق ہے؟“

”مجھے کھانا کھانے کا بھی شوق ہے اور پکانے کا بھی۔ لیکن اپنی مصروفیات کی وجہ سے کچن کو ٹائم نہیں دے پاتی۔ اس لیے گھر میں لک ہے لیکن جب مجھے وقت ملتا ہے تو میں ضرور کچھ بناتی ہوں اور بہت اچھا بناتی ہوں اور میرے ہاتھ کا پکا ہوا مدثر کو پسند بھی

”بکھی گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹایا مدثر صاحب نے؟“

”مدثر بالکل بھی کچن میں نہیں جاتے انہیں کچن میں جانا پسند ہی نہیں ہے اور نہ ہی انہیں کوئی کام کرنا آتا ہے اس لیے جب لک چلا جاتا ہے یا کوئی مجبوری ہوتی ہے تو پھر میں مدثر سے کہتی ہوں کہ آپ ذرا بچوں پر توجہ دیں میں ذرا گھر کی نوک پلک سنوار لوں۔“

”اور کچھ کھانا چاہیں گی؟“

”نہیں۔ بس سب کچھ تو آپ نے پوچھ لیا۔“

”اوکے جی بہت سسر یہ آپ نے ٹائم دیا۔“

اس کے ساتھ ہی ہم نے عاصمہ سیرازی صاحبہ سے اجازت چاہی۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل ----- علیہ

میک اپ ----- روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ----- موسیٰ رضا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ شعلع نومبر 2016 29

دستک دستک دستک

شایین رشید



کر چکی ہیں اور کن کن زبانوں میں۔۔۔؟
”جی میں۔۔۔ ورلڈ وائیڈ نیٹل اور انٹرنیشنل تشریاتی اداروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکی ہوں اور جناب! انگریزی، اردو، پنجابی، سرائیکی اور سندھی زبانوں میں گانے کا اعزاز حاصل کر چکی ہوں اور آپ کو بتاؤں کہ سندھ کے سب سے بڑے اور واحد رنہلٹی شو وائس آف سندھ کی چیف جج ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے اور نہ صرف پاکستان میں بلکہ۔۔۔ امریکہ، برطانیہ، انڈیا اور یورپ کے دیگر ممالک میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کر چکی ہوں۔“

”آپ صوفیانہ کلام گاتی ہیں تو کیا آپ کو بچپن سے ہی شوق تھا صوفیانہ کلام گانے کا؟“

”بچپن سے گانے کا شوق تو تھا، مگر صوفیانہ کلام کا نہیں۔ کیونکہ چھوٹی عمر میں صوفیانہ شاعری کو سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بس گانے کے شوق میں، میں نے میوزک کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ صوفیانہ کلام کی طرف تب راغب ہوئی جب میں نے صوفیا اکرام کو باقاعدہ پڑھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ دوسرے ممالک میں پاکستان کے خلاف منفی پروپیگنڈہ ہو رہا ہے۔

پاکستان کو بدنام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تب مجھے خیال آیا کہ ہمارے صوفیا کرام نے بھائی چارے اور محبت کا جو درس لوگوں کو دیا ہے، کیوں نہ میوزک کے ذریعے اسے عام کیا جائے۔ تاکہ لوگوں کے دلوں سے پاکستان کے لیے جو غلط فہمیاں ہیں دور ہو سکیں۔ چنانچہ میں نے صوفیا کرام کی شاعری کو انگریزی میں گا کر بھائی چارے، محبت اور حق و صداقت کا درس دیا اور میں یہ درس ہمیشہ دیتی رہوں گی اور یہ ثابت کر کے

سائرہ پشیر (پاکستانی نژاد برطانوی گلوکارہ)

”کیسی ہیں سائرہ؟“
”جی اللہ کا شکر ہے۔“

”بہت نام سنا ہے آپ کا۔ ہمارے قارئین کو اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟“

”جی۔ پاکستان میں جنم لیا۔ پاکستان کی ہی جامعہ کراچی سے میسٹری میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی اور ایم اے تاریخ، کوئین میری یونیورسٹی آف لندن سے کیا اور میں پاکستان کی واحد ”لوہیرا“ سٹار ہوں اور میں نے ایشیا کے نامور اساتذہ سے میوزک کی تعلیم حاصل کی۔ میں این جے آرٹس لندن کی ڈائریکٹر بھی ہوں۔ ایئرٹن اور ویسٹرن دونوں طرح کے گانے گاتی ہوں۔ مگر کلاسیکل انداز میری پہچان ہے۔“
”اچھا۔ گڈ۔ کہاں کہاں اپنے فن کا مظاہرہ



رہوں گی کہ ہمپاکستانی ایک پر امن قوم ہیں۔
 ”واہ۔ آپ کے ارادے تو بہت نیک ہیں۔ اللہ
 تعالیٰ آپ کو کامیاب کرے۔ جو کلام آپ نے گایا
 اسے ”الہم“ کی شکل بھی دی؟“

”جی میرا پہلا الہم جو کہ تیاری کے آخری مراحل
 میں ہے اس میں شاہ عبداللطیف کی خوب صورت
 شاعری شامل ہے اور اس الہم کا نام ”مورے من میں
 شاہ“ ہو گا۔ میں نے ”شاہ“ کا کلام ”سندھی اردو“ اور
 ”انگریزی“ میں گایا ہے اور اس الہم کی تمام تر تیاری
 ”لندن“ میں کی گئی ہے اور میوزک کی تمام تر تیاری
 ”توفیق احمد“ نے کی ہے جن کا تعلق معروف طبلہ نواز
 استاد ذاکر کے گھرانے سے ہے۔ میرا دوسرا الہم ”ملے
 شاہ“ کی شاعری پر مشتمل ہے اور تیسرا الہم ”سارہ“ کے
 نام سے ہے اور یہ تینوں ورلڈوائیڈ ریلیز ہوں گی۔“

”کیا موسیقی کا سیکھنا بہت ضروری ہوتا ہے؟“
 ”جی۔ بہت ضروری ہے۔ سنگیت کا علم سیکھنا
 اور بڑھنا بہت ضروری ہے۔ ہر شعبے کا شارٹ کٹ
 ہو سکتا ہے مگر میوزک کا کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے۔
 موسیقی کے ذریعے معاشرے کی اصلاح اور خدمت
 کی جاسکتی ہے اور اس کے لیے جذبہ اور جنون کا ہونا
 بہت ضروری ہے اور میں صوفیا کرام کا کلام لے کر
 پوری دنیا میں ان کا پیغام پہنچانا چاہتی ہوں۔ میں ادیسرا
 سنگر ہوں اور مجھے یاد ہے کہ جب میں نے شاہ کا کلام
 ادیسرا (انگریزی) میں گایا تو لوگوں نے بہت پسند کیا۔

خاص طور پر لندن کے شہل میں برطانیہ کے مایہ ناز
 سنگر ”بائیکل راؤز“ کے ساتھ پر فارم کیا تو لوگوں کی

تالیوں نے ثابت کر دیا کہ صوفیانہ کلام میں سکون بھی
 ہے اور طاقت بھی ہے۔ صوفی سنگیت کو عام کرنا میرا
 خواب ہے۔“

”انے ملک پاکستان کی موسیقی کے بارے میں کیا
 کہیں گی آپ؟“

”پاکستانی میوزک بہت اچھا ہے اور اسے مزید اچھا
 کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کا ماضی کا میوزک بے مثل

تھا۔ مگر اب میں سمجھتی ہوں کہ میوزک کا برا حال ہے
 اور میوزک کو اچھا کرنے کے لیے اس میں تعلیم و
 تربیت حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ میوزک کو سننا
 اور سمجھنا ایک فن ہے۔“

”جی۔ سندھ انکسپلنس ایوارڈ حاصل کیا
 2013ء میں بہترین سنگر کا ٹیگ رائٹرز ایسوسی
 ایشن کی طرف سے میوزک کا خصوصی ایوارڈ بھی
 حاصل کیا اور دیگر اعزازات سے بھی نوازی جا چکی
 ہوں۔“



عائشہ خان (جونیر)

”کیا حال ہے؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”جیناں کے حصار سے نکلیں کہ نہیں؟“

”میں نے کیا نکلتا ہے۔ لوگ ہی نہیں نکل رہے
 بس کوئی کردار مقبول ہو جائے لوگ اس کو لے کر بیٹھے
 رہتے ہیں۔“

”یہی توفیق کار کی قبولیت ہے۔“

”ہاں ہے مگر اس کردار سے سب کو نفرت تھی اور لوگ اس کردار کے حوالے سے بات بھی کرتے ہیں۔“

”آپ نے صلاح الدین کے ساتھ برا بھی تو بہت کیا؟“

”قسم۔۔۔“ آپ بھی۔۔۔“

”ویسے بات کر رہی ہوں۔ ہمارے لوگ ڈراموں،

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL

- کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے ہل آگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت 150/- روپے

سوہنی ہیر آئل 12 جزی بوتلوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف 150/- روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے آڈر بھیج کر ویشڈ پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے مئی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے	350/- روپے
3 بوتلوں کے لئے	500/- روپے
6 بوتلوں کے لئے	1000/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھجئے کے لئے ہمارا ہدف:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں
بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

کا بہت اثر لیتے ہیں۔ ڈرامے میں کوئی مظلوم رو رہا ہے تو ہمارے دیکھنے والے بھی رو میں گئے۔ کوئی نیگٹیو رول کر رہا ہے تو لوگ اس سے نفرت کریں گے۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ آج کل لوگ بڑی نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر لوگ کچھ نہ کچھ لکھ دیتے ہیں۔ لیکن خیر میں کوئی اصل والی ”جینا“ تو ہوں نہیں۔ کچھ عرصے میں لوگ اس کردار کو بھول جائیں گے۔“

”پہلی بار شاید آپ نے نیگٹیو کردار کیا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟“

”میں نے یہ کردار اپنی دوست ثناء شاہ نواز کے اصرار پر قبول کیا، جو مومنہ درید کے ساتھ اس سیریل کی پروڈیوسر ہیں۔ میں نے یہ کردار اپنے شوق سے کیا، کیونکہ میں رونے دھونے والے کافی کردار کر چکی تھی۔ اور اس کردار میں مجھے کافی جان نظر آئی۔ سو میں نے کر لیا۔ ویسے مجھے خوشی ہے کہ میرا یہ کردار پاپولر ہوا اور ایک نئے انداز میں ناظرین نے مجھے دیکھا۔“

”اور کیا ہو رہا ہے آج کل؟“

”بس کچھ خاص نہیں، جو اپنا کام ہے کر رہی ہوں۔ ان شاء اللہ بہت جلد آپ مجھے نئے پروجیکٹ میں دیکھیں گی۔“

”اب زیادہ تر کردار کس نوعیت کے ہوں گے۔ نیگٹیو یا پوزیٹو۔“

”پوزیٹو ہی ہوں گے، مگر اچھا نیگٹیو رول ملا تب بھی انکار نہیں کروں گی۔ کیونکہ میں نے نیگٹیو

رول کر کے دیکھا ہے کہ پوزیٹو سے زیادہ نیکٹو رول زیادہ مقبول ہوتے ہیں۔

”ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔۔۔ ویسے ہمارے پوزیٹو رول اب کچھ زیادہ ہی رونے دھونے والے نہیں ہو گئے؟“

”جی۔۔۔ میں بھی یہی کہنا چاہ رہی ہوں کہ اب رونے دھونے والے کردار بہت ہو گئے۔ میں اب ان کرداروں سے باہر آنا چاہتی ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں نے نیکٹو رول کو مقبول کر لیا۔“

”فلموں کی طرف کیا پیش رفت ہے؟“

”بات چیت چل رہی ہے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے وار“ اور ”میں ہوں شاہد آفریدی“ کی کامیابی کے بعد پر امید ہوں کہ اچھے ہی رول ملیں گے مجھے۔“

”او کے عائشہ! ان شاء اللہ پھر بات کریں گے۔“



نویں وقار

”کیسی ہیں؟ اور ”سلیہ دیوار بھی نہیں“ کا کیا رسپانس مل رہا ہے؟“

”جی۔۔۔ بہت اچھا۔۔۔ لوگ بہت پسند کر رہے ہیں۔“

”اور آپ۔۔۔؟“

”اور میں بھی۔۔۔ کیونکہ مجھے اس سیریل میں کافی نامور لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل رہا ہے اور بہت کچھ سیکھنے کو بھی ملا۔ کہانی بہت اچھی تھی۔ ہر لحاظ سے سیریل اچھا رہا۔“

”وہی مظلوم عورت، ظلم سہتی عورت۔۔۔ کچھ چیخ ہونا چاہیے؟“

”بالکل ہونا چاہیے۔۔۔ کیونکہ عورت جتنی ”مظلوم“ اور ”بے چارہ“ دکھائی جا رہی ہے اتنی ہے نہیں۔ آج کی عورت بہت اسٹرونک ہے۔ وہ اکیلی گھر سے نکلتی ہے۔ جاب کرتی ہے، کماتی ہے۔ نیچے پالتی ہے اور کفالت بھی کرتی ہے۔ تو ایسی عورت کے بارے میں ڈرامے ہونے چاہئیں۔ تاکہ وہ خواتین جو

مشہور مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گروپوش



قیمت

کتاب کا نام

450/-	سفر نامہ	آوارہ گرد کی ڈائری
450/-	سفر نامہ	دنیا گول ہے
450/-	سفر نامہ	ابن بطوطہ کے تعاقب میں
275/-	سفر نامہ	چلنے ہو تو چین کو چلیے
225/-	سفر نامہ	نکری نکری پھر اسافر
225/-	طرز و مزاح	خدا گندم
225/-	طرز و مزاح	اردو کی آخری کتاب
300/-	مجموعہ کلام	اس ہستی کے کوپے میں
225/-	مجموعہ کلام	چاند گر
225/-	مجموعہ کلام	دل وحشی
200/-	ایڈیٹر امین پو امین انشاء	اندھا کتواں
120/-	ادوہتری امین انشاء	لاکھوں کا شہر
400/-	طرز و مزاح	باتیں انشاء جی کی
400/-	طرز و مزاح	آپ سے کیا پردہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

ہوں گے۔ ”سایہ دیوار بھی نہیں“ میں بھی غدار عرفانی
تھے اور ان کے اور احسن خان کے ساتھ اچھی
کیمسٹری رہی میری۔
”آپ نے کامیڈی پلے بھی کیے ہیں۔ یہ تجربہ
کیسا رہا؟“

”بہت اچھا تجربہ رہا۔ بہت مزا آتا ہے کامیڈی
کرنے کو اور ہماری وجہ سے لوگوں کے لبوں پر
مسکراہٹ آجاتی ہے تو اور بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے۔
ویسے کامیڈی کرنا ٹھوڑا مشکل کام ہے۔ بہ نسبت
سنجیدہ اور سنگینوں کے۔“

”ہر وقت اسکرین پہ نہ رہنے کی کیا وجہ ہے؟“
”میں ہر وقت اسکرین پہ رہ کر اپنے آپ کو فارغ
اداکارہ نہیں کہلوانا چاہتی۔ ویسے بھی میں کردار بہت
سوچ سمجھ کر لیتی ہوں۔ بہت سلیکٹیو قسم کی فن کارہ
ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ بیک وقت میرے کئی
ڈرامے آن ایر آرہے ہوں۔ میں نے اب تک جتنا
کام کیا لوگوں کو یاد ہے، اس لیے میں اتنا ہی کام کرتی
ہوں کہ لوگوں کو یاد رہ جائے۔ آپ یقین کریں۔
بہت آفرز آتی ہیں۔ مگر سب کردار کرنے کے قابل
نہیں ہوتے۔ کیونکہ عموماً ”کردار ایک جیسے ہوتے
ہیں۔“

”توین۔ ان شاء اللہ اب آپ کا جب نیا سیریل
آئے گا تو پھر بات کریں گے۔“
”جی۔ ضرور۔“



برے حالات میں مایوس ہو جاتی ہیں ان میں کچھ ہمت
آجائے۔“

”اب ڈائریکٹرز اور پروڈیوسر کو یکسانیت سے نکلنا
ہو گا۔“

”بالکل جی۔ زندگی صرف چند واقعات کے گرد ہی
نہیں گھومتی، زندگی کا کینوس بہت وسیع ہے۔ بس نظر
دڑانے کی ضرورت ہے۔“

”اور انڈر پروڈکشن کیا ہے؟“
”انڈر پروڈکشن ”کچھ نہ کہو“ اور یہ بھی بہت اچھا

سیریل ثابت ہو گا۔ اس میں بھی میرے ساتھ عماد
عرفانی، عابد علی صاحب، ہما نواب صاحبہ اور علی سفینہ

شائع ہوئے ہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت مردانہ
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفٹ جیم

☆ تملیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 250 روپے
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے
☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

32216361

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ شعاع نومبر 2016 34

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



حکایت سحر طائر

تیز برستی بارش اور سماعتوں میں کسی کے تیز چبھنے جملے، یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا جو اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اس نے کسی سے ان سب کی بربادی کا وعدہ کیا تھا۔

آفندی ہاؤس میں اصول پسند آغا جان اپنے دو بیٹوں مبین آفندی اور سمیل آفندی ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں اپنا پوتا نہ ہونے کا بہت دکھ ہے پوتیاں ان کی اس بات سے بہت چڑتی ہیں۔

وقار آفندی کو ایک گانے والی زرنگار سے محبت ہو جاتی ہے۔ وقار آفندی زرنگار کو نکاح کی آفر دیتا ہے تو وہ غائب ہو جاتی ہے۔

طلال اور مہراہ یونیورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ تلال کے گھر والے مہراہ کا رشتہ لے کر آتے ہیں جو قبول کر لیا جاتا ہے۔

مبین آفندی آغا جان سے بات کرتے ہیں کہ فاران آفندی کو معاف کر دیا جائے اور اسے اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ آفندی ہاؤس بلا لیا جائے۔ فاران آفندی کو چھوٹے بھائی وقار آفندی کی حمایت اور آغا جان کی مخالفت کی وجہ سے گھر بدر کر دیا گیا تھا۔ پوتے کی خاطر آغا جان مان جاتے ہیں، تانی جان مبین آفندی کی بیوی اس بات پر بہت ناراض ہوتی ہیں۔ فاران آفندی پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں ان کی بیوی مہراہ اور مبین بہت ناراض ہوتے ہیں۔

وقار آفندی آخر کار زرنگار کو تلاش کر لیتا ہے۔ اور اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان میں متعارف کرائے گا۔

آنکھوں کی سیڑھی

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM



Downloaded From
paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

جہاں ہمراہ کارویہ طلال کے لیے امتحان بن گیا تھا وہیں مہراہ کو بھی طلال کی شکست نے آزرہ کیا۔
 ”یا شاید میں ہی غلط ہوں۔“ وہ نروس سی داہنے ہاتھ کی چھٹکی کا ناخن دانتوں سے چباتی، بے ساختہ تکیے کے پاس بڑے آئی فون کو دیکھنے لگی۔
 ”مجھے موحّد کو انکار کر دینا چاہیے تھا یہ فون لینے سے۔ کیا کرتا زیادہ سے زیادہ ناراض ہی ہو جاتا۔ تو پہلے کون سا بڑی دوستی نبھارے ہیں، ہم دونوں۔“ وہ مضطرب تھی۔
 موحّد سے گھر پر تعلقات صحیح کرتے کرتے وہ اپنا مستقبل کا رشتہ خراب کر رہی تھی اور اس کی چھٹی حس اسے خبردار کر رہی تھی کہ اسے موحّد سے دور ہی رہنا چاہیے۔



کبیر اسٹڈی روم میں داخل ہوا تو آغا جان نے کتاب بند کر کے رکھ دی۔ ان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ کبیر نے آگے بڑھ کر احراماً ان کے گھٹنوں کو چھوا۔
 ”السلام علیکم آغا جان۔ کیسے ہیں آپ؟“
 ”ہم۔ ہم تو ٹھیک ہیں۔ بیٹھو۔“ مسکراتے ہوئے کھنکھار کر انہوں نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”تم سناؤ۔ کیا حال چال ہے؟“ اس کے بیٹھنے کے بعد وہ پوچھ رہے تھے۔
 ”گاؤں میں سب لوگ کیسے ہیں۔ پشاور کیسا ہے؟“
 کبیر کی سنجیدگی اور بڑھی۔ تھوڑا سا آگے جھک کر کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم الجھائے ہوئے بیٹھا تھا۔
 ”پشاور بھی وہی ہے آغا جان اور گاؤں کے لوگ بھی ویسے ہی ہیں۔ اگر کچھ بدلا ہے تو وہ کبیر ہے آغا جان۔ گاؤں کے سارے گھر بھئی سے گونجتے ہیں، مگر میرے گھر میں میری بہنوں کے آنسو ہیں اور مرنے والی ماں کے لیے کرلا نہیں۔“ اس کا لب لہجہ بے حد آزرہ اور دکھ سے بوجھل تھا۔
 آغا جان کے چہرے پر بھی سنجیدگی در آئی۔
 ”مشیتِ ایزدی کو چھو کبیر۔ جلدی صبر آئے گا۔“
 ”میں تو صبر کر گیا ہوں آغا جان، مگر سونا آگن دیکھنے کی تاب نہیں ہے مجھ میں اور نہ بہنوں کے آنسو دیکھنے کی۔“ اس کی آنکھیں شدت ضبط سے لال ہو رہی تھیں۔
 وہ ماں کا اکلوتا لاڈلا، ناناں پلا بیٹا تھا۔ آغا جان نے آگے بڑھ کر اس کے شانے کو تسلی آمیز انداز میں تپکا تو وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

”قاران صاحب کا بہت افسوس ہوا آغا جان۔ مگر میں انہیں سکا بہت شرمندگی ہے مجھے۔“ اس کے کندھے پر دھرا آغا جان کا ہاتھ لرزا۔
 ”میں جانتا ہوں۔ تم خود غم میں گھرے ہوئے تھے۔“ انہوں نے اسے اس تاسف سے نکالنا چاہا۔
 سہیل آندھی نے کبیر کو اطلاع تو کر دی تھی، مگر وہ خود اپنی ماں کے مرنے کی خبر سن کر پشاور گیا تھا۔ کیسے آتا۔
 ”مگر ایک خوشی کی خبر بھی ہے کبیر۔“ وہ اس کے مقابل اپنی آرم چنبر پر بیٹھتے ہوئے خود کو گویا آزرہ کی سے نکالنے کی خاطر ذرا سا مسکرائے۔
 ”جی آغا جان۔“ وہ مڑوب سا ہمد تن گوش ہوا۔

”ٹار ان کا بیٹا۔ میری اس ساری جاگیر کا وارث۔ میرا پوتا اُلیا ہے میرے پاس۔“ وہ خوش تھے۔ بے حد خوش۔ کبیر کو ان کی آواز اور ان کے تاثرات ہی سے اندازہ ہو گیا۔

”موجود۔ تم ملو گے اس سے تول خوش ہو جائے گا تمہارا۔“ وہ مزید بولے۔

کبیر مسکرایا تھا۔ ”بالکل آغا جان۔“ (مل لیں گے موجود آغدی سے بھی۔)

آغا جان اس سے پشاور میں موجود اپنی زمینوں کا حساب کتاب معلوم کرنے لگے۔



وہ دروازہ کھٹکھا کر موجود کے کمرے میں داخل ہوئی۔

اپنی ”کم ان“ کے جواب میں وہ مہراہ کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ تب ہی الماری کا دروازہ بند کرتا اس کی طرف آیا تو چہرے پر گرم جوشی کا سا تاثر تھا۔

”وہ۔۔۔ ویکم۔۔۔“ اسے موجود کی طرف سے ایسے استقبال کی توقع نہیں تھی۔ وہ ذرا سا گڑبڑائی۔

”وہ۔۔۔ میں یہ واپس کرنے آئی تھی۔“ وہ دروازہ بند کر کے چند قدم ہی آگے آئی تھی بس۔ ہاتھ میں تھاما موبائل آگے کر دیا۔

”آف۔۔۔ ناٹ اگین۔“ مہری سانس بھرتا ہوا اڑیڑیوں پر گھوم کر پلٹ گیا۔

”موجود پلیز۔ یہ بلا وجہ کا گفت میرے گلے پڑ رہا ہے۔“ مہراہ نے قطعی انداز میں کہا تو وہ حیرت زدہ سا دوبارہ اس کی طرف مڑا۔

”کیا مطلب۔؟ میں نے کوئی چوری یا ڈاکے کا موبائل تو گفت نہیں کیا محترمہ۔“ بھنویں اچکا کر خٹکے لہجے میں کہا تو مہراہ کلسی۔

”یہ میں نے کب کہا؟“

”تو پھر صاف اور سیدھی بات بتاؤ۔ ایک ہفتے کے بعد کیسے تمہارے گلے پڑنے لگا یہ موبائل۔“ موجود کا انداز چبھتا ہوا تھا۔ نرمی تو شخص دوستی میں جھلکتی تھی اس کی۔ ورنہ تو نرا سرا ہوا تر بوڑھا (مہراہ نے دل میں لقب دیا)۔

”صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ“ وہ کہتے ہوئے ذرا رک کی زبان لڑکھڑاسی گئی۔

”طلال کو یہ بات پسند نہیں کہ میں تم سے گفت لوں۔“ موجود نے جڑے پیچھے پھر اسے گھورتے ہوئے بولا۔

”اور تمہیں۔؟ تم نے تو رکھ لیا تھا نا۔“

”ہاں۔ مگر تم نے زبردستی دیا تھا، تم اسے پھینکنے والے تھے۔“ مہراہ نے اپنی صفائی پیش کی۔

”اب اگر تم واپس کرو گی تو میں پھر پھینکوں گا اسے۔ پھر تم لے لو گی نا؟“ وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

”جی نہیں۔“ وہ نرموٹھے انداز میں بولی۔ (مذاق اڑا رہا ہے بد تمیز)

”اب تم اسے پھینک دیا تو ڈاکر اچار ڈال لو۔ مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں۔ اس کی وجہ سے طلال اور میرے بیچ مس انڈر اسٹینڈنگ ہو رہی ہے۔“ مہراہ نے قطعیت سے کہتے ہوئے موبائل اس کے بستر پر تقریباً ”اچھال دیا۔“

”اور تم۔ تمہاری اپنی کوئی چوائس نہیں اپنی زندگی کے بارے میں؟“ موجود نے حیرت سے پوچھا۔

”طلال میری اپنی چوائس ہے۔“ وہ فخر سے بولی۔

”ستغفار۔“ وہ بڑبڑایا مگر مہراہ کے کان حیرت سے سن لیا۔ ناگواری سے موجود کو دکھا تو وہ جلدی سے بولا۔

”تو کیا غلط کہہ رہا ہوں۔ اسے حق نہیں پہنچتا کہ اس گھر میں تمہارے معاملات میں دخل اندازی کرے ہاں شادی کے بعد تمہا بند ہو اس کی بات ماننے کی۔“

”وہ فیانیسی ہے میرا۔“ مہراہ نے بتایا۔
 ”تو کہاں لکھا ہے کہ فیانیسی کی بات ماننا فرض ہے؟ یا فیانیسی کے حقوق پر کوئی کتاب طلال صاحب کی اپنی ہی لکھی ہوئی ہے؟“ وہ ہنسنے لگے میں پوچھ رہا تھا۔
 ”وہ تمہارا درد سر نہیں ہے موحّد مگر ہر حال۔“ تھینکس فار دی گفٹ، لیکن میں اسے نہیں رکھ سکتی۔“ وہ اب کی بار قدرے رکھائی سے کہہ کر رکی نہیں۔ پلٹ کر دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔
 ”الو کا۔“

موحّد نے دانت پیستے ہوئے طلال کو شاندار خراج تحسین پیش کیا اور بے زار نظروں سے بستر پر پڑے منہ چڑاتے آئی فون سکس کو دیکھنے لگا۔



وہ آغا جان سے ملاقات کے بعد باہر نکلا تو کوریڈور خالی تھا۔ وہ ناک کی سیدھ میں نکلتا چلا گیا۔
 ”ہے۔ شش۔“ وہ داخلی دروازہ کھول کر باہر نکلا ہی تھا جب سرگوشی کی تیز آواز نے اسے بے ساختہ رکنے بلکہ مڑنے کے دیکھنے پر مجبور کر دیا۔
 گلابی آپٹل کو سر پر نکاتی۔ سانسیں ہموار کرتی وہ بھاگتے قدموں سے دروازے تک آئی تھی۔ کبیر نے اسے ”نظر جھکائی۔“
 ”تم آگئے۔؟“ (بے وقوفانہ سوال۔) پتا نہیں اشتیاق زیادہ تھا سوال میں یا جوش۔ کبیر نے ادب سے جواب دیا۔

”جی بی بی۔“
 ”کیسے ہو۔؟“ ادھ کھلے دروازے سے وہ اس کا پرشورہ چہرہ دیکھ سکتی تھی۔ مسکراتا تو وہ پہلے بھی کم ہی تھا مگر ماں کے غم نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ یہ ملاحہ کا خیال تھا۔
 ”ٹھیک ہوں۔“
 ”اور۔ تمہاری بہنیں؟“
 ”وہ بھی ٹھیک ہیں۔“
 ”اور۔“ اگلا سوال نہ سوچنے پر وہ گڑبڑا سی گئی۔
 ”اور۔ گاؤں میں خیریت تھی نا؟“
 ”پورا پشاور ٹھیک ہے بی بی۔ اب میں جاؤں؟“ بڑا ہی مؤدب اور نرم لہجہ۔ اتنا پر تحمل طنز ملاحہ نے اسے گھور کے دیکھا۔ پھر دانت پیش کر بولی۔
 ”جاؤ۔ اور جو ملیں تمہاری غیر موجودگی میں بند ہو گئی تھیں، انہیں چلاؤ جا کر۔“ وہ زور سے دروازہ بند کرتی چلی گئی۔
 کبیر سر جھٹک کر سیڑھیاں اترتا پورچ کی طرف بڑھ گیا۔



شمو گہری سوچ کا شکار تھیں۔ موحّد کا ایک دم سے بدلتا رویہ اور خصوصاً ”مہراہ کی طرف جھکاؤ۔“ وہ عدم تحفظ کا شکار ہونے لگیں۔
 (تو کیا آئندہ ہاؤس والے ایک بار پھر مجھ سے میرا بیٹا۔!! انہوں نے اپنی بے ساختہ سوچ پر جھرمجھری سی لے کر

نقی میں سر ہلایا۔
 نہیں۔۔۔ وہ میرا بیٹا ہے۔ میرا موجد فاران آندی۔ وہ مہراہ کی ماں کی اصلیت اچھی طرح جانتا ہے۔ کس طرح اس بد زبان اور کینہ پرور عورت نے وقار کے ساتھ ہمیں بھی در بدر کرایا تھا۔ اچھا ہوا میں نے وقت پر ہی سومیہ کا نام اس کے سامنے رکھ دیا۔
 انہیں سومیہ کے بارے میں سوچ کر کچھ تسلی ہوئی۔ آخر کو وہ بھی موجد کے بچپن کی دوست تھی۔
 میں بار بار اس کے سامنے سومیہ کا تذکرہ کروں گی تو وہ بھی مان ہی جائے گا۔ اب کی بار یہ سوچ انہیں اطمینان دے گئی تھی۔



”طلال! میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔“ اس نے طلال کے خشک سلام و دعا کے بعد سیدھے بھاؤ کہا۔ تو وہ طنزیہ گویا ہوا۔
 ”جارت دے دی تمہارے عزت مآب آغا جان نے۔۔۔؟“
 ”طلال پلیز!“ وہ ضبط کرتے ہوئے اسے ٹوک گئی۔
 ”میں بات کو سلجھانا چاہتی ہوں اور ابجنیں تب ہی ختم ہوں گی جب تم ملو گے۔“
 ”ہمم۔۔۔“ اس نے ہنکارا بھرا۔ ”سی“ ”یاڈی گارڈ“ ”کزن کے ساتھ آؤ گی یقیناً۔“ ”پھر تلخی۔ مہراہ کراہ کر رہ گئی۔
 ”کبیر آگیا ہے گاؤں سے۔ اسے کہوں گی وہ ڈراپ کروے گا پبلک لائبریری تک۔ تم پانچ بجے تک پہنچ جانا۔“
 اس نے بڑے تحمل سے کہا۔ جواباً ”وہ گہری سانس بھرتے ہوئے تھڑے روکھے انداز میں بولا۔
 ”اوکے۔“ ”اور یہ ان دونوں کے مابین ہونے والی دوسری ٹیلیفونک گفتگو تھی جو اس قدر تلخ اور سرد تھی۔
 مہراہ کا دل وحشت کا شکار ہونے لگا۔



آغا جان نے موجد کا تعارف کبیر سے کرایا تو اس نے گہری نگاہ اس ڈینٹ سے بندے پر ڈالتے ہوئے ہاتھ اس کی طرف پڑھا دیا۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا ہاتھ تھامنے والے کبیر کے ہاتھ میں بھی جوشیلی سی گمراہٹ تھی۔
 ”اور یہ کبیر ہے موجد۔ میرے بہت اچھے دوست کا پوتا۔ دوست تو نہیں رہا مگر اس کا پوتا ہمارا دوست راست بن گیا۔“
 آغا جان نے اب کی بار اپنے مخصوص انداز میں کبیر کا تعارف کرانا شروع کیا۔ تو وہ ہمیشہ کی طرح بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ یہ مشکل ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر آغا جان کو دکھا۔
 موجد کی زیرک نگاہ نے اس کی مسکراہٹ کے مصنوعی پن کو سرعت سے محسوس کیا تھا۔
 ”حالات اور گردش زمانہ نے میرے دوست کو بہت برے دن دکھائے تو میں نے اس کا ہاتھ تھاما۔ اسے اپنی زمینوں کی نگرانی سونپی اور اسے اس کے قدموں پر کھڑا ہونے کا موقع دیا۔“ وہ اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے نقاخر سے بتا رہے تھے۔
 کبیر موڈیانہ کھڑا تھا۔ نظریے زمین میں گڑی جاتی تھی۔

”پھر اس کا باپ بھی ہماری زمینوں پر بھیجتی پاڈی کرتا رہا اور اب یہ تیسری نسل چل رہی ہے ہمارے وفاداروں کی۔“ دوستی سے وہ ایک دم کہانی کو غلامی تک لے آئے تھے۔ موجد کو عجیب سا احساس ہوا۔

”بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر کبیر خان زادہ۔ سب سے بڑی تعریف سنی تھی تمہاری اور مجھے خوشی ہے کہ تم ہمارے خاندانی دوستوں میں سے ہو۔“

اس نے ایک بار پھر گرم خوشی سے کبیر سے ہاتھ ملایا تو اس کے لبوں پر — ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

آغا جان مسکراتے ہوئے اندر چلے گئے تھے۔

”مجھے بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اگر میں بچپن میں یہاں آتا تو آپ سے اچھی دوستی ہوتی۔“

”اچھا۔ ہاں۔ کتنے سال ہو گئے تمہیں یہاں آئے؟“ موحد نے دلچسپی سے پوچھا۔

”میٹرک کے بعد آیا تھا۔ دس سال ہوئے کو ہیں۔“

”ہم۔ آغا جان نے تمہاری مدد کی ڈیوٹیہ کا بتایا تھا۔ بہت افسوس ہوا سن کر۔“ موحد کو دھیان آیا۔

کبیر کی آنکھوں میں آرزو کی دھند چھانے لگی۔

”ہنس۔“ وہ جیسے خود برہنہ۔ ”لڑکیوں کا ڈانٹا لگ ہوتا ہے ماؤں کے مرنے پر۔ مگر میں بھی یہی کہتا ہوں موحد! میرا بھی میکہ ختم ہو گیا۔ ہاں کیا مری۔ مگر سنسان بیابان لگنے لگا۔“

”اور تمہارے بہن بھائی۔؟“

”تین بہنیں بڑی ہیں۔ شادی شدہ اپنے گھر یا روالی۔“ وہ بتا رہا تھا۔

”اور۔“ موحد کو افسوس ہوا۔ اب تو وہ صحیح معنوں میں یہاں غلامی میں آگیا تھا۔

”کبیر۔“ مترنم نسوانی آواز نے پکارا تو کبیر ہی نہیں پورے کانورا موحد آفندی بھی گھوم گیا۔

”جی بی بی۔“ موحد لب لباب۔ جھکی نظریں۔ یہ کبیر خاتون زادہ کا اس گھر کی عورتوں کے لیے انداز تھا۔

”مجھے ذرا پبلک لائبریری تک جانا ہے۔ گاڑی نکالو۔“ وہ حکمانہ انداز میں کہتی قصداً ”موحد کو نظر انداز کر رہی تھی۔ موحد نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ کبیر گاڑی نکالنے چلا گیا۔

”آہا۔ یہاں کوئی لائبریری بھی ہے کیا؟“ چمک کر پوچھا۔

”تو ہم کون سا چاند پر رہتے ہیں۔“ وہ ذرا سا چڑھی۔

”میں کئی روز سے سوچ رہا تھا کہ کسی لائبریری کا چکر لگاؤں۔ ذرا ذہن کو ہوا لگے۔ تمہاری بات سن کر تو میرا شوق مطالعہ بھی جاگنے لگا ہے۔“ وہ خوشی سے مسکرا کر اسے بتا رہا تھا۔

”خدا کے لیے اپنے اس فوق کو کچھ دنوں کے لیے مزید سوجا رہنے دو۔ میں اپنے ضروری کام سے جاری ہوں۔“ وہ روکھی سی ہو کر بولی۔ بس ہاتھ جوڑنے کی کسر پاتی رہ گئی تھی گویا۔

موحد نے اچھتی مگر گہری نگاہ اس کے ”یکفخت“ بدلتے انداز پر ڈالی۔ پچھلے دنوں والی بے تکلفی اس کے انداز سے غائب تھی۔ وہ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ موحد نے گردن موڑ کر گاڑی کو گیٹ سے باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اور میرا یہ نہیں جانتی تھی کہ ان کی گاڑی سے کچھ فاصلے پر ان کا تعاقب کرنے والی ایک دوسری گاڑی بھی اسی سڑک پر تھی اور اس میں بیٹھا اونچا لمبا بندہ بہت جانا پہچانا سا تھا۔ جیسے کچھ دن پہلے اس سے ٹکراؤ ہوا ہو۔



گیٹ سے گاڑی باہر نکلنے تک اسے موحد سے یوں رکھائی برتنے کا افسوس رہا، مگر یہ افسوس مین روڈ پر آتے ہی طلال کی ناراضی کی فکر میں جٹا ہو گیا۔

”میں یہیں پہ رکوں مہربی بی۔؟“ وہ اپنا شولڈر بیگ سنبھالتی گاڑی سے اتر رہی تھی جب کبیر نے موحدانہ

پوچھا۔ ”نہیں۔ تم جاؤ۔ مجھے تھوڑا ٹائم لگے گا۔ تمہارا نمبر ہے میرے پاس میں کال کر لوں گی تمہیں۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔
موبائل میں موجود سم میں وہ دوبارہ سے تمام کانٹیکٹس کو محفوظ کر چکی تھی۔ کبیر سر ہلا کر گاڑی اشارت کرنے لگا۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ لائبریری کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ پانچ بجنے میں محض دس منٹ باقی تھے، مگر اسے پوری توقع تھی کہ طلال وہاں آچکا ہوگا۔
اس نے داخلی دروازے سے اندر آکر لائبریری ہال میں طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ طلال تیز قدموں سے چلتا اس کی طرف آیا۔ مہراہ نے ہونٹوں پر خیر مقدمی مسکراہٹ پھیلانی۔
”کیسی ہو۔؟“ وہ اس آکر رکا۔

”ٹھیک۔“ مہراہ کے دل کو اطمینان ہوا۔ وہ سکون سے اس کی بات سننے کے موڈ میں تھا۔
”ساتھ ہی کافی شاپ ہے۔ وہاں چلتے ہیں۔ لائبریری میں بات نہیں ہو سکتی۔“ طلال نے لائبریری میں چھائی خاموشی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلا کر اس کی تقلید میں باہر نکل آئی۔
”کس کے ساتھ آئی ہو؟“ کافی شاپ میں کارنر کی ٹیبل سنبھالتے ہی طلال نے ٹیکھا سا سوال کیا تھا۔
”بتایا تھا نا۔ کبیر آگیا ہے گاؤں سے۔ وہی ڈراپ کر کے گیا ہے۔“ وہ اس کے حیکمے پن کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

”اب بتاؤ مہراہ۔ یہ موحد آندھی کہاں سے ہمارے رشتے اور اعتماد کے بیچ آگیا ہے؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جذباتی انداز میں پوچھنے لگا۔ مہراہ کو اس کے الفاظ نے شاک پہنچایا۔
”یہ تم نے محسوس کیا ہے طلال۔ اس کا مطلب ہے کہ تم لارہے ہو اسے، ہم دونوں کے درمیان۔“
”جو مجھے نظر آ رہا ہے اس کی نفی نہیں کر سکتا میں۔“ وہ تلخی سے بولا۔
”تم مجھ پر شک کر رہے ہو طلال؟“ مہراہ بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
”ایک بندہ مجھ سے روڈی بی ہو کر رہا ہے اور مسلسل کرتا ہی جاتا ہے۔ مہراہ تم پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا؟“ وہ تیز لہجے میں بولا تو مہراہ خائف سی ہو گئی۔
”اس کے ساتھ میرا فیملی ریلیکشن ہے طلال۔“ وہ ہنسنے لگی۔
”اور میں۔ اس سارے فیملی فریم میں میں کہاں فٹ ہوتا ہوں وہ بھی بتا دو آج۔“ اس کے انداز سے کڑواہٹ چھلکتی تھی۔

”کہاں گئی وہ موحد آندھی سے نفرت۔؟ فیملی ممبر تو وہ پہلے بھی تھا۔“
”فار گاڈ سیک طلال۔“ مہراہ کی آنکھوں میں بے اختیار نمی اتر آئی۔ وہ رک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر سلگ کر بولا۔
”تو کیا نہیں ہے ایسا؟ کہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ تمہیں تو چاہیے تھا ساری زندگی اس شخص کو منہ ہی نہ لگائیں۔ جس نے میرے ساتھ بد تمیزی کی اور یہاں تم اس سے گفت و وصل کر رہی ہو۔ اب اسے میں کیا سمجھوں؟“

”اوکے۔ میرا موبائل چھن گیا۔ گھر میں میں نے اس حادثے کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ مجھے ڈر تھا کہ آغا جان مجھے اگلے دن شادی میں شریک ہونے نہیں دیں گے۔ اس لیے اس نے مجھے موبائل دیا اور کچھ نہیں تھا طلال۔“
صفائی پیش کرتے کرتے اس کی آنکھیں چھلک گئیں تو اس نے چہرہ جھکا کر آنکھوں پر شور کھ لیا۔

طلال نے لب لہجے اور چند لمحے اس کے جھکے ہوئے سر کو گھورا۔ پھر وانت میں کرولا۔
 ”ایک تو تم لڑکیوں کے پاس یہ بہت بڑا ہتھیار ہے۔ ذرا سی بات ہوتی نہیں اور آنکھوں میں آنسو لے آتی ہو۔“

”تم بات بے بات ڈانٹو گے تو آنسو تو آئیں گے نا۔“ وہ اسے غم گلابی آنکھوں سے دیکھ کر منہ بسور کر بولی تو طلال کا دل پہلو میں لوٹ کر رہ گیا۔

”ہم کیا اور ہماری ڈانٹ کیا۔ تمہارے دو آنسوؤں کی مار ہے بس۔“ وہ اب کی بار مسکرا دیا تھا تو ہمراہ کی جان میں جان آئی۔

”چھاسوری نا۔ غلطی ہو گئی۔ آئندہ سے میں محتاط رہوں گی۔“ وہ معصومیت سے بولی تو طلال نے گہری سانس لے کر کرسی سے پشت لگالی اور بے بسی سے بولا۔

”اب کیا ہو سکتا ہے۔ قتل کرنے کے سارے داؤ بیچ آنا رہی ہو تم۔“

”طلال۔“ وہ ہلکے سے چلائی۔ ”یہ شوگر پاٹ اٹھا گے تمہارے سر پہ دے ماروں گی میں۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”میری دھمکی اپنے اس اسٹوپڈ کزن کو بھی دیتیں نا۔“

”اونہوں کو دیکھا! اب تم اسے لائے ہماری بات کے درمیان۔“ ہمراہ نے فوراً کہا۔

”میں اپنے سے منسلک چیزوں کے بارے میں بہت پوزیٹو بندہ ہوں۔ بلکہ شاید ہر کوئی ہوتا ہے، لیکن میں کچھ زیادہ ہی ہوں۔ وہ بندہ تم سے دس فٹ دور بھی نظر آئے مجھے گوارہ نہیں ہے۔ جو ہو چکا وہ میں بھولنے کی کوشش کروں گا، مگر یہ طے ہے کہ ہماری شادی کے بعد۔ تمہارا یہ کزن ہمارے گھر کبھی نہیں گھے گا۔“ وہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھا۔

”او کے ڈن۔“

ہمراہ نے فوراً اس کے فیصلے پر اپنے اثبات کی مرثبت کر دی۔ اس کے کون سا موحد آئندی کے ساتھ اتنے گہرے روابط تھے کہ وہ اس کی شادی کے بعد بھی اس سے ملنے آتا رہتا۔ یہ مشکل ہی سہی طلال کا موڈ ٹھیک ہو ہی گیا اور کافی آنے تک وہ پہلو الا طلال تھا۔ خوش مزاج اور اس کا خیال رکھنے والا۔

اور ادھر ہمراہ سوچ چکی تھی کہ موحد آئندی سے کنارہ کیسے کرنا ہے۔

مگر اے بندے! تقدیر۔ صحرا میں بھٹکے کو اکثر ہریالی اور سمندر میں بھٹکے کو کنارہ دکھائی دیتا ہے، مگر وہ محض نظر کا دھوکا ہوتا ہے۔ ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ ہمراہ آئندی کی تقدیر بھی بڑی انوکھی لکھی گئی تھی۔

طلال، نمبر اور موحد آئندی۔ ان کا چوتھا کونا تھی ہمراہ۔ اور بے شک اللہ ہی بہترین علم رکھنے والا ہے۔



زرنگار نے چار سال بڑے حوصلے اور صبر سے گزارے۔ نمبر اسکول جا رہا تھا اور گھر کا خرچہ پانی فاران آئندی ہر ماہ بھجوا رہے تھے۔

زرگل بائی کا چھ ماہ پہلے ہی ہارٹ اٹیک سے انتقال ہوا تو زرنگار کو دکھ کے ساتھ ساتھ ایک اور لیبل کے اپنے وجود پر سے اترنے کا اطمینان بھی ملا۔ وہ نہ صرف اسے کوٹھے پر واپسی کے لیے اکسایا کرتی تھی بلکہ ایک آدھ بار تو زرگل بائی نے اتنی سنجیدگی سے فاران آئندی کے ساتھ عقد ثانی کا مشورہ دیا کہ وہ چیخ اٹھی۔

”اماں۔ اللہ کا واسطہ ہے اب بس بھی کرو۔“

”اے لو۔ میں نے کیا غلط بات کہہ دی۔ بھاگ بھاگ آتا ہے یہاں اور کچھ نہیں تیرا اور تیرے بچے کا حق ہی

”بھائیوں کی طرح ہیں وہ میرے۔ اماں کچھ تو سوچ سمجھ کے بولا کرو۔“ زرنگار نے تادیبی لہجے میں کہا تو اس نے ہاتھ ہلا کر گویا مکھی اڑائی۔

”اری ہٹ۔ طوائفوں کے بھی بھلا بھائی ہوا کرتے ہیں۔ مرد اور طوائف کا ایک ہی رشتہ ہوا کرتا ہے۔ عورت اور تماش بین کا۔“ زرگل بائی پان کلے میں دباتے ہوئے مدبرانہ انداز میں بولی تو زرنگار کو اس کی سوچے کراہت محسوس ہوئی۔

اور اس بحث کے تین روز بعد ہی زرگل بائی کے مرنے کا فون آگیا۔ زرنگار کو دکھ بھی ہوا۔ وہ روئی بھی تھی مگر اس نے ماں کے جنازے میں شریک ہونے کے لیے بازار حسن کی ان گلیوں میں جانے کے متعلق بھول کر بھی نہ سوچا اور گھر ہی میں ماں کے ایصالِ ثواب کے لیے فاتحہ خوانی کر لی۔

”اور اگر میں بھی ایسے ہی کسی روز مر گئی تو۔۔۔ نمیر کا کیا ہو گا؟“ یہ سوچ ان دنوں زرنگار کے دل و دماغ میں گڑ کے رہ گئی تھی اور اس نے اچھی طرح سوچ بچار کرنے کے بعد فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ایک بار نمیر کو لے کر آفندی ہاؤس ضرور جائے گی۔

”ہو سکتا ہے پوتے کو دیکھ کر ہی دادا کا دل پھل جائے۔“ اس نے پاس سوئے چودہ سالہ نمیر کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

اچھی خوراک اور بے فکری نے دنوں میں اس کی صحت کو بہترین کر دیا تھا۔ وہ اچھی اٹھان اور خوب صورت نقوش والا لڑکا تھا۔

فاران تو پھر کبھی کبھار چکر لگا لیتے مگر شمو ایک آدھ بار ہی زرنگار کے پاس آئی۔ زرنگار کو کوئی بندہ نہ ملتا تھا جس کے ساتھ وہ اپنے ان خیالات اور توہم پرستی کی حد تک آلودہ سوچیں بانٹ لیتی۔ ان دنوں اپنی اچانک موت کا خوف اس کے دل و دماغ پر بری طرح حاوی تھا۔

فاران آفندی ماہانہ خرچ باقاعدگی سے بھجوا رہے تھے مگر زرنگار کو مسلسل پیٹ کے درد اور بخار کے ساتھ الٹیوں نے نڈھال کر دیا۔

چودہ سالہ بچے کا ساتھ بھی کوئی ساتھ تھا کیا۔ یہ زرنگار کو ان دنوں صحیح معنوں میں محسوس ہوا۔ نمیر کا بھی کوئی ہونا چاہیے۔ اگر میں مر گئی تو؟

دن کو پڑوسن منت سماجت اور سوئحوں کے بعد اگر ہانڈی بوٹی کر دیتی مگر بخار اور الٹیوں سے نڈھال پڑی زرنگار کو کھانا کون کھلاتا اور وہ کون وقت پر دیتا کہ خود میں تو اتنی ہمت ہی نہ رہی تھی۔

اور وہ ہفتہ جیسے تیسے گزارنے کے بعد وہ اپنی کمزوری اور موسم کی پروا کیے بغیر نمیر کا ہاتھ تھامے بس میں بیٹھ گئی۔

”امی کہاں جا رہے ہیں ہم۔؟“ نمیر ماں کی بیماری اور اب اس قدر متوحش انداز سے پریشان تھا۔

”تمہارے دادا کے پاس نمیر۔۔۔ دعا کرو وہ تمہیں اپنائیں۔“ زرنگار کے اپنے دل کو قرار نہیں آ رہا تھا۔ جس شخص نے اپنے بیٹے کو قبول نہ کیا وہ پوتے کو۔

”ابو نے منع کیا تھا ان کے پاس جانے سے امی۔۔۔ وہ ابو سے ناراض تھے۔“ وہ بے چین ہوا اٹھا۔ کھڑکی والی سیٹ کی طرف بیٹھ کر بس سے باہر جھانکنے کی ساری خوشی مانڈ پڑ گئی۔

”وہ بہت اچھے ہیں نمیر۔ تم بس یہ سوچو۔ وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔“ اس نے خود کو تسلی دی یا نمیر کو۔ وہ بے یقینی سے ماں کو دیکھنے لگا۔

”تو پھر ابویوں نہیں لے کر گئے، نہیں وہاں؟“

ماں باپ کے آنسوؤں ان کی بے بسی۔ اور پھر باپ کی بے بسی بھری موت کا گواہ تھا وہ مگر نرم دل اتنا کہ ماں کو بھی جھٹلا نہیں پارہا تھا۔

”مگر تم دیکھنا تمیر۔ تمہیں دیکھتے ہی ان کا دل پکھل جائے گا۔“

وہ چند لمحوں تک سماں کا کمزور پڑتا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہاں اس و نر اس بھری حسرتوں کی اتنی گہری داستان رقم تھی کہ وہ چودہ سالہ بچہ بھی اچھی طرح پڑھ سکتا تھا۔ وہ پچھلے چار سالوں سے تمام باتوں اور والدین کے جذبات و احساسات کو لب و لہجے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ سمجھنے لگا تھا۔

”تم بس اللہ سے دعا کرو۔ وہ ہمارے گناہ معاف فرما دے تو یہ لوگ بھی ہمیں معاف کریں گے۔“

زرنگار نے تھک کر سیٹ سے پشت نکالی۔ نیمر کچھ بولے بنا سر گھما کر کھڑکی سے باہر بے فکرے ہجوم اور عجلت بھری زندگی کو دیکھنے لگا۔ ہر کوئی جلدی میں نظر آتا تھا۔ جیسے وقت کم ہو۔ مگر اس کا دل آنے والے وقت کے قدموں کی ان سنی دھمک سے سما جاتا تھا۔ اللہ تو معاف کر ہی دیتا ہے مگر اس کے بندے معاف نہیں کرتے۔



تندو تیز ہوا میں کالی گھٹاؤں کو جانے کس دس سے اڑا لائی تھیں جب نومبر کے ابتدائی دنوں میں بادل نور سے گرجے اور بارش کا تیز چھینٹا پڑا تو موسم آپوں آپ سر ہو گیا۔ اندر بستر پر موجد بخار میں تپ رہا تھا۔

”یا اللہ خیر۔“ بادلوں کی گرج سن کر شمو نے بے اختیار کہتے ہوئے جھک کر موجد کی پریشانی چومی۔ وہ تیز بخار کی وجہ سے بے سدھ پڑا تھا۔

”دوائی سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا بخار میں فاران۔“ وہ تشویش سے بولی۔

”فکر مت کرو۔ اللہ بہتر کرے گا۔ ابھی دوائی دیے آدھا گھنٹہ ہی تو ہوا ہے۔ فوراً بخار اترنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ آہستہ آہستہ صحیح ہو جائے گا۔“ انہوں نے تسلی دی تھی۔

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے فاران۔ موسم بھی اتنا خراب ہے۔ دوبارہ ڈاکٹر کے پاس جانا بھی محال ہے۔“ شمو نے متوحش انداز میں کہا تو انہوں نے تادیبی نظروں سے بیوی کو دیکھا۔

”اللہ سے بہتری کی امید رکھو اور آسانی کی دعا مانگو بس۔“

وہ غم آنکھوں سے بے سدھ پڑے موجد کو دیکھنے لگی۔ اللہ نے ایک ہی اولاد دی تھی ہر وقت جان اسی میں انکی رہتی۔ اور کچھ صدیقہ بھابھی کی طرف سے اس کے دل کو دھڑکا لگا رہتا جو تین بیٹیوں کی ماں بننے کے بعد بھی اولاد زینہ کے لیے ترس رہی تھیں اور موجد کو عجیب تر سے ہوئے انداز میں دیکھتیں۔ البتہ جب آغا جان اپنے اکلوتے لاڈلے پوتے پر پیار بچھاؤ کرتے تب کبھی کبھار شمو کو ان کی آنکھوں سے جھلکتا حسد صاف دکھائی دیتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں قرآنی آیات پڑھ کر موجد پر پھونکتی رہتی۔

اگلے آدھے گھنٹے میں موجد کے بخار میں کافی کمی آئی تھی۔ شمو مطمئن ہو کر اس کے پاس ہی بستر پر دراز ہو گئی۔ باہر ابھی بھی بادلوں کی ہلکی ہلکی گرج سنائی دیتی تھی۔ فجر کے ٹائم سے موجد کی پریشانی میں جاگتی شمو اٹھنے لگی۔

اور اب جب سب موسم کی یکایک تبدیلی کے باعث اپنے کمرے میں دیکھے ہوئے تھے ڈور بیل کا بجناسب ہی کو متوجہ کر گیا۔

”اس وقت کون آیا۔ برستی بارش میں۔“ فاران کتاب رکھ کر اٹھے۔ ایک نظر نیند میں ڈوبی شمو پر ڈالی اور

کمرے سے باہر نکل آئے۔ اسی وقت لاؤنج میں سے آغا جان کے تیز لہجے میں بولنے کی آواز آئی تو وہ جلدی سے اس طرف بڑھے مگر لاؤنج میں قدم رکھتے ہی جیسے چھت ان کے سر پر آن پڑی تھی۔



”کبیر۔“ بڑی عجلت میں پکارا گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کراہ کر رہ گیا۔ پلٹا تو نگاہ جھکی ہوئی تھی۔

”جی۔“

”مجھے کچھ بکس لینی ہیں بازار سے۔“ ملاحہ نے اسے بتایا۔

”جی ضرور لیں۔ میں آغا جان کو لے کر بینک جا رہا ہوں۔“ اس نے مٹوہانہ انداز میں کہا تو ملاحہ کو غصہ آیا۔

”تم سے اجازت لینے نہیں آئی ہوں میں کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ گاڑی ریڈی کرو۔“ غصہ دیا کروہ بڑے مالکانہ حکم سے بولتی تھی۔

”آدھا گھنٹہ باقی ہے صرف بی بی۔ آغا جان نے بینک جانا ہے پھر۔“

”سن لیا ہے کبیر خان۔ سہری نہیں ہوں میں۔ اب چلیں؟“ تنک کر کہتے ہوئے اس نے دونوں ہانڈیوں پر

لیٹے ہاں سے اجازت لے کر آئی تھی اور جھجک کس بات کا ہوتا بھلا۔

کبیر نے بے بسی سے اس کو دیکھا۔ وہ اسی کو گھور رہی تھی۔ بھوری آنکھوں کا کالنج شریقی رنگ سے بھرا پڑا تھا

جیسے۔ ملاحہ کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا۔

(کم بخت کی آنکھوں کا رنگ دیکھو ذرا۔ اف)

”میں یہاں سے مل بھی نہیں سکتا ملاحہ بی بی۔ آغا جان کے غصے سے واقف ہیں آپ۔“

”اور تم میرے غصے سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔ بکس نہیں ہوں گی تو میں پڑھوں گی کیسے۔ میرا فیل ہونا

تمہارے سر ہوگا۔“

ملاحہ نے وائٹ میس (گویا فیل ہونا نہ ہوا قتل ہونا ہو گیا)

”وہ منظور ہے مجھے، لیکن اگر آغا جان کو ٹھیک تین بجے گاڑی یہاں نہ ملی تو۔“ وہ جلدی سے بولا، مگر بات

ادھوری چھوڑ کر لب بھج گیا۔ (آگے صرف سوچ ہی ہے آپ کی)

”تم چاہتے ہو کہ میں باہر جاؤں اور رکشہ کر لوں؟“ ملاحہ نے زور دیا۔

”آپ اپنا ٹائم آگے کیوں نہیں کر لیتیں۔“ وہ زنج آگیا تھا۔

”تو ابھی پورا آدھا گھنٹہ تھا۔ پانچ منٹ تم نے خواہ مخواہ کی بحث میں ضائع کر دیے۔ چلو اب۔“ وہ جلدی جلدی کا

شور مچاتی فناٹ آغا جان کی سیاہ کرولا میں بیٹھ گئی۔

”لفف۔“ کبیر نے دو انگلیوں سے ماتھے کو چھوا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سر کہاں پٹختے۔ وہ کچھلی نشست پر

براجمان اس کی بے بسی دیکھ رہی تھی۔ اسے وہیں کھڑا دیکھ کر ہاتھ بڑھا کر ہارن بجایا تو وہ ہڑبڑا کر آگے بڑھا اور تیزی

سے دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے خفگی سے بولا۔

”یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔ آغا جان اپنی گاڑی کا ہارن پہنچاتے ہیں۔“

”پتا ہے خان! تم مجھے مجبور کرتے ہو ان ظالمانہ کارروائیوں کے لیے۔“ وہ اطمینان سے بولی تو مارے باندھے وہ

گاڑی اشارت کرتے لگا۔

”اللہ جانے کیا دشمنی پال لی ہے آپ نے مجھ سے۔“ وہ سخت کبیدہ خاطر ہو رہا تھا۔ ملاحہ نے بے ساختہ اسے

پٹھانوں کی مخصوص رنگت، بھوری آنکھیں اور شیونہ کرنے کے باعث ہلکی شیوہ بھی ہوئی تھی۔
(دشمنی۔؟) وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے ونڈا سکرین کے پار دیکھنے لگی۔ پھر اطمینان سے کہا۔
”تم کام ہی دشمنوں والے کرتے ہو۔“

”جلدی سے بتائیں کس ہارکیٹ جانا ہے۔ مجھے پورے تین بجے گھر ہونا چاہیے۔“
”الفلف۔۔۔“ وہ ایک دم چیخی۔ کبیر کا پاؤں بے اختیار بریک پر پڑا۔ وہ پر جوش سی باہر اشارہ کر رہی تھی۔
”کیا ہوا۔۔۔ کون ہے؟“ وہ ایک دم سے الرٹ ہوا تھا۔

”وہ۔۔۔ او فوہ۔ اس دوسری لین میں۔ ہمارے کالج کے باہر جو گول گپے والا ہوتا ہے اس کی ریڑھی دیکھی میں
نے۔“ چمکتی آنکھوں کے ساتھ منہ میں گویا پانی بھرے وہ اسے بتا رہی تھی۔ کبیر نے مشکوک نظروں سے اسے
دیکھا۔

”تو۔۔۔؟“
”تو یہ کہ گول گپے کھانے ہیں بھی اور کیا۔۔۔“ کہتے ہوئے وہ مزے سے دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر گئی تھی۔
”یا اللہ۔۔۔“ خود کو بے بس محسوس کرتا کبیر گاڑی کا انجن بند کرتا مجبوراً ”نیچے اتر اور اس کی طرف آیا۔ جواڑ
کر سڑک کے اس پار جانے کو تیار تھی۔
”آپ گاڑی میں بیٹھیں۔ میں یہیں لا دیتا ہوں پیک کروا کر۔ گھر جا کے تسلی سے کھا لیجیے گا۔“ ادب سے
مسئلے کا حل پیش کیا۔

”ہنس۔ جو مزہ اس تھل میں ہے وہ اس تسلی میں نہیں ہو گا۔“ اس کی رنگت تہمتا رہی تھی۔ کبیر نگاہ پھیر گیا۔
”اچھا پھر آپ بیٹھیں گاڑی میں آگے جا کر ٹرن لیتا ہوں۔ یہاں بہت ٹریفک ہے روڈ کر اس کرنا بہت مشکل
ہے۔“ ہار کر اس نے مشورہ دیا۔ ملاح نے مشکوک بھری نظروں سے اسے دیکھا۔
”جھوٹ تو نہیں بول رہے؟“

”مرنا ہے مجھے آپ کے ہاتھوں۔“ وہ بڑے ضبط سے بولا پھر ہاتھ کے اشارے سے اسے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا۔
”اگر تم مجھے یہاں سے دھوکے سے لے کر گئے تو شور مچا دوں گی میں۔“ اس کے گاڑی اشارٹ کرتے ہی ملاح
نے اسے دھمکایا تھا۔

”جانتا ہوں میں۔ کافی عرصے سے آپ کی الٹیز چیک کر رہا ہوں۔“ وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولا تو ملاح نے
اسے گھور کے دیکھا۔

”اچھا اب باہر کھڑے ہو کر نہیں کھائیں گی آپ۔ یہیں گاڑی میں ٹرے لا دیتا ہوں۔ آں۔ ضد کریں گی تو
سیدھا گھر لے جاؤں گا۔ بے شک چلاتی ہوئی جائیے گا۔“
وہ ریڑھی سے کچھ فاصلے پر گاڑی کھڑی کرتے ہوئے تنبیہی انداز میں بولا اسے منہ کھولتے دیکھا تو ساتھ ہی
اٹل لہجے میں دھمکا بھی ڈالا۔

”ہنس۔“ سر جھٹک کر سینے پہ بازو لپیٹتے ملاح نے خفگی سے منہ پھیر لیا تھا۔ مگر کبیر مطمئن ہو کر گاڑی سے اتر گیا
اسے پتا تھا کہ اب وہ اندر ہی بیٹھی رہے گی۔

”ہم۔۔۔“ وہ اس قدر مزے اور انہماک کے ساتھ گول گپے کھا رہی تھی کہ حد نہیں۔ مگر کبیر کی نگاہ گھڑی پر
تھی۔

”جلدی کریں۔ آدھا گھنٹہ تو یوں ہی نکل گیا۔ ابھی بکس ایسی ہیں آپ نے۔“ دُرج آگیا۔

”ہر چیز جلدی جلدی کھانے والی نہیں ہوتی۔ مگر تمہیں کیا معلوم تم کوئی انسان تھوڑی ہو۔ باڈی گارڈ ہو باڈی گارڈ۔ گارڈ سے ہی بنے ہوئے۔“ وہ اس پر طنز کرتے ہوئے اب کھٹاپانی پی رہی تھی۔ کبیر اس کا مذاق اڑاتا انداز میں ہنسا۔

”اچھی بات ہے کہ آپ سمجھتی ہیں۔ میں نوکر ہوں اس گھر کا۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پرسا۔ انداز میں بولا مگر ملاحہ کا تول ہی مٹھی میں بھینچ گیا ہو۔

”بس۔۔۔“ اس نے ٹرے اٹھا کر کبیر کو تھمائی۔ ابھی پلیٹ میں چاٹ سے بھرے گول گپے باقی تھے۔

”تم جو ہو۔ ہر بات ختم کرنے کے لیے۔“ وہ اسے گھورتے ہوئے بولی تو وہ خاموشی سے ٹرے لے کر پلٹ گیا۔ ملاحہ کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔

دل کو اس راہ پہ چلنا ہی نہیں
جو مجھے مجھ سے جدا کرتی ہے

”اب کہاں۔۔۔؟“ وہ گاڑی اشارت کرتا بے عجلت پوچھ رہا تھا۔

”گھر چلو بس۔“ وہ مجھے ہوئے انداز میں بولی۔ تو کبیر کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے بے یقینی سے پوچھا۔

”آپ صرف یہ گول گپے کھانے آئی تھیں؟“

”نہیں۔ تمہارا سڑاپ گھر چلو سیدھے۔ کتنا بولتے ہو تم۔ سر میں درد کرو یا۔“

وہ تنک کر کہتی چہرہ موڑ گئی اور سر پیٹ سے نکال دیا۔ گہری سانس بھرتا کبیر خان خود کو اپنی برداشت پر داؤدے کر رہ گیا۔



”مہر۔ تمہارا ایک فور چاہیے تھا۔“ وہ بے تکلفی سے اس کے کمرے میں چلا آیا تھا۔ مہواہ کو اندازہ نہیں تھا کہ دستک کے جواب میں یہ شکل دکھائی دے گی۔

”کیا۔۔۔؟“ اسے گھور کر دیکھا۔

”یہاں کی جو مشہور جگہیں ہیں۔ تم مجھے وہاں لے جاؤ گی؟“ وہ پوچھ نہیں رہا تھا۔ اسے بتا رہا تھا کہ تم ہی ہو جو مجھے وہاں لے جاؤ گی۔ مگر مہواہ کا مزید مروت بھانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

”آٹم سوری موحد۔ میں بہت بڑی ہوں۔“ اس نے فوری انکار کیا۔ پھر حتمیاً۔

”کبیر آپ کا ہے۔ وہ ساتھ جاسکتا ہے تمہارے۔ اسے پتا ہے ہر جگہ کا۔“ اس کا لہجہ روکھا سا تھا۔

موحد نے جاچتی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ پچھلے دنوں سے الگ وہی پرانی والی مہواہ بن گئی تھی۔ اکھڑ اور بدتمیز۔

”تمہیں طلال نے منع کیا ہے میرے ساتھ کہیں جانے سے؟“ اس کا سوال غیر متوقع تھا، مہواہ کو امید نہیں تھی کہ وہ صاف گوئی سے پوچھ لے گا۔ وہ پہلے گڑبڑائی۔

”نہیں تو۔۔۔ وہ کیوں منع کرے گا بھلا۔“ خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے تیوری پر پل ڈالے۔

”وہ اتنا تنگ نظر نہیں ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم خود میرے ساتھ کہیں جانا نہیں چاہتیں۔“ موحد کی پیشانی پر شکن ہو گئی۔

”یہی سمجھ لو۔ جو تمہارا نقصان کیا تھا اس کے لیے تم مجھ سے معافی منگوا چکے ہو۔ بلکہ پالشی کے طور پر تمہیں

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

شاہنگ پر لے جانے کی کڑی بھی بھادی میں نے معاملہ ختم۔ اس نے اطمینان سے کہتے ہوئے ہاتھ جھاڑے۔

”ویری روڈ۔“ موحّد نے تبصرہ کیا تھا۔ مہوا نے شانے اچکائے۔
 ”تم جو بھی کہو۔ کزن شپ اپنی جگہ۔ مگر میں پبلک اسپاٹس پر تمہارے ساتھ گھوم پھر نہیں سکتی۔ سوری۔“
 اس کا جواب صفا جھٹکا تھا۔
 ”ہم۔“ وہ ہنسنے لگا۔ پھر ہلکے سے مسکرایا۔ وہی۔ خوب صورت سی مسکراہٹ جو محض جھلک دکھاتی تھی اور اس کا چہرہ تو آواز نہ لگتا تھا۔
 ”یعنی کہ آج سے ہم دونوں کا ایک دوسرے کو فوراً ختم۔“ مہوا بازو لپیٹے خاموش کھڑی رہی۔ اس شخص کی خاطر وہ طلال کو خفا نہیں کر سکتی تھی۔
 ”اوکے۔“

وہ ہٹا کچھ کسے واپس مڑ گیا تھا۔ پل بھر کو مہوا کو افسوس ہوا مگر وہ مجبور تھی۔ سو خاموشی سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ پھر گہری سانس بھرتے ہوئے موبائل اٹھایا۔ جو اس نے ماں کے ساتھ جا کر خریدا تھا اور پہلے والا موبائل گم کرنے پر خوب ڈانٹ بھی کھائی تھی۔

”وقوف۔ اپنی منگنی کی سلامیوں کے پیسوں میں سے خود لے لوں گی۔ آپ بس ساتھ چلیں۔“
 اس نے انہیں مناتے ہوئے کہا تو وہ سر جھٹک کر رہ گئیں۔ مگر سہر حال وہ نیا موبائل لے ہی آئی تھی اور سارے نمبر و بارہ محفوظ کر لیے۔ اس نے طلال کا نمبر نکالا۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔
 ”کیا ہوا۔ مل گئی اجازت جانے کی؟“ طلال نے چھوٹے ہی پرچھا تھا۔

”ہاں۔ مل گئی۔ اب یہ ہینڈ گیز وغیرہ مجھے کچھ خاص سمجھ میں نہیں آتیں۔ مگر صرف تمہارے لیے اتفاقاً جان سے اجازت ملی ہے۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔

”آہاں۔“ طلال کے دل و دماغ پر ہلکی پھلکی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ ”ہم بھی بہت کچھ آپ کے لیے ہی کیا کریں گے۔ جناب۔ آپ میسر تو ہو جائیں بس۔“

”اوہو۔ زیادہ فری مت ہو۔ ٹائم ہٹاؤ۔ کب تک الحرام پنچو گے؟“ گلابی بڑتے چہرے کے ساتھ وہ فوراً بات کا رخ بدل گئی۔ تو وہ محفوظ ہوتے ہوئے اسے وقت بتانے لگا۔ پھر جیسے اسے خوش خبری سنائی۔

”ماما سے کہا ہے میں نے شاہی کی ڈیسٹیکس کرنے کا سوچا۔“ مہوا کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا۔
 ”اچھا۔ پھر؟“

”بس بابا کا کہنا تھا کہ آفس جانا شروع کر دوں۔ میں نے یونیورسٹی کے فوراً بعد جانا شروع کر دیا۔ تو اب وہ سمجھ جائیں گے کہ بیٹا اپنی فیملی بنانے کے قابل ہو گیا ہے۔“ وہ ہنسا تھا۔

”بے وقوف۔“ مہوا کے کان تپے۔
 ”کاش میں تمہارے سامنے ہوتا اور دیکھتا کہ کنگھی ملی شرتاتی ہوئی کیسی لگتی ہے۔“ وہ بڑی حسرت سے شرارت میں کہہ رہا تھا۔ مہوا نے ہنستے ہوئے خدا حافظ کہا۔

آج دل کا موسم بہت خوب صورت ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

فاران آندری سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس قدر غیر متوقع منظر اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔

لاؤنج میں اس وقت زرنگار وقار آفندی اپنے بیٹے نمبر کے ساتھ موجود تھی اور وہ سری طرف غیض و غضب کا شکار بنے آغاذا القار علی اور صدیقہ بھابی۔
 ”قاران! یہ دیکھ رہے ہو جرات۔ اس دو نکلے کی عورت کی کہاں ہے جو کیدار؟ آج ابھی اسے فارغ کرتا ہوں۔ کیسے اندر آنے دیا اس کو۔“ آغا جان نے لاؤنج میں داخل ہوتے قاران کو دیکھا۔ اب وہ گرج رہے تھے۔
 ”آغا جان! ذرا برداشت سے کام لیں۔“ قاران نے فوراً آگے بڑھ کر آغا جان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے دیا۔

”آپ کا پوتا پہلی بار گھر آیا ہے۔“ ان کا ذہن بدلنے کی سعی کی۔
 ”خبردار! خبردار جو اس رذیل عورت کے خون کو کسی نے میرا پوتا کھاتو۔“ وہ مارے طیش کے لرزے لگے۔
 زرنگار تڑپا۔

”میں تو صرف اس کی ماں ہونے کی گناہ گار ہوں آغا جان۔ خون تو آپ کے بیٹے کا ہے یہ۔ آپ کی نسل ہے۔“
 صدیقہ بھابی تو جلتے کو نکلے پر لوٹ گئیں۔ پہلے نمونے بیٹا پیدا کر کے ان کی پوزیشن ڈاؤن کی اور اب یہ طوائف زاوی اپنا سیمپل لے کر آگئی تھی۔

”ری ہٹ۔ اب ہر کوئی دعوے دار بن کر آجائے وراثت کا تو کیا ہم آنکھیں بند کر کے مان لیں گے۔“
 ”یہ وقار آفندی کا بیٹا ہے آغا جان۔ کیا آپ کو اس میں اپنا بیٹا دکھائی نہیں دے رہا۔“ زرنگار کرا لائی۔ چودہ سالہ نمبر کی طرف اشارہ کیا۔

”ارے۔ بات کو سمجھتی نہیں ہو تم۔“ صدیقہ بھابی کو خوب ہی غصہ آیا اور غصے میں وہ سوچتی کم اور بولتی زیادہ تھیں۔
 ”خبردار جو وقار کا نام بھی لیا ہو تم نے۔ غلطی کر بیٹھا تھا وہ جو گند میں منہ مار لیا اور تمہیں کس کا گناہ اس کے سر منڈھنے چلی ہو۔“

”بھابی! قاران ناگواری سے اونچی آواز میں انہیں ٹوک گئے۔ سہیل نے بھی تنبیہی نظروں سے بیوی کو دیکھا۔ خوف زدہ سا نمبروں کے بالکل ساتھ چپکا کھڑا تھا۔

یہ سب لوگ اسے ظالم و رندے لگ رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ کیسے اس کا باپ کمپری کی حالت میں مرا۔ اتنے بڑے گھر میں رہنے والے لوگوں کا بیٹا۔ افلاس کے ہاتھوں مار کھا گیا۔

”قاران۔ اگر تمہیں اس عورت سے زیادہ ہمدردی ہے تو اس سے کوچ کر کے یہاں سے نکل جائے۔ میں اس سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔“ آغا جان ان پر گرجے تھے۔

”یہ جذباتیت سے نہیں ہوش و حواس سے حل کرنے والا مسئلہ ہے آغا جان۔“

”اب تمہارا بھائی مرچکا قاران! مت حمایت کرو اس ناپاک عورت کی یا پھر اب تمہاری باری ہے اس کے چنگل میں پھنسنے کی۔“ آغا جان کا تنفر کروفر اور لفظی بے احتیاطی عروج پر تھی۔ غصے میں وہ زبان و بیان پہ قابو کھو بیٹھتے تھے۔

قاران کا چہرہ مارے اہانت کے سرخ پڑ گیا۔
 ”آغا جان پلیز۔“ وہ زرنگار سے نظر نہ ملا سکے۔

وہ چپ چاپ آنسو بہا رہی تھی۔ آج تو وہ جگر والا مرد بھی ساتھ نہ تھا۔ جو اس کے آگے کھڑا ہو کر ان طعنوں تشنوں سے اسے بچایا کرتا تھا۔ ہاں نمبر آفندی تھا ساتھ از حد حساس اور عمر سے پہلے ہی ذہنی بلوغت حاصل کرنے والا بچہ۔ اب بھی یہ ماحول اور باتیں اس کے ذہن پر انٹ نفوش چھوڑ رہی تھیں۔

”تم کیا جانو فاران۔ کس کی ناجائز اولاد اٹھا کر لے آئی ہے یہ ہمارے گھر۔ جائیداد کا وارث بنانے کے چکر میں۔“ صدیقہ بھابی نے حقارت سے زرننگار کو دیکھتے ہوئے کہا بھیس تھوکنے کی کسریاتی رہ گئی تھی۔
 ”ہوش سے بات کریں آپ۔ خبردار جو کسی نے وقار آفندی کے خون اس کی جائز اولاد پر انگلی اٹھائی تو۔“
 زرننگار شیرینی کی طرح غرائی تھی۔ سرخ و سپید رنگت اور مارے غم و غصے کے سپید پڑتے ہونٹ۔ وہ لرز رہی تھی۔ بیماری اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کر چکی تھی۔ مگر ہمت تو لوگوں کے رویے توڑتے ہیں۔ بیماری تو صرف موت کا بہانہ بنا کر کرتی ہے۔

”بھابی! آپ اتنی گری ہوئی بات کریں گی یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“ فاران کو بھی غصہ آیا تھا۔
 ”سب جانتے ہیں کہ وقار نے اس عورت سے شادی کی ہے اور آغا جان یہ۔۔۔ یہ دیکھیں۔ کوئی فرق نظر آتا ہے آپ کو اس بچے اور وقار میں؟“

وہ نمبر کو شانوں سے تھام کر آگے کیے ”آغا جان سے جذباتی ہو کر پوچھ رہے تھے۔
 ”دور کرو ان دونوں کو یہاں سے فاران، ورنہ میں دھکے دے کر نکلاؤں گا۔“ وہ ایک نظر بھی دہشت سے کپکپاتے نمبر پر ڈالے بنا سفاکی سے بولے تھے۔

”اللہ سے ڈریں آغا جان! یہ آپ کا پوتا ہے۔ آپ کا وارث۔“ زرننگار بے بسی کے مارے رو پڑی۔
 ”اللہ نے دے رکھا ہے پوتا مجھے۔ تم اس گندگی سمیت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ بہت کھا چکی ہو تم وقار کے ذریعے۔ اس کا سارا بینک بیلنس اس کا پلاٹ۔ اب یہاں کوئی حق نہیں تمہارا اور نہ اس غلیظ کا۔ جسے تم میرا پوتا بنا کر لائی ہو۔“ وہ بڑی حقارت سے کہہ رہے تھے۔

”میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں آغا جان۔ وقار مر گیا۔ میں بھی مر گئی تو آپ کا خون گلیوں میں رل جائے گا۔“ رو رو کر اس نے تھک کر ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ بے بس سے نمبر کی آنکھوں سے سیل رواں تھا۔ مگر وہاں اس وقت انسان نہیں بستے تھے۔ پتھر کے بت تھے۔ نہ سنتے نہ دیکھتے۔

”فاران اسے تم باہر نکالو گے یا میں جو کیدار کو بلاؤں؟“ آغا جان کا لہجہ سرور میں تھا۔
 بادلوں کی گڑگڑاہٹ نے زور پکڑا۔ آج بارش میں بھی کسی بیوہ اور کسی یتیم کے آنسوؤں کی سی روانی تھی۔
 ”آغا جان رحم کریں ان پر۔ یہ ظلم مت کریں۔“

”تمو ابھی جا گئیں تو فاران کو کمرے میں نہ پا کر باہر نکلیں۔ لاؤنج سے آغا جان کی۔ آنے والی آواز نے انہیں بعجلت ادھر آنے پر مجبور کر دیا اور زرننگار کے متعلق آغا جان کے ارشادات سن کر وہ گنگ سی کھڑی رہ گئی تھیں مگر اب جب بات حد سے بڑھتی دیکھی تو وہ احتجاجاً ”اوپنی آواز میں بول انھیں۔“

مگر یہ وہ گھر تھا جہاں بہوؤں کو ”اختلاف“ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ آغا جان کے سامنے تمو اور فاران کے بولنے کی جرات نے انہیں سچا کر دیا تھا۔

انہوں نے اسی وقت زرننگار اور نمبر کو وہاں سے نکال دیا۔ صدیقہ بھابی کے دل میں ٹھنڈک اتر گئی۔ تمو آغا جان کے ہاتھ کے محض ایک اشارے پر ہی اندر چلی گئی تھیں۔ فاران بے بس کھڑے تھے۔ سہیل آفندی میں ہمت ہی نہ تھی کہ وہ آغا جان کے سامنے کسی بھی قسم کی آواز اٹھاتے۔
 لاؤنج میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے ابھی کسی کی موت کی خبر سن کر سب گنگ رہ گئے ہوں۔

تیز موسلا دھار بارش ختم چکی تھی مگر موسم کے تیور نہیں بدلے تھے۔ وہ روتی ہوئی ماں کا ہاتھ تھامے اس

عقربٹ خانے سے نکل آیا۔
اس کا وجود ابھی بھی خوف و دہشت سے لرز رہا تھا۔ رات کے اس پہر سڑک پر اونچی آواز میں روتی۔ اس کی ماں اور ماں کے دکھ میں کشتادہ لیے بے آواز آنسو بہا تا چودہ سالہ معصوم نمبر آندی۔
”آہ۔۔۔“ زرنکار کو ٹھوکر لگی اور وہ اوندھے منہ سڑک پر جا گری۔
”ای۔۔۔“ وہ تڑپ اٹھا۔ گھبرا کر برا فروختہ ہو کر انہیں سیدھا کرنے کی سعی کی تو ان کی پیشانی خون سے تر ہوتی۔
”ای۔۔۔ ای۔۔۔“ وہ وہیں اونچی آواز میں رونے لگا۔



وہ کبیر کے ساتھ وقت سے کچھ دیر پہلے ہی المحرم الہال پہنچ گئی۔
”ایک گھنٹے تک آجانا کبیر۔ میں باہر ہی ملوں گی۔“ اس نے کبیر کو یاد دہانی کرائی تھی۔
اور اب۔۔۔ اس نے گردن اچکا اچکا کر پنچوں کے بل کھڑے ہو کر بھانت بھانت کے لوگوں میں طلال کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ مگر بے سود۔
اس نے موبائل نکال کر اسے کال کی۔
”بس ابھی پانچ منٹ میں نکل رہا ہوں۔ تم پہنچی تو نہیں؟“ وہ آفس میں ہی تھا۔ بجلیت بولا تو وہ جل کر رہ گئی۔
”نہیں۔ ابھی راستے میں ہوں۔“
اس نے منہ پھلا کر کہتے ہوئے موبائل بند کر کے بیک میں ڈال لیا۔ اب کچھ بھی ہو۔ وقت گزاری کے لیے ہینٹنگز ہی دیکھنا پڑیں گی۔ اوکھلی میں سردے لیا تو بھلا موسلوں سے ڈر کے کیا حاصل۔
وہ آگے بڑھی اور جا کر ایک تصویر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ انہماک کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے تصویر کا دو منٹ تک جائزہ لیا اور پھر اثبات میں سر ہلایا (جیسے کہ سارا آرٹ سمجھ لیا ہو محترمہ نے) اور جا کر اگلی تصویر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔
مگر تین تصویروں کے بعد فیلے پیلے رنگوں سے اسے گویا یرقان ہو جانے کا اندیشہ ہوا تو وہ پلٹ گئی۔
”توبہ۔۔۔ بنانا تو دور کی بات۔ انہیں تو دیکھنے کے لیے بھی اسٹاپ مینا چاہیے۔ نہ آنکھ نہ کان نہ ہاتھ نہ پیرو۔“
وہ سخت بے زار ہوئی۔ مگر پلٹتے ہی نشن آسمان نظروں کے سامنے یوں گھومیں گے اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

”آہا تم یہاں؟“ وہ موحد آندی تھا۔ مہواہ چکرائی۔
”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مہواہ نے تو یہی سوچا کہ وہ محض اسے ساتھ لے جانے کے لیے گھومنے پھرنے کی آفر کر رہا ہے۔ یہ نہیں پتا تھا کہ وہ سب سے پہلے ”اس“ مشہور جگہ کو دیکھنے آجائے گا۔
”وہ۔۔۔ میں ہینٹنگز دیکھنے آئی ہوں۔“ وہ گڑبڑائی۔
”اچھا۔ تو بڑی لائف میں سے ”اپنے“ لیے وقت نکال ہی لیا۔ بہت اچھا کیا۔“ وہ محفوظ ہوتے ہوئے مسکرایا۔

مہواہ نے نگاہ پھیری۔ کبھی ہیرو لگتا تھا مگر اس کے ساتھ ستارے نہیں ملتے تھے کہ دوستی ہی کر لیتی۔ کسی بھی بل طلال پہنچنے والا تھا۔

”ہوں۔“ مہم انداز میں کہہ کر یونی اور ادا دیکھنے لگی۔ جیسے اس سے بات نہ کرنا چاہتی ہو۔

”اکیلی کیوں آئی ہو؟ زمین یا ملاحہ کے ساتھ آجائیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”کبیر ڈراپ کر کے گیا ہے (دادا ابا نہ ہوتے)۔“ وہ جھک کر بولی۔

”اور یہ تم نمائش دیکھنے آئے ہو یا میری کلاس لینے؟ جاؤ اور جا کر ہینٹنگز دیکھو۔“

”تم بھی چلو۔ ہر قسم کے لوگ موجود ہیں یہاں۔ اکیلی کھڑی رہو گی کیا؟“ وہ قطعیت سے بولا۔

”او فوہ۔ ٹھیک ہوں میں یہاں۔ سار کھانی ہے کسی نے مجھے کچھ کہہ کر۔“ وہ جھلائی۔ موحد نے اسے گھورا۔

”آغا جان کو فون کروں؟“ اس کی دھمکی نے مہواہ کو اندر تک سلگایا۔ تنک کر بولی۔

”جی نہیں۔ بہت شکریہ۔ ان کا نمبر ہے میرے پاس۔ میں خود کال کر لوں گی۔“

اب جو لوگ وہاں موجود تھے وہ ایک نظر تو ضرور ہی اس خوب صورت کپل پر ڈالتے تھے۔ جھنجھلائی ہوئی مگلابی رنگت اور سیاہ بالوں والی لڑکی اور خوب صورت نقوش والا پیاری سی مسکراہٹ والا لڑکا۔ وہ اس کی بات پر بے ساختہ ہنس دیا۔

”ہیلو مہر۔“

طلال کی سروسی آواز نے ابے ٹھٹھرا سا دیا۔ وہ بمشکل مسکرائی۔

”ہیو۔ اتنی دیر کروی۔ کب سے اکیلی کھڑی تھی میں۔“ اسے باور کرایا کہ موحد کے ساتھ نہیں تھی۔

طلال نے ایک نظر ٹراؤز کی جیبوں میں انگلیاں پھنسائے کھڑے موحد پر ڈالی۔ پھر مہواہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔

”اففف۔“ مہواہ کی ٹانگیں من من بھر کی ہو گئیں۔ (کیا سوچتا ہو گا۔۔۔ موحد)

”او کے موحد۔ انجوائے یور سیلف۔“ وہ بدقت مسکرا کر کستی تلال کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

”پھر یہ شخص تمہارے ساتھ تھا مہر۔ میں نے کہا بھی تھا تم سے کہ اب یہ بندہ تمہارے آس پاس بھی نظر نہ آئے۔“

موحد کے کانوں میں دور جاتے تلال کی پر تش آواز آئی تو وہ لب بھینچے ہینٹنگز کی طرف بڑھ گیا۔

”او فوہ۔ میرے کون سا دادا کا ہے انجرا ہال۔ جس کی مرضی ہو وہ آسکتا ہے یہاں۔“ مہواہ جھک کر بولی۔ ”میں کبیر کے ساتھ آئی تھی۔ اب موحد کب آیا مجھے نہیں بتا۔“

”سارا مزہ خراب کر دیا اس بندے کے دیدار نے۔“ وہ تصویریں دیکھتے ہوئے بھی بدبوتا رہا تھا۔ مہواہ الگ ٹینشن کا شکار تھی۔

”میں یہاں ہریات ختم کرنے آئی تھی تلال اور تم نئی ٹینشن لے کر بیٹھ گئے ہو۔“ وہ خفا ہونے لگی۔

”میں نے بھی سوچا تھا یہاں سے سیدھا پڑا ہٹ اور پھر لانگ ڈرائیو مجھے کیا پتا تھا تمہارا ”خاندانی“ باؤی گارڈ بھی منہ اٹھا کر چلا آئے گا۔“ وہ تپا ہوا تھا۔

”متکنی کا پریڈ“ اس قدر یادگار ہو گا یہ تلال نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ”سالا۔“ وہ وانت کچکا کر رہ گیا۔

”وہ دوبارہ کہیں نظر نہیں آیا تلال۔“ چلا گیا ہو گا۔ ”مہواہ نے اسے تسلی دی۔ ”آئس کریم تو کھا ہی سکتے ہیں۔“

”موم بھی بہت اچھا ہو گیا ہے اب تو۔“ وہ مسکرائی۔

طلال کے تپتے ہوئے اعصاب بھی کچھ ڈھیلے پڑے۔

”ویسے تلال، مجھے پتا نہیں تھا کہ تم اتنے غصیلے اور پوزیسیو ہو۔“ آئس کریم پارلر میں آئس کریم سے لطف اندوز

ہوتے ہوئے مہواہ کا انداز اسے چھوڑنے والا تھا۔

”شادی کے بعد تو میں باقاعدہ ایک گن رکھوں گا اپنے ساتھ۔ جو بھی تمہیں دیکھے گا وہ فائر۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

مہواہ نے اسے گھور کر دیکھا اور بتایا۔
 ”کوئی اور بھی یہی سوچ لے تو؟ کسی کی بیوی پر تمہاری بھی نظر پڑ سکتی ہے۔“
 ”میری نظر تم پر سے ٹپکے گی تو نا۔“ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تو وہ جھینپ گئی۔
 ”آئس کریم کھاؤ آئس کریم۔ میرے اتنے پنڈ سم کزن سے ہر وقت جھلس ہوتے رہتے ہو۔“ مہواہ نے اسے چھیڑا تھا۔

”ہنس۔“ طلال نے ناپسندیدگی سے سر جھٹکا اور اسے گھورا۔
 ”مجھ سے زیادہ پنڈ سم لگتا ہے وہ تمہیں؟“ مہواہ نے مسکراہٹ دی۔
 ”تم سے تھوڑا سا کم۔“ وہ لبہا کھینچ کر بولی۔ ساتھ ہی چٹکی سے اشارہ بھی کیا۔
 ”بہت ساروں کا مہواہ! اسے کچا چبانے والے انداز میں دیکھتے ہوئے بولا تو وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔
 ”جلدی کرو۔ کبیر آنے والا ہو گا۔ مجھے الجھرا ڈراپ کرو۔ فٹافٹ۔“
 ”اف۔ ایک تو یہ خواجواہ کی پابندیاں اور باڈی گارڈز۔“ وہ سخت کوفت سے پیالے میں چچہ پھینکتے ہوئے بولا۔
 ”شادی کے بعد دیکھنا اتنی مٹیں کروں گی تب لے کر جایا کرو کے لانگ ڈرائیو پر۔“ مہواہ نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے اسے چھیڑا۔

”وہ دن آنے تو دو مہو۔ دیکھنا کیسی زمانے بھر کی خوشیاں تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔“
 وہ گہرے لہجے میں بولا تو مہواہ کے چہرے پر خوب صورت سی مسکان پھیل گئی۔ پلکیں اٹھا کر ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ اسی کی طرف متوجہ تھا۔
 ”مجھے پتا ہے۔“

”اعتراف محبت؟“ وہ فوراً اٹھ گئی تھی۔ طلال خوش دلی سے مسکرایا۔



طلال کی ضد پر اسے نہ چاہتے ہوئے بھی لانگ ڈرائیو پر جانا ہی پڑا مگر سارے راستے وہ ٹائم ویکھتی رہی۔
 ”کال کرو اسے ٹھہر کے آجائے یا میں ڈراپ کر دوں گا۔“ طلال نے مزے سے حل پیش کیا۔
 ”شام ہونے والی ہے طلال۔ آفس سے ابو اور مچھا جان کو پک کرنے کی ذمہ داری بھی اب اسی کی ہے۔ آغا جان کو پتا چلا تو۔“ وہ سخت پریشان تھی۔
 ”وہ آیا ہوتا تو کال کر لیتا نا۔ اسے بھی کوئی کام پڑ گیا ہو گا۔“ طلال نے اسے تسلی دی۔
 ”ہاں۔ یہ بھی ہے۔“ اسے خیال آیا۔ کبیر نے مس کال نہیں کی تھی۔ مطلب ابھی وہ نہیں آیا تھا اور اگر محترمہ مہواہ صاحبہ اس وقت ذرا سی دانش مندی دکھاتے ہوئے ایک بار اپنا موبائل فون چیک کر لیتیں تو انہیں پتا چل جاتا کہ وہ لوہو شری کی وجہ سے شٹ ڈاؤن ہو چکا ہے۔ جانے کبیر نے کتنی کالز کڑا لی تھیں۔
 ”اب بس طلال واپس چلو۔“ مہواہ نے دیئے ہوئے ٹائم سے آدھا محفہ اوپر ہوتے دیکھ کر طلال کو سختی سے کہا تھا۔

”بڑی ظالم بیوی ہو گی۔“ وہ ہنسا تھا مگر ہر حال گاڑی واپس موڑ دی لی۔ راستے میں سے زبردستی اسے ہاتھوں میں پنہنے کے لیے گھر لے کر دیے۔

”تم جانو جو گھر کر رہے ہو طلال۔ اسے اب سخت بے چینی اور پریشانی ہو رہی تھی۔
 طلال نے اسے الجھرا بال ڈراپ کیا۔ وہاں کبیر کا نام و نشان تک نہ تھا۔

”لو۔۔۔ وہ ابھی پہنچا بھی نہیں اور تمہیں جلدی کی پڑی ہوئی تھی۔“ طلال خفا ہونے لگا۔ مہوا نے اسے دھکیلا۔
”تم نکلو جلدی سے۔ ہو سکتا ہے وہ ابو اور چچا جان کو پک کرتے ہوئے مجھے لینے آئے۔ میں کال کر لیتی ہوں اسے۔“

”او فف۔ تو سر صاحب سے ملنے میں کیا قیامت ہے بھلا۔ میں بھی ویٹ کر لیتا ہوں۔“ وہ شرارت سے بولا۔
”طلال۔“ مہوا کو ہنسی آگئی۔ طلال کو بمشکل وہاں سے دھکیل کر بھیجا اور موبائل نکالا، تاکہ کبیر کو کال کر کے صورت حال معلوم کرے۔ مگر تاریک اسکرین پر نگاہ پڑتے ہی اس کے قدموں تلے سے صحیح معنوں میں زمین نکلی تھی۔

”شٹ۔“ موبائل آن کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر اسے احساس ہوا کہ بیٹھری کی چار جنگ ختم تھی۔
اس نے پریشانی سے ماتھا سہلایا۔

(اب تک تو گھر میں طوفان مچ چکا ہو گا۔) وہ ٹیکسی کی تلاش میں نظروں ڈالنے لگی۔ اس بات سے بالکل بے خبر کہ اس سے کچھ فاصلے پر گاڑی میں موجود شخص اسی پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔



مہوا کا کافی دیر انتظار کرنے اور مسلسل اس کا فون بند ملنے کے بعد پریشان ہو کر کبیر واپس گھر پہنچا۔ سوچا شاید مہوا گھر پہنچ گئی ہو۔ مگر جو کیدار ہی سے پتا چل گیا کہ وہ واپس نہیں آئی تھی۔ اسی لمحے موجد کی گاڑی آکر اس کی گاڑی کے سامنے رکی۔ کچھ سوچ کر کبیر گاڑی سے نکل کر اس کی طرف بڑھا۔
”خیریت۔؟“ کبیر نے پریشانی کے عالم میں ساری بات اسے بتادی۔

”اب بتائیں۔۔۔ وہ گھر بھی نہیں آئیں اور موبائل بھی آف جا رہا ہے۔“
”ڈونٹ وری۔ مجھے پتا ہے وہ کہاں ہے۔“ موجد نے اطمینان سے کہتے اسے تسلی دی۔ اسے تسلی تو کیا ہوئی وہ بے یقینی سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔

مگر وہاں مذاق کی کوئی رفق موجود نہ تھی۔

”سچ کہہ رہا ہوں یا ر۔ تم جاؤ، چچا جان اور تایا جان ویٹ کر رہے ہوں گے تمہارا۔ میں اسے لے کر آتا ہوں۔ اپنی دوست کے ساتھ چلی گئی تھی وہ وہیں تھا میں بھی۔“ الحرامیں۔“ موجد نے اسے تسلی دی تو الحرام کا حوالہ سن کر کبیر نے گہری سانس بھری۔ اگر موجد کو یہ پتا تھا کہ وہ مہوا کو الحرام چھوڑ کر آیا تو پھر وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔
موجد نے وہیں سے گاڑی آگے نکال لی اور کبیر اطمینان کی سانس لیتا آفس کے راستے چل دیا۔

مگر اسے یہ خیال نہیں آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے گھروں کر کے مہوا کی واپسی کا جو پوچھا تھا اس کا کیا؟ تائی جان تو بھری بیٹھی تھیں۔ وہ رکشے میں گھر لوٹی تھی۔ جلدی سے پیپے پکڑا کر رکشے والے کو فارغ کرتی تیل بجانے لگی۔
جب وہ گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو اسی وقت وہی گاڑی گیٹ کے سامنے آکر رکی تھی۔

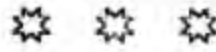
وہ جل جل لال کا ورد کرتی اندر آئی تو لاؤنج ہی میں تائی جان، چچی جان اور باقی سب کی پریشان شکلوں کے ساتھ آغا جان عیض و غضب سے لال ہوتا چہرہ لیے موجود تھے۔
”کہاں تھیں تم؟“ تائی جان شدید غصے میں تھیں۔

اور مہوا جو سارے راستے بہانے سوچتی آئی تھی۔ خالی الذہن کی سی کیفیت میں کھڑی رہ گئی۔ اسی وقت کسی نے لاؤنج میں قدم رکھا۔

”السلام علیکم میرے ساتھ تھی یہ۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

سب نے بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اور تو اور مہراہ کو بھی اس سفید جھوٹ پر کمرٹ سا لگا۔ جبکہ آنے والا مطمئن تھا۔



”میں نے بھی سوچ رکھا تھا کہ میں نمبر کو ایک نہ ایک دن وہاں ضرور لے جاؤں گا۔ جو اس کا حق ہے وہ اسے دلاؤں گا بھابھی۔ آپ نے اس قدر جلد بازی کر کے کام بگاڑ دیا۔“ فاران ماہانہ خرچ دینے آئے تو پڑمروہ سی زرنگار پر خفا ہونے لگے۔

”ہو نہ ہو۔ ہمارے کام سنو رہے ہی کب تھے بھائی صاحب۔ جواب بگڑیں گے۔“ وہ استہزاء سے مسکرا کر بولی۔

”میں معذرت چاہتا ہوں آپ سے، بس دکھ کی کیفیت میں آغا جان کچھ زیادہ ہی بول گئے۔“ فاران نے پرہز رکھنا چاہا۔

”دکھ نہیں۔ ان لوگوں کو انا پسندی لے بیٹھی ہے بھائی صاحب، دکھ ہوتا تو اس یتیم کے سر پر ایک بار تو ضرور ہاتھ رکھتے۔“ وہ آنسو پیتے ہوئے صاف گوئی سے بولی۔

فاران آئندی نے پاس بیٹھے نمبر کے شانے پر بازو پھیلا کر اسے اپنے ساتھ لگالیا۔ وقار آئندی کا بیٹا بھی انہیں اسی کی طرح پیارا تھا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا وہ شام سے پہلے اسے آئندی ہاؤس لے جاتے۔ مگر جانے آغا جان کا دل پھر کیوں ہو گیا تھا۔ وہ کڑھ کر رہ گئے۔



”آغا جان۔ ہم نے وقار کو کھو دیا۔ اس کے غم میں ماں جی چلی گئیں۔ اب بس کرویں پلینز۔ وقار کی آخری نشانی ہے اس کا بیٹا۔ اسے اپنالیں۔ آپ کا اپنا خون ہے وہ۔“

وہ شام کو آغا جان کے پاس آئے تو پکا ارادہ تھا کہ ان کے خیالات اور اصولوں میں دراڑ ڈال کر ہی رہیں گے۔ مگر آغا جان کس غضب میں گھرے ہوئے ہیں یہ انہیں بتا ہی نہیں تھا۔

وہ فاران کی بات کے جواب میں پہلے تو خاموش رہے۔ پھر سرد مہری سے بولے۔

”تم اس طوائف پر پیے لٹا رہے ہو آج کل۔؟“ فاران چکر اکر رہ گئے۔ خفگی سے پوچھا۔

”آغا جان۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”کہو کہ یہ جھوٹ ہے۔ جب سے وقار مرا ہے تم باقاعدگی سے وہاں جاتے بھی ہو اور روپیہ بھی لٹاتے ہو اس پر۔“ تنفر کی حد تھی۔ فاران سناٹے میں آگئے۔

”تم مجھے دھوکا دیتے رہے ہو فاران۔ مجھے۔ غلطی ہو گئی مجھ سے جو تمہیں وقار سے الگ سمجھا میں نے۔ تم بھی اسی غلاظت میں گر گئے جا کر۔“ ان کی آنکھیں انگاروں کی طرح دھکنے لگیں۔

”خدا کے لیے آغا جان۔ بس کرویں۔“ فاران پھٹ پڑے تھے۔ ”ان کا خرچ دے رہا ہوں بس۔ ان کا حق ہے یہ۔“

”بس تو تم لوگوں نے کروی ہے میری فاران آئندی۔ اٹھاؤ اپنا بوریا بستر اور اسی خبیث عورت کے پاس شفٹ ہو جاؤ تم بھی۔“ وہ قطعیت سے بولے تھے۔

وقار کے بعد فاران کی دھوکا دہی نے ان کا دماغ گھما دیا تھا۔ بعد میں شاید غصہ ٹھنڈا ہوتا تو وہ اپنی باتوں پر نظر ثانی کر لیتے مگر فاران کا دل اس قدر بڑی طرح ٹوٹا کہ وہ اسی شام بیمار مودہ اور سمو کو لیے وہاں سے نکل گئے۔

صدقہ بھائی نے بظاہر دیکھا۔ مگر دل میں اتنی ٹھنڈک تھی کہ بڑھتی ہی چلی جاتی تھی۔ سائے نے میاں کو فون کیا۔ مگر سہیل کے آنے تک وہ لوگ آندری ہاؤس سے ہمیشہ کے لیے جا چکے تھے۔ آغا جان کو پتا چلا تو وہ ساکت سے رہ گئے۔ بلندیوں پر رہنے والے اکثر تنہا ہوتے ہیں۔ مگر انہیں اس بات کا شعور بہت دیر سے آتا ہے۔ آغا ذوالفقار علی آندری بھی ان ہی میں سے تھے۔ ان کے گھر کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ وہ شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئے مگر اسی تنہائی میں۔ اسٹڈی کا دروازہ بند کر کے۔

اللہ نے منتوں، مرادوں کا پوتا دیا تھا۔ ایک کو ناجائز کہہ کر مسترد کر دیا۔ جو جائز تھا اسے ناجائز طریقے سے جدا کر دیا۔

ہو گا کوئی آغا ذوالفقار علی آندری جیسا بے مراد اور شقی القاب شخص۔ مگر اے بندے! اللہ کی لاشی بے آواز ہے۔ ہر زبردست کو ایک نہ ایک دن زبردست آنا ہی ہے۔ حق اللہ۔ لاشی کھائے بغیر سمجھ میں کسی کی کوئی آتا ہے۔



موحد آندری نے اتنے آرام سے جھوٹ بول کر اسے آغا جان کے غضب سے بچا لیا تھا کہ مہواہ چکرا کر ساری صورت حال دیکھتی رہ گئی۔ اب کسی کو یقین آیا ہو یا نہیں مگر بات ختم ضرور ہو گئی تھی۔ وہ اس کے پیچھے جانے کو تھی جب صدیقہ بھائی اسے بازو سے پکڑ کر تقریباً "ٹھٹھکی ہوئی اپنے کمرے میں لے گئیں۔" "اب مجھے ٹھیک سے بتاؤ۔ کہاں تھیں تم اور کس کے ساتھ؟" انہوں نے غرا کر پوچھا۔ "اوف۔ بتا کر تو گئی تھی امی۔" وہ جھنجھلائی۔ اس ساری صورت حال نے ویسے ہی انہیں بھرپور ڈھیلے کر دیے تھے۔ اوپر سے اب یہ پوچھ کچھ۔

"تو وہ کیوں کہہ رہا ہے کہ تم اس کے ساتھ تھیں؟" "دیر ہو گئی تھی مجھے طلال کے ساتھ امی۔ موحد نے بس ذرا سی فیور دے دی مجھے۔" وہ تادم سی ہو کر بولی تو وہ اسے گھور کر رہ گئیں۔



دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

"لیس۔ کم آن۔" وہ مصروف سا بولا۔ مہواہ اندر داخل ہوئی۔ موحد آندری کا شکریہ ادا کرنا تو بگڑا ہی تھا۔ "تم۔ تم کیا لینے آئی ہو یہاں؟ گیٹ لوسٹ۔" وہ سرد لہجے میں کہتا اس تک آیا۔ وہ جو موحد کے اس قدر حیران کن انداز پر ششدر سی کھڑی تھی۔ اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کمرے سے باہر کر کے دروازہ دھاڑ سے بند کر دیا۔ باہر حق دق کھڑی مہواہ کی آنکھیں اس قدر بے عزتی پر بھر آئیں۔ اور اندر بستر پر بیٹھ کر جوتے اتارتے ہوئے موحد آندری کے ہونٹوں پر محفوظ کن مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ

حیری گٹر

وہ اس کی خاموشی اور افسردگی دیکھ رہی تھیں مگر کچھ بولی نہیں۔ وہ تھکے قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں آیا تھا۔

دلہن کے سرخ زرد تاروں پر بے کسوڑی دیکھتے ہی دن بھر کی افسردگی بھنے کی آگ میں بدل گئی تھی۔ اس کے

وہ لاؤنج میں چپ چاپ بیٹھا اپنی شادی کا ہنگامہ دیکھ رہا تھا۔ زرق برق سوٹ پہنے میک اپ سے سجے چہرے ہار پھول کھانا خوشیاں سب ہی لوازمات تو تھے۔ اگر نہیں تھا تو وہ یہاں نہیں تھا۔ اس کا ذہن دور کسی صدمے میں گم تھا۔ گاڑی پہ سجے پھول اس کے سینے میں کانٹوں کی طرح چبھتے رہے تھے۔ دلہن کے پسماندہ دیہات کے ڈھولک کی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ رہا اچھا مستقبل! تو وہ بھی اسی ڈھول میں گم کر آیا تھا۔

”بیٹا! رات بہت ہو گئی ہے اب تم بھی جالر سو جاؤ۔“ امی کے احساس دلانے پر اسے اندازہ ہوا کہ سارا ہنگامہ کب کا ختم ہو چکا ہے۔



خوابوں اور آرزوؤں کی بربادی کی وجہ وہی تو تھی۔
خوش آمدید ”وہ اس کے سامنے آ بیٹھا تھا۔“ ”کیسا
لگا آپ کو شہر؟“ اس کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا اس
نے چونک کر سر اٹھایا۔

”بتیاں دیکھیں؟“ الفاظ تھے کہ پتھر۔ اس اہانت پر
اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا، یہاں تک کہ دوپٹے اور اس
کے چہرے کا رنگ ایک سا ہو گیا تھا۔ مگر وہ بولے جا رہا
تھا۔

اتنا بڑا اور خوب صورت گھر بھی پہلے کبھی نہیں
دیکھا ہوگا، ہے نا؟“ وہ اسی دھیمے مگر زہر خند لہجے میں بولا
تھا۔ جیسے ایک ایک لفظ کا مزہ لے رہا ہو۔

”اس گھر میں بہت سارے لوگ بھی ہیں اور چیزیں
بھی جو آپ نے زندگی میں نہیں دیکھی ہوں گی تو
تعارف ضروری ہے۔ سب سے پہلے مجھ سے
ملیں میں ہوں سلمان، اس گھر کا سب سے لائق اور
قابل بیٹا اور اتنا ہی بد قسمت بھی، آپ سے شادی جو
ہو گئی۔ اب آئیے کمرے کی چیزوں کی طرف۔ آج سے

پہلے یہ سب کچھ خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوگا آپ
نے، ہے نا، میں صحیح کہہ رہا ہوں نا؟“ اس نے جیسے
اپنے ہی لفظوں کی تصدیق چاہی۔ مگر وہ کچھ کہنے بتانے
کی پوزیشن میں ہی کہاں کھڑا تھا۔ سارے جملے اچانک
اور اس کی توقع کے برعکس تھے۔

یہ جو آپ کے سر کے اوپر ہے اسے پٹکھا کہتے
ہیں۔ خود کشی کرنے کے کام بھی آتا ہے، آپ نہ کیجیے
گا، ویسے اس کی نیت نہیں آئے گی۔ یقیناً سنا ہے
وہ ساقی بہت سخت جان، مطلب ڈھیٹ ہوتے ہیں۔
وہ خود ہی سوال جواب کر رہا تھا۔

اور یہ جو دیوار کے ساتھ لگا ہے اسے اے سی کہتے
ہیں۔ یہ گمرہ ٹھنڈا کرتا ہے۔ یہ ٹیوب لائٹ ہے۔ یہ
سائیڈ ٹیبل ہے۔ یہ لیمپ ہے۔ یہ وہ ہے یہ وہ ہے۔“

وہ بولے جا رہا تھا اور وہ آنکھیں پھاڑے حیرت سے
اسے دیکھ رہی تھی۔ اچھے خاندان کا قابل انسان اندر
سے اس قدر زہرا ہو گا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔
وہ لفظوں کی صورت زہر اس کی رگ رگ میں اتار رہا

تھا۔ اس کے چہرے پر اس کے لیے نفرت، حقارت،
غصہ کیا کچھ نہ تھا۔ پہلی ملاقات کا یہ نقشہ ہو گا اس کے
وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ نہ حسن کی تعریف نہ
ساتھ نبھانے کا وعدہ، وہ اسے الیکٹرونکس پڑھا رہا تھا۔



صبح ہوتے ہی اس نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا
تھا۔ وہ جس کے لیے یہاں لائی گئی تھی۔ جب اسے ہی
اس کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ وہ اس کے لیے
شرمندگی کا باعث تھی شاید۔ تو پھر یہاں زیروستی رہنے
کا کیا جواز تھا۔ پھر رات اس نے اسے جس ذلت اور
شرمندگی سے دوچار کیا تھا۔ وہ یہ سب دوبارہ نہیں سہ
سکتی تھی۔

نماز کے بعد اس نے معمول کی دعائیں مانگی خاص
طور پر ابو کی صحت کی دعا اور اچانک جیسے اس کی
یادداشت واپس آگئی تھی لپٹا گھر گھر کے سب لوگ ابو
ان کی بیماری سب یاد آگیا تھا۔ اس کے گھر۔ میں

سکون تھا، محبت تھی احساس تھا۔ اس کے گھر میں
خوشیوں اور امیدوں کے چراغ جل اٹھے تھے۔ اب
ان چراغوں میں اس کا خون جلتا یا دل اسے ہر حال میں
انہیں روشن رکھنا تھا۔ واپسی کا فیصلہ رات کو جتنا
آسان لگا تھا اب اتنا ہی ناممکن لگ رہا تھا۔ وہ واپس جا
کر اپنے ماں باپ کو کیسے شرمندہ کر سکتی ہے، اس کی
قسمت میں جو کچھ تھا اسے مل گیا تھا۔ اب زندگی
چاہے کتنی ہی محروم گزرتی اس نے ہر چیز پر عزت کو
ترجیح دی تھی۔

وہ بھی جاگ چکا تھا۔ رات کی ایک ایک بات اسے
یاد آرہی تھی۔ ڈھیروں زہرا لگنے کے بعد اسے اپنے
روپے پر تھوڑا سا بچھتاوا ہوا تھا۔ اس نے آئندہ ایسا
نہ کرنے کا کمزور سا ارادہ بھی کیا تھا۔ مگر اسے دیکھتے ہی
اس کا غصہ دوبارہ لوٹ آیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر
باتھ روم میں گیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس
نے خود کو غور سے دیکھا۔ کس چیز کی کمی تھی اس میں
پھر اس کے ساتھ آخر ایسا کیوں ہوا تھا اس کی قسمت

کھولنی نکلی تھی۔ اس کے اپنے ہی ماں باپ نے اس
دیساتن کو لا کر کس قدر آسانی سے اس کے خوابوں کا
خون کر دیا تھا اور اس نے یہ ہونے دیا تھا۔ وہ اس کے
بارے میں وہی باتیں جانتا تھا۔ وہ دیساتن تھی اور ملل
پاس تھی اور ان ساری معلومات کا منبع اس کی
بھابھیاں تھیں جو اس کی معلومات میں اضافہ کرتی
رہتی تھیں۔ جتنا رہتی تھیں۔

”سنا ہے خالی ہاتھ جھلاتی آرہی ہے پینڈونہ تعلیم
نہ شکل نہ پیسہ۔ جینوز وغیرہ بھی کچھ نہیں ہوگا۔ ہم کیا
پاگل تھے ٹرک بھر بھر سامان لائے۔ حالانکہ ماں باپ
پہلے ہی تعلیم پر کروڑوں خرچ کر چکے تھے۔“

یہ بڑی بھابھی تھیں مشہور گانا کالوجسٹ،
ان کا دن رات کلینک پر ہی گزرتا تھا۔ کافی بھاری فیس
تھی ان کی اس کے ساتھ ساتھ ذاتی لیبارٹری اور
میڈیکل اسٹور کا دھندہ بھی زوروں پر تھا۔ جس جگہ
سے ہن برس رہا تھا ترجیح بھی اسی کو حاصل تھی۔ گھر
رشتے ذمہ داریاں سب خاموشی سے ان کی زندگی میں

کہیں دیکھے پڑے تھے۔

”حیرت ہے تم اس شادی پر راضی کیسے ہوئے
کہاں تمہارے اونچے خواب اور کہاں یہ دیساتن۔
ڈیڈی نے اپنے گاؤں کے کسی دوست کی بیٹی پسند کر لی
تم نے بھی آؤ دیکھانہ تاؤ اسے بیانے چل دیے۔“

یہ آفرین بھابھی تھیں خیر سے انجینئر تھیں ٹائن ٹو
فائو والی نوکری، دفتر کی میسنگز پارٹیاں ٹور زئی ان کی
زندگی تھے۔ تنخواہ کے لاکھوں روپے ان کی ذاتی تزیین
و آرائش پر ہی خرچ ہوتے لیکن عدیل بھائی سے بھی
ہر ماہ ایک موٹی رقم وصول کرتی تھیں۔ اگر دیر ہو جاتی تو
خوب ہنگامہ کرتیں۔ اس کے باوجود اس کے بھائی ان
حسین، طرح دار گیر و دو من پر جتنا فخر کرتے کم تھا۔

بچے کسی کے بھی نہیں تھے، کیونکہ ابھی انسان
نہیں گیر پڑنے کا وقت تھا۔ یہ لڑکی مینا ان کے رویوں
کے رد عمل کے طور پر لائی گئی تھی یہ بات وہ جانتی
تھیں کی وجہ تھی کہ وہ سلمان کے سامنے اپنا اور اس
کی بیوی کا تقابلی جائزہ پیش کرتی رہتی تھیں۔ جو کسی

طور بھی اس جیسے اعلا انسان کے لائق نہیں تھی۔
”ہم حیران ہیں تم جیسا انسان اس لڑکی کے ساتھ
کیسے زندگی گزارے گا۔“

وہ خود بھی حیران تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ کیسے زندگی
گزارے گا؟ گزارے گا بھی یا نہیں؟ می ڈیڈی نے
اسے ایسے گھیرا تھا جیسے یہ شادی نہ ہوئی تو خاندان پر نہ
جانے کتنی بڑی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اور کسی کمزور
گھر کی گرفت میں آکر وہاں کر بیٹھا تھا اور یہی کمزور لمحہ
زندگی کی سزا بن گیا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اس کی جارحیت اور
مینا کی خاموشی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اسے تکلیف
دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔ کبھی کبھی
اسے لگتا وہ گونگی ہے مگر جب بھی وہ اس کی آنکھیں
سرخ دیکھتا اسے تھوڑا سا پچھتاوا ہوتا۔ وہ خود نہیں
آئی تھی گائی گئی تھی۔ مگر اب ماں باپ پر تو وہ غصہ
نکالنے سے رہا۔ لیکن وہ یہ سب کچھ کیوں نہ رہی
تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ آخر وہ چلی کیوں نہیں
جاتی۔ یہاں آنا اس کے اختیار میں نہیں تھا مگر جانا تو تھا۔

لیکن اگر وہ پھر بھی یہاں تھی تو اسے اس کی پوری
پوری قیمت چکانا ہوگی۔

اس نے خود کو بہت مصروف کر لیا تھا۔ گھر کے ہر
حصے میں اس کی مداخلت اور کارروائی صاف نظر آتی۔
وہ سلمان کی بھی ہر ضرورت جیسے ٹیلی فنی کے ذریعے
جان کر پوری کر دیتی۔ اسے اپنی ہر چیز اپنی جگہ پر تیار
ملتی، کھانے کی میز پر بھی لطف اور مزہ بڑھتا جا رہا تھا۔
اسے گھر آنا ہی بڑا لان کے پھلوں اور پھولوں میں بھی
اضافہ ہوا تھا۔ حتیٰ کہ کچن گارڈن میں سبزیاں تک
اگائی جا رہی تھیں۔

اسے یقین تھا کہ کچھ دنوں میں کچن کے پچھواڑے
دو بھینس بھی بندھی ہوں گی اور اس کے کپڑوں کی
الماری سے انڈے دیتی مرغیاں بھی برآمد ہوں گی مگر وہ
اس کی اس ساری محنت سے ذرا بھی متاثر نہیں تھا۔ یہ
سارے کام تو ملازم بھی کر رہے تھے۔

مینا نے پہلے پہل تو یہاں رہنے کا فیصلہ ماں باپ کی

تھے۔ لیکن بولتے اس لیے نہیں کہ میاں بیوی کا مسئلہ
تم آپس میں ہی حل کر لو اچھا ہے۔“
”ڈیڈی! آپ نے اور می نے اپنا بڑھاپا آرام وہ
بنانے کے لیے بیٹا قربان کر دیا۔ ایک ٹل پاس دیہاتن
میرے سر تھوپ دی سناہ تو رہا ہوں اب اور کیا
کروں۔“ وہ سخت ناراض تھا۔

”تو تم کو اس بات پر اعتراض ہے کہ اس کا تعلق
دیہات سے ہے۔“ وہ اسے غور سے دیکھ رہے
تھے۔ ”بیٹا دیہاتی تو میں بھی ہوں۔ گاؤں سے شہر آیا
تھا۔ تمہاری ماں بھی ایک دیہاتی کی اولاد ہے تو پھر
ہمارے لیے کیا سزا ہے ہو لو! رہا سوال اس کے ٹل
پاس ہونے کا۔“ وہ اسے خاموش دیکھ کر دوبارہ بولے تو
اس کی وجہ یہ ہے کہ گاؤں میں ٹل تک ہی اسکول تھا۔
اس کے بعد کی داستان قربانی کی داستان ہے جس سے
تمہیں یقیناً کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ لیکن صرف
تمہاری معلومات کے لیے بتا رہا ہوں۔ مینا کا باپ ایک
قاتل پروفیسر تھا سارے جہان میں علم ہانٹنے والا کیا اپنی
اولاد کو بھول جائے گا اس نے بیٹی کو شہر بھیجنا چاہا مگر وہ
خود نہیں گئی۔ جانتی تھی باپ بیمار ہے۔ گھر میں
مسائل ہیں۔ اسی لیے اس نے پردھا تو بہت کچھ مگر
پرائیوٹ اپنے قاتل باپ کی زیر نگرانی۔“

وہ بول رہے تھے مگر وہ اسی طرح حلق بیٹھا تھا۔
”بیٹا! اپنی مصنوعی اور نمائشی دنیا سے باہر آؤ۔
انسان کی قدر کرنے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ وہ
انسان ہے۔ اور جان لو علم ڈگری کا محتاج نہیں نہ ہی
ڈگری علم کی ضمانت ہے۔ میں برسوں سے مینا کے باپ
کو جانتا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ مسائل کے باوجود
یہ سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک
دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں۔ تب مجھے یقین ہو گیا کہ
میرے خاندان کو بے حسی اور خود غرضی سے اگر کوئی
بچا سکتا ہے تو وہ ہی لڑکی ہے۔“

وہ بڑے یقین سے کہہ رہے تھے۔
”مینا ہی وہ لڑکی ہے جو تمہارے گھر میں اس نسل کی
بنیاد رکھ سکتی ہے جو محبت، خلوص اور احساس جیسی

محبت میں کیا تھا۔ اس کے بعد باقی سب کچھ اس کی
محبت میں یہ ناراض شخص کب اس کے دل میں آسا
تھا اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اس کے آس پاس رہتا
اس کے کام کرنا حتیٰ کہ اس کی ڈانٹ کھانا بھی اب
اسے اچھا لگتا تھا۔

اس کی اس درجہ سعادت مندی پر وہ اور چڑ جاتا
اسے یہ سلیقہ مشین نہیں چاہیے تھی۔ اسے ایک
حسین، تعلیم یافتہ، پر اعتماد بیوی کی ضرورت تھی۔ جو
اس کے گھر کے اندر ہی نہیں باہر کی زندگی میں بھی
پوری طرح سے شریک ہو۔ کچھ اختلافات کے باوجود
وہ اپنی بھابیوں کو بہت پسند کرتا تھا۔ وہ ذہین
تھیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اپنے اپنے شعبے میں بہت
قابل ان کی اپنی ایک الگ اور مضبوط شخصیت تھی۔
وہ کسی کی محتاج یا پابند نہیں تھیں۔ مگر اس کی بد قسمتی
یہ تھی کہ اسے بیوی اپنی ترجیحات کے بالکل برعکس ملی
تھی۔ جو صرف گھر چلا سکتی تھی۔ حالانکہ آج کی دنیا
میں عورت کے لیے مخصوص سمجھے جانے والے کام

اب مشینیں زیادہ بہتر کر رہی تھیں۔ بچے ہاشلوں میں
زیادہ اچھے طریقے سے مل رہے تھے۔ ایسے میں عورت کی
قابلیت کو گھر میں دفن کرنا کہاں کی عقل مندی تھی۔
مگر اس کے ساتھ یہ سانحہ پیش آچکا تھا۔

اس کی بیوی میں اکیلے گھر سے باہر نکلنے کی قابلیت
بھی نہیں تھی۔ اس کی ساری دلچسپیاں گھر اور شوہر
تک محدود تھیں۔ وہ ذرا سا بھی بیمار پڑتا وہ بے چین
ہو جاتی ایسی فکر اور بے چینی تو اس نے می کے چہرے
پر بھی نہیں دیکھی تھی اپنے لیے اس کے باوجود وہ
اسے کوئی اہمیت نہ دیتا۔ وہ ایک بریکٹیکل آدمی تھا۔
جذباتیات کے مضمون میں اسے کوئی دلچسپی نہیں
تھی۔

وہ آفس کے لیے نکل ہی رہا تھا جب ڈیڈی نے
اسے بٹھالیا۔

”ہم سب تمہارا رویہ دیکھ رہے ہیں“ وہ کہہ رہے

”یہ ممکن تو اب ساری زندگی کی کہانی ہے۔“ پوچھنے پر وہ سر ہلاتے ہوئے بولا تھا۔
 ”اور اس کہانی کا ولن یقیناً ہماری بھابی ہیں۔“ سلمان شرارت سے مسکرایا۔
 ”بالکل۔“

”ارے ہاں بھابی سے یاد آیا۔ تم دونوں میاں بیوی تو بڑے چھپے رستم نکلے اور زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ تم نے بھی کچھ نہیں بتایا۔“ وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

”بھئی کیا نہیں بتایا؟“ وہ اس کی بات سمجھ نہیں پارہا تھا۔

”آج کا اخبار دیکھا ہماری بھابی کا بڑا زبردست کالم چھپا ہے۔“ عاصم نے جیسے بریکنگ نیوز دی۔ ”بھئی کیا گرفت ہے موضوع پر کیا تجزیہ ہے۔ میں تو یہی سمجھتا رہتا کہ یہ کسی بڑی عمر کے تجزیہ کار اور دانشور کا کالم ہے۔ وہ تو کل شائستہ نے بتایا کہ یہ مشہور کالم نگار

جن کا کالم بیک وقت انگریزی اور اردو اخبار میں چھپتا ہے کوئی اور نہیں ہماری بھابی ہیں زمین جمال بھئی میں تو حیران رہ گیا۔ مجھے تو ہمیشہ سے ان کے کالم بہت پسند رہے ہیں۔ ان کا فیس بک پیج دیکھو گلا کھوں خالو وہ ہیں۔ جو عالی ایڈیٹر پر ان کی رائے کا انتظار کرتے ہیں اسے اہمیت دیتے ہیں۔“

”تو آج تھا ہی انگلش فکٹ کا دن۔“ اس نے اپنے آپ کو بہلایا اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی بیوی کا نام اور کام کیا تھا۔ وہ دوسروں سے سن رہا تھا۔ نکاح کے وقت اس کا اصل نام سنا ہوگا۔ مگر تب وہ ذہنی طور پر وہاں تھا کہاں پھر گھر میں سب اسے مینا ہی کہتے تھے۔ وہ کیسے جان پاتا کہ اس کے گھر میں اس کے ساتھ رہنے والی مینا ہی دراصل مشہور کالم نگار زمین جمال ہے۔ آدمی آدمی رات تک وہ کچھ لکھتی تو ضرور تھی۔ دودھ وہی کا حساب لکھ رہی ہوگی و سائن اس نے ہمیشہ یہی سوچا تھا۔

گھر آنے والے اخبارات کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ جو اکثر اسی کے گھرے میں پائے جاتے۔ اچھا!

خوبیاں رکھتی ہو۔ میں تمہارے سامنے یہ بات کرنا نہیں چاہتا مگر حقیقت یہ ہے کہ تمہاری پاں سے شادی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی میں اپنی اولاد کو نہ ماں دے پایا نہ گھر۔“

ان کے لہجے میں چھتاوا تھا۔ ”پھر میرے بیٹے بھی چمک کے پیچھے ہی بھاگے“ میں انہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نہیں سنا پایا کہ لوگ شادی کے لیے خاندان محسن اور دولت دیکھتے ہیں مگر تم دین دیکھنا ان کی ایسی کوئی تربیت ہی نہیں کی تھی۔ اپنی اور اپنے بیٹوں کی زندگی برباد کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ عورت کا گھر میں رہنا کس قدر ضروری ہے۔ ارے چھوٹی سی کریانے کی دکان تک تو چلتی نہیں جب تک مالک خود نہ بیٹھے تو گھر جہاں نسلوں کی آبیاری ہوتی ہے۔ عورت کے بغیر چل سکتا ہے کیا؟ یہ بات اب تو تمہاری ماں کی سمجھ میں بھی آگئی ہے۔ اسی لیے میں نے جب مینا کو تمہارے لیے منتخب کیا تو اس نے میرا ساتھ دیا۔ کیونکہ وہ بھی بہوؤں سے بہت مایوس تھی۔ جو اپنی ذات میں سے کسی کو کوئی حصہ یا حق دینے کو تیار نہیں۔ پھر تم بھی کسی نہ کسی طرح مان گئے۔ شاید اللہ کو اس خاندان کی حالت زار پر رحم آگیا، بیٹے میں اپنے ہی گھر سے مایوس اور ہارا ہوا انسان ہوں۔“

ان کے لہجے میں عجیب سی تھکاوٹ تھی۔ ”مینا کی صورت میں امید کی ایک کرن چمکی ہے اسے بچھنے نہ دینا۔ اپنی بیوی کی قدر کرو ورنہ تمہارا حال بھی مجھ سے مختلف نہیں ہوگا، کیونکہ اس عمر میں مایوسی اور تنہائی بہت تکلیف دیتی ہے۔“

ڈیڈی خاموش ہو گئے تھے اور وہ بھی کسی سوچ میں گم آفس آگیا تھا۔



آج عاصم کے ساتھ اس کی اہم میٹنگ تھی۔ وہ اس کا بچپن کا دوست بھی تھا اور اب بزنس پارٹنر بھی، مگر وہ بھی آج بہت تھکا ہوا اور بے زار لگ رہا تھا۔ رات اس نے اپنی بیوی کے ساتھ ڈنر اس کے گھر پر ہی کیا تھا۔ تب تو وہ بالکل ٹھیک تھا۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناؤ لزا اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

✓ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

✓ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

”محترمہ اخبار کی دنیا کا ہاٹ کیب تھیں۔“ اور ہاں شائستہ بتا رہی تھی۔ ”عاصم کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ بھابھی کو ایک دو غیر ملکی یونیورسٹیز سے انٹرنیشنل ایشوز پر لیکچرز کی بھی آفر ہے مگر انہوں نے گھریلو مصروفیات کا کہہ کر معذرت کر لی ہے۔“

”گھریلو مصروفیات!“ وہ تکلیف دہ ہنسی ہنسا تھا۔ ”آخری دفعہ تم نے کب سنا کہ میری بیوی یا تمہاری بھابھیوں نے حتیٰ کہ ہماری ماؤں نے گھریلو مصروفیات کی بنا پر اپنی کوئی تفریح چھوڑی ہو؟“ عاصم اس سے پوچھ رہا تھا مگر وہ اپنی ہی سوچ میں گم تھا۔

تو کیا میرے گھر کا انتظام چلانا اور میرے لان میں پھل پھول اگانا اس کے لیے اتنا اہم تھا کہ وہ اس کے لیے کچھ بھی چھوڑ سکتی تھی۔ وہ خود کو بہت عقل مند سمجھتا تھا، شرمندہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ مگر ہو رہا تھا۔



تنازعہ تو دونوں کے درمیان عرصے سے چل رہا تھا مگر نتیجہ طلاق ہو گا یہ کسی نے نہیں سوچا تھا۔ دو واقعات ایک ساتھ ہوئے۔ عدیل بھائی کے ہاں بچے کی پیدائش اور آفرین بھابھی کی ان سے علیحدگی۔ عدیل بھائی کو طلاق اور اپنے بچے کی ماں سے محرومی نے اتنی تکلیف نہیں دی تھی۔ چھٹی اس خبر نے دی کہ آفرین بھابھی کے معاملات بہت عرصے سے اپنے ایک کولیگ کے ساتھ چل رہے تھے۔ وہ بہت پہلے طلاق لے لیتیں مگر بچے کی پیدائش تک انہیں رگنا رہا۔ وہ ماضی کی کوئی نشانی ساتھ نہیں لے جانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے ابھی بھی عدیل بھائی کو اپنے لائق نہیں سمجھا تھا۔ صرف آسانشوں کے حصول کے لیے انہیں استعمال کیا تھا۔

بڑی بھابھی بھی راحیل بھائی کو لے کر اپنے ماں باپ کے گھر شفٹ ہو چکی تھیں کیونکہ وہ قریب تھا کلیننگ سے۔ اپنے گھر کے ہوتے راحیل بھائی گھر واپس جانے سے زندگی پر پہلے ہی ان کا اختیار بہت کم تھا۔

تو وہ بالکل ہی بے بس ہو گئے تھے۔ اوہر عدیل بھائی کی طبیعت اچانک ہی بہت بگڑ گئی تھی۔ انہیں اسپتال شفٹ کرنا پڑا تھا۔ وفا سے خالی عورت اتنا بڑا سانحہ ہو سکتی ہے وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ می ڈیڈی اسپتال میں ہی تھے۔ وہ ابھی ابھی گھر آیا تھا۔ مینا دو تین دفعہ آچکی تھی۔ شاید عدیل بھائی کا پوچھنے یا پھر کھانے کا۔ مگر پھر بغیر کچھ کہے چلی گئی تھی۔ ٹھیک بھی لگا تھا ان کے بچ کچھ کہنے سننے کا تعلق بنا ہی کب تھا اور اب وہ مصروف بھی بہت تھی عدیل بھائی کے بچے کو وہ سنبھال رہی تھی۔

ان کی حالت سلمان کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ گھر بنانے کے لیے ضروری چیز کیا تھی؟ عورت کی محبت، وفا، قربانی یا پھر اس کا گلہ مو، جس عورت کے لیے سیلف گرو منگ سب کچھ ہو۔ وہ خود غرضی کی دلدل میں دھنستی چلی جاتی ہے۔ اپنے لیے ہی جیتی ہے۔ جو کچھ آفرین بھابھی نے کیا اگر یہی کچھ می نے کیا ہوتا یا پھر مینا نے۔

اسے ایک دم سے گلے میں پھندا سا محسوس ہوا تھا۔ وہ اس سے آگے کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ اس کے اندر کی طبیعت اس کے خیالات سے بالکل مختلف نکلی تھی۔ عدیل بھائی جیسا سانحہ اسے اپنے لیے ناقابل برداشت لگ رہا تھا۔ اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر لیا۔ کوئی مار ٹنگ شو ہو سٹ اچھل اچھل کر گھر بھاؤ کرنے کے سارے نئے بتا رہی تھی گھر آباد کرنے کا ایک بھی نہیں۔ اس نے بیزاری سے ٹی وی بند کر دیا۔ کہیں سکون نہیں تھا اس کے اندر ایک جنگ چل رہی تھی۔ ساری زندگی کے پالے پوسے نظریات بدلنا آسان نہیں تھا۔



پچھلا ایک ہفتہ اس پر بھاری گزرا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت تنہا اور کمزور محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنے ابو کو ہی نہیں بلکہ ان کی شکل میں ایک بہترین دوست استاد اور ہیرو کو بھی کھو دیا تھا۔ اچانک ہی ان

کی وفات کی خبر ملی تھی۔
 سلمان اسے لے کر فوراً گاؤں روانہ ہو گیا تھا۔

اس کی آواز پر وہ خیالوں سے باہر آگئی تھی۔ تو اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ ایک اچھا انسان تھا۔ پھر جس طرح ابو کی وفات کے بعد سے اس کے خاندان کے تمام معاملات سنبھال رکھے تھے وہ اس کی احسان مند تھی۔ اس کا مزاج اس کا رویہ بدل رہا تھا۔ اس کا کالم بھی وہ باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ یعنی وہ جان چکا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی اور وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سادگی میں بھی ایک خوب صورتی تھی۔ نہ نجی ہوئی، بھنویں نہ رنگے ہوئے بال، نہ میک اپ، نہ چہرہ اس کی صورت ویسی ہی تھی جیسی اللہ نے بنائی تھی۔

”میں نے تمہیں بہت پریشان کیا تھا اس کے لیے میں پچھتاوا تھا۔“ دراصل میں تمہیں سمجھ نہیں پایا اور

شاید خود کو بھی مگر اب میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم بہت خاص ہو۔ اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی تھی۔ ”تم مجھے وہ سب دے سکتی ہو جس کی مجھے اور میرے گھر کو سخت ضرورت ہے۔ محبت، خلوص، وفا، وہ تم ہی ہو میں جس کے ساتھ خوش رہ سکتا ہوں۔“ ”کیونکہ انگریزی اخبار میں میرا کالم چھپتا ہے؟“ وہ خود کو کہنے سے روک نہ پائی۔

”نہیں زبان دراز لڑکی ایہ سچ نہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں تم سے متاثر ہوں، صرف تم سے۔“ وہ بڑے یقین سے مسکرایا تھا۔ موسم کے ساتھ اس کا لہجہ بھی دلنشین تھا۔ وہ اس کے چہرے کا ایک ایک نقش جیسے دل میں اتار رہا تھا۔ جو آج تک نہیں بتایا تھا وہ سب بتا رہا تھا۔ لیکن مینا کا دل بس اتنا کہہ رہا تھا۔

تمہاری بات لمبی ہے
 مثالیں ہیں
 دلیلیں ہیں
 ہماری بات چھوٹی ہے
 ہمیں تم سے محبت ہے

”مجھے تمہارے ابو کی وفات کا بہت دکھ ہے۔“
 وہ باضابطہ طور پر شاید پہلی بار اس کے سامنے افسوس کر رہا تھا۔ ”میری ان سے ملاقات کم رہی مگر میں جانتا ہوں وہ ایک نہایت قابل اور شکر گزار انسان تھے۔“

ان کی یہ خوبیاں مینا سے بہتر کون جانتا تھا۔ ابو کی بخشش کم تھی اور گھر کا خرچ زیادہ۔ کئی دفعہ سودا سلف اور دوائی میں سے کسی ایک کا فیصلہ کرنا پڑتا تب وہ چپ چاپ جا کر گھر کا سودا سلف لے آتے۔ امی ناراض ہوتیں، وہ اس وقت بہت چھوٹی تھی مگر سب سمجھنے لگی تھی۔

یہی وجہ تھی جب ابو نے اسے پڑھائی کے لیے شہر بھیجنا چاہا تو اس نے انکار کر دیا۔ مالی مسائل میں گھرے بیمار باپ کو چھوڑ کر جانا اس نے پسند نہیں کیا۔ پھر شروع میں اس نے ضرورت کے تحت اخبار میں لکھنا شروع کیا۔ اگرچہ لکھنے کا شوق بھی تھا پھر آہستہ آہستہ اس کا کالم لوگوں کی توجہ حاصل کرنے لگا۔

حالات کو سمجھنے ان کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت کو چمکانے میں ابو نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کا کالم اخبار کی ضرورت بن گیا۔ اس کی آمدنی بڑھتی گئی اور اب جب زندگی کے سفر میں چھاؤں آئی تھی۔ تو چپ چاپ چلے گئے۔





”اول تو رضوان مجھ پہ ایسا وقت آنے نہیں دے گا اور دوم اگر ایسا ہو بھی جائے تو میں بھی چٹنی کو سہارا نہیں بناؤں گی۔ بھوکا رہ لوں گی، مگر چٹنی نہیں کھاؤں گی۔“ اس نے اتنے یقین سے کہا تو اماں اسے دیکھ کر رہ گئیں۔



”ایک بات تو بتاؤ نائلہ۔ چٹنی سے اتنا بھاگتی کیوں لے چٹنی بنا رہی تھیں کہ انہیں پلاؤ پہ بھی چٹنی ڈال کے کھانے کا شوق تھا؟ جس پہ اس نے انہیں دیکھتے ہوئے بھابھی ہنس کر اس سے پوچھنے لگیں۔“

”بھابھی! جب رب تعالیٰ نے اتنی اچھی اور عمدہ نعمتوں سے نوازا رکھا ہو، اتنے عمدہ کھانے دے رکھے ہوں تو یہ چٹنی کھانے کا کیا فائدہ اور مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا آپ لوگوں کو چٹنی اتنی پسند کیوں ہے؟“

”چٹنی دیکھنے اور کھانے میں حقیر سی چیز ہے نائلہ! لیکن اس کے فوائد بہت زیادہ ہیں۔“

”ارے نائلہ پکوڑے بنائے ہیں تو ساتھ چٹنی بھی بنالیتیں اب خالی پکوڑے کھائے جائیں گے بھلا؟“ وہ گرما گرم پکوڑے نکال کر پلیٹ بھر کر ابھی اماں، بھائی اور بھابھی کے سامنے رکھ ہی رہی تھی جب اماں بغیر چٹنی کے پکوڑے دیکھ کر بولے بغیر نہ رہ سکیں۔

”اماں! آپ تو رہنے ہی دو، یہ تازہ پکوڑے ہیں ایسے ہی چٹنا چٹ، فائٹ صاف ہو جائیں گے۔“ اس نے ایک بھاپ نکالتا پکوڑا منہ میں ڈالتے ہوئے گویا تاک سے مکھی اڑائی تو اماں نے بے حد ناگواری سے اسے دیکھا، جب کہ بھابھی نے مسکرا کر کہا۔

”یوں کوئی نہیں چٹنی پسند ہی نہیں۔“

”ہاں۔ ہے تو سچ بات، پھر خواہ مخواہ کا تردد کا ہے کوئی۔“ اس نے ایک اور پکوڑا منہ میں ڈال لیا۔

”عجیب لڑکی ہو تم، لوگ تو چٹنی کے پیچھے بھاگتے ہیں اور تم ہو کے چٹنی سے بھاگتی ہو۔“

”یہ بھی کوئی کھانے والی چیز ہے بھلا۔“

”منہ پھٹ لڑکی! یہ بھی خدا کی نعمت ہے۔“ اماں نے اسے ڈپٹنا چاہا، لیکن جواباً اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھالے۔

”اے اللہ! میرے دشمنوں کو بھی چٹنی کھانا نصیب نہ کرنا۔“

”خدا انخواست۔ کبھی ایسا وقت بھی آن پڑتا ہے جب کھانے کو کچھ نہ ہو تو چٹنی کا سہارا لیتا پڑ جاتا ہے۔ تب پیٹ کو چٹنی سے بڑھ کر کوئی اور چیز بہتر نہیں لگتی۔“

اماں نے اسے حقیقت میں ڈرانا چاہا، بھابھی نے بھی سر ہلا کر ان کی تائید کی تو اس نے دور دور سے نفی میں گردن ہلائی۔

”ہاں۔ پیٹ کا درد ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ہاضمہ درست رہتا ہے۔ کھانے میں ذائقہ آ جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔“ اس نے تیزی سے بھابھی کی بات کو مکمل کیا تو بھابھی ہنس پڑیں، وہ سر جھٹک کر بچن کی کھڑکی سے باہر چھانکنے لگی۔ جہاں رضوان کی بڑی سی گاڑی آکر رکی تھی۔

”رضوان آگئے۔“ اس نے سرگوشی کی۔

”چلو تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ پھر کھانا لگاتے ہیں“ آج تم نے واپس بھی جانا ہے۔“ بھابھی نے فوراً اس کے ہاتھ سے راتنے کا باؤل لے لیا۔

”ہاں۔ رضوان مجھے لینے ہی تو آئے ہیں۔“ وہ

مسکرا کر باہر نکل گئی۔

تب اس لیے نہ بولی کہ گھر کے تمام افراد موجود تھے،
ایسے میں رضوان یقیناً اسے کچھ نہ بتاتا۔

”ارے نائلہ! یہ پلاؤ یہ چٹنی بھی تو ڈالو“ رافعہ نے
بہت مزے کی بنائی ہے۔“

”نہیں بھائی! آپ جانتے ہیں نا چٹنی مجھے کبھی
اچھی نہیں لگتی۔ میں یہ راستا سلاؤ اور سالن ڈال کے
کھاؤں گی۔“

”اوسے میں تو بھول ہی گیا۔ چٹنی سے تو تمہیں
الرجی ہے۔“ بھائی نے ہنس کر چٹنی اماں کی طرف بڑھا
دی۔

”کیا بات ہے رضوان“ آپ آج کل بہت پریشان

”رضوان! کاروبار کیسا جا رہا ہے تمہارا؟“ کھانے
کی میز پر بھائی نے یوں ہی بات بڑھانے کی غرض سے
پوچھا تو رضوان کے چہرے پہ سایہ سا لہرا کر گزر گیا جسے
بھائی نے دیکھ لیا۔

”خیر تو ہے یار! سب ٹھیک ہے نا؟“ بھائی نے فوراً
اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا تو اس نے زبردستی مسکرا کر
اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ہاں سب ٹھیک ہے۔“ اس کے کمزور سے لہجے کو

نائلہ نے بہت بری طرح سے محسوس کیا تھا، لیکن وہ



WWW.PAKSOCIETY.COM

”اس کی؟“
”دیکھیں رضوان! یہ زیور وغیرہ بُرے وقت کے لیے ہوتے ہیں۔ کوئی مشکل وقت آئے۔“

”اس سے بُرا اور مشکل وقت میرے لیے کیا ہوگا؟“ اس نے ترشی سے اس کی بات کاٹ کر پوچھا تو وہ لب کھلنے لگی اور پھر اندر گئی اور آرام سے باقی کا سارا زیور لا کر چُپ چاپ اس کے ہاتھوں پہ رکھ دیا۔ رضوان کی آنکھیں جھک اٹھیں۔

”تم۔ تم بہت اچھی ہونا لگے۔“ رضوان کی محبت عود کر آئی تو اس نے سر جھکا لیا کہ رضوان کو وہ کبھی پریشان نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کی خوشی میں ہی اس کی خوشی اور سکون تھا۔ اس نے ایک بار پھر اسے ڈیل زیور بنانے کا کہا اور زیور اٹھا کر باہر نکل گیا۔

لیکن دن گزرتے گئے۔ رضوان کی پریشانی کم ہونے میں نہ آئی۔ زیور، روپیہ سب لگ گیا اور کاروبار سنبھلنے میں آئی نہ سکا۔ رضوان کی سیاہ پڑتی رنگت دیکھ کر نائلہ کو ہول اٹھتے۔ اس نے اپنی کلائیوں میں سجے دونوں کڑے اتار کر بھی لے دے دیے۔ معاملہ تب بھی نہ سنبھلا تو اس نے اپنے کانوں کو بالیوں سے بھی آزاد کر دیا۔

”شوہر کی خاطر اپنا آپ بھی ہار دو تو کم ہے۔“ اس نے یہ جملہ بہت پہلے پڑھا تھا، لیکن اب جب وہ سب کچھ شوہر پہ ہار رہی جا رہی تھی۔ اب اسے سب سمجھ میں آ رہا تھا۔ مہینے کا آخر چل رہا تھا۔ گھر میں سودا سلف ختم ہوتا جا رہا تھا اور جیسے جیسے سودا ختم ہو رہا تھا۔ اس کی اپنی رنگت بھی رضوان کی طرح سیاہ پڑتی جا رہی تھی۔ شوہر کی طرح اسے بھی اپنے ماں، بھائی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ حالانکہ بارہا جی چاہا تھا ان سے اپنے گھر کے حالات کے بارے میں بات کرے، لیکن انا اور حیا اڑے آ جاتی۔ جیسی تو بات فاقوں تک آگئی۔

رضوان شدید ٹینشن کی وجہ سے بیمار پڑ گیا تو اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ ڈاکٹر نے اسے اچھی خوراک اور اچھا ماحول دینے کا کہا تو وہ چُپ چاپ سر ہلانے

دکھائی دے رہے ہیں۔“ گھر آکر اس نے سب سے پہلی بات یہی پوچھی تو رضوان کو چُپ سی لگ گئی وہ بے چین سی ہو گئی۔

”رضوان! کوئی پر اہلم ہے۔ پلیز مجھے بتائیں۔“ رات جب وہ دیر تک جاگتا رہا تو وہ اس کے پاس آ کھڑی ہوئی وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”کیا بتاؤں یا۔۔۔ ان دنوں کاروبار بہت ڈاؤن جا رہا ہے۔ سست لاس ہو گیا ہے۔“

”تو پھر اب؟ اب کیا ہوگا؟“ وہ اس سے زیادہ پریشان ہوئی۔

”مجھے پیسوں کی بہت ضرورت ہے۔“

”کتنے پیسے؟“

”پانچ“ چھ لاکھ لازمی چاہئیں۔“

”میں اماں بھائی سے بات کروں؟“ اس کے ذہن میں سب سے پہلا خیال اپنے میکے والوں کا ہی آیا۔

”نہیں۔۔۔ میں ادھار نہیں لینا چاہتا۔“ اس نے فوراً منع کیا۔

”تو پھر کیا کریں گے؟“

”تمہارے پاس کتنا زیور ہے؟“ اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا تو نائلہ کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔

”آپ میرا زیور بیچیں گے؟“

”اس کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں اور تم فکر نہ کرو کاروبار جیسے ہی دوبارہ سے چلے گا میں تمہیں اس سے دگنا زیور بنا کر دوں گا۔“ اس نے جیسے اسے ساتھ ہی نئی امید بھی تھمائی چاہی تھی۔ وہ کچھ بول نہ سکی۔



”یہ زیور پورا تو نہیں۔“ دوسرے دن جب وہ اسے زیور کے ڈبے تمہاری تھی وہ ادھا زیور دیکھ کر ٹھنک گیا۔

”ہاں۔۔۔ یہ ادھا زیور ہے، سات تولے میں نے رکھ لیا اور یہ سات تولے ہے۔“ اس نے اقرار کیا تو وہ اسے گھور کر دیکھنے لگا۔

”تم نے کیوں ادھا رکھ لیا۔ تمہیں کیا ضرورت

گئی۔ رضوان سب جانتا تھا۔ جب ہی افسردگی سے مسکرا دیا۔

”تم ٹینشن نہ لو۔ سب بہتر ہو جائے گا۔“ بیڈ کے کراؤن سے سر نکا کر رضوان نے اس کے ساتھ جیسے خود کو بھی حوصلہ دیا تھا۔ وہ سر ہلانے لگی۔

”کچھ کھانے کے لیے ہے“ تو پلیز جلدی سے لے آؤ۔ بعد میں مجھے دوائی بھی لینی ہے۔“ رضوان کی بات پہ وہ جلدی سے سر ہلا کر کچن میں چلی گئی، لیکن کچن میں آکر وہ سوچ میں پڑ گئی کہ سوائے چاولوں کے اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا اور چاول پکانے کے لیے نہ کھی تھا نہ پاز، مرچ، ٹماٹر۔ اک سوچ کے تحت اس نے چاول ابلانے کے لیے رکھ دیے کہ اب اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ چاول ابل گئے تو خالی چاول دیکھ کر اس کا دل بھی خالی ہو گیا کہ صرف ابلے ہوئے چاول کوئی کیسے کھا سکتا ہے۔ سوچ سوچ کر اس کا سر بھٹنے کے قریب ہو گیا تھا کیبنٹ پہ پڑی سوکھے پودینے کی شیشی دیکھ کر اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر اس نے وہ شیشی اٹھائی تو اس میں سوکھا پودینہ دیکھ کر اس کا سانس وہیں بحال ہو گیا۔ (صد شکر، تھوڑا سسی، لیکن پودینہ موجود تھا) ”چٹنی“ اس نے گویا دل سے چٹکی بجائی اور شیشی کو متاع جان کی طرح ہاتھ میں دیو بیچ لیا۔



ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ چٹنی دیکھ کر رضوان کی بھوک جیسے مزید بڑھ گئی تھی اور اس کی اپنی بھی حالت جیسے ایسی ہی تھی۔

”جلدی کرو نائلہ! بہت بھوک لگی ہے۔“ رضوان کے جلدی مچانے پہ اس نے فوراً ”دونوں ہلمٹوں میں چاول نکالے اور اوپر چٹنی اینڈریل دی۔ اور جب چاول منہ میں ڈالے تو چٹنی کے ذائقے نے گویا اس میں نئے سرے سے روح اینڈریل دی ہو۔

”بہت مزے دار ہے یار۔“ رضوان جلدی جلدی کھانے لگا۔ تب باہر گھنٹی ہوئی تو وہ اپنی پلیٹ وہیں

چھوڑ کر دروازہ کھولنے چلی گئی۔ باہر بھائی اور بھابھی تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر کھل اٹھی۔ انہیں اندر لیے چلی آئی تو بھائی بھابھی چاول دیکھ کر خوش سے ہو گئے۔

”واہ بھئی! چاولوں کی طلب تو پہلے سے ہو رہی تھی، کیا پتا تھا آتے ہی مل بھی جائیں گے۔“ بھابھی نے آتے ہی اس کی پلیٹ اٹھا کر چاول کھائے تو ان کی آنکھیں وہیں حیرت سے کھل گئیں۔

”نائلہ! اس میں تو چٹنی۔“ بھابھی کی بات پہ وہ کنفیوز سی ہو گئی اور پھر آہستہ سے سر ہلا دیا۔ ”ہاں اس میں چٹنی ہے۔“

”لیکن تمہیں تو چٹنی کبھی بھی اچھی نہیں لگی اور تمہارے چاولوں میں چٹنی۔“ بھائی بھی حیران تھے۔

”اصل میں چٹنی مجھے اچھی لگتی ہے اور میری خاطر ہی نائلہ بھی چٹنی کھانے لگی ہے۔“ رضوان نے فوراً بات کو سنبھالا۔

”اور میں حیران ہوں کہ چٹنی اتنی بھی مزے دار ہوتی ہے۔“ نائلہ نے کھل کر اظہار کیا تو سب مسکرا دیے۔

”یہ بات ہے تو پھر میں تمہارے لیے پکوڑے لایا ہوں۔“ چٹنی اس لیے نہیں لایا کہ تمہیں پسند نہیں اب خالی کھا سکو تو کھا دو رنہ۔“

”ورنہ کیا۔“ میں ابھی چٹنی بناتی ہوں۔“ اس نے بھائی کے ہاتھ سے پکوڑے لے کر خوشی سے کہا اور بھاگ کر کچن میں چٹنی بنانے چلی گئی۔ پہلے اس نے مجبوری میں چٹنی بنائی تھی اور اب شوق سے اور دونوں بار ہی اسے ذائقہ بہت پسند آیا تھا، لیکن جو چٹنی مجبوری میں بنائی تھی وہ اس کے لیے زیادہ اہمیت کی حامل تھی کہ مشکل وقت میں چٹنی نے اس کا ساتھ دیا تھا اور برے وقت کے ساتھی کو کوئی کیسے بھول سکتا ہے بھلا۔؟



WWW.PAKSOCIETY.COM

صال کے چٹوں

اٹھائے اور اڑ کر اپنی جیتی زہرہ کے پاس پہنچ جائے۔
اس سے جدائی کے لمحات سوچ سوچ کر آواز بھرا جاتی،
آنکھیں پر سنے لگتیں۔

انبالہ سے قصور ہجرت کے وقت ان کا قافلہ دو
حصوں میں بٹ گیا تھا۔ پاکستان آکر کوئی کہیں، کوئی
کہیں پہنچ گیا۔ بہت ملنے کی کوشش کی، لیکن اللہ کو
منظور نہ تھا۔ خاندان کے تقریباً سب لوگوں کا پتا چل
گیا، صرف زہرہ اور اس کی ماں کا کچھ پتا نہ چلا۔ چار
سال بعد کسی نے بتایا وہ بہاول پور کی کسی مندر نما
حویلی میں دیکھی گئی ہیں۔ ماں نے مرنے سے پہلے

رکی ہوئی برسات کی سیلن میں جس بڑھتا جا رہا
تھا۔ وہاں پر موجود جم غفیر نے ٹھٹھن مزید بڑھادی۔
سانولے، گہرے سانولے، گورے، بچے بوڑھے،
جوان عورت مرد سب طرح کے لوگ موجود تھے ایسا
لگتا تھا آج سارا شہر مسافر بنا اڑے پر آرکا ہے۔
ریڑھیاں، ٹھہلے، بے ہنگم آوازیں اور رش اس
رش کو چرتی مختاراں اس کا ہاتھ تھامے تیزی سے
لاری کی سمت بڑھ رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ میں چھوٹی
سی گھڑی اور دوسرے ہاتھ سے گھونگھٹ سنبھالے
پہنچی گئی۔ ماسی مختاراں کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ ایک قدم

مکمل ٹاؤل



Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM

شادی کر دی، زہرہ کے مرنے کا سانس بہت ہی خوب صورت ہے۔

مختار ایں پتالے کروڑوں ڈیڑھائی ڈیڑھائی وہاں تک پہنچی پتا چلا کچھ دن پہلے ہی اس کے سانس کو نوکری مل گئی اور یہاں سے چلے گئے۔ اتنا کسی کے پاس نہیں۔ وقت پندرہ چوبارے چڑھ گیا، لیکن یاد اسی طرح دل کی گلیوں میں بھکتی رہی۔ اب پچھلے مہینے کسی پرانے ملنے والے نے اسے لاہور میں دیکھا تھا۔ پتالا کر مختاراں کو تھمایا۔ اس نے اب کے چلنے سے پہلے خط ڈال کر اپنے آنے کی اطلاع دی، مبادا اب پھر نہ آگے پیچھے ہو جائے۔ خوشی ماسی مختاراں کے چہرے سے پھوٹی تھی وہ بس میں بیٹھی مسلسل زہرہ کا ذکر کرتی رہی۔

”زہرہ کو کھٹی میں نے دی تھی، بچپن سے میرے ساتھ رہی، کھایا، پیا، سوئی۔ بالکل میرے جیسی ہے“

عمر تیرے جیسی ہوگی۔ ”سوار کے سنے ہوئے زہرہ نامہ میں بی بی کو قطعاً“ دلچسپی نہیں تھی وہ بس اتنا سوچتی رہی جب پھڑپھڑے ملتے ہیں تو کیا اتنی ہی خوشی ہوتی ہے، کیا میرا کوئی اپنا ہے، دل مٹھی میں جکڑ گیا۔ آواز آئی۔

”میرا کون ہے۔ میرا بھلا کوئی کیسے ہو سکتا ہے، تنہا تھی، تنہا ہوں۔“ اس کی سوچوں کا ارتکاز ماسی کے ٹھوکے نے توڑا۔ جانے کس وقت اس نے بھنے پنے خریدے، کاغذ کا لفافہ اس کی سمت بڑھاتے کہہ رہی تھی۔

”لے کھالے، بھوک لگی ہوگی۔ میری زہرہ کو چنے بڑے ہی پسند ہیں، میرے ہاتھ کی چاٹ پر جان دیتی تھی۔“ اس نے تھوڑے سے چنے اپنے ہاتھ میں اٹھالیے۔ بھنے ہوئے کالے چنے اور اس کے جھریوں زہرہ سیاہ ہاتھ دونوں ایک سے لگ رہے تھے بھٹی میں اچھل اچھل کر کے پھوڑے۔

”یہ تو تقسیم نے دچھوڑے ڈال دیے، ورنہ اپنوں سے جدائی کا کوئی کیوں سوچے۔“ ماسی پھر شروع ہو گئی۔ جھک جھک کرتی لاری گول، بجری سے بنی کی سلیٹی سڑک پر آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ لاری میں

بیٹھے ہر شخص کی الگ داستان تھی۔ تقریباً ”ڈیڑھ دہائی“ مکمل ہونے کو آگئی، لیکن لوگوں کی جدائی کے قصے ختم ہونے کو نہ آتے۔ جہاں دو لوگ اکٹھے ہوئے، باتوں میں آنسو ڈیرہ ڈال لیتے۔ اڈے پر پہنچتے ہی وہ ہاتھ روک اور بیٹھ گئیں۔ گھوڑا بڑی سڑک پر بھاگتا تنگ گلیوں میں جانے لگا۔ ایک قدرے تنگ گلی کے کنارے پر رکا اور کوچوان بولا۔

”تو بھئی بیٹیوں، آگیا۔“

ماسی اسے پیسے ادا کر، ٹھہری بی بی کو پکڑا اور بے تابی سے گلی میں داخل ہوئی وہ تھکے کشیدہ مسافر کی طرح مرے قدموں سے پیچھے چل رہی تھی ماسی مختاراں کو اپنی زہرہ واقعی مل گئی تھی۔ دونوں بے تابی سے لپٹیں۔ ایک دوسرے کے گل، آنکھیں ہاتھ چومے۔ زہرہ کی سوالیہ نظروں پر خالہ نے ہلکا سا سر ہلا کر اس کا تعارف کرا یا۔ پھر وہ ان دونوں کو اندر پکے کمرے میں لے گئی۔

مسہری پر بٹھایا۔ سرخ سینٹ کا پستکا فرش، دیواروں پر پلستر کے ساتھ روغن بھی چڑھا تھا۔ تین کمروں کا چھوٹا سا صاف ستھرا گھر۔ ضرورت کا بہتر سامان، آسودگی ظاہر کرتا تھا۔ پھر تقریباً ”آٹھ برس“ کا گول مٹول سا بچہ تالی سے ملنے آیا۔ اس کی آنکھیں ہونٹ ملی بی بی کو کہیں دیکھے بھالے لگ رہے تھے۔ اس نے چاہا اس کے پاس بیٹھے وہ اسے غور سے دیکھے محسوس کر کے یاد کرے، عمر وہ بچہ تھا اس کی اکھڑی، گئی پھٹی گہری سیاہ رنگت سے خوف زدہ ہو کر سلام کر کے تالی کے پاس ٹک گیا۔ وہ گردن کو خم دیے تر جھی نظروں سے اسے نکلے جا رہی تھی۔ وہ تالی کے ساتھ جڑا بیٹھا مسلسل پاؤں ہلاتا رہا تھا۔

”آتا بڑا ہو گیا تو، مگر کھوتوں کی طرح کھر بجانے نہ چھوڑے، پاؤں مت ہلایا کر، رشتوں پر نحوست پڑتی ہے۔“ جواباً اس نے فلک شکاف قہقہہ لگایا۔

”اماں! رشتے پاؤں پر بندھے ہیں، جو مل کر گر جائیں گے۔“ بی بی اپنے کانوں کی گونج پر جوئی اس کی سانس سٹھنی اور نظروں کا رخ بدل لیا۔ بچہ ابھی بھی

پاؤں ہلارہا تھا۔ سفید گوری رنگت، بیضوی مسکراتا سا چہرہ، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں پر گھنیری لمبی پلکیں، بھرے بھرے نارنجی ہونٹ، وہ کھڑی ناک کو مزید سمیٹتے جھجائے انداز میں اندر داخل ہوئی۔ وہ تقریباً "پارہ برس کی ہوگی۔ سلور کی ٹرے میں دو گلاس لال شربت کے رکھے سلام کرتے ہوئے ان کے سامنے کیے۔ بی بی اسے دیکھتے ہی اگلا سانس لینا بھول گئی تھی۔

کون ہے یہ، ایسے جیسے بہت عرصے سے جانتی ہو، جیسے ہمیشہ سے اس کے آس پاس رہی ہو، وہی مین نقشہ، مسکراتے ہوئے بائیں رخسار پر گڑھا، آخر اسے کہاں دیکھا، کہاں ملی ہے، کچھ یاد نہ آتا۔

"بی بی اپنی لے لے، ایمان سے بڑی گری ہے۔" ماسی مختار اُن نے اسے متوجہ کیا اور اپنا گلاس ایک سانس میں اٹھا چڑھا گئی۔ وہ ڈکار لے کر دونوں بچوں کو بانوں میں دوپے چٹا پٹ چوم رہی تھی، زہرا بھی

پھوپھی سے لپٹ لپٹ جاتی۔ پائلٹی پر بھی جھجائی لڑکی ایک آدھی نگاہ بی بی پر ڈالتی پھر مسکرا کر سمٹ جاتی۔

وہ بولتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا۔ ان وقتوں میں دن دہاڑے دروازے مقفل کرنے کا رواج نہیں تھا۔ وہ کچھ کتا ہوا سیدھا اندر کی جانب آ رہا تھا۔ شاید اس کے ساتھ بھی کوئی بچہ تھا جسے قائل کرنے لگا۔

"یار ایک تو تو بات نہیں مانتا، ہر بار غلط ضد، جانور ہمیشہ ایک رنگ کا پیارا لگتا ہے، سفید والا کتنا پیارا تھا، وہ کالے والا بھی اچھا تھا۔ پر نہ جی تجھے تو وہ جت کبرا مہمنا پسند آ رہا ہے، مجھے تو وہ گھر میں اچھلتا کودتا ذرا نہیں بھائے گا۔" وہ قریب بڑھتی آواز نہیں تھی کوئی پکھلتا ہوا گرم سیسہ تھا۔ اس کے کانوں میں ٹپکتا گیا۔ بی بی کا وجود گنٹام بے جان چیز کی طرح ساکت ہوا، مسسری میں دھنسا جا رہا تھا۔ دل اس قدر تیز دھڑکا جیسے پھٹ جائے گا اور اس نے چاہا کہ اب یہ پھٹ ہی جائے۔

اس کی آواز پر پھوپھی اور زہرا اٹھیں باہر نکل

گھنٹیں۔ ماسی کے آنے کی انہیں خط کے ذریعے اطلاع تھی۔ وہ خود لپٹے آجاتا اگر پھوپھی خط میں اپنا پتا بھی لکھوا دیتی۔ انہیں پھوپھی کے ملنے کی بہت خوشی اور آنے کا انتظار تھا اور اس وقت ان کی سلام دعا کی آوازیں سے خوشی چھلکتی تھی۔ بی بی نے کسی خیال کے تحت چادر کا پلو قدرے آگے کر لیا اس کی بھاری آواز پر بدن ہولے ہولے لرزا اور کمرے میں داخل ہوتے قدموں کی چاپ پر جسم کے ہر ماسم سے پانی پھوٹ پڑا، ہاتھ پاؤں سب ٹھنڈے ہو گئے، اس نے کپکپاتے ہوئے پیٹھ دروازے کی جانب کمری اور پلو بائیں رخسار پر اچھا خاصا آگے کر لیا۔ وہ اس کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ چوکھٹ بر رک، زہرا کو استفہامیہ نگاہ سے دیکھا۔ جواباً وہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"یہ پھوپھی کی بیٹی ہے۔"

"ہیں۔" اسے حیرت ہوئی۔

"ہاں۔۔۔ بیٹی ہی ہے، اور ان کے ساتھ رہے گی۔" وہ احسرا "کھڑی ہو چکی تھی اس نے اسے

دعوتی وکس کا تھار کردہ

Herbal

سوہنی شامپو

SOHNI SHAMPOO



✽ اس کے استعمال سے چند دنوں میں غلٹی ختم ✽

✽ مگرے ہوئے بالوں کو روکتا ہے ✽

✽ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے ✽

قیمت - 90/- روپے

رہنمائی سے منگوانے پر اور مٹی آرڈر سے منگوانے والے

10 روپے 250/- روپے تین روپے 350/- روپے

اس میں ڈاک خرچ اور پیکیج ہارڈر شامل ہیں۔

بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ

بانی بکس 53، اورنجیہ، مارکیٹ، ماہارے، جناح روڈ، کراچی۔

دفتری خرچے کے لیے:

بکس نمبر 37، 33، 34، 35، 36، 37، 38، 39، 40، 41، 42، 43، 44، 45، 46، 47، 48، 49، 50، 51، 52، 53، 54، 55، 56، 57، 58، 59، 60، 61، 62، 63، 64، 65، 66، 67، 68، 69، 70، 71، 72، 73، 74، 75، 76، 77، 78، 79، 80، 81، 82، 83، 84، 85، 86، 87، 88، 89، 90، 91، 92، 93، 94، 95، 96، 97، 98، 99، 100

32216361 فون نمبر

”بیٹھو بیٹھو“ کہا اور پھوپھی سے سفر کے متعلق پوچھنے لگا۔

”آپ لوگ خیریت سے پہنچ گئے، کوئی پریشانی، تکلیف تو نہیں ہوئی، گھر آسانی سے مل گیا۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے اک ترچھی نگاہ سے اسے دیکھا۔ وہ تقریباً ”پینتیس“ چھتیس سال کا مضبوط جٹھے والا مرد تھا۔ وقت کے ساتھ شخصیت میں مرواگئی اور رعب بڑھ گیا۔ کچھ سرکاری دفاتروں میں اٹھنے بیٹھنے سے سراپے میں مزید نکھار آگیا۔ وہ پھوپھی سے مخاطب تھا اور بی بی ڈری ڈری چورنگاہ سے اس کا سر لپا دیکھ رہی تھی۔ اس کے سوکھے کانٹے ہونٹ دانتوں نے جھنجھک لیے، نگاہ اس کی شہرے تلے والی جوتی پر گڑی رہ گئی۔

”ممبر اپتہ۔ او کہاں ہے تو؟“ وہ کھرے کے پاس بیٹھی تھائی مار مار کپڑے دھو رہی تھی۔ تایا صلاح الدین کی آواز کیسے اس تک آئی۔ اس کا دھیان بار بار بیان کی جانب بھٹکتا تھا۔ اس کی سوجھ بوجھ میں کپڑے دھونے کا لطف ہی الگ تھا۔ اور کپڑے کیا ہر کام ہی۔ اس کی نگاہیں اس کے سارے وجود کو گرا دیتی تھیں۔ ہری چرن نے جب سے ان کے کپڑے دھونے سے انکار کیا تھا، اچھا خاصا مسئلہ بن گیا تھا۔ تائی ثریا کے کندھے جوڑ سردی سے اینٹھ جاتے۔ میرا نے ان کے کندھے دباتے ہوئے نرمی سے کہا۔

”تائی جی! کپڑے ہوتے ہی کتنے ہیں، دو تو جی ہیں۔ تایا اور۔“ وہ لمحہ بھر کی موقعیے کی جلی جیسے چہرے پر زعفرانی سلیہ پڑا۔

”اور اس کے۔ میں دھولیا کروں گی۔“ ہری چرن نے بڑا سا میلا گٹھڑا واپس کیا تھا۔ اس نے کاشنگ سوڈے کا پتلا پتلا سا صابن لکایا، تسلا کھرے میں رکھ، چوکی پر بیٹھ کپڑے دھونے لگی۔ وہ باہر جانے کی عرض سے قریب سے گزرا تھا، اتنا جاڑا، ٹھنڈا پانی، سردی سے اکڑی پٹی پٹی انگلیاں۔ سفید ملائی جلد پر نیلگوں رنگوں کا جال۔ وہ لمحہ بھر ہی دیکھ سکا۔

”ٹھنڈے پانی میں کیوں دھو رہی ہے۔ رک ذرا۔!“ اسے کہہ کر اس نے مٹی کے چولہے میں اور لکڑیاں ڈالیں۔ تانبے کا گاکر اس پر چڑھایا۔ تھوڑی دیر میں پانی کھولنے لگا، تار اس کے قریب رکھ دیا۔ وہ شرمساری سے اسے دیکھتے کہہ رہا تھا۔

”آئندہ زیادہ گندے نہیں کروں گا۔“ لمبی سیاہ پلکوں کا خم دار سلیہ آتشیں گالوں پر کانٹے لگا۔ دھڑکن بے حد تیز۔ اس کے سامنے پہلے تبھی یہ کیفیت نہیں ہوئی تھی۔ بے شک کچھ معمول سے ہٹ کر ضرور ہوتا تھا، مگر ان دو مہینوں میں اس کی نگاہ محسوس ہوتے ہی بدن ہولے ہولے لرزتا۔ لفظ کانپ جاتے وہ بمشکل کہہ پاتی۔

”گندے۔! یہ تو میلے ہی نہیں ہیں۔“ وہ استہزائیہ گرون مار چولہے کی جانب بڑھا۔ جلی لکڑی باہر نکال، نور سے فرش پر ماری۔ ٹوٹے نارنجی انگارے انگھٹشی میں بھر اس کے قریب رکھ باہر نکل گیا تھا۔ اسے دیکھ کر ساگ کی گندیں چھپتی تائی ثریا کے ہونٹ مبہم سے پھیلے تھے۔

”م“ بھی صرف دو بول پڑھائے ہیں تو یہ عالم ہے، جس دن باقاعدہ گھروالی بن جائے گی، پھر جانے کیا کرے گا۔“

”خیر!“ وہ مسکرائیں۔ ان کے لیے اس سے بڑھ کر کیا خوشی تھی کہ وہ خوش ہے۔

”بس جلدی سے وہ دن آجائے کہ اس کا سہرا کٹے، بچوں کا اٹلنا میں شور ہو۔“

پھر جب، جب وہ کپڑے دھوتی وہ معمول کی طرح پانی گرم کر کے اس کے قریب دھر جاتا، ایک طمانیت سی اندر تک بھر جاتی تھی۔ موسم بدل گیا تیل کا پانی ہی اچھا آنے لگا۔ پھر پانی گرم نہ کر تا دو تین بالٹیاں بھر کر کھرے میں رکھ جاتا، لیکن آج وہ جلدی میں تھا، بھول گیا۔ وہ کچھ دیر منتظر رہی پھر پانی بھر کر کپڑے دھونے لگی۔ ہنڈیا بھونتی تائی نے چھیڑا۔

”کچھ دیر انتظار کر لے، ورنہ کپڑے تو دھوئے گی، ٹھنک وہ جائے گا۔“ وہ شرم سے دہری ہو گئی۔ ہر طرف

پیان مچنے لگا۔ اس کی پہچان کیا صلاح الدین کی دوسری تیسری پکار نے توڑی۔

”میرا پتر لائین لادے“ آج ڈسکن لگواتا ہوں۔ اور بھی جو چیزیں ہیں ٹھیک کروانے کی نکال دے“ جلدی کر رہا تھا۔ ”دو مہینے سے لائین کی کمی کا ڈسکن جانے کہاں کر گیا تھا۔ مل کر نہ دیا۔ دو تین بار پیان نے لکڑی کا ڈاٹ اس میں اڑایا، مگر جب تیل ڈالتی پھسنا بھول جاتی۔ ایک دو بار موم جاے کا ٹکڑا رکھ دھاگہ باندھا وہ لپیشنا بھول گئی۔ ایک بار پیان نے ڈنٹا۔

”مگر تیل گر گیا“ آگ لگ جائے گی۔“

”احتیاط تیل کرنے نہیں دیتی۔“

اور واقعی دو مہینے گزر گئے تھے تیل نہیں چھلکا تھا۔ اس نے احتیاط کی تھی۔ بے احتیاطی تو حواس باختگی میں ہوتی ہے۔ آج تیل لانے ڈسکن لانے کا ارادہ کیا۔ وہ چوکی سے اٹھ کر گھڑوئی کے شہتر پر لٹکی لائین لینے آئی تھی۔ گھڑوے کا سرخ اینٹوں کا فرش کھرے کے ایک جانب گھڑوئی پر تین کھرے اور ایک صراحی ہوتی تھی۔ پیان ہمیشہ صراحی کا پانی پیتا تھا۔ ٹھنڈا میٹھا فرحت بخش، لیکن اب وہاں صرف کھرے تھے، صراحی نہیں تھی، کھرے میں تل لگا تھا کھرے برتن دھونے کے لیے گھڑوے کی دیوار کی اینٹوں کی جالی نما تھی۔ جہاں سے اندر تازہ ہوا آتی گھڑولا ٹھنڈا رہتا اور باہر بہت دور دور تک دکھائی بھی دیتا تھا۔ وہ شہتر سے لائین اتار عادتاً ”جالی کے قریب آگئی۔ ملل کا قیوڑی چنا دوہٹا، پلو دانتوں میں دیا، کلی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں سوراخ میں ٹک گئیں۔ مٹی کا صاف چمیل میدان، پھر کچی سڑک جس کے دونوں اطراف دور دور تک لہلہاتے کھلیان، کسی وقت میں وہ ساڑھے آٹھ قلعے کے کھلیان ان کے تھے پھر موہن گیتا ان پر قابض ہو گیا۔ جعلی کلیم بنوا لیے لڑائی جھگڑا، پنچایت اکٹھی ہوئی۔ ٹھاکروں، راٹھوروں، پنڈت کے علاوہ صلاح الدین قضا الدین نے مولوی نظام کو بھی شعلیا، مگر گیتا نے حمایتی اکثریت کی وجہ سے انہیں دبا لیا۔ اس وقت

ان کا ساتھ صرف ایک رند اور سگہ نے دیا تھا۔ ایک تو وہ پرہیزی تھا دوسرا دوست۔ اس کی نیت تو اللہ جانتا تھا، مگر بظاہر گیتا پر چڑھ چڑھ جاتا۔ بے شک وہ اپنی زمینیں گیتا سے چھڑوانہ سکے، مگر رند اور نے حمایت کر کے دل میں خوب جگہ بنالی تھی۔ پھر اسی نے مشورہ دیا۔

”یار صلاح چھوڑاے“ جو چند قلعے تیرے پاس رہ گئے ہیں، اسی سے اناج روٹی کھالو، قتل غسائیں گیار کھا ہے۔“ تنا چاہتے ہوئے بھی اس کی بات دل کو لگی۔ اب اس چمیل میدان کی اوطاق سے ملحقہ دو قلعے کا کھلیان ان کا تھا۔ لہلہاتی فصل میں اس کے گھروے ٹاپوں کی آواز اپنے دل کی دھک دھک پر حاوی ہوتی چہرہ سرخ کر رہی تھی۔ اس آواز میں عجیب سرور تھا۔ جب وہ گیارہ بارہ برس کی تھی وہ سفید ٹو بھگتا لالتا۔ وہ اور اس کا دوست امرت سگہ، امرت کا پھوپھی زوار حیت سگہ۔ تینوں قہقہے لگاتے، سرپٹ ٹو بھگاتے۔ اب، تیار صلاح الدین اور امرت کا پاپ رند اور سگہ اوطاق میں لگے بوکے درختوں کے نیچے چار پائیاں بچھائے اپنے اپنے حقے کی گڑ گڑا ہٹ میں ان کی حرکتوں پر ہنستے۔ ارجیت ان میں بڑا اور اسکول جانے لگا تھا۔ وہ انہیں اسکول کے قصے سناتا، سرکنڈوں کی عینک لگا، منہ بگاڑ بھاری آواز میں ماسٹر کی نقل اتارتا۔ ان دونوں کے کان پکڑ کر پٹائی شروع اور وہ آگے آگے بھاگتے پھر دھولی ہری چرن کی گھاٹ سے اس کا گدھا کھول لے جاتے اور سارے گاؤں میں بھگاتے۔ ہری چرن پتھر شاخیں چھڑیاں، ان پر اچھالتا، گالیاں بکتا ان کے پیچھے پیچھے بھاگتا۔ شرارت کا سرور ایسا تھا۔ اس کے پاس سے ہوا کی طرح گدھا اڑا لے جاتے جب قابو نہ آتے تو وہ ان کے باپوں کے پاس رونے دھونے لگتا۔

”ہری بابا تم بیٹھو ادھر۔“ قضا الدین نے پیر سمیٹتے جگہ بنالی۔

”بھی آنے دو کینوں کو، مرغابا کرا ایک ایک کی خبر لوں گا، گھاٹ پر تمہارے ساتھ کھرے بھی دھلو! میں گے۔“

”نہیں، نہیں، صاراں ج۔“ وہ ہچکچاتا، ظاہر ہے،

ہچکچاتا ہوا تھا۔ صلاح الدین، ضیا الدین دونوں بھائیوں کے مستقل کپڑے تو دھو رہا تھا مگر وہ اجرت کے علاوہ فصل سے کچھ حصہ جامن، آم کا پھل اور جب کپڑے لینے دینے آتا تو کھانا پینا بھی۔ اور ہاں اس کا گدھا اکثر ان کے گھیتوں میں چرتا بھی تھا۔ لالچ سے عاری دل، سادہ لوح، سادہ زبان، مذہب فرقہ اگر نہ چھیڑو تو آبادی میں خاصی یک جہتی تھی اس وقت۔ اسی لیے وہ کیسج جاتا۔

”بچے ہیں مہاراج، عقل آتے سے آجائے گی“ بس اتنا سمجھا دینا، میرا کٹھن کچڑ میں نہ پھینکا کریں۔“ وہ گدھے پر رکھا سالانہ بنا دیکھے پھینک کر بھاگ جاتے۔ ”ضرور ضرور ضیا الدین گردن ہلاتے دھیمسا مسکراتے کچھ عرصے بعد ضیا الدین کی گھوڑی نے جڑواں بچے دیے تھے۔ گھوڑی تو ضرورت پڑنے پر بیچ دی، مگر وہ بچے امرت اور بیان کو دیتے وقت گماتھا۔

”ایک تیرا اور دو سرتیرا کھلاؤ، پلاؤ جب تمہارا وزن اٹھانے کے قابل ہو جائیں تو اپنا اپنا لے جانا۔“ امرت کو ہمیشہ اچھی چیز پسند آتی تھی۔ سفید اور بھورے صحت مند کو دیکھ کر فوراً ہاتھ رکھا۔

”چاچا، یہ چتکبو امیرا۔“

”ہاں ہاں تم لے جانا۔“ ضیا مسکرائے۔

”اور یہ میرا چاچا جی۔“ بیان کو چتکبوی چیریں ویسے ہی ناپسند تھیں۔ اس نے سفید بادلوں جیسے دبلے پتلے بچے کے ماتھے کو چھوا۔

”ٹھیک ہے، لیکن وعدہ کرو اب ہری چرن کے گدھے کو تنگ نہیں کرو گے۔“

”ٹھیک ہے چاچا جی۔“ دونوں بیک زبان بولے۔

انہیں اب نیا مشغلہ مل گیا۔ امرت اپنے ساتھ ارجیت کو بھی لے آئے۔ پہلے تینوں کھیتوں سے چارہ اکٹھا کرتے، بیان بوتلوں میں دودھ بھر لاتا اور گھاٹ کے پاس بنی لمبی سے ٹانڈ میں چارہ ڈال، زبردستی ان کے منہ میں دودھ ٹھونکتے، اماؤں سے مندی گھلواتے، ان پر چاند تارے پڑتے، بیان کا گھرو، امرت کا شیرو۔ ”یارا“ امرت اپنے چھوٹے سے سر پر پٹری

درست کرتے ہوئے فکر مندی سے بولا۔ ”شیرو، ست ہوتا جا رہا ہے۔“

”مگر ہر وقت کھلاتے رہو گے تو ست ہو کر اوٹھتا ہی رہے گا۔“ ضیا الدین ان کے گھوٹوں کے لیے گھنٹیاں اور ہٹیل کے جھانچر بنوالائے تھے مگر وہ دور جائیں تو آواز سے پہچانے جائیں۔ انہوں نے جھانچریں، گھنٹیاں انہیں پکڑا دیں۔ وہ شیرو کو جھانچر باندھتے مسلسل گھرو کو تک رہا تھا۔

”نہیں نے جلدی میں غلطی کر دی، مجھے چاچا سے سمجھو لینا چاہیے تھا۔“ وہ دن میں کئی بار یہی سوچتا۔ گھرو تھا بھی ایسا، جتنا پیدائش کے وقت کمزور تھا اب دن بدن اتنا ہی طاقت ور و توانا ہوتا جاتا تھا اور جب انہوں نے اس پر سواری شروع کی اس کی رفتار ٹاپوں کی آواز شیرو سے کہیں زیادہ۔

جاڑے کا موسم تھا، سرشام ہی آسمان پر سیاہی پھیلنے لگتی۔ ان وقتوں میں دھند کا راج نہیں تھا البتہ سردی کڑا کے دار پڑتی تھی۔ وہ دونوں اپنے گرد لال، پیلی، اولی شالیں لپیٹے ٹاٹ کے ٹکڑے پر بیٹھتے۔

امرت، بیان کی گھوڑا ریس دیکھنے میں محو تھیں۔ وہ گھوڑے سرٹ بھگاتے کھیت سے آگے نہر، لیکر کے جھاٹوں کو پار کر ہری چرن کی گھاٹ تک کئی چکر لگا آئے۔ بھی شیرو آگے، بھی گھرو گھر کے قریب آتے ہوئے شیرو کا پاؤں پٹ کر پھسل گیا، مگر بچت ہو گئی۔ امرت اچھل کر پیچے اترا۔ بیان نے بھی طنائیں کھینچ لیں۔

”بچوٹ تو نہیں لگی؟“ اس کے استفسار پر امرت تیوری چڑھائے بولا۔

”ضیا چاچا نے اچھا گھوڑا تجھے دیا ہے، تب ہی ہر بار تو جیت جاتا ہے۔“ اس کی بے جا خفگی بیان نے قہقہے میں اڑائی۔ سستی جھلا کر بولی تھی۔

”مرت، ہار کر تو ایسے نہ کہا کر، جھوٹے شیرو تو نے اپنی مرضی سے پسند کیا تھا، اب بیان کی طرح بھگا نہیں سکتا تو شیرو کا کیا قصور۔“ دوست کے لیے بہن کی حمایت اس کے اندر کڑواہٹ گھول گئی۔ تنگ سے

پہلے ہی بھڑکتا تھا۔ چلا کر دلا۔
 ”تو یہاں کیا کر رہی ہے، دفعہ دو گھر۔“ وہ ایک ہاتھ سے شیرو کی مٹائیں پکڑے دوسرے سے سستی کی نازک کلائی دبوچے لے جا رہا تھا اس کے شور مچانے کے باوجود اسے گھینٹا گھر تک لے گیا۔ بیان کی ہانک۔ ”یار آرام سے بہن ہے تیری۔“ پھر بھی اسے فرق نہیں پڑا تھا۔ اب وہاں صرف مبرا کھڑی بیان کو دیکھ رہی تھی۔

”تہی سردی میں تم دونوں روز روز کیوں آجاتی ہو؟ بیمار ہو جاؤ گی۔“ وہ جواباً ”صرف سٹائش لہجے میں بولی۔“

”تیری دوڑ دیکھنے۔“
 ”جیسے سردی لگ جائے گی۔ مبرا چل بیٹھ اس پر گھر لے چلوں۔“ یہی وہ لمحہ تھا جس کا اسے انتظار رہتا تھا۔ وہ اپنا گھوڑا بھاگاتا لاتا۔ وہ اور سستی رسہ گیند پٹے اشاپو، کھکلی ہر کھیل چھوڑ اس کی راہ میں کھڑی ہو جاتیں کہ اب اس کی واپسی کا وقت ہے۔ وہ اپنے گھوڑے پر اسے بٹھائے گا، گھوڑے کی لگام پکڑ کر گھر تک آگے آگے چلے گا اور اسے اپنا آپ کسی مہارانی کی طرح لگتا تھا۔ سستی حسرت سے دیکھ کر کہتی۔
 ”کاش! وہ کبھی مجھے بھی بٹھائے۔“

صلاح الدین کے اکلوتے بیٹے بیان الدین کی رندا وہ سنگھ کے بیٹے امرت سنگھ سے بچپن سے ایسی یاری تھی جیسے صلاح الدین اور رندا کی۔ ہم عمر، سطلے دار، بیٹوں کا پرانا میل ملاپ، دکھ سکھ، عید تہوار میں خاندان برادری کی طرح شرکت کی جاتی۔ اپنے مذہبی اقدار و روایات کا پاس اپنی جگہ برقرار تھا۔ مگر دلوں میں اتنی وسعت ضرور تھی کہ حق ہمسائیگی، انسانیت کے ناطے اک دو جے سے اپنے مسائل پر تبادلاً خیال کرتے۔ بس آپس میں رشتے ٹاتے نہیں گندھے تھے باقی کوئی پابندی کا تصور نہیں تھا۔ ہندو خاندان سے اٹھ بیٹھ ضرور تھی مگر سنگھ برادری اپنے معاملات گرم جوشی سے نبھا رہی تھی، یہی چیز اگلی نسل میں منتقل ہو گئی۔ امرت کی چھوٹی بہن سستی ضیاء الدین کی بیٹی مبرا کی بی ہم جولی تھی۔ راج گری کیوں میں ان کا بچپن اکٹھے

کھیلتے کودتے گزرتا، جوانی میں وہ خود ان کے گھر آنے کے بہانے ڈھونڈتی، کبھی سلائی کڑھائی، سینے پروانے کے بہانے، کبھی کوئی نیا پکوان تائی ثریا سے چیکنے، امرت اور بیان سارا دن گلیوں، کھیتوں میں پھرتے، اکٹھے اسکول آتے جاتے، صرف مسجد گروارے کے اوقات الگ الگ تھے، بچپن کے یار آنے وقت کے ساتھ لڑکپن تک جگری دوستی میں بدل گئے۔ بیان خلوص میں خوب آگے تھا۔ بچپن میں میر، جامن، مانے کچھ بھی کھیتوں سے توڑنا سب سے پہلے ار حیت کی جانب بھاگتا تھا۔ کچھ بڑے ہوئے، کبڈی، کشتی، میلوں میں ایک دو جے بنا شرکت تو کیا کرنی، غلیل یا لبا کی بندوق سے چڑے، شیر شکار کرنا، سب سے پہلے ان کا خیال آتا تھا۔



روشنی جامن کے دیر ختوں سے پھسل کر سارے کچے مچن میں رقصاں تھی، کالی چڑیاں، بلبل، گولیس نئی لپائی کیے مٹی کے فرش سے تنگے جن جن کر لے جا رہی تھیں۔ وہ ایک تھیلے میں بہت سے شیر ڈالے تیزی سے اندر داخل ہوا۔ وہ لال چارپائی پر بیٹھی بستر کی چادر پر رنکین نیل بوٹے کاڑھ رہی تھی۔ دونوں گھر ساتھ ساتھ جڑے تھے، درمیانی دیوار برائے نام تھی چھلانگ مار دیوار اک چھوٹا سادہ روناہ بھی تھا جو ہر وقت کھلا رہتا۔ زینب (مبرا کی ماں) کی وفات کے وقت مبرا بمشکل آٹھ برس کی تھی، ماں کو یاد کر کے ہر وقت روتی، ثریا ایک بل بھی اسے خود سے دور نہ کرتیں، لپٹا لپٹا کہہ پیار کرتیں، رات کو ضیاء الدین کھیتوں سے پلٹتے، کھانا کھا کر اس کی انگلی پکڑ کر گھر لے جاتے۔ وہ چارپائیاں ساتھ جوڑا سے تھک کر سلا دیتے، جیسے جیسے بڑی ہوتی چارپائیوں میں فاصلہ بڑھتا گیا لیکن سویرے اٹھ کر تائی ثریا کے ساتھ ناشتا اور پھر سارا دن ادھر۔ ناظرہ، سلائی کڑھائی، کھانا پکانا سب تائی نے سکھایا تھا۔ سب سے پہلے ابا اور تائیا کے بستر کاڑھے تھے، بیان نے وہاں شکوہ اپنے لیے کیا تو اب اسی کی چادر بن رہی تھی۔ یوں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



اچانک اس کے آنے اور قریب سے گزر کر چھی نگاہ ڈالنے پر وہ جزبہ ہوئی اور سوئی پور میں۔ ”اچھ“ اس کے آگے بڑھتے قدم رکے پلٹ آیا۔

زیادہ تو نہیں لگی؟ انگلی دانتوں میں دابے نفی میں سر ہلارہی تھی۔ اس نے پل بھر دکھا پھر تھپلا اس کے قریب رکھ دیا۔

”جب اٹھو تو یہ تنور میں بھون دینا! شام کو امرت“ ارجیت کی دعوت ہے۔ ”وہ تھیلے کو تکتی ذرا توقف سے بولی۔

”تو امرت ارجیت سے ذرا فاصلہ رکھا کر۔“

”کیوں؟“ اسے اچنبھا ہوا تھا۔

”پتا نہیں۔“ اس نے کندھے اچکا کے خفت بھرے انداز میں کہا۔

”وہ دونوں بہت عجیب ہوتے جا رہے ہیں“ انہیں دیکھ کر میرا دل ڈرتا ہے۔ بس اب تجھے ان سے دور ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

”پاگل۔! اس نے گردن تھمائی۔“ اس کی بہن“ تو تیری بڑی بچی سیلی بنی پھرتی ہے“ اس سے ڈر نہیں لگتا؟“

”سستی اس جیسی نہیں ہے۔“ اس کی بر جستگی پر وہ ٹوکتے ہوئے کہنے لگا تھا۔

”حالانکہ مجھے وہ لگتی ہے“ آدمی نہیں پوری پاگل۔“ وہ بچہ نہیں تھا کہ خود پر جی اس کی حسرت بھری نگاہیں محسوس نہ کرتا لیکن جگری دوست کی بہن اور مبرا کی سیلی ہونے کے سبب درگزر کر کے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ امرت ارجیت کے حوالے سے مبرا کے بے جا خدشے پر اس نے قہقہہ لگایا اور اندرونی کمروں کی جانب بڑھا جاتے جاتے اسے ”ریشان نہ ہوا کر“ کی تنبیہ کی اور اچھا پکانے کی یاد دلائی گرائی۔

تائی ثریا مؤذن کی آواز پر باہر نکلی تھیں بیان کی فرمائش سنتے ہی گھور کر بولیں۔

”پہلے اسے نماز پڑھ لینے دے۔“

”اُم! ابھی تو اذان ہوئی ہے، گھنٹے دو گھنٹے تک وقت ہوتا ہے۔“

”بوقت نہیں ہوتا۔ مہلت ہوتی ہے۔“

اس کی حجت پر ان کی تیوری چڑھ گئی تھی ”کبھی مسجد میں اذان کے گھنٹے دو گھنٹے بعد جماعت ہونی دیکھی کہ چلو بھیا ابھی وقت رہتا ہے“ اذان ہوتے ہی جماعت کھڑی ہوتی ہے، دیر تک مہلت تو اللہ نے اس لیے دی ہے کہ کسی مجبوری کی وجہ سے اس کے بندے کی نماز قضا نہ ہو بلکہ کچھ ٹھہر کر وقت ملے تو بندہ ادا کر لے، اولین وقت کی نماز اول ہوتی ہے۔ اور تیری کون سی مجبوری ہے سکھوں کی دعوت؟“ ان کے غصے کو وہ ناک چڑھائے سن رہا تھا۔ اور وہ اس کی خفگی کے سبب بے چارگی سے منہ ہٹائے کہنے لگی۔

”جلدی سے پڑھ کر ابھی بھون دلوں گی۔“ وہ مسکرا کر اندر جانے لگا کہ ثریا کی آواز نے قدم روک دیے۔

”ندر کہاں جا رہا ہے؟ باہر نکل مسجد جا۔“ وہ اپنی گردن کھجا کر خجالت دور کرنا باہر کی جانب بڑھا تھا اور وہ گھڑوے کی اینٹوں سے بنی جالی میں اس کا ٹھم ہوتا سر پانگے لگی۔ دل رک رک کر دھڑکتا تھا۔ کچھ تھا جو غلط ہونے جا رہا تھا۔ ہر وقت ایک بے چینی رہنے لگی اب پہلے والے حالات نہیں رہے تھے۔ بچپن کا سلون، پھاگن بیت چکا تھا۔ جوالی کا جیٹھ، اسارہ چڑھتا آ رہا تھا۔

تعلقات، بچپن کی محبتوں پر ناپیدہ اوس دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ ٹھنوں میں پر سوں سے چلتی شورش زور پکڑتی گاؤں تک پہنچ چکی تھی۔ اس شورش کا سر پیر، مقصد کچھ واضح نہ ہو پاتا تھا۔ حکومتیں تو بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں۔ مگر دیس، ملک کب بنتے یا ٹوٹتے دیکھے؟؟

پہلے پہل فرنگیوں کی آمد و رفت گاؤں میں جیسی ہوتی رہتی تھی، کبھی اکیلے آتے تو کبھی چھوٹی سی جیب نما مٹم پر ایک دو گوریاں بھی ساتھ بیٹھی ہوتیں۔ پھر وقت کے ساتھ ان کی آمد بڑھنے لگی۔ شورش بڑھنے پر جب کوئی نیا افسریا وائے سرائے آتا تو ٹھاکروں کے راج مگر کا چکر لازمی لگاتا تھا۔

کالے سیاہ قیمتی گھوڑوں کی ٹاپوں میں اس کی سفید

ضرورتاً مگر اس بار بوری لینے سے صاف انکار کر دیا۔

”ہماری پہلی ہی ختم نہیں ہوئی۔“

ضیاء الدین کو بہت حیرانی ہوئی کیا دلوں میں تیریں (دراڑ) آئی شروع ہو گئیں؟ ان کے دل بدن نے تلے بوئے لب و لہجے بتانے کو کافی تھے، تقسیم کا عمل دور نہیں برصغیر پر انگریز تسلط وہاں کے باشندوں نے بھی قبول نہیں کیا تھا۔ راٹھوروں، ٹھاکروں نے دو تین بار زوردار لڑائیاں بھی کیں۔ چھوٹی موٹی جنگیں، تحریکیں شروع ہوئیں پھر بنا مضبوط سرپرستی کے دم توڑ دیتیں۔ لیکن پہلی عالمی جنگ کے بعد علی برادران کی تحریک

خلافت نے خوب زور پکڑا۔ اس علاقے کی کمزور، ڈرپوک قوم اس تحریک کے پھلنے سے خوف زدہ تھی۔ اس علاقے پر صدیوں مسلمان حکومت کر چکے تھے اور اگر پونی صدی کا فرنگی تسلط جاتے جاتے سارا علاقہ پھر سے انہیں حکومت سونپ گئی تو ان کی قوم تو پھر سپاہی رہے گی اسی خدشے کے پیش نظر اندرون خانہ سازشوں، فریب کاریوں کا جال بچھایا گیا اور شدھی تحریک کا آغاز ہوا۔

اس تحریک میں اسلامی بنیادوں کو بدعت کے ذریعے ہندوانہ مذہب کی طرف راغب کرنے کی از حد کوشش کی گئی۔ لیکن عالم دین نے شدھی تحریک کو سنگٹھن تحریک کے ذریعے دیایا۔ یہ تحریکیں مخصوص علاقوں میں کام کرتیں اور ان ہی لوگوں کو متاثر کر رہی تھیں لیکن جب علی گڑھ کالج کے فارغ التحصیل طلباء نے باقاعدہ گاؤں گاؤں، قریہ قریہ جاکر تصور پاکستان اجاگر کیا تو لوگوں میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی تھی۔ قوموں کے نظریات، اہمیت سامنے آئی۔ اور ان ہی دنوں الہ آباد میں ایک اجلاس ہوا اور باشعور افراد نے قرار داد پیش کی۔ وہ کچھ عرصے میں منظور بھی ہو گئی۔ اس کی منظوری پر ایک تعمیر یادگار ہوئی جہاں پر خوشی میں بہت بڑا جلسہ بھی ہوا تھا۔ اس جلسے میں شرکت کے لیے صلاح الدین، ضیاء الدین اپنے چند مسلمان دوستوں کے ساتھ لاہور گئے تھے۔ انے حقوق کے لیے کھڑے ہونا، اپنے عقائد و نظریات کے

ثم ٹم چلتی۔ جنگ گلیوں میں رتھ کے گرد سفید جال لگا کر اس کی میم کو سیر کروائی جاتی۔ درختوں، باغوں سے اچھا پھل توڑ کر خدمت میں پیش کیا جاتا۔ اور وہ گلابی، نیلی، سفید جالی دار لمبی لمبی میکسی پنے سر پر برطانوی گول ہیٹ سجائے، سچے موتیوں کی جھولتی مالا پنے مسکرا مسکرا کر گاؤں اور گاؤں کی آبادی کو دیکھتی۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ سب پر ان کی اصلیت کھلنے لگی۔ تو ان کی مسکن کراہت زندہ لگتی۔ ان کی چمکتی نیلی، سبز آنکھوں میں ہوس جھانکتی تھی۔ جو ہر کسی کو محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اور شاید ٹھاکروں، راٹھوروں کو تو محسوس نہ ہوتی تھی۔

اور وہی ان کے گرد زیادہ دکھائی دیتے تھے۔ ہاتھ جوڑے، کانپتے، مہاراج، مہاراج کرتے۔ ان کی خوشامدیں کرتے۔ ہری چرن کی گھاٹ سے خاصے فاصلے پر ریسٹ ہاؤس تھا۔ جب کوئی اپنی میم کے ساتھ آتا تو ایک آدھ دن وہاں قیام و طعام ہوتا اور گاؤں کے تمام حالات سے آگاہی کے لیے ہری چرن ساتھ ساتھ۔ کبھی پہلے وہ چھوٹی چھوٹی ضرورتوں، خواہشوں کے لیے اکثر صلاح، ضیاء کے پاس بھاگا آتا تھا لیکن 1940ء کے بعد اس کے چکر کم اور پھر بہت کم ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ کچھ عرصے بعد اس نے ان کے کپڑے دھونے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اور امرت کا باپ بھی اب پہلے کی طرح اوطاق میں بیٹھا اونگھتا نہیں تھا، وقت کے ساتھ ان کے مزاج میں برہمی نمایاں ہونے لگی اور پچھلے مہینے نئی فصل آنے پر ضیاء نے گندم کی بوری اس کی طرف بھجوائی جیسے ہر نئی فصل آنے پر بھجواتے تھے۔ اگر کبھی بھول چوک سے رہ جاتی تو پچھوٹا سا امرت شکوہ کرنے لگتا۔

”چاچا! آپ کی مونگ تو اس بار بہت اچھی ہوئی ہے، مگر آپ کا بھتیجا ابھی تک مونگ کی پنہوں کو ترس رہا ہے۔“ وہ قہقہہ لگا کر ایک دھپ لگاتے۔

”تیری بوری اوطاق میں رکھی ہے اپنے شیر پر اٹھا کر لے جا، اور پنیاں میرے لیے بھی لانا۔“ پنیاں تو جانے کبھی لایا تھا یا نہیں مگر ہر طرح کی فصل میں حصہ

مگر خاصی دیر خاموش رہا تھا۔ اب اتنی سی خفگی پر کیسے
گمان ہوا کہ سیاسی جغرافیائی تبدیلی سے دوستی بے
اعتبار ہو سکتی ہے۔

وہ بھنے بیٹیوں کی دعوت دینے امرت کی طرف گیا تھا۔ وہ گھر کے بیرونی احاطے میں رنداؤہ کے لیے حقہ کی چلم بھرتے بے اعتنائی سے بولا۔

”میرا پیٹ خراب ہے۔ مجھے نہیں کھانے

”کیا ہوا؟“ وہ اس کے کندھے پر دھب لگاتے چارپائی پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ”کل تک تو تو ٹھیک تھ۔“

”لمحے میں دنیا بدل جاتی ہے بیان‘ تو کل کی بات کر رہا ہے۔“ چلم میں اٹکارے ابھی دھکے نہیں تھے سلتے دھواں چھوڑ رہے تھے۔ بیان آنکھیں سکیڑ رہے مسکرا دیا۔

”زیادہ فلسفی نہ بن، چل حکیم شکورے کا چورن لے آتے ہیں۔“

”میں نے کہا تھا، مجھے نہیں کہیں جانا تو اب جا۔“
وہ درستی سے کہہ، چلم اٹھا اندر کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اس وقت بیان کو اپنا آپ وہاں بے وقعت لگا تھا۔
گھر کے بیرونی حصوں، صحن تک میں ان دونوں کا آنا جانا اک عام سی بات تھی۔ اور بیان تو بہت کم اس کی طرف آتا تھا۔ اکثر وہ ہی ان کے احاطے میں آ جاتا تھا۔
لیکن جب بھی بیان اس کی طرف آیا، وہ ایسے کبھی اٹھ کر نہیں گیا تھا۔ کوئی چیز اندرونی یا منگوانی ہو تو کسی کو آواز دے دیتا تھا مگر اب اس طرح اٹھ کر چلے جانا واضح اعلان تھا کہ وہ وہاں سے چلا جائے۔ وہ کچھ دیر متذبذب سا کھڑا دیکھتا رہا، پھر نگاہ اندرونی کمروں کے درتے پر کھڑی سستی پر گئی۔ وہ ہمیشہ کی طرف مسکراہٹ سجائے اسے دیکھنے میں محو تھی۔ اس نے تلخ نگاہ اس پر ڈالی اور واپس مڑا۔ اک الجھن نے آکھیرا۔

۲۔ مرت نے ایسے کیوں کہا؟ ہو سکتا ہے اس کی طبیعت واقعی خراب ہو یا پھر چاچا رندانہ نے کچھ کہا ہو۔ ابابھی تو ہر وقت فاصلہ فاصلہ کی رٹ لگائے رکھتا

ساتھ پر امن زندگی گزارنا اپنی نسلوں کی بقا تھا گناہ نہیں۔ یہ کوئی جیت یا اعلان جنگ نہیں تھا جو وہ اپنے رائے اور عقائد کے لیے لڑ رہے تھے۔ بلکہ یہ ان کے بھی فائدے کی بات تھی۔ وہ اپنے نظریات و عقائد کے مطابق اپنے خطے میں زندگی گزار رہے تھے۔ فسادات سے پاک پر امن خطہ بن جائے لیکن نسلوں سے چلتی تعلق داری، دوستی، محبت، آپس کا میل ملاپ ان کی ایک شرکت نے کنارے لگا دیا۔ رند اوہ سنگھ نے تب سے اوطاق میں آنا چھوڑ دیا۔ ملاقات پر لہجے میں واضح برہمی چھلکنے لگی اور تو اور اب موہن گیتا اور اس کی اولاد سے خوب راہ و رسم پر بھالی مہتی - ضیاء الدین، صلاح الدین کو اس بات کا دلی دکھ تھا۔ اسی رنج پر صلاح الدین نے بیان کو ان سے محتاط رہنے کا کہا تھا مگر اس کے نزدیک بچپن کی دوستی بڑی مقدس چیز تھی۔

”ابا! بچپن کی یادیں بے اعتبار نہیں ہوتیں تیرا وہم ہے۔ مجھے امرت سے کوئی خطرہ نہیں۔“

ہمارے کڑیل جوان ہوتے پیمان کی سوچ اس کی صاف رنگت چمکی پیشانی جیسی تھی۔ اٹھارہ سالہ پیمان جو بیس پچیس سالہ مضبوط جسم والا نوجوان لگتا تھا۔ صاف ستھرا ماحول خالص غذا۔ فکر سے آزاد زندگی جو ایک بار دیکھ لیتا نگاہوں میں ستائش ابھرتی تھی، عقل و فہانت میں بھی سب دوستوں سے آگے، گھر سواری، نیزہ بازی کے کتنے مقابلے جیت رکھے تھے مگر امرت سے مقابلہ کرنے سے وہ خود اجتناب کرتا تھا۔ غالباً امرت سے ہارنا نہیں چاہتا تھا اور اسے ہر اکر خوشی منانا دشوار تھا کچھلے ہفتے کی بات تھی۔ امرت اور ار حیت کے بے حد اصرار نیزہ بازی کا مقابلہ کیا اور سب سے پہلے پیمان نے نیزے سے کلی اکھاڑی۔ اس نے گھنی ابرو اٹھا کر اسے استہزائیہ دیکھا تھا اور لمحہ بھر میں ہی اس کی آنکھوں میں سرخ لکیریں تھیں، نتھنے پھولے پیمان ہنس دیا۔

”کیا ہوا یار“ تیری فرمائش پر مقابلہ ہوا تھا۔ اور میں کون سا جیتا ہوں“ تیرا یار جیتا ہے۔“ اس کی چار بھری دھب سے امرت کا مزاج قدرے معمول پر آیا۔

ہے، ٹھیک ہے علاقے بٹھے والے ہیں، مگر دوستی تو نہیں بٹ سکتی۔ چلو پھر کسی وقت پوچھوں گا۔“ وہ خود کو تسلیاں دے رہا تھا، مگر وہ تسلیاں زیادہ عرصہ نہیں رہیں۔ رویے کھل کر سامنے آنے لگے تھے۔



آتی گرمی کی بات تھی رات میں کچھ خنکی ضرور تھی مگر راتیں ابھی ویران نہیں ہوئی تھیں۔ علی الصبح ہی راج گھر میں شور مچ گیا تھا۔ مولوی نظام علی اس کی حاملہ بیوی اور بیٹے کو سانپ نے ڈس لیا۔ آبادی کے بہت سے مردان کے گھر جمع تھے۔ اکثریت مسلم تھی۔ چھ گلوں، شور شرابا۔ نظام علی کی برادری اکٹھی اور گھر میں عاف ماتم۔ ہر شخص غم زدہ اور حیران کہ وہ کمرے میں ہی تڑپ تڑپ کر مر گئے، آخر باہر کیوں نہ نکلے، کوئی تو بچتا۔ کیا ایک سانپ نے سب کو ڈس لیا۔ اب یہ اللہ ہی جانتا تھا ایک سانپ تھا یا کئی بھاؤں کا مشہور سراغ رساں کرم داس کھرگی نوعیت اور سائز دیکھ کر نہ تک پہنچ جاتا تھا۔ وہ بہت دیر تک نشان دیکھتا رہا۔ کمرے میں سانپوں کے لوٹنے کی لیکریں ضرور تھیں مگر کمرے میں داخل ہونے یا باہر نکلنے کا نہ نشان نہ سوراخ، ایک چوڑے پاؤں کی آتی چل کے نشان تھے۔ بہت سنبھل سنبھل کر رگھے قدم قدموں کے وزن سے لگتا تھا ہاتھوں میں کوئی قیمتی، کوئی محتاط سامان ہے۔ جو کھٹ کے قریب قدم گھرے تھے، وہ کچھ دیر وہاں رکا ہوگا؟ پھر ان ہی نشانوں پر ہلکا سا پاؤں سرکنے کا گمان تھا۔ غالباً اس نے ارد گرد دیکھا ان ہی پرانے پاؤں والی جیسی کے قدم رک کر چلے گئے تھے۔ تو کیا کسی نے باہر سے کنڈی لگادی اور کچھ دیر بعد کھول بھی دی۔ یہ کرم داس کی گہری سوچ تھی۔ وہ ان نشانوں کو چھڑی سے کریدتا، کھوٹا گھر سے بہت دور کھیتوں میں سے ہوتا ہری چرن کے گھاٹ پر بہت سے قدم کھل مل گئے تھے۔ کرم داس کی نگاہ سامنے کھڑے چوڑے پیروں پر پڑی۔ نگاہ سرکتی اٹھی۔ چند مل نگاہ ہری چرن کی نگاہوں پر جمی رہیں۔ استفسار، کوئی بھانپ لینے کا اظہار

محسوس ہوتا تھا۔ بہت سے لوگ پوچھتے پچھاتے کرم داس کے ساتھ چلتے یہاں تک آئے تھے۔ بیان سے صبر نہ ہوا وہ کرم داس سے استفسار کر رہا تھا۔

”چاچا جتا نہیں چل رہا؟ وہ یک لخت چونکا اور اپنی ایک عدد سے کی عینک سنبھالتے ہوئے کہنے لگا تھا۔

”مولوی صاحب کے گھر تک ایک ہی کمرہ ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ان ہی کا ہو۔“

”یہ کیا بات ہوئی چاچا؟“

بیان کو اچنبھا ہوا ”مولوی صاحب کھسہ بہنتے تھے، گھراہوائی چپل کا ہے۔ پھر سانپ کا لہرا بھی نہیں کوئی بات تو ہے، تیری سمجھ میں نہیں آئی یا تو بتانا نہیں چاہ رہا۔“

”نہیں، نہیں۔“ کرم داس نے انکار کیا۔ اور ہری چرن لوگوں کے پیچھے ہوتا مجمع سے غائب ہو گیا تھا۔ کرم داس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ نشان چوڑے چپے پاؤں کا ہے اور اکثر دھوپوں کے پاؤں چوڑے ہوتے ہیں۔ امرت خواہ تھوہ ناک چڑھا کر بول پڑا تھا۔

”مولوی نظام بڑا اکتا تھا ناں، دونوں میں سانپ، بچھو ہوں گے، یہ ہوگا وہ ہوگا۔ تیرے گردنے وہاں سے بھیج دیا ہوگا، اسے درشن کرانے، جگ میں ہی دیکھ لے کیسے کیسے ڈستے ہیں۔ ہا ہا ہا۔“ بیان کو اس سے ایسی گھٹیا بات کی قطعاً ”امید نہ تھی۔ اس نے سرعت سے نگاہ اٹھائی۔ وہ دن بدن بدلتا جا رہا تھا۔ اب وہ پہلے والا چوہہ، پندرہ سالہ امرت رہا تھا، پہلی محبت نہ یاری، لفظوں میں درشتی بڑھتی جا رہی تھی۔ دو چار سال میں بہت بگڑ ہو گیا تھا ان دونوں نے قریبی قصبے سے اکٹھے آٹھویں جماعت پاس کی تھی تب تک دوستی مثالی تھی۔ پھر جیسے جیسے حالات بدلے 47ء قریب آنے لگا امرت کا رویہ بدلتا جاتا تھا۔ مگر اس سال واضح بدلاؤ محسوس ہونے لگا تھا۔

چند مہینے پہلے کی بات تھی کسی ظالم نے قرآن پاک کے بہت سے اوراق شہید کر کے گھاٹ کی ندی میں چھینک دیے۔ علاقے کی مسلم آبادی غیض و غضب

امرت کو مل گئی۔ کانوں کان پتا بھی نہ چلا۔ ویسے بھی تمام اداروں میں اکثریت رانٹھوروں، ٹھاکروں، برہمنوں کی تھی۔

مسلمان بھی کوئی کوئی بھرتی ہو جاتا اور پھر سب خوشی مناتے۔ امرت کو نوکری مل گئی خوشی میں شامل تو کیا کرتا تھا جتنا گوارہ نہیں کیا۔ پہلے تو یہ نظر انداز کیے گزرنے لگا تھا مگر پھر رانی موت کے تحت سرد انداز میں مبارک دے ڈالی۔

”تیری نوکری لگ گئی تو نے بتایا بھی نہیں۔“
”تیری بھی لگ جاتی، اگر ان بے تکے جلسے جلوسوں میں وقت برباد نہ کرتا۔“

اسے اس کی بات بہت چھبی تھی، پہلے تو اس نے ایک دو جلسوں میں ہی شرکت کی تھی مگر اب ضد نے سراٹھایا۔ ان دنوں علی گڑھ کالج کے طلباء بہت متحرک تھے گاؤں گاؤں، قریہ قریہ جاتے، آزادی کی دی گئی تاریخ پر ڈٹے رہنے کا عزم پیدا کرتے۔ چند دن پہلے مولوی نظام کے گھر آئے، جمعہ کے خطبے کے بعد بہت سے معززین سے مشاورت کی، ایک رات کا قیام و طعام بھی کیا تھا۔ اس رات بیان بھی وہاں موجود تھا۔ اور آئندہ ان کے ہر جلسے میں مولوی صاحب کے ساتھ شرکت کی یقین دہانی بھی کرائی تھی۔

اگلا جلسہ ہفتے کے روز برابر گاؤں میں تھا مگر اس سے پہلے ہی مولوی صاحب کی حادثاتی موت ہو گئی۔ موت حادثہ یا سانحہ وہ بھی پورے کنبے کے ساتھ۔ اتنے پر سوز لمحات پر امرت کا ہنسا، بیان کے کانوں کی لوئیں سلگنے لگیں۔ وہ پہلی بار امرت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سامنے آکھڑا ہوا۔

”امرت تو ہوش میں رہ کر بت کر یہ نہ سمجھ میں تیری وردی سے ڈر جاؤں گا۔“
”کیوں؟“ اس کے چبا چبا کر بولنے پر امرت ترخا۔

”نظامہ تیرا لٹا لٹا تھا، یا میں اس کا ہاتھ پکڑ کر دو رخ میں ڈال آیا ہوں، جو تجھے اتنی تپ چڑھی ہے۔“ بیان اس پر چڑھ دوڑنے کو تھا لوگوں نے بمشکل قابو کیا۔

میں تھی۔ مولوی نظام نے باقاعدہ لوگوں کو جمع کر کے احتجاج بھی کیا۔ لمبی لمبی تقریریں کیں بہت رویا۔ دعا کی، اللہ سے معافی مانگی۔ اسی حوالے سے ایک دن ان دوستوں میں بحث ہو گئی تھی ارجیت ان دنوں نیا نیا کلکٹر بھرتی ہوا تھا۔ جب بات کرنا گروں اکثر جاتی، سینہ پھول جاتا۔

”ضلع ہی تو تھے، اس میں اتنا چیخنے کی کیا ضرورت ہے، اور لکھ لے نظامہ کہ یاد نہیں رہے اسے۔“
قریب حقہ پیتے ہری چرن نے قہقہہ لگایا۔ بیان کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی۔

”زبان سنبھال کر۔ ارجیت۔“ وہ غرایا اور ہری چرن کو گھورا۔ ”وہ ہماری مقدس کتب ہے، اس کی حفاظت ہمیں اپنی جان سے بھی پیاری ہے۔“

”اچھا!“ وہ استہزائیہ ہنسا۔ ”پہلے تو نظامہ کہتا تھا اس کی حفاظت کا ذمہ تیرے رب کا ہے۔ پھر ہری چرن کے استہزائیہ گھومتے ڈیلے ارجیت کے لفظ اس کو تباہ گئے۔ اس نے لمحے میں ہی ارجیت کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ اس سارے عرصے میں امرت خاموش بیٹھا تھا مگر جیسے ہی دست درازی دیکھی میکانیکی انداز میں اٹھا اور اس کے ہاتھ جکڑ لیے۔

”ہو نہ۔ جوانی کا خون ابل رہا ہے، مگر یہ نہ سمجھ اجیت اکیلا ہے، اس کا بھائی زندہ ہے ابھی۔“ اس کا تا سینہ جتاتی آنکھیں بیان کے لیے بہت تکلیف دہ تھیں۔ بچپن کا دوست ہمیشہ بھائی کی طرح سمجھا، کبھی پہلے مذہب پر کوئی بات نہیں کی مگر آج اپنے اندر کی شیطانیت دکھا رہا ہے، بیان نے بہت دکھ سے اسے دیکھا تھا۔ ہری چرن ان دنوں کو وہاں سے ہٹا لے گیا۔

”یہ سارا فتنہ نظامے کا ہے، ہو جائے گا اس کا بندوبست۔“ دھولی بڑبڑا رہا تھا۔ کئی دن گزر گئے دوبارہ ان کا آئنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ بہت دنوں بعد سر راہ وہ ملا اک اجنبی کی طرح۔ اس نے حوالدار کی وردی پہن رکھی تھی۔ ان دنوں نے کئی بار قریبی شہر میں نوکری کی درخواست دی تھی سرکاری دفاتر کے چکر لگائے، ہر بار جواب ملتا ”جگہ خالی نہیں ہے۔“ اب اچانک

میں خشک کی تھالی، کڑھی اور اجار کٹوری اس کے سامنے رکھ گئی۔ کبھی یہ کھانا اسے سوغات کی طرح لگتا تھا جس دن بھی بننا اوطاق میں پلیٹیں بھر بھر لے جاتا۔ کڑھی پر تیرا دسی گھی کا تڑکا، تختوں میں جاتی سوکھی میتھی، گرم مسالے کی خوشبو۔ یک لخت وہ بے درو یاد آگیا تھا۔

”یار جو تیرے گھر کی کڑھی کا ذائقہ ہے، میں پورے راج گھر میں نہیں ملتا۔“ بیان کا دل کھانے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

”آخ۔“ چاولوں، بھرا جیج پلیٹ میں بیج کر نفرت کا گھونٹ اندر اندر اٹھلتا اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ ٹرے وہاں دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ شیشے کا رنگین پراندہ لہرائی سستی جانے کہاں سے آدھمکی۔ جب سے اس کی امرت سے تو، نکار ہوئی تھی میرا نے سستی سے بھی فاصلہ کر لیا تھا۔ بیان باہر کے محلات کبھی گھر میں آکر نہیں جاتا تھا اور پھر امرت سے جھگڑانا ممکن۔ گلی محلے کے بچوں سے پتا چلا تھا۔

”یا جی، مولوی صاحب کے گھر کے باہر بیان باؤ نے امرت جی کا گریبان پکڑ لیا تھا۔“

”کیوں؟“ اس نے دل تھا۔

”گھر پر لڑائی تھی امرت جی نے کچھ کہا۔ بڑا غصہ کیا بیان باؤ نے۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے بیج بچاؤ کرایا، گندی گالیاں دے رہے تھے ایک دوسرے کو۔“ اسے بچوں کی باتوں پر کبھی یقین نہ آتا اگر بیان کا الجھا، خاموش رویہ محسوس نہ کر لی۔ پھر شام کو تائی ثریا نے تعریف کے لیے پوچھ بھی لیا۔

”تو امرت کے ہتھی پڑا تھا۔؟“

”مجھے کیا ضرورت ہے، اس کتے کے منہ لگنے کی۔“ اس نے کندھے پر رکھا صافہ جھاڑا اور اٹھ کر باہر جانے لگا۔

”دیکھ بیان الدین۔“ تائی اس کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ ”اب تقسیم کا وقت قریب ہے، وہ اور اس کے جیسے بار بار الجھیں گے۔ تو ٹھنڈا رہا کر، گھر میں دیوار اٹھانا آسان نہیں ہوتا۔“

”میں نے تیرے گھر کو آج تک کچھ نہیں کہا اور تو۔“

”لو، تو کچھ کہہ بھی سکتا۔“ امرت جواباً گرون مار کر چلایا تھا۔ بیان کے سینے پر ہاتھ رکھے کتنے لوگ اسے قابو کر رہے تھے وہ جھٹ جھٹ جاتا لیکن امرت وہاں سے چلا گیا تھا۔ پھر کس نے کھڑا ہونہا تھا؟ مولوی نظام علی کا معمر بھی بہت سے معمر کی طرح خوب گیا تھا۔ البتہ بیان کے دل میں ایک دیوار اٹھ گئی تھی۔ بچپن کی یاری، سارا خلوص اس کے نیچے کہیں دب گیا۔ اتنے لمبے عرصے کی دوستی پر صرف اسے دکھ تھا بلکہ پچھتاوا بھی تھا۔

”اس کے بجائے کسی کتے سے دوستی کی ہوتی، کم از کم وفادار تو رہتا۔“



وہ صبح سے باورچی خانے میں لگی پوری دل جمعی سے کڑھی، خشک اہل رہی تھی۔ بیان کو کڑھی خشک بہت پسند تھا۔ کڑھی میں جیج ہلاتے اس میں بجتے پختے ملیے دیکھتے وہ خیالوں کی رو میں جانے کہاں سے کہاں گم تھی۔ وہ کب پچھے آن کھڑا ہوا؟ بڑا سا بلبہ یک لخت پھٹا اس کا چھینٹا اس کی سٹول کلائی پر آگرا۔

”آؤج، سس۔“ اس کی سسکاری پر وہ ٹھکر سے آگے بڑھا تھا۔

”دماغ کہاں ہے تیرا۔“ کلائی پکڑ کر اپنے دامن کے کنارے سے پوچھی، سپید نازک کلائی پر گلابی دھبہ بن گیا تھا۔ اس نے اپنی پوریں دھبے پر رکھیں اور ٹھنڈی راکھ چٹکی میں بھر کر اس پر چھڑکی تھی تاکہ ابلہ نہ بنے۔ میرا کے کہیں بہت اندر تک ٹھنڈک اتر رہی تھی۔

”جلن کم ہوئی؟“ استفسار پر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی کلائی کھینچ لی۔ وہ بھی یک لخت سٹپٹا۔ اور مڑتے ہوئے کہا۔ ”دھیان سے کام کیا کر، جانے کیا سوچتی رہتی ہے۔“

کڑھی پر تیزیات ڈوڈی مرچ کا تڑکا لگتے ہی سارے گھر میں خوشبو پھیل گئی۔ بڑی سی تمام چینی کے تھال

”کیوں۔“ وہ رانت جھانک رہا تھا۔ ”اس کے باپ کا گھر“

میرا حق دیکھتی رہ گئی تھی۔ امرت کے بارے میں کبھی ایک لفظ نہیں سنتا تھا اور اب اتنی نفرت۔ حالانکہ امرت اسے خود بھی کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔ عجیب گھٹیا لالچی سا۔ اور اب اپنی پرانی اور بہت کی سہیلی صرف امرت کی بہن ہونے کے سبب جیسے لگی تھی۔ حالانکہ سستی خود بھی بھائی کے خلاف ہی تھی۔ کتنی بار تو وہ میرا کو کہتی۔

”امرت کے مقابلے میں بیان ہیرا ہے۔ اور ہیرے چھپے رہیں تو اچھا ہے۔“ میرا تب بھی اس کی بات ناگواری سے سنتی اور دن بہ دن انداز میں روکھا پن لے آتی، مگر وہ ڈھیٹ نہ تھی۔ صرف آجانی بلکہ پہلے کی طرح بے تکلف، ہنسی، ٹھٹھول۔ اب بھی سیدھی چارپائی کے پاس رکی اور میرا کو نزدیک سے گھورا۔ ”تو نے کڑھی خشک بنایا“ اور میری طرف بھیجا بھی نہیں۔ بے دید، بے وفا۔ ”چارپائی پر پکڑ کر مار پلیٹ اٹھا کھانے لگی۔ میرا گھور رہی تھی جس کے لیے بنائے اس نے چکے بھی نہیں، اور وہ ندیدوں کی طرح ہڑپ کر رہی ہے۔“

”گھور کیوں رہی ہے، نظر لگائے گی۔“ اس نے اچار کی پھانک کھاتے ہوئے اسے استفہامیہ دیکھا اور پھر چٹکارہ لیتے کہا۔ ”جا۔ جا کے ایک گلاس پانی لے کر آ۔“ اس کے انداز پر وہ چڑ گئی۔

”جا کر پی لے۔ تیرے پیروں پر مندی لگی ہے۔“ ”ہا۔ آ۔ ہائے۔ جادو ہو۔“ ہاتھ جھٹک، پلیٹ دھو۔ اٹھی۔ وہ گھڑولے کی جانب بڑھی کہ امرت چلاتا ہوا دندنا اندر آگیا۔ آج سے پہلے وہ ہمیشہ کھنکھار کر ”ہوا اٹریا۔“ آواز دے کر اندر قدم رکھتا تھا۔ مگر آج لال پیلا ہوا جا رہا تھا۔ اسے پہلی نظر میں ہی سستی دکھائی دی وہ اس کی جانب بڑھا۔ اور سستی کو چٹیا سے پکڑ لیا۔

”کیوں مری ہے یہاں بے غیرت، تمک۔ حرامیوں کے گھر۔ آئندہ آئی تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔“ میرا دھڑکا

لپٹتی سہم کر کئی قدم پیچھے ہو گئی تھی۔ بیان ”ٹریا شور کی آواز سن کر باہر آئے تھے۔ امرت کی چیخ پکار اسے سلگا گئی۔ اس کے کانوں کی لو، کنڈی کی رگیں، چہرے کی لالی اس کے شدید غصے کی غمازی تھی، وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

تیری جرات کیسے ہوئی، میرے گھر میں شور شرابا کرنے کی۔ اور تمک حرام کے کہا۔ تمک حرام تو تم ہو، ساری زندگی ہمارا کھاتے رہے، اب جدائی کے وقت آنکھیں ماتھے پر رکھ لی ہیں۔“

”لو۔ بکواس بند کر اپنی۔“ امرت نے نتھنے پھلائے چٹیا پر گرفت بھی سخت ہو گئی تھی۔

”بکواس تو بند کر۔ آئندہ یہاں قدم رکھا۔ تو!“ ”کیا تو؟ تو نے بڑے یہاں خزانے داب رکھے ہیں۔“ طنز کہتے اس کی نگاہ بیان کے پہلو میں کھڑی تازک سی میرا پر کی غورا۔ ”لجے میں تمام خباثت اتارتا اس پر آنکھیں جمائے بولا تھا۔

”ویسے۔ خزانے تو یہاں ہیں۔“ ”لو کے پیچھے۔“ بیان نے اسے گریبان سے جا پکڑا۔ ”اگر اس پر نگاہ بھی ڈالی، تو تیری آنکھیں نکال لوں گا۔“

”نگاہ! ہونہ۔“ سستی کی چٹیا چھوڑ، جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑ لیا۔ ”اگر تو نے جلے، جلوس، نعرے بازی نہ چھوڑی، نگاہ تو کیا، ساری کی ساری کو اٹھا لوں گا۔“ ”امرت!“ بیان کی دھاڑ سے درو دیوار لرز اٹھے تھے اس نے قریب رکھا تیز دھار کھرا اٹھالیا۔ ”ٹریا، میرا نے چلاتے ہوئے اسے کھینچ کر قابو کیا۔

”رب کا واسطہ تجھے بیان۔ ٹھنڈا رہ۔“ سستی الگ بھائی سے چکی چلا رہی تھی۔ ”امرت ہوش کر، وہ تیرا دوست، تیرا پار ہے۔ کچھ عرصے میں چلا جائے گا۔ چل یہاں سے، آئندہ کبھی نہیں آؤں گی۔ چل میرا ویر۔“

”ہونہ۔“ اس نے تضحیک سے تھوکتے ہوئے ہاتھ ہوا میں اٹھالیا۔ ”بڑا آیا، بی بی جگر ٹھنڈا کرنے والا۔“ ہاتھ نور سے گھڑوچی پر رکھی صراحی کو مارا۔

چھنا کے سے مٹی کا کوہ ٹوٹا۔ ٹھنڈے پانی نے سرخ گول اینڈ کے فرش کو جل نکل کر دیا تھا۔



کھلی فضاؤں میں چیل کو بڑھتے جارہے تھے جہاں کہیں شکار دیکھتے جھپٹ پڑتے۔ ان کا بچا کچھا گدھ نوچنے آجاتے۔ پورے ماحول میں بے ہنگم سا شور برپا تھا۔ معصوم چڑیاں، مینا سہم کر بیٹھی اپنی سیلیوں کو بھی ترسیں۔ آج پھر وہ بڑی سی چادر اوڑھے چھپتی چھپاتی کوئی تیسری بار صراحی لے کر آئی تھی۔ سرخ، نیلی، سفید، پیلے پھول پتوں کی رنگین صراحی۔

”مبرا تو میری سیلی ہے، ناں۔ رکھ لے اسے۔ بیان کو گھرے کاپانی پسند نہیں ہے۔“

”تو تیرا کیا خیال ہے، یہ بات مجھے نہیں بتا تیرے سے پہلے اسی دن میں نے یہاں صراحی لا کر رکھی تھی، مگر وہ کہتا ہے اب بھی صراحی کاپانی نہیں پیے گا، تو نہیں پیے گا تو جانتی ہے نا وہ اپنی بات کا کتنا اکا ہے۔“

”یہ تو صحیح ہے مگر؟ وہ پیسا سارہتا ہو گا تو کہیں چھپا کر رکھ دے، چکے سے اس کا پانی دے دیا کر۔“ وہ صراحی زمین پر رکھتے ہوئے منمنائی تھی۔

”چھا! جیسے وہ بچہ ہے۔“ وہ جتا کر بولی تھی۔ ”میں یہ سب کر کے دیکھ چکی ہوں اور یہ بتا تو کیوں اتنی ہلکان ہو رہی ہے، کیا لگتا ہے تیرا۔“ اس کی تفتیشی نگاہ پر وہ جربز ہوئی۔

”میرا۔ میرا کیا لگتا ہے جو لگتا ہے، تیرا ہی لگتا ہے۔“

”چل پھر یہ اٹھا۔“ مبرا نے ابرو اٹھا کر صراحی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ”اور جا۔ وہ آجائے گا۔“ اس کی کاجل بھری آنکھیں پانی سے لرزے لگی تھیں۔

وہ گنا چھیلتا گھر میں داخل ہوا تھا۔ کانوں تک آتے کھٹکھریالے بال، چوڑے شانے، کھلا رنگ، آسمانی کرتے میں وہ مضبوط جوان لگتا تھا، وہ لمبے ڈگ بھرنا صحن عبور کر رہا تھا جب اس کی نظر رنگین شیشوں سے

بھی نارنجی اوڑھنی پر گئی۔ وہ فوراً سمجھ گیا تھا۔ ہونا ہو۔ یہ سستی ہے۔ اس نے گنا ایک جانب پھینکا اس کا پھوک تھوکا۔

”کیوں آئی ہے یہ۔؟“ اس کی گہمیرتا آواز کٹ دار تھی۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا گلابی ہونٹوں میں نارنجی اوڑھنی کاپلو، آنکھوں میں ٹھٹھا تابی۔

”یہ۔ صراحی۔“ وہ بمشکل بولی تھی۔ ”یہ تیری یا تیرے بھائی کی بھول ہوگی سستی کہ میں صراحی کاپانی پیے بنا ٹرپ کر مر جاؤں گا، صراحی نہیں تو گھڑا، نلکا، ندی، نالہ، جوڑ کوئی سا بھی پانی لی کر جی لوں گا، پیسا زندہ رہ لوں گا۔ میرا پانی ضائع کر کے جو سمجھتا ہے ناؤر جاؤں گا پیاس سے۔ اس کی بھول ہے۔

صرف بھول۔ جو اس نے سوچ رکھا ہے نا ہندوستان پر فرنگی کے بعد راتھور، ٹھاکروں کی حکومت۔ وہ کبھی نہیں ہو سکتی، بتا دے اسے، ہم لہو دے کروطن بنالیں گے، پانی کیا چیز ہے۔ پاکستان بنے گا، ان شاء اللہ ضرور بنے گا۔ ہونہ۔“ اس نے جاتے جاتے صراحی کو زور سے ٹھوکر ماری۔ وہ گول گھومتی زمین سے ٹکرائی، اس کاٹل دار اونچا منہ چچ کر ٹکڑے ہو گیا۔ دو موٹے سے آنسو رخساروں پر بہہ گئے تھے۔ وہ زمین پر بیٹھی چٹنی صراحی اور ٹکڑے سمیٹ رہی تھی۔ مبرا نے بھی اپنے آنسو بہت مشکل سے روکے تھے۔ اپنے گھر میں یوں اپنی سیلی کی بے وقعتی وہ بھی صرف اس کے بھائی کی وجہ سے، اس کی برداشت سے بالکل باہر تھا۔ وہ اس کے شانے سہلائی اس کے برابر بیٹھ گئی۔

”سستی تو یہاں مت آیا کر، بیان کا تجھے جھڑکنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ اس نے چادر سے آنسو اور ناک پونچھتے بلجی نگاہ اٹھائی، مبرا نے اسے گلے لگالیا۔

”تو امرت کی بہن ہے اور امرت۔ کیسے آنکھوں میں خون کیسے پھرتا ہے، بچپن کی یاری، دوستی کسی بات کا خیال نہیں، صرف ملک بننے سے وہ اپنے جگری دوست کا دشمن بن گیا۔“

”مبرا یہ صرف نہیں ہے۔“ اس نے سراٹھا کر مبرا کے چہرے کو ٹٹولا، اپنا ہاتھ اس کے رخسار پر رکھا۔

”مبرا یہ صرف نہیں ہے۔“ اس نے سراٹھا کر مبرا کے چہرے کو ٹٹولا، اپنا ہاتھ اس کے رخسار پر رکھا۔

”مبرا یہ صرف نہیں ہے۔“ اس نے سراٹھا کر مبرا کے چہرے کو ٹٹولا، اپنا ہاتھ اس کے رخسار پر رکھا۔

مگر دوسری کی سسکیاں صرف پچھوٹے کی تھیں، جانے کس سے؟ کیا خوف، کیا اندیشے؟



کونے میں بیٹے باورچی خانے میں وہ بہت دیر سے کام میں مشغول تھی۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی غیر محسوس طریقے سے سارے گھر کے کام آہستہ آہستہ اپنے ذمہ لے لیے۔ صبح سب سے پہلے اٹھتے ہی سارا گھر صاف کر لیتی، برتن دھو کر ٹھکانوں پر رکھتی، جب تک سب افراد اٹھتے وہ ناشتا تیار کر چکی ہوتی۔ ناشتے سے قاصغ ہوتے ہی باتوں باتوں میں زہرہ کے ساتھ سبزی بناتی، روٹی، کبھی وہ تو کبھی زہرہ اتارتی تھی۔ بچوں کے اسکول سے آتے ہی بھاگ بھاگ ان کے کام کرتی۔ ان کے منہ چومتی۔ پھوپھی مختار اس دواہرہ کو واپس اپنے گھر جانے لگی جب بلی بی سے چلنے کو کہا۔ وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

”مائی مجھے زہرہ اور بچوں کے پاس چھوڑ دے۔“
زہرہ تو سنتے ہی کھل گئی۔ اس کے آجانے سے اسے بہت آرام ہو گیا تھا۔ کب کیسے سارے کام ہو جاتے، وہ آرام سے پرئوس میں ملنا ملنا بھی کر لیتی۔ اس نے بھی پھوپھی سے فرمائش کی۔ برسوں بعد اس نے فرمائش کی تھی وہ مان گئی۔

درمیان میں ایک دو چکر لگائے، مگر بلی کا دل ایسا یہاں لگا کہ کہیں جانے کو تیار نہ تھی۔ سچے سچے اس سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ پھوٹا فیضان اس کی جلی ہوئی جلد سے ڈر جاتا۔ ڈرتے ڈرتے کوئی چیز پکڑتا، پکڑاتا۔ چونک بڑے بھی جاتے تھے اگر کبھی یک لخت سامنے آجاتی۔ رنگت اچھی خاصی گہری سرخ سانولی تھی، لیکن دس سالہ عثمان اور خاص کرام ہالی کی اس سے بہت دوستی ہو گئی۔ اس کے پاس بیٹھی قصبے کہانیاں سنتی، بال بنواتی جب وہ باورچی خانے میں ہوتی تو کھانا پکانے کے طریقے پوچھتی رہتی۔

ام ہالی اس کے قریب چوکی پر بیٹھی باتیں مٹھا رہی تھی۔ اس نے کڑھی دم پر رکھی۔ دم لگا خشکے اتار کر

دوسرے رخسار سے رخسار جوڑ لیا۔ ”یہ ذرا سی بات نہیں ہے، گھروں میں دیواریں اٹھ رہی ہیں آپس داری، بچپن کی سکھلاں پچھڑیں گی، سرحدیں قائم ہوں گی بہت دیر آجائے گی۔ مبرا۔“

”ہستی، جب زمین کسی ایک قوم و فرقے کے لیے تنگ کر دی جاتی ہے نا پھر وہاں دیواریں تو اٹھتی ہیں، سرحدیں بچ جاتی ہیں۔“
”کیسی تنگی مبرا۔؟ سب کچھ تو ہے تمہارے پاس۔ کھیت کھلیاں۔ گھر رشتے۔“

”ہاں۔ بچے کچھے کھیت۔ آدھے سے زیادہ تو موہن گپتا نے قبضے میں لیے۔ کسی نے انصاف دیا ہمیں، الٹا چپ کرایا۔ ارجیت کلکٹر لگ گیا۔ امرت کو حوالہ داری مل گئی اور بیان وہ بھی تو اتنا ہی پڑھا لکھا ہے، اسے کیوں نہیں ملتی تو کری۔؟ کیوں کہ وہ مسلمان ہے، شہر کے اسکولوں میں انگریزی، سنسکرت کو اہمیت دی جا رہی ہے، اردو پہ کیوں پابندی ہے، مسلمانوں کے گھر جل رہے ہیں، دین کی بے حرمتی ہو رہی ہے، ہر جگہ ہمارے رستے تنگ اور تو کھتی ہے ہم آزادی کی بات نہ کریں۔“

اس نے سسکتے ہوئے ”مبرا“ کہا اور گلے میں بانٹیں ڈالے لپٹ کر رونے لگی۔

”اپنی جنم بھوی پر سرکار سب کو برابری پر رہنے کیوں نہیں دیتی؟ اپنے بچپن کے تنگی سا مٹی سے کتنی یادیں، محبت ہوتی ہے، کتنا مشکل ہے ان کے بغیر جینا۔“ وہ کراہتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”مبرا۔ تم نہ جانتا۔ گرو کے واسطے تم لوگ مت جانا، میں تو مرجاؤں گی اگر تم لوگوں کو نہ دیکھا۔“ اور دل پکار رہا تھا۔ ”بیان کو نہ دیکھا تو۔“

”کوئی کسی کے لیے نہیں مارتا، پگل۔ اپنی آئی پر جاتے ہیں اور جب حالات اچھے ہوں گے، ہم آئے جاتے رہیں گے۔ ایک دوسرے کو یاد کریں گے، خط لکھیں گے۔“ دونوں لڑکیاں بہت دیر روتی رہی تھیں۔ ایک کے آنسو آنے والی آزاد فضاؤں کی امید، بیم کے لمحات کے تھے، کہیں کہیں سسلی کا دکھ بھی تھا،

”تو نے پکائی ہے۔“

”نہیں۔ بی بی نے بنائی ہے۔“ اک تر چھی نگاہ دور اس لڑکی کی پشت پر گئی تھی جو چوہے لمبے میں بچھی رکھ کر کھانے سے کرید رہی تھی۔ وہ پھیکا سا مسکرایا۔

”اس کے ہاتھ کا ذائقہ بہت مانوس سا ہے۔“

”ہاں کہتی ہے اسے اور اس کی سہیلی کو کام کرنے کا بہت بچپن سے شوق تھا۔ دونوں نے مل کر بہت جلدی سارے کام سیکھ لیے تھے۔“ وہ کھانا کھاتے آہستہ آہستہ اثبات میں سر ملاتا رہا۔ کئی بار نگاہیں اس پر ڈالیں وہ جوں کی توں جھکی بیٹھی تھی۔ پتا بھی نہ چلا کہ پلٹ صاف ہو گئی۔ زہرہ بھی حیران رہ گئی۔ پھر تو کئی بار اس نے خود کہہ کر کڑھی خشک بنوایا۔ جیسے کڑھی کے ذائقے پر ٹھٹھا تھا اسی طرح کئی اور ذائقے چونکا دیتے کھانے تو کھاتے ہی اور کئی معمول کے معاملات تھے وہ بل بھر کے لیے دم بخود رہ جاتا اور پھر ساری رات بے چین کروٹوں میں گزرتی، صبح آنکھوں کے گرد لالی اس کے رت جگمگ کی چٹکی کھاتی۔

سائیں نے کئی بار زہرہ سے پوچھا تھا۔

”تم نے پوچھا اس سے کس علاقے کی ہے۔“

اس کے بارے میں جو تھوڑا بہت مختار اس کو پتا تھا زہرہ کو بتا دیا اور زہرہ نے میاں کو، لیکن اس سوال پر اس نے ناک ہونٹ تاسفانہ پھینکے۔

”کہتی ہے علاقہ یاد نہیں، بس چار افراد تھے گھر کے،

سب آگے پیچھے ہو گئے، بے چاری کسی سہیلی کے ذکر

پر گم صم ہو جاتی ہے۔“

”آہ!“ سائیں نے ٹھنڈی سانس کھینچی۔ ”زہرہ

وہاں کی یادیں ہیں ہی کم صم کر دینے والی، بڑا کرب ہے

اس ہجرت میں۔“ اس کے چہرے کی اذیت و کرب کی

لکیریں زہرہ کے دل میں لانی کی طرح پیوست ہو جاتی

تھیں۔ وہ اس کے کرب سے بہت اچھی طرح واقف

تھی۔ سائیں نے پہلی رات ہی بتا کسی لگی لپٹی کے اپنا

دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

”میں یہ نہیں کہتا میں تیری عزت نہیں کروں گا“

نیچے رکھ دیا۔ وہ سفید لٹھی کے سوت پر سیاہ واسکٹ پہنے ابھی دفتر سے واپس آیا تھا۔ وہی بارعب سرایا، چوڑی اٹھان آج بھی کسی کو اپنے پیچھے پاگل کر سکتا تھا۔ وہ قدم قدم بڑھتا اس کے قریب سے گزرا ”سلام علیکم“ اس کی بھاری آواز پر کڑھی میں بنے پھٹے بلبلے کی مانند اسے اپنا دل پھٹتا محسوس ہوا۔ اس نے رخ پھیرتے ہوئے سر کے خم سے جواب دیا۔

وہ پہلے اپنے کمرے میں گیا پھر کڑے اٹھائے غسل خانے کی جانب بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد نانہ دم ہو کر صحن میں پچھی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ زہرہ اس کے پاس آ بیٹھی اور فیضان کا بانو صبح کرباپ کے سامنے کیا۔ روزانہ کی طرح شکایتیں شروع کر دی تھیں۔ وہ اس کی کسی بات پر مسکراتا، کسی پر فیضان کو گھور کر دیکھتا۔ کڑھی کے تڑکا لگنے کی خوشبو پر وہ لمحہ بھر کے لیے چونکا تھا پھر مائیں کرنے لگا۔ اس نے ایک بڑی ٹرے میں چاول، کڑھی، سلاد اور پانی رکھ کر امہانی کو تھمائی۔

”جا اپنے ابو کو دے آ۔“ اس نے ٹرے پکڑتے ہوئے کہا تھا۔

”بی بی ایک کٹورے میں شکر اور کھی بھی ڈال دو ابو

کڑھی نہیں کھاتے۔“

”کیا!“ اس نے حیرت اسے دیکھا اور غیر

ارادی نگاہ قدرے فاصلے پر بیٹھے سائیں پر گئی۔ اب وہ

فیضان کے تھنکے والے بالوں میں انگلیاں پھنسائے

اسے چھیڑ رہا تھا۔ نگاہ پلٹ آئی۔

”کیوں کیوں نہیں کھاتے؟“

”وہ کہتے ہیں کڑھی سب کو پکائی نہیں آتی۔“

”صحیح کہتے ہیں۔ وہ تو کوئی اور ہی کھی جس کی کڑھی

سارے گاؤں میں مشہور تھی۔“

اس کی بڑبڑاہٹ پر ہانی نے پوچھا۔ ”بی بی کیا

کہا۔؟“

”کچھ نہیں۔ جاتویہ لے جا۔ اگر پسند نہ آئی تو

کھی شکر لے جانا۔“ شرمیلی سی امہانی نے ٹرے باپ

کے سامنے رکھی تھی۔ پہلے نوالے پر ہی وہ بل بھر کے

لیے دم بخود رہ گیا۔ اک استغما یہ نگاہ اٹھا کر زہرہ سے

کے بعد اس نے اس سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ پندرہ برس گزر گئے تھے۔ اتنے عرصہ بعد بھی اس کے چہرے پر وہی پہلی رات والا کرب دیکھ کر اس کا دل پاتال میں اتر جاتا پھر وہ اپنی کوشش اور باتوں فطرت سے فوراً اس کے درد کو یہ کہہ کر نکالتی۔

”چلو سائیں اللہ پاک جانے والوں کو بخشے۔“ پھر بچوں میں الجھا دیتی۔ اپنی اولاد سے محبت فطری جذبہ ہے۔ وہ بھی ان کے خوب لاڈ اٹھاتا، لیکن کسی کسی معاملے پر اڑ جاتا تھا۔ عثمان کے روٹنے اور ضد کرنے پر بھی اسے اس کی مرضی کا مہمنا لے کر نہیں دیا تھا بلکہ جو سفید خود کو بھایا وہی لے کر دیا۔ عثمان منہ پھلائے اس کی رسی تھامے ڈھیلے قدموں گھر میں داخل ہوا تھا اور شام کو ماں اور بی بی کے پاس بیٹھا شکوے کر رہا تھا۔

”مجھے سفید اور بھورا پسند آیا تھا“ ابونے وہ لے کر نہیں دیا۔“

”یہ بھی بہت پیارا ہے“ سفید دودھ جیسا۔“ بی بی میٹھنے کی پشت پر ہاتھ پھیرتے نرمی سے سمجھا رہی تھی۔

”تجھے پتا تو ہے ابو کو ڈب کھری چیزیں پسند نہیں۔ ایویں ضد کر رہا ہے۔“ ام ہانی کے لفظوں پر بی بی کی سلوٹ زہ آٹکھیں پوری کھل گئیں۔ کھورا سیاہ ہاتھ نرم براق بالوں سے فہل کر نیچے جا کر ”پھر تریاق نکل جلد سنبھل گئی۔ ویسے بھی اسے جلد سنبھلنے کی عادت ہو گئی تھی۔ عثمان کو خوش کرنے کے لیے اس نے میٹھنے کی خوب خاطر کیں۔ وقت کے ساتھ وہ اچھا خاصا ملا ہوا بکرا بن گیا۔ بی بی کو دیکھتے ہی اچھلتا دونوں اگلی ٹانگیں اٹھا کر چھٹکتے چھٹکتے کھٹکھٹوں والے کھروہم سے نیچہ مارتا تھا۔



اس کے شیرو کے ٹاپوں کی آواز ریسٹ ہاؤس سے ہوتی نہر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ ضیا الدین کھیتوں کو پانی لگانے کے بعد گھر کی جانب چل

حفاظت نہیں کروں گا تو میری عزت ہے“ ذمہ داری ہے، لیکن مجھ سے یہ مت چاہنا کہ وہ میرے دل سے نکل جائے گی اس کی خوشبو میرے خون میں تیرتی ہے، اپنی آخری سانس میں بھی اسے دیکھنے، پانے کا تمنائی رہوں گا۔“ اس نے لب کھلتے بھر آئی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اور بہت ڈرتے ڈرتے اپنے نازک ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھوں پر رکھ دیے۔

”لیکن سائیں کوشش تو کر سکتی ہوں۔ نا۔۔۔“ اس نے اس دن پہلی بار اسے سائیں کہا تھا جب سے وہ اب تک سائیں ہی تھا۔

”ہاں! کر لیتا۔ میں تیری کامیابی کے لیے دعا کروں گا، لیکن مجھے یقین نہیں ہے۔“ اس کی درد سے مندی گہری آنکھوں پر اس نے اپنا گھونٹ پھیر لیا۔



پاکستان آجانے کے بعد وہ بالکل بے آسرا ہو گئی تھی۔ باپ بھائی راستے میں مارے گئے۔ بوڑھی ماں کے ساتھ ایک مندر نما حویلی کے ایک کمرے میں رہنے لگی۔ ایک سال میں ہی ماں کو بی بی ہو گئی، خون تھوکنے لگی، واحد رشتے دار بھوپھی تھی اس کا پتا نہ چلتا تھا۔ برابر کمرے والی ثریا خالہ جب بھی اس کی ماں کی عیادت کو آتی اس لڑکی کو دیکھ کر بہت ترس آتا تھا۔ ایک دن اس کی ماں نے روتے ہوئے ثریا کی خمتیں کیں۔

”میں مر گئی تو لوگ اس کو نوح کھائیں گے تو میری بیٹی کی عزت بچالے۔“ انہوں نے ویسی ہی ختمیں بیان کی بھی کی تھیں، مگر وہ مان کر نہ دیتا تھا۔

”جانے والوں کو بھول جاتے ہیں بیان۔“

”اس کے چلے جانے پر میرا دل راضی نہیں۔“

”دل کا کیا ہے۔“ ثریا نے اس کی پشت کو سہلایا۔

”دل حقیقت کب تسلیم کرتا ہے، یہ تو خواب دیکھنے کا

عادی ہے۔“ دو سال بعد ثریا کی بے تحاشہ فٹیں فریاد کے بعد چاچے ہوئے بھی اسے راضی ہونا پڑا۔ غالباً

زہرو کی یاں مر گئی تھی اور وہ بے آسرا ہو گئی۔ شادی

پڑے سورج ان کی پشت کی جانب قدرے نیچے ہوتا جاتا تھا۔ نماز عصر قضا ہونے کے خدشے سے انہوں نے اپنا پھاوڑا قریب رکھا اور نہر پر ہی وضو شروع کر دیا۔ شیرو کی عتابیں کھینچنے سے ہنسنے کی آواز انہیں بالکل اپنے عقب میں محسوس ہوئی۔ مڑ کر دیکھا۔ امرت چہرے پر رعونت سجائے مونچھوں کو تاؤ دیتا تاہم ہاتھ سے شیرو کی باکیں اتنی زور سے کھینچیں کہ اس کی گردن بھی اسی طرح تنی منہ بے بسی سے کھل گیا۔ وہ شیرو کو کبھی دو قدم آگے، کبھی دو قدم پیچھے کرنا مسخرانہ ہنسا۔

”سنا ہے چاچا تو سیا لکوشن حج کر کے آیا ہے۔“

ضیا الدین نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔ ”تو کیا جانے حج، نماز۔ جا، جا کر اپنا کام کر، میری نماز قضا ہو رہی ہے۔“

اس نے لگائیں ڈھیلی چھوڑتے ہوئے تنفر سے نتننے پھلائے۔ ”ہمارا ہندوستان قضا کر کے تجھے اپنی نمازوں کی پڑی ہے چاچا۔“

”نہ کس بات کا ستنا ہے تجھے امرت۔“ وہ کیلے بازو پر آستین برابر کرتے مقابل اکھڑے ہوئے۔

”جانتا ہے نا تو، کس پر سوار ہوا تن رہا ہے۔“ ان کا جلتا انداز اسے سیخ پا کر گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے تھکیک آمیز غرایا۔

”ہاں، ہاں یاد ہے اور تیرا تحفہ ہی تیری قضا بنے گا۔“ وہ یک لخت اتنی تیزی سے ان سے بھڑک کر گزرا کہ ضیا الدین کو سنبھلنے کا موقع تک نہ ملا۔ وہ لڑکھڑائے۔

امرت جاتے جاتے تانبے کی رکاب میں پھنسا پاؤں پوری قوت سے ان کی کن پٹی پر مار کر گزرا۔ بوڑھے ضیا الدین کے ہاتھ سے اک خون کا فوارہ ابل پڑا۔ وہ زمین پر گرے گھوڑے کا سم ان کے ہاتھ پر رگیدتا آگے بڑھ گیا۔ بچپن کے تقابل بھی عجیب ہیں چلنا سیکھتے ہیں تو سب سے پہلے چاند سورج کی رفتار سے مقابلہ، پہلے کون نیچے گا۔ نہر کے تیز دھارے سے دو ٹوٹے وہاں

تھی کئی نیچے رہ رہ کاٹاؤ ٹوٹے سے گھماتے نہر کی تیز لہر

کے ساتھ رہیں لگاتے آ رہے تھے۔ جو بچوں میں نسبتاً بڑا اور قدرے آگے تھا وہ خون میں لت پت تڑپتے ضیا الدین کو دیکھ کر پہلے ٹھٹکا پھر چلایا۔

”ضیا چاچا۔“ پھر بہت سے لوگ اکٹھے ہوتے گئے۔ خون رکنے کا نام نہ لیتا تھا۔ گھر لے جانا بے وقوفی تھی۔ بیان کو پیغام پہنچا دیا تھا۔ تب تک ضیا الدین اتنے غمگین ہو گئے کہ کشتی سے زبان ساتھ چھوڑی تھی۔ حکیم شکورے کا مطب کئی دن سے بند تھا۔ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ بلکہ وہ کیا بہت سے مسلمان گھرانے اچانک سے غائب ہو جاتے۔ شاید خاموش ہجرت شروع ہو چکی تھی۔ غالباً ”کچھ لوگ فضا میں بدلی ہو سونگہ لینے کی صلاحیت زیادہ رکھتے ہیں اور شکور تو حکمت سے بھرا تھا۔“

شہر میں ایک چھوٹا سا اسپتال تھا اور شہر زیادہ دور بھی نہیں تھا، لیکن وہاں لے جانے کے لیے کسی تیز ریل گاڑی یا ٹرک کا ہونا ضروری تھا۔ کہار دتے کا ہیل پیار تھا زیادہ چل نہیں سکتا تھا اور بیان کے گھوڑے پر لے جانا ناممکن، صلاح الدین نے سواری کے انتظام کی کوشش کی۔ ریسٹ ہاؤس بھی گئے شاید کوئی بندوبست ہو سکے کچھ لوگوں نے وہاں سے ٹرک لے لیا تھا، مگر وہاں پہرے پر بیٹھے ایک ٹھاکراروی نے صاف کہہ دیا۔ ”او میاں، صاحب آرام کر رہے ہیں، ہم اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔“

”تو جگاؤ انہیں۔“ صلاح الدین نے ہاتھ جوڑے۔ ”کچھ دیر کے لیے سواری دے دیں، ہم زیادہ کرایہ دے دیں گے، میرا بھائی خون میں نہا رہا ہے۔“

”کیا ہم نے نہ لایا ہے؟ جاؤ یہاں ہے، خود ہی مرہم پٹی کرلو، ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس کا تنگ آمیز رویہ بیان کی برواشت سے باہر تھا۔ آج سے کئی برس پہلے چاچی زہنب (میرا کی ماں) کو روزہ سے تڑپ رہی تھی۔ دائی نے بھرپور کوشش کے بعد کہہ دیا۔

”شہر یا برابر گاؤں دو سری دائی کے پاس لے جاؤ، میرے بس کی بات نہیں۔“ سواری کا بندوبست اس

وقت بھی مشکل تھا۔ کسی نے قیل گاڑی تک نہ دی۔ چارپائی پر ڈال کر برابر گاؤں تک لے جا رہے تھے۔ بمشکل آوارہ راستہ طے ہوا تھا جب وہ مردہ بچے کو جنم دے کر ابدی پرسکون نیند سو گئی۔ بیان اس وقت گیارہ برس کا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں تھی کہ چارپائی پر کیوں گئی کیوں تڑپی، ہاں اتنا یاد تھا اس کے ٹھنڈے وجود اور پہلو میں معصوم پھول کو دیکھ کر سارا محلہ تڑپا تھا اور آٹھ سالہ میرا کی آنکھوں میں گھبراہٹیں پانی آج بھی یاد آجاتا تھا۔ پھر اپنی آنکھوں دیکھے کتنے واقعے کوندے کی طرح لپکے تھے۔

رام چند لوہار کا دن بدن بڑھتا تپ دماغ کو چڑھ گیا تھا اسے فریڈی ٹائیکل (فرنگی آفیسر) نے اپنے گھوڑے بان کے ساتھ شہری اسپتال علاج کے لیے بھیجا تھا۔ مستری راج پت ریسٹ ہاؤس کی مرمت کے دوران گرا ٹانگ ٹوٹی اس کے لیے عم عم کا انتظام ہو گیا تھا۔ امرت کی ماں کوئی بی تھی کتنی بار اسے شوگر کے ساتھ شیر آتے جاتے دیکھا۔ عبدالغفور خان پانی روز کا سینکڑوں روٹی لگانے والا جانے کیسے خور میں گر گیا، کسی نے دشمنی میں دھکا دیا یا امرت 40 سے 47 سال تک کے سفر میں ایسے امرت بہت عام ہو گئے تھے پتا ہی نہ چلتا کون کیسے جل گیا امرت کوئی مسلمان مسافر نہر کنارے پھسل کر ڈوب مرنا، کوئی بے احتیاطی میں اگلے چوڑے کے ڈور میں جا کر مارا، کوئی اپنے کنبے سمیت چولے میں رہ جانے والے بچھے انگاروں سے ہی راکھ بن جاتا اور نہیں تو چارہ کاٹنے کی مشین سے ٹکرا کر مرنا۔ بالکل اسی طرح عبدالغفور بھی جھلس گیا۔ وہ تنور سے ”مچھڑ“ سانس لیتا نکلا تھا، مگر بروقت سواری کا انتظام نہ ہونے سے وہ شکورے کے مطب میں دم توڑ گیا۔ بالکل نہر چوڑے، مشین میں گرے، جھلے خاکی بدنوں کی طرح، زہن کی طرح اور ضیا الدین کی طرح بیان نے تھنے پھلاتے جڑے جمائے اور اردلی کو دبوچ لیا۔ وہ گندی گالی دے کر چلایا تھا۔

”لوئے۔ تو جگاتا ہے۔ یا۔“ شور سے لونسون مارک کی آنکھ کھلی وہ گسسا سا جمالی روکتا باہر نکلا۔

پوری بات سنی۔ شوگر ٹم ٹم دینے کے لیے شہر رضامند سا لگتا تھا، مگر عقب سے آئی نو عمر لڑکے کی آواز شاہد تھی۔

”تھیا چاچا کا سورج ڈوب گیا ہے۔“ سانپوں کو آستینوں میں پال کر دودھ پلایا تھا۔ انہوں نے ڈسنا تو تھا ہی، جنہیں اپنے منہ کے نوالے کھلاتے رہے انہوں نے حلق میں انگوٹھے ٹھونس دیے تھے۔

اتنی جلدی سورج کیسے ڈوب سکتا ہے نور کیسے بجھ سکتا ہے، ابھی تو ان آنکھوں نے پاکستان کی رو پہلی شعلہ دیکھی تھی، کتنی خواہشیں، کتنے شوق ان کی آنکھوں میں جلتے بجھتے تھے، پاکستان کا نام لے کر ہی چہرہ کھل جاتا تھا۔ دیوانگی اس حد تک بڑھ چکی تھی تیند میں ان کی واضح بڑبڑاہٹ محسوس ہوتی۔

”لے کر رہیں گے پاکستان، بن کر رہے گا پاکستان“ سننے پر گولی کھائیں گے پاکستان بنا میں لگے۔ ”دوبارہ پہلے کی بات تھی کہنے لگے۔

”سوچ رہا ہوں بھرجائی، پاکستان ایک بار دیکھ آئیں مہر نہیں ہوتا“ پھر اچانک سے سیالکوٹ دیکھنے کا پروگرام بنالیا، اور چلے بھی گئے، تقریباً ”ہفتہ لگا کر آئے تھے، رو میں، رو میں، خوشی، لفظوں میں چاشنی“ سیالکوٹ کا تذکرہ کرتے صبح بیٹھے رات ہو جاتی۔

”بس بھرجائی، پاکستان کی ٹانی کوئی مٹی نہیں، ایسی سوندھی ہے کیا گیہوں، کیا سونا، کھیتوں کے رنگ ہرے کچور، دھلے دھلائے لہلاہتے، ہوا مشک بار بدن کو چھوئے جگر فرحت آگیاں۔ پانی ایسا زم زم جیسا، پی پی طبیعت، سر نہ ہو۔“ خدا جانے حقیقتاً ”ایسا ہی تھا یا ان کے صاف دل لوگوں میں اپنی ہونے والی مٹی سے عقیدت کا جذبہ اس قدر تھا۔ ہر احساس پر حاوی، ہر چیز سے محبوب۔

”کیا واقعی بھائی جی!“ تائی ثریا کی آنکھیں استعجاب سے پھیلیں۔

”میں جھوٹ تھوڑی کہہ رہا ہوں۔“ ضیا الدین نے بولتے ہوئے قیصر کے کیمے میں ہاتھ ڈالا۔ ایک روال کی چھوٹی سی پوٹلی باہر نکلی اور سب کے

سامنے کھول کر رکھ دی۔ سنہری تانہ تانہ مٹی کی ہونڈھی خوشبو ایسے تھی جیسے کنواری حسینہ کے بدن سے اٹھتی ہو، منتھنوں کے ذریعے دماغ کی ہر نرس کو تراوٹ بخشی تھی۔ سب نے تبرک کی طرح ہاتھوں میں لے لے کر سونگھی، چوٹی، صلاح الدین نے چٹکی بھر منہ میں رکھ لی اور قفا خرسے بولے۔

”تب ہی کہوں، ضیا الدین ایک ہفتے میں جوان کیسے ہو گیا، بھئی جنت سے ہو کر آ رہا ہے۔“

”ضیا چاچا۔“ بیان کو شرارت سو جھی۔ ”ایک ہفتے میں جوان ہو گئے ہمیشہ رہیں گے تو۔“ نو جوان کہیں نئی چاجی ڈھونڈنی نہ پر جائے۔ ”بیان کے مذاق صلاح نے گھر کا، ثریا، مبرا، شرمیں، مگر ضیا الدین ہنسنے لگے تھے پھر تاسفانہ ہو کا پھرا۔

”نک۔ ہا۔ بیٹا یہی تمنا سیدہ جلاتی ہے، تیری چاجی کی ڈھیری کسی طرح اپنے ساتھ اٹھالے جاؤں، وہ ظالموں کے بیچ کیا کرے گی۔“ چاجی نے منب کی ڈھیری تو کیا ساتھ جاتی وہ خود بھی وہیں ڈھیر ہو گئے تھے ہر تمنا، ہر آرزو، آزادی، وطن سب مٹی کی اک قبر میں دب گئی۔ ان کی روح کے قرار کے لیے بیان نے سیالکوٹ کی وہ مٹی جو پولی میں بندہ مہینے سے چاچا کی جیب میں تھی ان کی لحد کے اندر اور اوپر چھڑکی اور بست دیر وہاں بیٹھا روتا رہا۔

”یوں اچانک سے موت جانے پہچانے رستے پر کیسے پاؤں رہنا، ایسی بھی کیا چوٹ لگی جان ہی لے لی۔ بے شک ان کا پھاوڑ ان کے پاس سے ملا تھا، گرنے سے گھاؤ سر کی پشت کے بجائے کن پٹی پر؟ کیا ترچھے گرے تھے؟ زخم کی گہرائی، موٹائی پھاوڑے کی دھار سے خاصی موٹی؟ اگر بیان کو پتا چل جاتا کہ اسی ناگ نے ڈسا ہے جسے بانہوں میں کھلایا تھا تو وہ اس کے بدن کو لیو لیر کر دیتا، اتنے گھاؤ لگا تا کہ امرت شمار نہ کر سکتا، مگر یہ وہ معمر تھا جو مٹی میں دبتا جاتا تھا۔ بالکل مولوی نظام علی کے خاندان کی طرح اور جانے کتنے عاشقان وطن کے معے یونہی مٹی میں دبے جاتے تھے۔

مٹی سے لیے زرد گھر کے دروازے پر سوگ،

سکیاں ہر طرف جھانکنے لگی تھیں۔ رات کی سیاہی میں ابا کے خرائٹوں کی آواز پر وہ چونک، چونک اٹھی۔ ”ابا۔ ابا۔“ پکارتی اور گھٹنوں میں سر دیے گھٹنوں روتی بلکتی۔ تائی ثریا اسے اپنے ساتھ چمٹائے خود بھی رونے لگ جاتیں۔ ان دونوں بچلی گاؤں تو کیا شہر کے ہر گھر میں نہیں تھی۔ سب لائین ساتھ رکھتے تھے بیان سر شام ہی لائین لائن یا اس کی چارپائی کے پائے پر جلا کر لٹکا جاتا تھا، چچا ضیا کی زندگی میں وہ رات کو ہمیشہ اپنے گھر میں رہتی تھی، مگر اب مستقل تیا صلاح الدین کے ہاں رہنے لگی۔

دن، ہفتے، مہینے گزر گئے۔ اللہ کی بے شمار نعمتوں میں بھول بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر یہ انسانی دل و دماغ کے لیے نہ بنائی جاتی تو دنیا پہلے غم پر ختم ہو جاتی۔ اباں حوا ہاتھل کے غم میں اور بچے جنا بھول جاتیں۔ صدے، مقصد کائنات روک دیتے، مگر اللہ عزوجل کا بڑا احسان ہے اس نے انسان کے لیے بھول بنائی اور انسان غم سے نکل کر آہستہ آہستہ زندگی کے راستے پر سوار ہو جاتا ہے۔ زندگی ضیا الدین کے بعد پہلے رکتی محسوس ہوئی پھر آہستہ اور پھر معمول پر چلنے لگی۔ زندگی کے محرک ہوتے ہی عزیز و اقارب کی صدے سے تلو لگی زبانیں حرکت میں آ گئیں۔

”اے ثریا! تو اتنی سمجھ دار بنی پھرتی ہے اور جوان بچے گھر میں ایسے ہی چھوڑ رکھے ہیں، پہلے تو سر پر باپ تھا، مگر اب؟ تیرے سامنے پلی، بڑھی، سوہنی کڑی۔ بیاہ کیوں نہیں دیتی اپنے لڑکے سے۔“

”ابا! میں تو بیل نہ لگاؤں، مگر تیرا بھائی کتا ہے اپنے دیس جا کر پہلی خوشی کریں گے۔“

”اے پاگل۔“ وہ پھر کہنے لگیں۔ ”حالات تو دیکھو، ایسے میں بندہ پیدا ہوتی بیاہ دے۔“ مگر ثریا کیا کرتیں۔ پاکستان جا کر خوشی منانا صرف صلاح الدین ہی نہیں بیان الدین کی بھی خواہش تھی۔ جب تذکرہ بیان کے سامنے چھڑا تو اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا۔

”اباں! خوشیاں اپنے گھر اپنی مٹی پر اچھی لگتی ہیں

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

اور یہ دشمن ہم پر حملہ اور یہاں کے پاسی ہمارے
برائے۔ "اعلان پاکستان میں جانے سرکار نے کتنا وقت
لگانا تھا تاریخ دی جا چکی تھی، مگر جھنڈا لہرانے میں
زبردست رخنے بن رہے تھے۔ لوگوں کی باتوں اور
خدشات سے گھبرا کر جمعے کے دن نماز جمعہ کے بعد سادہ
سی نکاح کی تقریب رکھی گئی۔ بیان کی تمنا کا بھی خیال
کیا گیا۔

"کہہ لیا ٹھیک ہے جیسے آپ اور ابار شے کو محترم
بنانا چاہیں، مگر باقاعدہ رخصتی و دعوت ولیمہ میں اپنے
گھر پاکستان میں کروں گا۔" کسی کو اعتراض نہیں ہوا
تھا۔

بیس سالہ کڑیل خوبرو بیان سفید لٹھے کی قیص
شلوار کالی واسکٹ، جناح کیپ میں بھرا بھرا مضبوط آج
کل کے پچیس، چھبیس سال کے اسمارٹ نوجوان سے
زیادہ برکش و جیمہ لگ رہا تھا۔ سبز ہریالی سائن کا کھلا
کھلا قیص شلوار جس کے دامن اور گلے پر سلور چمپا
کلی گو کھروسے باڈر بنا تھا، گولے کناری والا بڑا سا سبز
دھنیا سرے سینے تک گھونگٹ نکالے۔ سیاہ بڑی بڑی
آنکھوں میں کاجل کے ڈورے دمکتی گوری رنگت،
ہونٹوں پر سرخی۔ سترہ سالہ مبرا تائی ثریا کے ساتھ
شرابی چپک کر بیٹھی تھی۔ نکاح کے تحفے کے طور پر
بیان بہت ڈھونڈ کر بہت خوب صورت چیز لایا تھا اور وہ
اس کی ستواں ناک میں جب تائی ثریا نے پہنائی سیاہ
نگوں کے لونگ کی چمک ہی بدل گئی۔ وہ ناک سیکڑنی
نگ لشکارے مارنے لگتے۔ ثریا اپنی بہو کے لیے سرخ
شنیل کا جوڑا منگوانا چاہتی تھیں، مگر بیان نے قدرے
جھجکتے ہوئے کہہ دیا۔

"اماں لال رنگ سے خون کی بو آنے لگی ہے، تم
سبز بنالو، ہرا بھرا، امن و سکون کا رنگ۔ اور جب ہم
پاکستان جائیں تو میرا وہی پہن کر، ہری بھری امیدوں
کے ساتھ جائے گی۔"

"چل دیوانے۔" انہوں نے اس کے شانے پر ہار
بھری دھپ لگائی۔ "خون کیوں؟ شمن کا رنگ بھی لال
ہوتا ہے، مہندی نہیں دیکھی، کیسی لال ہوتی ہے۔"

"مہندی ماں، مہندی تو ہری ہوتی ہے، پتا نہیں رنگ
لال کیوں چھوڑ جاتی ہے۔" آہ کتنی حقیقت ہے اس
بات میں، امن و سکون کا ہر رنگ کیسے ہر چیز سرخ کر دیتا
ہے، برسوں اس کی سرخی نہیں جاتی، شمن، مٹی، ہندی،
نالے سب سرخ گرم سیال۔

نایا صلاح الدین نے اس کے سر سبز آنچل پر مان
بھرا ہاتھ رکھا، اقرار لینے کے لیے نکاح کا رجسٹر اس کے
سامنے پھیلایا تاکہ انگوٹھا لگا دے، مگر اس نے انگوٹھے
کی جگہ ٹوٹا پھوٹا ہی سہی، مگر اپنا نام "ممبر اپیان" لکھ
دیا۔ نایا حیران۔ انہیں کیا پتا بچپن میں بیان سے ہی
اس نے نام لکھنا سیکھ لیا تھا۔ گھر میں دو ہی بچے تھے۔
جیسے سب پکارتے "ممبرا۔ بیان" ویسے ہی اس نے
لکھنا شروع کر دیا۔ دونوں کا نام ساتھ جڑا الوہی چمک
دیتا تھا۔ ہر لب پر مبارک سلامت تھا۔ وہ نایا کے سینے
میں تھسی گہرے سانس لیتی تھی۔ کالا کاجل آنسوؤں
میں لپٹ کر صلاح الدین کا گریبان بہت دیر بھکوتا رہا۔

ستارے نکلے گولے کناری والے سبز آنچل سے
اسے الوہی سی محبت ہو گئی تھی، جس دن سے وہ اوڑھ
کر بیان سے نام جڑا تھا اس میں سے عقیدت و اعزاز
کی خوشبو محسوس ہوتی۔ ایسی مہک جو چار اطراف
حصار باندھ لے۔ جلت رنگ بچ انھیں، رہا پ کے تار
چھڑ جائیں، ہر طرف بیان دھڑکتا ہو۔ تائی ثریا کے
سامنے شرم کے مارے، بھی دوپٹے پر نگاہ بھی نہ ڈالی، مگر
چوری جیسے بھی دن میں، بھی شام، رات میں دوپٹا
نکالتی سو نکلتی، چومتی، کوڑھتی پھر شرما کر خود میں سمٹ
جاتی۔ نکاح کے بول کی طاقت کا اندازہ بیان کو بھی بعد
میں ہوا تھا۔ اسے پکارنے، بلانے میں آواز لہجہ دونوں
بدل گئے۔ خاصے فاصلے سے گزرنے پر بھی دل کی
دھڑکن غیر معمولی ہو جاتی، اسے چلتے پھرتے، کام
کرتے دیکھ کر اچھا خاصا دھیان بٹ جاتا، نگاہ بار بار
اسے ڈھونڈتی۔ راتوں میں چارپائی کی چرچراہٹ بڑھ
جاتی، کتنی بار اٹھ کر ضیا الدین پچا کے کمروں میں جاسویا
تھا۔ بس ایک تمنا روکے تھی، اپنے وطن میں جا کر نئی
زندگی آباد کریں گے۔

وجہ دیکھ کر ثریا دہل کر سینہ تھامے اس کی سمت بڑھیں۔

”کیا ہوا بیان خون کیسا ہے؟“ مبرا چولہا ہانڈی چھوڑ پلو منہ میں داب پیچھے آکھڑی ہوئی۔ وہٹا کا ایک پلو پھاڑ کر اس کی جانب بڑھایا۔

”نہیں۔۔۔“ اس نے انکار کرتے اپنا بازو اوپر اٹھایا آستین سے ناک منہ رگڑ لیا۔ ”آج کے بعد گھر سے باہر قدم مت نکالنا، کبھی کسی صورت بھی۔ جب تک میں نہ کہوں۔“ وہ پورے استحقاق سے اسے کہہ رہا تھا۔

”آخر بتا تو سہی ہوا کیا ہے؟“ ثریا نے پوچھا۔
”بھی کچھ نہیں ہوا، مگر ہو ضرور جائے گا، اگر امرت کا سایہ بھی گھر کے باہر سے گزرا۔ اور سن لیا تو نہ۔“ یاس سے گزرتے ہوئے پھر سے یاد دہانی کروائی تھی۔ وہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھے گئی۔ اتنے ٹھوس اٹل انداز میں تو وہ کبھی بھی بات نہیں کرتا، بھلے کچھ ہو جائے۔ ”ہاں“ اسے یاد پڑتا تھا آج سے کئی برس پہلے تب وہ بارہ تیرہ برس کی تھی۔ بیان سے نیا نیا اپنا نام لکھنا سیکھا تھا۔ ٹیڑھا میڑھا چار حرفی نام لکھنا آئی گیا۔ مہندی گھول اس کے سفید گہرہ کی گردن پر بڑا سا لکھ دیا۔ ”مبرا“

”یہ تو نے اس پر کیوں لکھا ہے؟“ لہجہ ترش کھورہ تھا۔

”تجھے یہ گھوڑا پسند ہے نا بس اسی لیے۔“
”بے وقوف!“ اس نے گردن جھٹکی۔ ”یہ ڈنگر ہے اور مبرا کوئی ڈنگر نہیں۔ سمجھی! آج کے بعد میں نہ دیکھوں، اس پر تیرا نام۔“ اس کا حکم بھرا لہجہ بالکل آج جیسا تھا۔ ہرنی جیسی بڑی بڑی آنکھیں وحشت سے پھیلیں پھر سٹ گئیں، اس نے ہلکا سا اثبات میں سر ہلایا تھا اور اندر کہیں بہت دور تک تحفظ کا احساس آن بسا تھا۔



امرت بہت دنوں سے گاؤں میں نظر نہیں آیا تھا۔ سننے میں آیا تھا اس کا تبادلہ دور ہو گیا ہے۔ بیان نے اسے اپنے نکاح کے کچھ دن بعد ریل کی پٹری والے رستے پر دیکھا تھا۔ اس کا گمان تھا شاید وہ اسے مبارک دینے آیا ہو۔ کسی وقت کا پکا یار تھا۔ غالباً نکاح کا دعوت نامہ جمعنے ٹائی کے ہاتھ بھجوا یا بھی تھا، مگر اس کے باپ رندھاوانے کہہ دیا۔

”وہ ایسے فضول کاموں کے لیے فارغ نہیں ہوتا۔“ اب پتا چلا ہو اور آگیا ہو، اسی خام خیالی میں وہ پرانی رنجش بھلا کر ہاتھ ملانے آگے بڑھا، مگر وہ استہزاء سے مومچوں کو بل چڑھانے لگا۔

”سنا ہے راج مگر کی سوہنی تیرے نام چڑھ گئی ہے۔“ بیان کی آنکھیں تحیر سے پھیلیں، پیشانی تنی۔
”حالانکہ ہرنی ہرن کے ساتھ جیتی ہے۔“
”امرت!“ وہ چلایا۔ ”تجھے کوئی شرم حیا ہے یا ماں، بس کا احترام بھی کھل گیا۔“

”بہن لگتی تھی وہ تیری۔“ اس نے کہنے پن سے انگشت سینے پر رکھی۔ ”میرے تو یہاں بستی تھی۔“ اس کی ہر حد جواب دے گئی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ سے بے حد زور سے طمانچہ امرت کے منہ پر مارا کہ ہاتھ پر بندھی نئی گھڑی جھٹکے سے کھل گئی۔ دونوں کے بیچ کا تم گلوچ، شدید لڑائی ہوئی تھی۔ کھونے، پھسڑ گربان چاک ہو گئے۔ کچھ راہ کیوں نے بیچ بچاؤ کروایا تھا۔ امرت کے منہ اور بیان کی ناک سے خون بننے لگا۔ اس نے ناک آستین سے پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

”اس خون کی بددعا ہے تجھے امرت! جیسے تو نے دوستی کو بے اعتبار کیا، اسی طرح تیرے اپنے بے اعتبار ہو کر تیرا خون پیئیں گے۔ تو روک نہیں پائے گا۔“
”او۔ دفع ہو! بڑا آیا بددعا والا۔“ گھر میں داخل ہوتے ہی وہ گھڑولے کی جانب تیزی سے بڑھا تھا۔ نکلا چلایا اور منہ دھویا۔ گربان چاک آستین پر خون کے

ساون کی بارشوں کا نور ٹوٹ چکا تھا۔ نہریں بھر

گئیں مہربانی جھوٹی سی ملی کی دیوار بیٹھ گئی۔ گنگا جتنا خوب اچھل اچھل بہتے — راوی کنارے پروا کی مدھر خنکی میں سارنگی کا گمان ہوتا تھا۔ موسم کی نازکی اور آنے والے لہات کا احساس رگوں میں اپنی جگہ مگر دل کو ہر وقت اک دھڑکا سا لگا رہتا، جانے کب کیا ہو جائے، پورے علاقے میں اندرون خانہ سازشوں کا جال بچھا جاتا تھا۔ بظاہر ہمدرد، مہمان بنے، پشت سے کھال اتارنے کے درپے تھے۔

رمضان المبارک کا خوب صورت چاند نئی نویلی دلہن کی طرح مسکراتا تاروں کے جھرمٹ میں گنگن پر نمودار ہوتے ہی چھپ گیا۔ فضاؤں میں عقیدت کے رنگ سما گئے، مٹون کی خوش الحانی بڑھنے لگی، گھروں میں تلاوت قرآن پاک و طائف عروج پر تھے۔ کبے گرم دلوں کی بڑھتی محضن کے روزے بھی پر صغیر کے مسلمانوں کے لیے روح افزاں تھے۔ اک غمناک تارا جسے دیوانے کا خواب، احمقوں کی جنت، بے عقلوں کی سوچ کہہ کر تھک چکی تھی، مگر اب اس کی لودن بدن تیز ہو رہی تھی۔ بس کوئی بل تھا۔ جھنڈا لہرایا کہ لہرایا۔

لاہور بکریٹریشہر تو کب کا اک دلیر متوالی نے اپنے آچل کا بنا کر لہرا دیا تھا، مگر سارے دیس پر لہرا نا پاتی تھا۔ ریڈیو پر خبر نامے کا ساز گونجتے ہی گھر کے تمام افراد پروانوں کی طرح اس کے گرد جمع ہو جاتے آواز تو آواز سانس تک روک لیتے مبادا سماعت کسی خبر سے محروم نہ رہ جائے۔ زہنی، فضائی، حسندیاں طے پا چکی تھیں پانی کی تقسیم اور دوسرے معاہدے ہو رہے تھے۔ ادارے بٹ رہے تھے، فوجیں بن رہی تھیں، ہر جگہ ہر چیز پر مسلمانوں کو سمجھوتہ کرنا پڑ رہا تھا۔ چپ کروایا جا رہا تھا زبان سے، نہیں تو جان سے، کنوئیں سے نکلے چند ڈول پر بھی مسلم سجدہ شکر بجالاتے۔

مخالف قوم اک قطرہ دینے پر رضا مند نہ تھی۔ خواص سے زیادہ عوامی طبقہ آنکھوں میں لہو لیے پھرتا۔ بات بے بات دست دگر بیاں ہو جاتے۔ ساتھ بیٹھ کر دعوتیں لوٹنے، میلے دیکھنے والے اک دوجے کے لہو سے خود کو رنگنے کے لیے بے تاب رہتے۔ وہ جب

گھر سے نکلتا پیچھے اس کا نازک دل ہولنا رہتا تھا۔ امرت و دشمنی براتر آیا تھا۔ کتنی بار تو سہتی خود بے لفظوں میں کہہ گئی تھی۔

”یہاں کے حالات اب تم لوگوں کے لیے اچھے نہیں رہے، بیان کو ہوشیار رہنا چاہیے۔“ مبرا کا دل مٹھی میں سمٹ جاتا۔ بار بار بہانے بہانے سے اینٹوں کی جالی میں نگاہ جمائے اس کی راہ ہکتی رہتی۔ اب بھی لائین ہاتھ میں پکڑے بہت دیر سے سرخ جالی کے پار جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ فیروز کی لعل کا چناؤ پٹامہ میں دے اس کے گھر کے ٹاپوں کی آواز جیسے جیسے قریب آئی شکر بھرا سانس اندر تک پھیل گیا۔

”مبرا۔ اے مبرا۔“ عقب سے آئی ثریا کی آواز پر وہ چونک کر مڑی۔

”کیا دیکھ رہی ہے۔ آنے ہی والا ہو گا وہ۔“ راز فاش ہونے پر منہ وا ہوا گیلا پلو چھٹ گیا۔ دودھیا بے داغ رخساروں پر حیا کی لالی دھڑکن بے ترتیب، پلکوں پر لرزہ، ثریا مبہم مسکرا دیں۔

”تیرا تایا“ تجھے آوازیں دے دے کر چلا بھی گیا۔ لائین کا ڈسکن آج پھر رہ گیا، اب تو نے یاد رکھنا ہے، بیان کو کہہ دوں گی، وہ لگو الائے گا۔ پاکستان جاتے اپنی روشنی ساتھ لے کر جائیں گے۔“ وہ اس کی خفت مٹانے کے لیے اس کی کلائی تھامے باہر چارپائی پر لے کر بیٹھ گئیں۔



”شام کا وقت تھا۔ وہ قیلو لے کے بعد کمرے سے نکلا پانی منے کی غرض سے گھڑوئی کی جانب بڑھا تھا۔ پٹ سن کی کیلی بوری لیے گھر کے ساتھ ایک رنگین صراحی بھی دھری تھی۔ تقریباً سولہ سترہ سال بعد اس اس نے گھر میں صراحی دیکھی تھی۔ اس نے تحیر سے بھنو میں سکیڑ کر زہرہ کو دیکھا۔

”یہ کون لایا ہے؟“

”بی بی نے ریڑھی والے کھارے سے خریدی ہے،“ کہہ رہی تھی اس کا پانی بڑا ٹھنڈا، میٹھا، فرحت بخش

عادتیں ملتی جلتی ہوتی ہیں، میرا دل دکھا ہوا ہے اسی لیے بار بار شک اپنے علاقے سے تعلق پر جاتا ہے۔



بیان کے نام پر اس کی کانپتی پلکیں، شرم سے لرزتا بدن، نرم گورے گالوں پر دوڑتی حیا کی سرخیاں، ثریا کو بے حد پسند تھیں۔

پہلے اس کے سامنے جان کر بیان کا تذکرہ چھیڑتیں پھر مسکرا کر اسے دیکھتیں، خود میں بھیج لیتیں۔ وہ دونوں چولہے کے پاس بیٹھیں افطاری بتا رہی تھیں۔ ثریا آہستہ آہستہ اسے گھر داری، مہروں کا مزاج، ازدواجی زندگی، بچوں کی پرورش کے بارے میں بہت سی باتیں بتا رہی تھیں۔ نسل پر پودے، انار دانے کی چشتی رگڑتے اس کا چہرہ انگارے کی طرح لودیتا تھا۔ چشتی نور نور سے رگڑنے سے کان کا بالا ہلتا جو خاصی دور جامن کے درخت تلے کچھی سفید چاندنی پر بیٹھے ہاتھ اٹھاتے بیان کی دعا میں کچھ خلل سا ڈالتا اس نے قدرے پہلو بدلا۔

آج کل عبادت اور دعاؤں پر خوب نور تھا۔ غالباً دیوانے کا خواب مجسم حقیقت ہوا چاہتا تھا۔ افطار اور اس کے نتیجے میں ملی عید — کی خوشی اللہ عزوجل نے پہلے روزے کے ساتھ ہر مسلم کے لیے عطا کر دی تھی، لیکن سن 47ء کے رمضان میں افطار، عید، باب الریان کے ساتھ برصغیر کے پے مسلمانوں پر اپنی بہترین مقبول ترین مہرک رات میں ماویٰ کی وادوں سے ایک ٹکڑا اپنے بندوں کی جمہولی میں ڈالا، اس تمبرک کا خیال رکھنا، سنبھال رکھنا، امن سے، قوت سے وحدت سے۔ پھیلو، راج کرو، صحرا، سمندر، پہاڑ، مٹی اور اس میں دفن پیش قیمت خزینے مختص کر دیے تھے۔

فرشتوں کی پر نور جماعت کے ہمراہ ہواؤں، فضاؤں، پانیوں میں، اپنے معصوم بھولے لوگوں کو کتنی بے حرمتی سے ہماری نسل کہہ دیتی ہے۔

”پاکستان میں کیا رکھا ہے، باہر چلو، مستقبل بناؤ۔“

ہوتا ہے، بوری لیٹنے نہیں پڑے گی۔ اس کی سن نگاہیں کمرے کی کھڑکی سے دکھائی دیتی بی بی کی پشت پر گڑ گئیں۔ وہ پانی پینا بھی بھول گیا تھا۔ قرش پر چکرائی ایک رنگین صراحی کی ٹوٹی گرون اور سانولی سستی کی پانی سے لباب بھری آنکھیں نگاہوں میں آریں۔ اس دو ڈھائی سال کے عرصے میں وہ بات بات پر چونکتا اور کئی کئی دن کے لیے الجھ کر رہ جاتا۔ ایک دن اس نے ٹھان ہی لی اس سے خود پوچھے گا۔ وہ کہاں کی رہنے والی ہے، کس خاندان سے ہے۔



زہرا اپنے کمرے میں سو رہی تھی اور وہ چائے دم پر رکھے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ سائیں اس کی جانب آکھڑا ہوا اور اس کے سوال نے اسے سٹپا دیا۔ اس نے سمجھتے ہوئے سر گھٹنوں میں دے لیا۔ وہ اس کے سامنے اچھا خاصا گھونگھٹ کے اور بائیں رخسار سے پلودانت میں دا بے ہمیشہ خاموش رہتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ سر ہلا کر کسی بات کا جواب دے دیا، لیکن آج کے سوال پر اس کا سر بھی نہ ہلا۔

”ٹی بی میں بھی تمہاری طرح مہاجر ہوں، بڑی عزت کرتا ہوں تمہاری، میری بہنوں کی طرح ہوتی۔“ وہ اس کے سر پر مان بھرا ہاتھ رکھ اندر کمرے کی جانب بڑھتا تھا۔ آج اس کے ہاتھ کالمس پھلتے گرم لوہے کی طرح بدن پر گر رہا تھا۔ اس کا سارا بدن آگ کی طرح چپ گیا۔ زمین پھٹے وہ اس میں سما جائے۔ بہت سے لوگ جل کر مرتے دیکھے تھے۔ آخر یہ کیوں نہیں جل کر مرجاتی۔ سرخ نارنجی دھکتے انگاروں کو دیکھ کر اس کا جی چاہا پرات بھر بھر انگارے اپنے اور ڈال لے۔ وہ اپنے کمرے میں بے حد شرمندہ بیٹھا تھا۔

”جانے میرے بارے میں وہ کیا سوچتی ہوگی، مجھے یوں اکیلے میں اس کے پاس نہیں جانا چاہیے تھا، زہرا اور بچے بھی تو پاس نہیں تھے۔ آئندہ احتیاط کروں گا“ براہ راست پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، زہرا پوچھ تویتی ہے، اگر جانا ہوتا بتا دے گی۔ ویسے بھی مہاجروں کی

کتنے مکر، سفاک ہیں وہ خدشے۔

”پاکستان کے جو حالات ہیں، وہ ٹھیک ہوتے دکھائی نہیں دیتے۔ پتا نہیں۔؟ چند سال بعد۔؟ کہیں یہ ملک بھی۔؟ کیا تمبرک میں بخشی گئی چیز اور دینے والا شہنشاہ کل اپنی بخشش واپس لے سکتا ہے؟

ہرگز نہیں! البتہ ہم اپنے اعمال، عادات، حرص، ہوس سے اس کی اہمیت کم ضرور کر سکتے ہیں، اس لوگو کو جو اس دھرتی کو رنگ دینے میں بچھاور کیا، وہ خواہشیں دفن ہوئیں، وہ محبتیں جو جلتی بجھتی اپنی آنکھوں پر، نفس، خواہشات کی بی بی باندھ کر سب پس خیال ڈال سکتے ہیں، لیکن خالق اکبر و حقیقی اپنی مخلوق سے نذرانہ واپس نہیں لیتا، جو دے دیا سو دے دیا تمبرک بھلے چٹکی، بھلے تھال۔

اک تھال کی طرح سجا چٹیل میدان کہیں پانی کی لکیریں، کہیں ذخیرے، کہیں بلند و بالا کسار، برف سے نکلنے، آبشار، اک خطہ مقدس، دھرتی ماں اپنی اماں کی پیشانی کا پتا ملتے ہی سکون اندر تک تراوٹ اُتار تا تھا۔ ہندوستان میں منالی گئی وہ عید ایسے تھی جیسے نامہ اعمال لے کر پل صراط پار جنت ہو۔ پل صراط تو پل صراط ہے ناں، راہ تیز و ہار، ہر قدم دشوار اور اس راہ کی تیز و ہاری عود کر آتی تھی۔ جن نصیح و دور اندیش لوگوں نے فضا میں لال اندھیرے کی بو سونگھ کر ہجرت جلد کی وہ امن میں رہے، لیکن جنہیں ہمسائیوں پر مان تھا، دوستی پر بچا کچھالین تھا وہ لٹ گئے کوئی راہوں میں، کوئی پناہوں میں۔

منالی ثریا کی بوڑھی والدہ کچھ عرصہ سے علیل تھیں۔ عورت کی ٹھٹھی میں اپنی ہر چیز سے محبت گندمی ہوتی ہے۔ اپنی مٹی، اپنا گھر، اپنا سامان، ایک ایک چیز کی دیکھ ریکھ کی، تنکا تنکا جوڑ آسانہ بنایا۔ بھلے زیادتیاں تھیں، مگر گھر تو اپنا تھا۔ اتنی آسانی سے کسے سب چھوڑ کر کہیں اور چل پڑیں۔ اندر ہی اندر غم گھن کی طرح چائے لگا۔ کھانسی تیز بخار میں بدلنے لگی۔ جھنڈا لہرایا گیا تھا۔ سرزنش وطن کے ترانے بج گئے تھے خوشی بہت تھی، مگر جنم بھوی کے چھوٹے کا غم بھی بہت تھا۔

اسی لیے پیار ہو گئیں۔ بچان کے نکاح پر ثریا کے میکے سے سوائے ایک بھائی کے کوئی نہیں آیا تھا۔ ٹیلی گرام، تار کے ذریعے اماں کی دن بدن بڑھتی سنبھلتی طبیعت کا پتا چل جاتا۔ اب جب قافلے آئے دن نکل رہے تھے انہوں نے بھی سامان باندھنا شروع کر دیا تھا۔ ثریا نے زندگی میں پہلی بار اپنی ماں سے ملنے کی فرمائش کی تھی۔

”ایک بار ملو دو، پھر جانے کب ملیں یا نہ ملیں۔ وہ لوگ اماں کی طبیعت سنبھلنے پر ہی نکلیں گے۔“

صلاح الدین نے ان کی فرمائش کا احترام کیا۔ صبح سویرے نکلنے کو کہا تھا۔ رام پت، راج مگر سے انی دور تھا تانگے پر صبح نکلتے تو سورج ڈھلنے تک پہنچ ہی جاتے۔ ایک دن جانے کا ایک آنے کا ایک دن کا قیام ہی طے ہوا تھا واپس آتے ہی پاکستان کے لیے نکلنا تھا۔ منالی ثریا جاتے جاتے مبرا کو گھر سنبھالنے کی ہدایات دے گئی تھیں۔

”ساری چیزیں باندھ کر رکھے، صندوقوں میں سامان سنبھال کر ملا ڈال دے، چارپائیاں رسی سے اکٹھی باندھے، برتن، بستر اور ہاں پرانے اچار کا مرتبان ذرا آگے رکھے، کچھ دن وہی کھاتے رہیں گے، اناج کی ایک دو پوری۔ سل ہٹا بھی رکھنا، بیان اناج دانے کی چٹنی ضرور کھاتا ہے۔“ وہ اپنے نام پر چونکا اور فرست سن کر قہقہہ لگایا۔

”میری پیاری بھولی ماں! پاکستان اتنا سامان نہیں لے جاسکتے، رزبڑھے، لاری پر بس انتہائی ضروری چیزیں جائیں گی۔ شکر کرنا، جانیں پوری پہنچ جائیں۔“

غالباً جو لوگ ذرا پہلے نکلے تھے وہ بہت سا سامان لے گئے تھے، مگر اب شورش، قتل و فساد میں بدل گئی تھی۔ قاتلوں کو زور و کوب کیا جا رہا تھا، جس گھر میں سامان سمیٹا دیکھتے اسے آگ لگا دیتے، دن و ساراے مرد قتل ہوتے، آپرل روندے جاتے، ماںیں لٹ جاتیں، کتنی بچیوں نے اپنی عزت بچانے کے لیے خود نہول کنوئیں میں چھلا نکلیں ماری تھیں۔ شاید اسی لیے اب قافلے دن کے بجائے رات کو خاموشی سے نکلنے

لگے تھے اور خاموشی میں اتنا سداں ناممکن۔ سنتے ہی
شریائی آنکھیں بھیگ گئیں۔
”کیا مطلب؟ مسلمان بغیر کیسے رہیں گے۔؟“

”اماں جی اپنی مٹی، آرام و سکون۔۔۔ تھوڑا تھوڑا
کر کے سب بنائیں گے اور اگر حالات اچھے ہو گئے تو
بعد میں آکر لے جائیں گے، یہاں ہی چھپا کر رکھ دو۔“
بے بسائے گھر سے دستبرداری کا اعلان کر دینا بہت
آسان، مگر کر دکھانا نہایت مشکل تھا۔ چند گاؤں چھوڑ
کر اپنی اماں کے گھر وہ برسوں بعد جارہی تھیں، پھر
ملکوں کے فاصلے پر کون یہ چیزیں لینے آئے گا ان کا ہاتھ
سنے پر پڑتا تھا۔ اپنے ہاتھوں لپھا فرش، چنی دیواریں،
کسی چارپائیاں، مٹی دریاں، کاڑھی چادریں، ایک ایک
چیز پر پتلیاں گھومتیں، دل بیٹھنے لگتا۔ کئی مہینوں پہلے
جب سستی روز آکر قابل کرتی۔

”تائی تم نہ جانا، سمجھایاں کو، تیا کو۔ یہ گھر تو نے
بنایا ہے اس کے بنا کیسے دل لگے گا۔“
”کیوں نہیں لگے گا۔؟“

انہوں نے بھنتی ہانڈی میں چھینٹا مارا۔ ”وہ بھی تو اپنا
گھر ہو گا۔ اسے بنا، سنوار لوں گی۔“

”تائی جی، پودے کی جگہ بدلنے سے پودا سوکھ کر
ختم ہو جاتا ہے، بوہتا نہیں۔“

”سستی، اگر پانی بروقت اور مٹی موافق ملے تو، جڑ
بھی پکڑ لیتا ہے، پھل بھی دیتا ہے۔“

”یہ سب کہنے کی باتیں ہیں تائی! نفس کے پودے
کو مرضی کی مٹی، پانی نہ ملے تو سوکھے گا ہی اور تو دیکھ لینا
کچھ ہی عرصے میں، یہی علیحدگی کے نعرے مارنے
والے، نفس کے پیچھے اک دو بجے کو کاٹ کاٹ کھائیں
گے۔“

کتنے سفاک، بے رحم، نفس کے پجاری بننے
جارہے ہیں ہم آج کل کے پاکستانی، اپنے آباؤ کی تمام
قرائیاں ان کا بہتا ہوا بھلا کر اس خود غرضی کی ماری سستی
کی بات پوری کر رہے ہیں، حالانکہ محب وطن خوددار
پاکستانی بوڑھی شریائے اس لئے بڑے فخر سے اسے کہتا
تھا۔

”نور فطی من، تیرا، تیرے منہ میں سوا (راکہ)
بد بخت، ہم پاکستانی مسلمان ہیں بھائی بھائی، بھوکے
کر بھی اپنے بھائی کا خیال کر لیں گے۔ اور ان چیزوں کی
یاد تو کیا خیال بھی نہ آئے گا۔“

اس وقت بہت زعم سے انہوں نے کہا تھا، جذبہ
اب بھی کم نہیں تھا، مگر اپنی چیزوں سے فطری محبت
اندر سے کچھ کے ضرور لگا رہی تھی۔

وہ علی الصبح اٹھیں، فجر پڑھنے کے بعد رام پت کے
لیے نکلتا تھا۔ جاتے بل انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے
وہ اس گھر سے ہمیشہ کے لیے جارہی ہیں کہیں بہت
دور۔ شاید صلاح الدین نے کہا تھا جس روز واپسی
ہوگی اسی شام یا صبح پاکستان کے لیے روانگی، وہ ایک
ایک چیز پر ہاتھ پھیرتیں۔ ایک نوالہ بھی حلق سے اترتا
نہ تھا۔ پھر سے مبرا کو ہدایت شروع کردی۔ ”اچھی
طرح باندھ کر اوپر چارپائیاں رکھ دے نا، پیمان الدین
کہہ جو رہا ہے، حالات اچھے ہوئے تو آکر لے جائے
گا۔“ دروازے سے نکلتے نکلتے پھر پلٹیں مبرا کو بہت زور
سے لپٹایا ماتھا چوما۔

”اگر وہ کلمہ ہی سستی آئے، منہ نہ لگانا اور منع کرنا
یہاں آنے سے۔“

وہ حیرت سے تائی کا منہ تک رہی تھی۔ ”بھلا اب
سستی یہاں کب آتی ہے؟ اس کے نکاح کے بعد وہ
صرف ایک دو بار آئی تھی۔ آواز میں نہ سابقہ
کھٹکناہٹ تھی نہ چہرے پر تازگی۔ سانولا رنگ اور
بھی سنولا گیا، آنکھیں چھوٹی کیسے بس مبرا کو تنکے جاتی۔
”ایسے کیا دیکھ رہی ہے؟“ مبرا نے پوچھا۔ وہ پھیکا
سامکرائی۔

”تیری لیکھ (قسمت) پر رشک کر رہی ہوں۔“
”کیسی لیکھ (قسمت)؟ بچپن میں ماں چھوڑ گئی،
جوانی میں باپ اب جب نکاح ہوا تو اپنا علاقہ، اپنی
چیزیں، سکھماں سب زبردستی چھوٹ رہا ہے۔“

”بیابا کے بعد علاقے، سکھماں تو سب کی چھوٹ
جاتیں ہیں۔“ سستی کے ہونٹ استہزائیہ پھیلے۔
”لیکن اگر پیمان جیسا خوبو ہم رائی مل جائے، پھر بھلے

گئی۔ ہوشیار ہو کر رہتا اور ہاں۔ اس کی نگاہ سفید کرتے پر گئی۔

”بقیہ چیزیں رکھ دیے، ضروری ضروری سامان سنبھال کر باندھ، کسی وقت بھی نکلنا پڑ سکتا ہے، ہو سکتا ہے اہاں، ابا کے آتے ہی چل پڑیں، قافلہ تیار ہو رہا ہے۔ کسی بھی رات کو چل پڑے گا اور ہاں۔“ اسے آگے بڑھتے ہوئے یاد آیا۔ ”لائین ضرور رکھ لیتا۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتی اپنی اوڑھنی سمیٹتے ہوئے اٹھی تھی۔ وہ چند قدم بڑھا اس نے پیچھے سے پکارا۔

”وہ۔“ وہ واپس پلٹا سوالیہ آبرو اٹھائے، مگر مبرا چپ اپنے ہونٹ ترکرتی، چباتی، تھوک نکلنے جیسے کچھ گنا چاہتی ہو، مگر الفاظ سلب۔

”کیا بات ہے۔ کچھ کہنا ہے۔؟“

”ہاں۔ ہاں۔“ بمشکل نکلا۔ ”وہ۔ کا۔ کاغذ۔ رکھ لیا۔“ سیاہ گھنی مونچھوں تلے بھرے سرخ ہونٹ میسم سے پھیلے اک ستائشی نگاہ اوڑھنی میں ملفوف حور پر سر پیا سرگی۔

”وہ تو میں نے سب سے پہلے رکھ لیا تھا۔“ اس نے جیب تختیا کر نکاح نامہ ہونے کا یقین کیا تھا پھر چند بل اس کی جھکی نگاہیں، اتاری رخساروں پر لرنہ سیاہ سلیہ، نیچے ہونٹ اور قدرتی سپیدی میں گلال اترنا دیکھے گیا۔ وہ دھیرے سے بولا تھا۔

”اک بات کرنی تھی، تجھ سے۔“ بمشکل لمحہ بھر کے لیے نوکیلی پلکیں اٹھیں، ہیروں کی طرح دھکتی سیاہ آنکھیں، مقناطہ بیت سے بھرا عجب بے پروا معصوم چمکتا حسن، جس میں حیا کے سب رنگ تھے۔ اس کے سارے بدن میں سنساٹ دوڑی اس نے سنبھلتے ہوئے اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیا۔ اس کی خم دار باڑھ بچھ گئی۔

”مبرا۔“ لمحہ میں ہی وہ سب بھول گیا تھا کیا کہنا تھا، کیوں کہنا تھا پھر ہمت کر کے یاد کیا۔

”مبرا! میرا رخصتی اور ولیمہ کے تاویر فیصلے پر، تجھے اعتراض تو نہیں تھا؟“ اس نے لمحے کے چوتھے بل میں گردن جھٹکنے سے لٹی میں ہلائی اور سانس روک لی، وہ

دنیا چھٹ جائے، کیا غم۔“

”جادع ہو۔ تو بیان کو نظر لگا کر رہے گی۔“ مبرا نے خفگی سے چپٹ لگائی تھی اور پھر واقعی وہ ان کی طرف نہیں آئی۔ اگر آتی بھی تو دروازے سے جھانک، ایک دو بات کر کے واپس چلی جاتی۔ وہ سوچ رہی تھی۔

”اب ابھی جا، دیر ہوتی ہے، کوچوان کو ستا ہو گا۔“

تایا صلاح الدین نے کوئی چوتھی بار آواز لگائی تھی۔

”اچھا، رب کے حوالے۔“ ثریا تائی نے مبرا کی پیشانی پھر چومی، بیان کے کندھے دا بے پھر حسرت بھری نگاہ سارے گھر بڑا لی تھی۔ ”میں بیاہ کر یہاں آئی تھی، بیان الدین اور تو یہاں پیدا ہوئے تھے۔“

”ماں پریشان نہ ہو۔ ہم سب سنبھال کر رکھیں گے۔“ نکلتے نکلتے درخت پر لٹکے کچے انار کو پیار کیا۔ ”خدا جانے، تو ابھی تک کیوں نہیں پکا۔ چھوٹا سا پودا لگایا تھا تیرا، پانی دے، گوڈی کر۔ اب جوان ہو گیا۔“ وہ خود کلامی کرتی اوڑھنی سے آنسو پونچھتی صلاح الدین کے پیچھے چلتی جاتی تھیں۔

وہ محن میں بیٹھی سفید کرتے کا گلا سفید ریشم سے کاڑھ رہی تھی۔ بہت دن ہوئے شروع کر رکھا تھا، مگر مکمل ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ کرتا بیان نے پاکستان روائی پر پن کر جانا تھا۔ تائی ثریا کو گئے ایک دن ہو چکا تھا۔ سارا گھر سائیں سائیں کرنے لگا۔ بیان اندر کمروں میں کچھ کھٹو پٹر کر رہا تھا۔ کبھی کمرے میں جاتا کبھی کوٹھڑی میں تو کبھی ابا کی طرف۔ کبھی صندوقچیاں کھولے بیٹھا رہتا۔ غالباً ”صلاح الدین گھر اور زمینوں کے کھاتے اور رجسٹریاں سنبھالنے کا کہہ گئے تھے اور یہ بھی کہ پٹواری سے مل لے، ایک دو کاغذ اس کے پاس بھی ہیں۔ زبان عام تھا پاکستان جانے پر زمین کے کلیم کے بدلے کلیم ملے گا سو سائو سامان کے بجائے کاغذ لے جاؤ۔ کماؤ اور کھاؤ، وہ موٹے موٹے کاغذ ایک دستری میں باندھ، اس کے پاس گزرتے گزرتے کہنے لگا۔

”میں پٹواری کے پاس جا رہا ہوں، دیر لگ جائے

مسکرایا اور ایک ایک قدم آگے آگیا۔ اس کی سانسیں بے ہنگم ہونے لگیں وہ پھر سے مسکرایا۔

”اگر تھا بھی تو پھر مجھے معاف کر دے، میرا دل نہیں چاہتا اس زہن پر کوئی بھی اچھی یاد رکھنے کو۔“ اس نے اپنے دونوں گرم مضبوط ہاتھ اس کے نازک شانوں پر رکھ دیے وہ بے ہوش ہونے کی حد تک ٹھنڈی پڑ رہی تھی۔

”ایک بات تجھ سے کرنے کی نہ کبھی ہمت ہوئی نہ موقع ملا۔“ اس کی سانس رک سی گئی تھی۔ ”تجھ سے محبت میرے دل اور دماغ کی ہر پس میں رچی ہے مبرا، کبھی تنہا نہیں چھوٹوں گا“ بس تم بے اعتبار نہ ہونا۔“

جواباً وہ کپکپاتے لبوں سے کہنے لگی۔ ”محبت کو صرف دل تک رہنے دے۔ بیان اگر یہ دل میں رہے تو عقیدت بنی رہتی ہے جو دماغ کو چڑھ جائے تو جھل پن۔ صرف جھل پن۔“ اس کے گہرے انداز پر بیان کا تقہر نکل گیا۔ اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں سے اٹھائے۔

”بڑی باتیں آگئی ہیں، تجھے اچھا چل ایک بات اور سن اپنا ہر اجوڑا نکال لے بلکہ پن ہی لے جائے کس وقت جلدی میں نکلنا پڑ جائے اور تیرے شگن کا جوڑا رہ جائے۔“

اس کی ساری قوت جواب دے گئی۔ لرزتی پلکوں سے دو موتی، خوشی، حیا، رخصتی کے گالوں پر پھیلے۔ بیان نے ہاتھ بڑھا کر اپنی پوروں پر سے چن لیے وہ دو قدم مزید آگے آیا اس کے بھرے بھرے گرم ہونٹ اس کی ٹھنڈی نم آلود پیشانی پر ثبت ہو گئے تھے۔ وہ پرے ہٹتے ہوئے ٹیکھا سا مسکرایا اور ”جھلی“ کہہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

اس نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھول کر اس کی چوڑی پشت کو کم ہوتے دیکھا تھا۔ اطمینان، آسودگی پور پور اترتی تھی۔ زندگی میں آج پہلی بار اسے اپنی پیشانی دنیا کی نایاب قیمتی چیز محسوس ہوئی۔ اس نے دوڑ کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ آج اسے اپنا وجود کسی مہارانی سے

کم نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بہت دیر سے گھر کا سالان سمیٹ سمیٹ کر چھپا رہی تھی۔ بیان نے کہا تھا۔ سونے جیسی قیمتی چیزیں ساتھ نہیں رکھنی۔ لالچ میں ظالم ہاتھ کاٹ رہے ہیں۔ سالان کی وجہ سے قافلے لٹ رہے ہیں۔ سب سے پہلا خیال اسے اپنی بڑی سی سات لگی لونگ کا آیا۔ اتارنے ہی والی تھی کہ آس پاس تائی ثریا کی آواز ابھری۔

”یہ تو سائیں کے سلامت ہونے کی علامت ہے، بھلے جان چلی جائے، مگر بیاہی لڑکی کی ناک خالی نہیں ہونا چاہیے۔“ اس کا سپید ہاتھ ناک سے پھسل کر دل پر جم گیا۔ اس نے پوری شدتوں سے بیان کی زندگی، صحت و سلامتی کی دعائیں مانگی۔

اس نے زمین میں ایک گڑھا کھودا۔ زینب، ثریا کے گلو بند ہار، بالیاں اس میں دبائیں، مٹی برابر کر دی۔ ”بیان کہہ جو رہا ہے بعد میں آکر لے جائے گا۔ صندوقوں پر تلا ڈالا، چارپائیاں رکھیں، سب چادر سے ڈھانپ دیا۔ ہر چیز رکھتے سنبھالتے اس کا دل بھر بھر آتا۔ کتنا مشکل ہوتا ہے نا اپنے ہاتھوں سے بنائی سبالی چیزیں دوسروں کے لیے چھوڑ کر خود خالی ہاتھ نکلنا، لیکن آزاد مٹی کی خوشبو حوصلہ بڑھاتی گئی۔

”بریں مڑوہ کر جان فشانم رواست“ ایسی خوشی پر جان بھی جائے تو شکر ہے۔ وہ سب کا ایک ایک جوڑا، بیان کا اودھا کڑھا کرتا اور اپنی سبز لال چوڑیاں ایک گٹھڑی میں باندھ رہی تھی کہ اسے اپنی پشت پر کسی کی موجودگی کا گمان ہوا، جھکے جھکے مڑ کر دیکھا۔ چٹیا آگے جھول گئی۔

سہتی کھڑی ایک ٹک اسے اور سٹے سالان کو دیکھ رہی تھی۔ ”میوں اچانک یہ کہاں سے آگئی۔“ اس نے سیدھے کھڑے ہوتے سوچا۔ چٹیا پیچھے کمر پر ڈالی، بیان کے جانے کے بعد اسے کوئی خیال کہاں رہا تھا۔ حالانکہ وہ جاتے جاتے دروازہ بند کرنے کی تاکید کر گیا تھا، مگر پہلے اس کا بس، اس کی خوشبو محسوس کرتی رہی پھر اسی کے بتائے سمجھائے کاموں میں لگ گئی۔

سے پتا ہے وہ چاند تک نہیں پہنچ سکتی مگر چاہت میں
پر تڑپا لیتی ہے اڑان نہیں چھوڑتی۔“

”کیا مطلب؟“ مبرا گھوم کر اس کے سامنے آئی۔
”تجھے واقعی ارجیت سے محبت ہو گئی ہے۔“

اس نے پچھلے مہینے ہی سنا تھا ارجیت سنگھ کا باپ ان
کے گھر رشتہ لے کر آیا تھا اور امرت نے باپ سے پہلے
ہاں کر دی۔ سگائی کا دوپٹا چوڑی مہندی بھی رکھ لی۔ مبرا
نے اس کے دونوں کندھے پکڑ کر شرارتاً جھلائے۔
اس نے خفگی سے جھٹک کر چھڑوائے۔ ”پتا نہیں۔“
کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔



ابا کے گھر کوٹھری، کمرے کے کواڑ بند کر کے وہ
تائی ثریا کے برآمدے میں بیٹھی تھی۔ اس نے ہرا
سوٹ پہن کر کس کر چٹیا گوندھ رکھی تھی۔ نگاہ بار بار
بیرونی دروازے پر جاتی۔

”پتا نہیں کب آئے گا کہہ رہا تھا دیر ہو جائے گی“
کتلی دیر۔ ”تیز چمکتی دھوپ تقریباً“ آدھے صحن
سے سمت گئی تھی۔ اچانک سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ وہ
اوڑھنی سمیٹتی دروازے کی جانب بڑھی تھی۔

”کون۔؟“ کوچنے پر سستی کی گھبرائی آواز آئی۔
”مبرا“ دروازہ کھول جلدی کر۔ ”اس نے دونوں
ہٹ کھول دیے۔ اس کی آواز سے زیادہ چہرے پر
گھبراہٹ تھی۔ وہ تیزی سے اندر بڑھتے کہنے لگی۔
”مبرا جلدی کر زیادہ وقت نہیں ہے“ تجھے بیان بلا
رہا ہے جلدی نکل جلدی۔“

”کہاں ہے بیان۔؟“ اس نے پہلے اسے پھر گھبرا
کر باہر جھانکنے کی کوشش کی، مگر سستی نے اس کی کلائی
کھینچ لی۔

”یہاں نہیں ہے“ جھلی۔ وہ گھاٹ سے پرے ملا
شیر کے گھر ہے وہاں قافلہ تیار ہو رہا ہے رات میں
کسی بھی پل نکل پڑیں گے۔ تباہی تلی راستے میں ہی
قافلے میں شامل ہو جائیں گے تو نکلنے کی کڑبیان نے
تجھے جلدی پہنچنے کا کہا ہے۔“

”تو کب سے کہتی ہے؟“ اس کے استفسار پر وہ
کھوئے لہجے میں بدبالی۔

”میں تو کب سے کہتی ہوں، پر کسی کو نظر ہی نہیں
آتی۔“ پھر قدرے زور سے پوچھنے لگی۔

”تو تم حقیقتاً جارہے ہو۔؟“
”ظاہر ہے۔“ اس نے لاپرواہی سے کندھے

اچکائے۔

”اور تیا“ تائی وہ کہاں ہیں، دکھائی نہیں دے
رہے۔“ اس نے تفتیشی نگاہ دوڑائی۔

”وہ اپنی اماں کے گاؤں میل ملاپ کرنے گئے ہیں“
کل ان کے آتے ہی ہم نکل پڑیں گے۔“

”اور بیان۔؟“

”وہ پٹواری سے ملنے گیا ہے“ اپنے کام نبیڑ کر ہی
جائیں گے۔“ کارنس اور شیلفوں پر سے چیزیں اتار
اتار کر سنبھالتی وہ بہت سادگی سے سب کہتی رہی تھی۔
”سستی! اگر تو میری پکی سہیلی ہے تو ہمارے گھر اور
چیزوں کا خیال رکھنا ہم اپنی چیزیں لینے آئیں گے۔“

”مبرا ایک بات پوچھوں۔؟“ سستی کو اس کی باتوں
سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بے دھیانی سے سستی اپنی
سوچوں میں الجھی تھی۔

”ہاں پوچھ۔“ وہ ایک گٹھڑی بیٹی میں ڈالتے ہوئے
بولی۔

”تجھے بیان سے واقعی محبت ہے؟“ وہ ایک دم سے
ٹھٹکی اور زور سے بیٹی کا ڈھکن چھوٹا۔

”میرا مطلب ہے محسوس تو نہیں ہوتی، نہ تیرے
لفظوں سے نہ تیرے رویے سے۔“

”سستی میری محبت اتنی ہلکی نہیں ہے۔“ وہ دھیرے
دھیرے چلتی اس کے مقابل آکھڑی ہوئی۔ ”کہ لفظ اور
رویے کے پڑے میں تولوں، میری محبت قوس قزح کی
متلاشی نگاہ جیسی ہے، اس کے خاموش رنگ کھمگن پر
مٹ بھی جائیں تو بھی نگاہیں انہیں ٹٹول ٹٹول کھکتی
نہیں۔“

”آہ!“ سستی نے آہ بھر کر بیٹے موڑ لی۔ ”مجھے بھی
محبت ہے اور وہ چکوری کی طرح ہے جسے شروع دن

”لیکن وہ خود کیوں نہیں آیا۔“ اس کی کچھ سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے ایسا کیسے ہو سکتا ہے بیان اسے خود لینے نہ آئے۔

”گدھی۔۔۔ وہ کیسے آئے اس کاروانے پٹواری سے فساد ہو گیا تھا تو جانتی تو ہے اس کے غصے کو پٹواری کا سر پھاڑ دیا اس نے شکر کر ملا شیر موجود تھا۔ بیچ بچاؤ کروا کر اسے اپنے گھر چھپا رکھا ہے پٹواری کے بندے اس کی بوسونگہ رہے ہیں تو یہاں گھر پر اکیلی ہے اس لیے مجھے وہاں بلایا۔“ وہ ہونق سی ہونق تھی۔

”میں تو گھاٹ پر امرت کے کپڑے لینے گئی تھی وہاں ملا شیر کے لڑکے نے دیکھ کر بیان کا پیغام دیا زیادہ سوچ نہیں نکلنے کی کر۔“ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے حلق اندر تک خشک کانٹے دار یہ تو معلوم تھا سب چھوڑ کر جاتا ہے مگر یوں تھا۔ وہ کبھی سستی کو کبھی گھر کو دیکھتی نہ ہونٹ کاٹتی کچھ سوچ رہی تھی۔

”اب کیا سوچ رہی ہے کیوں دیر کر رہی ہے۔“ اس نے اس کی ہری اوڑھنی اتار اپنی شیشوں والی چادر اس پر لپیٹ دی۔ ”یہ اوڑھ“ تاکہ تیرا کسی کو پتا نہ چلے۔“ وہ اس کا بازو تھامے باہر کی جانب کھینچتے جلدی جلدی بچاتی رہی۔

”گھر تو سہی۔“ اس نے بازو چھڑایا گھڑی پر سے لائین اور دیا سلائی اٹھائی۔ وہ خاص طور پر اس کی یاد دہانی کروا گیا تھا۔ پھر وہ گھڑی جو ابھی باندھی تھی اٹھانے کے لیے جھکی بہتی اس سے پہلے جھک کر کھول دی۔

”کیا ہے اس میں؟“ سب سے اوپر آدھ کڑھاسفید کرتا اور ہری ملال چوڑیاں رکھی تھیں۔

”تو چوڑیاں لے کر جائے گی۔؟ یہ تو بھیجیں گی کم عقل شک ہو جائے گا کسی کو۔“

”میرا بے چارگی سے اسے دیکھنے لگی۔“ چھاپا یہ کرتا تو لینے دے وہ پن کر جائے گا۔“

”سستی نے کرتا جھٹک کر اٹھالیا اور بغل میں داب لیا۔“ چل یہ لے لیتے ہیں اب جلدی نکل۔“ وہ اس کا بازو دوپے کوئی لمبی چوڑی تفصیل سنائی گئی تیزی

سے باہر پڑھ رہی تھی۔ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ مڑ مڑ کر نفی گھر رستے کی جانب دیکھتی جاتی۔ آنسو جو آنکھوں سے پھسل کر گالوں پر پھیلتے جاتے تھوڑے خنوں کی اوٹ کیکر کے جھاٹوں سے ہوتی وہ وسطی پگڈنڈی سے خاصی دور عقبی کچے پر چل رہی تھی۔

”یہ کہاں لے جا رہی ہے مجھے؟“ اس کو قدرے تشویش ہوئی۔

”سش۔۔۔ آہستہ بول۔“

وہ سرزنش کرتی کنویں کے پاس آرکی۔ ”میری بات غور سے سن مبرا“ سورج ڈوبنے کے بعد بیان یہاں کنویں کے پیچھے ملے گا اب خاموشی سے اودھرا۔“ وہ پھر گھاٹ کے پیچھے دھولی کی کچی پکی چار اطراف سے ڈھکی برسائی کے پاس آرکی۔ برسائی کی دیوار کے باہر لمبی سی ناندھی جہاں دھولی کے گدھے کے ساتھ اور لوگ بھی چارہ ڈال کر اپنے چوپائے باندھ جاتے تھے۔

امرت بھی اکثر اپنا شیر وہاں ہی باندھتا تھا۔ ”تو اس میں چھپ جا۔“ سستی نے چارہ ایک طرف کرتے ناندھی میں اس کے لیے جگہ بتائی۔ مبرا کی آنکھیں خمیر سے پھیل گئیں۔

”اس میں۔؟“

”ہاں آ۔“ مبرا ہمنویں سیٹھ نفی میں سر ہلاتی رہی۔

”چھا چل۔“ سستی نے چند بل سوچا پھر اسے کلائی سے گھسنتی برسائی میں گھس گئی۔ اس کے ایک کونے میں ملے دھلے کپڑوں کے گھڑ رکھے تھے دوسری جانب چارے کے بورے اپلوں کا ڈھیر۔ اس نے گھڑیوں کی جانب اشارہ کیا۔

”ان کے پیچھے چھپ جا۔“

”لیکن کیوں؟“ اس نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

”تو تو کہہ رہی تھی بیان کے پاس۔“

”تو بہت ہی جھلی ہے مبرا پٹواری کے بندے اسے دھونڈ رہے ہیں تیرے جانے سے اگر اس کا پتا چل گیا پھر تو یہاں بیٹھ میں اسے جا کر آتی ہوں تو کہاں

”جیسے وہ اندر چلے گئے گا۔“
”کیسے مجھے ڈر لگے گا سستی۔“

”ڈرنے کی کیا بات ہے۔ بچپن میں ہم اوھر کھیلتے نہیں تھے، تھوڑی دیر میں سورج چھپ جائے گا، گرو کے واسطے تو یہیں بیٹھی رہتا، جب تک میں یا بیان تجھے لینے نہ آجائیں اور ہاں۔“ وہ جاتے جاتے مڑی لالین کو دیکھا۔

”یہاں بتی نہ جلاتا، کہیں کسی کو شک ہو جائے، بس کچھ ہی دیر میں بیان کو چھپا کر لے آتی ہوں، ہوشیار رہنا۔“

وہ سمٹی، ذکی، اک گھڑی بنی بیٹھی تھی۔ بے ہنگم جگہ، بساند ہی بساند، تنہائی، نیم تاریکی، اس کا دل بے طرح سے دھڑک رہا تھا۔ پل پل صدی کی طرح گزرتا تھا۔ اسے سستی کے خلوص پر بھی شک نہیں گزرتا تھا۔ پچھلے دنوں کتنے حالات خراب ہوئے، مگر سستی کے رویے میں قطعاً فرق نہیں آیا تھا۔ تائی ثریا اور بیان کے کہنے پر اس نے اس سے راہ رسم بہت محدود کر لی تھی، لہجے میں ناگواری رکھتی، مگر وہ پہلی سی بے تکلفی ہی رکھتی تھی۔ اس کے نکاح پر بھی چوری چھپے آئی تھی۔ خاموش تھی، روئی بھی تھی اور بعد میں ایک دو ملاقات ہوئیں تب بھی بہت مطمئن لگی تھی۔ جس طرح ہر سہیلی اپنی سہیلی کے نکاح اور ودائی کے خیال سے اداس رہتی ہے بالکل اسی طرح پھر کیسے اس کی محبت پر شک کرتی۔ وہ صرف انتظار کر رہی تھی بیان اور سستی کا انتظار۔

پڑا خانے سے گھر کی جانب آتی پگڈنڈی سے نیچے درخت اور جھاڑ کی اوٹ میں وہ بہت دیر سے ایسے بیٹھی تھی جیسے کوئی ملی گھات لگائے بیٹھی ہو، وہ آنکھوں سے زیادہ کانوں سے کام لے رہی تھی۔ بار بار کان اوپر کر کے گھبرمکے ٹاپوں کی آواز سننے کی کوشش کرتی۔

”وہ یہاں سے ہی گزرے گا۔“ اتنا یقین تھا، لیکن گھبرمکے ٹاپوں کی آواز نہ آئی تھی نہ آئی۔ سستی اپنی ماں کو ملا جی گئے گھر کا کہہ کر آئی تھی۔

”اماں، میرے دل نے چاؤلوں کی پٹیاں، بنوائی ہیں، اماں جی کے چلی جاؤں۔“ اماں کا اثبات میں ہلکا سر دیکھ کر فوراً بولی۔ ”آج رات ادھر ہی رہوں گی۔“

اماں نے لسی بلوتے کہا۔ ”اچھا ٹھیک ہے، کل آتے سے اپنی مائی کو ساتھ لے آؤ، تیری رضائیاں گنگدنی ہیں اور میرے کو بھی لے آؤ۔“

اماں کی کھلی پچھٹی سے وہ بے فکر ہو گئی۔ سورج غروب ہوا چاہتا تھا۔ ابھی تاریکی سارے رستے پر چھائی نہیں تھی۔ خاصی دور کوئی بعل میں کچھ دابے تیز تیز چلتا اسی جانب بڑھ رہا تھا۔ متوازی چال، مضبوط کاٹھی والا، سر سے صاف اتار کر جھٹکا، منہ پوچھ شانے پر دھرا، کانوں سے نیچے تک آتے گھٹکریا لے ہال، ڈوبے آفتاب کی نیم تاریکی میں بھی اس کی چمکتی صاف رنگت، وہ آنکھیں سکیڑے بغور اسے تک رہی تھی۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا درخت کے پاس سے گزرا، وہ جست لگا پگڈنڈی پر چڑھ گئی۔

”بیان!“ پکار پر اس نے مڑ کر دیکھا، بھنوائیں استعجاب سے سکڑیں۔

”تو گھر جا رہا ہے؟“

”ہاں۔ کیوں؟ تو کیوں پوچھ رہی ہے اور یہاں کیا کر رہی تھی۔“ اس کے کرخت انداز پر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیلاتے سانس بحال کی۔

”انتظار! میرا مطلب ہے تیرا بہت دیر سے انتظار کر رہی تھی، مبرا نے بتایا تھا تو پڑا خانے۔“

”لیکن کیوں؟“

اس کے درستی سے جملہ کانٹے پر وہ تھوک نکل کر بولی۔ ”وہ تجھے بتانا تھا۔ تیرے گھر پر کوئی نہیں ہے، مبرا چلی گئی۔“

وہ پوری شدت سے چونکا اور پھر گھر کی جانب تیز قدم اٹھے۔ وہ اس کی تھلید میں بھاگنے کے انداز میں چلتی کہہ رہی تھی۔

”تایا، تائی صبح یہاں پہنچ گئے تھے، کچھ دیر تیری راہ دیکھی، لیام کوٹ سے ایک سرکاری اربن لاری قصور جاری تھی۔ اس میں سوار ہو گئے، لاری میں بہت سی

عورتیں! بچے تھے ملٹی اور میرا کے خیال سے کہ خیریت سے پہنچ جائیں تیا خود تو چھت برلنگ کر گئے ہیں۔ تو تو جو ان ہے ریل یا قافلے میں بھی آسکتا ہے رات کی ریل کا پیغام دے کر گئے تھے تیرے لیے۔ اس کے ایک سانس اطلاع پر وہ میکا کی انداز میں پلٹا غرا کر دکھا۔

”تو چپ کرتی ہے۔ یا۔!“ سہتی کے قدم اور سانس دہشت سے رک گئے۔ ”اور میرے پیچھے کیوں آرہی ہے؟“

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔ ”میرا نے تجھے پیغام دینے کو کہا تھا۔“

”دے دیا؟ اب جا! ہونہ۔“ وہ گردن جھٹک تیز چلنے لگا وہ بھی پہلے آہستہ پھر تیز اس کے پیچھے آرہی تھی۔ گھر کی چوکھٹ پر پہنچ کر ایک بار پھر اسے گھورا اور دونوں پٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اندھیرا پھیلتا جاتا تھا۔ گھر وچ والی لائٹیں غائب تھیں۔ اس نے چوکھٹوں کے ساتھ بنے طاقچوں کی قدیلیں جلا میں اور میرا کو پکارنا کمروں کو گھڑی کی جانب بڑھا۔

”تجھے یقین کیوں نہیں آتا وہاں نہیں ہے۔“

سہتی کے جملے نے اس کے اعصاب متخل کر دیے۔ ”بھلا وہ تنہا کیسے جاسکتی ہے ابھی صبح تو وہ یہاں چارپائی پر بیٹھی تھی۔“ پورے چاند کی روشنی میں اس کی نگاہیں چاندنی میں نہانی خالی چارپائی پر تھیں۔ وہ تو اسے کہہ کر گیا تھا سلمان سمیٹ کر تیاری رکھے دیر کا ضرور کہا تھا، مگر نہ آنے کا تو نہیں، اس نے میرا اعتبار کیوں نہیں کیا، وہ جلدی ضرور آجاتا، مگر ایک تو پٹوار خانہ اگلے گاؤں کو پر سے پٹواری کی بحث بہتی گنگا میں

سب ہی ہاتھ کیا پورا وجود دھونا چاہتے ہیں۔ پہلے کلندوں پر آمیں بائیں کرنے لگا۔ پھر مطالبت رقم اس کے پاس نہیں تھی جو اسے چپ کروانا، لیکن رقم سے زیادہ قیمتی وہ جسے اپنے اور اس کے بچپن سے پالا تھا۔ خوب دیکھ دیکھ کی، گنہگار جو اس کا بہت لاؤلا تھا۔ پٹواری کی نگاہ اس پر ٹھہری بہت مشکل فیصلہ تھا، مگر کرنا تھا۔ اسے پاکستان بھی نہیں لے جاسکتا تھا، چھوڑنا تو تھا

ہی۔ کہنے لوگوں سے سنا تھا جانوروں کی رمیاں کھول کر اللہ کے نام پر چھوڑ گئے تھے، سو اس نے بھی دل پر پتھر رکھتے ہوئے اس کی باگ پٹواری کے حوالے کی۔ کتنی دیر اس کی پشت، پیشانی، سہلاتا، چومتا رہا۔ تھکے قدموں وہ پیدل واپس آیا تھا، مگر ایسی بھی کیا دیر گئی اب آگئے تھے تو اس کا انتظار کیوں نہ کیا، کسی اور لاری میں چلے جاتے، مگر اکٹھے تو جاتے۔ جانے ان کی لاری کہاں کہاں ہوتی جائے، کہاں رکے، کیسے ڈھونڈوں گا انہیں۔ اس کے ذہن میں اک جھماکا سا ہوا۔

ابا کہہ رہے تھے۔ ”ہم تو مرد ہیں، تنہا کیوں بھی آجاسکتے ہیں، مگر میرا اور تیری ماں کے ساتھ ہم میں سے کسی ایک کا ہونا لازمی ہے۔“ تو کیا ابا نے اپنا ہونا ضروری سمجھا، اسے چھوڑ گئے۔ نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے اسے کچھ بھائی نہ دیتا تھا۔ سر تھا، بہت دیر چارپائی پر بیٹھا رہا۔ میں نے جب سے اسے باہر نکلنے سے منع کیا تھا، اس نے قدم باہر نہیں رکھا، پھر آج میری اجازت کے بغیر، انتظار کیے بغیر کیسے چلی گئی۔ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ جھٹنے کے انداز میں اٹھا، اس کو دونوں شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”ہما میرا کہاں ہے؟ سچ بول، ورنہ تیری جان لے لوں گا۔“

”تو قسم لے لے گرد کی، میری ماں کی، میرا یہاں نہیں ہے، چلی گئی، وہاں تیرا انتظار کر رہی ہے۔“ ”کو اس کر رہی ہے تو جھوٹ بول رہی ہے، وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“ اس نے جھٹکے سے اسے چھوڑا۔ غصے کی شدت سے آواز کانپتی، چہرہ انگارہ بنا تھا۔

”میں جھوٹ کیوں بولوں گی بیان۔“ وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ ”میں نے ہمیشہ تیرا بھلا چاہا ہے، اب برا کیوں چاہوں گی۔“

وہ اس پر کرخت نگاہیں جمائے کھڑا تھا۔ اس کے آخری جملے سے الجھ سا گیا۔ اپنے بھائی کے مقابلے میں ہمیشہ وہ اس کی حمایت کرتی تھی اور جیسے جیسے امرت کا مزاج بگڑنے لگا تو کتنی بار اسے میرا سے کہتے سنا۔

کی جدائی میں ویسے بھی گھٹ گھٹ کر مر جائے گی، قسمت آنے میں کیا حرج ہے اور ویسے بھی وہ بیان کو مبرا سے کہیں زیادہ چاہتی ہے، زیادہ خوش رکھے گی۔ امرت مبرا کو پسند کرتا ہے، اگر ذرا سے جھوٹ سے دو گھر خوش ہو سکتے ہیں تو برائی کیا ہے؟ یہ اس کی سوچ تھی۔ اس بات سے قطع نظر کہ دونوں خاندانوں میں کتنے فرق ہیں، مذہبی، معاشرتی اور اب تو ایک اہم سیاسی فرق بھی بن چکا ہے، مگر پھر بھی اس کے نزدیک عام سی بات تھی اور وہ اپنی سوچ میں کسی حد تک کامیاب ہی رہی جب بیان نے وہ کرنا دیکھا۔

”یہ دیکھ، مبرا نے دیا تھا، تو اسے پن کر جائے گا“ ہاں۔ ”وہ یک لخت ڈھیلا بڑ گیا۔ اک سنسناتی لہر سارے بدن میں تیرتی تھی۔ کتنا ایک مضبوط جنت کی طرح تابوت میں ٹھکا تھا۔“

”تو واقعی اس نے میرا اعتبار نہیں کیا، چلی گئی۔“

وانتوں تلے بھرے لب کو زور سے کاٹا تھا۔

اب اسے پاکستان جانا تھا۔ ابھی اسی وقت کوئی بھی ریل گاڑی یا قافلہ ملے، مگر ابھی جانا تھا۔



خنک رات ہر طرف سناٹا بچھا چکی تھی۔ ایک پر گزر چکا تھا۔ کہیں سے گیدڑوں کی چٹکھاڑیں آئیں، کہیں گھوڑوں اور بیلوں کی گھنٹیوں کی۔ لہ لہ خوف، خدشے بڑھتے جا رہے تھے وہ زندگی میں پہلی بار ایسے تھا اک اجنبی، ہولناک جگہ پر تھی۔ دل کی دھڑکن بدن پھاڑ دینے کی حد تک تھی۔ وقت کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ بس ایک سیاہ رات تھی۔ لمحے کے ہرل میں اسے ایک ہی احساس تھا۔ کہیں کچھ غلط تو نہیں ہو رہا، سستی اس کے ساتھ غلط کیوں کرے گی؟ ہو سکتا ہے پواری کی وجہ سے بیان آج رکا رہے، دن چڑھے نکلے، کہیں خدا نخواستہ۔ اور پھر دل دھڑ دھڑ دھڑ۔



وہ بہت دیر اضطراری کیفیت میں اپنے ہتھکڑیا لے

”بیان سے کہا کہ، امرت، ارجیت سے پرے رہے، آج کل بڑی گرمی کھانے لگے ہیں۔“ ایک بار براہ راست اسے سمجھا رہی تھی۔

”تو شرجے میں گیا تھا، اب ذرا گھرنک کر بیٹھ، امرت غصے میں بھرا ہے۔“

”کیوں؟ میں ڈرنا ہوں اس سے، چوڑیاں پن رکھی ہیں۔“

”تو نے تو نہیں پن رکھیں، مگر کسی اور کی چوڑیاں روٹھ جائیں گی، امرت تیرے لیے اچھا خیال نہیں رکھتا۔ مجھے تیری فکر ہے۔“

”اچھا!“ وہ استہزائیہ ہنس۔ ”اپنے بھائی کے مقابل میری فکر کیا لگتا ہوں تیرا؟“ وہ بہت دیر چپ رہی پھر آہستگی سے بولی تھی۔

”میرا تو کچھ بھی نہیں لگتا، مگر میری سہیلی کا سب کچھ لگتا ہے۔“

”پھر فکر بھی سہیلی کو کرنے دے، چل ہٹ رستے سے۔“ نہ اسے اس روز یقین آیا تھا نہ آج آتا اگر وہ یک لخت آخری پتہ نہ کھیلتی۔

”تجھے یقین نہیں آ رہا، یہ دیکھ اوڑھنی۔“ اس سارے عرصے میں اس نے پہلی بار اس کی ہری اوڑھنی کو غور سے دیکھا۔ قندیل کی لہرائی لو میں جھللاتا، گو نے کنارے والا سبز آئچل! اس آئچل سے وابستہ رشتہ اور لمس کو پہچاننے کے لیے تیز روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔

”مبرا نے مجھے یہ کہہ کر دی تھی کہ تو اسے دیکھتے ہی میری بات کا یقین کرے گا اور یہ دیکھ۔“ اس نے بغل سے ادھ کڑھا کرنا نکالا جو گھبراہٹ میں مبرا کو لینا یاد نہیں رہا اور اس نے تو شاید جان کر نہیں دیا تھا جب سستی، مبرا کی زبانی ساری تیاری اور جانے کا ارادہ سن کر گئی تھی۔ وہ ساری بازی مار گئی تھی۔ اس کے ذہن نے تیزی سے کام کیا۔ چند گھنٹے تھے جو کرنا تھا، ان ہی میں کرنا تھا۔ اگر تیا تائی آگئے یا کسی طرح پکڑی گئی تو کیا ہوگا، زیادہ سے زیادہ بیان اسے مار دے گا یا پھر بھی پلٹ کر نہیں دیکھے گا۔ اور تو وہ ویسے بھی جا رہا ہے اس

بالوں میں انگلیاں چلاتا رہا۔ گہری سوج سے اس کی چوڑی پیشانی پر شکنیں بڑھیں، قطرے چمکے، دانت کچکچائے۔ کبھی پشت پر ہاتھ باندھے کمرے سانس لیتا، کبھی ہتھیلی پر رکے مارتا۔ رات کا بہت سا حصہ بیت چکا تھا۔ اس نے اپنا صافہ کندھے سے اتار کر چہرہ پونچھا اور پھر تیزی سے باہر نکلا تھا۔ کانڈوں والی دستی فیفے میں اڑی۔ وہ بھی پیچھے اسی رفتار سے چل رہی تھی۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا کچی فلی عبور کر کے تیزی سے پگڈنڈی پر چڑھ گیا۔ وہ اپنی سوچوں میں اس قدر الجھا تھا کہ بہت آگے جا کر اپنے تعاقب میں آتے قدموں کا احساس ہوا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ چاند کی روشنی میں بھی اس کا سانولا وجود صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ بہت اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ جیسے وہ رکا، وہ بھی رک گئی۔ اسے اب یاد آیا وہ تو بہت دیر سے اس کے ساتھ ہے۔ رات شروع ہونے سے پہلے سے، لیکن کیوں؟ اپنے گھر کیوں نہیں جاتی؟ پیغام دیتا تھا دے دیا اب جائے! اس نے تنقیدی ابرو اٹھا میں۔

”اب کیا ہے؟ کیوں پیچھے آرہی ہے؟“

وہ چہرے کو دوپٹے سے مزید لپٹتے ہوئے بولی۔ ”پیچھے نہیں آرہی، تیرے ساتھ جارہی ہوں۔“

”تو ہوش میں ہے؟“ وہ کرختگی سے بولا تھا۔

”ہاں! پورے ہوش میں ہوں، اب اگر اتنی رات میں گھر جاؤں گی، امرت ویسے ہی مجھے مار دے گا، مجھے یہاں نہیں رہنا، جہاں تو جائے گا میں بھی چلی جاؤں گی۔“

”نیکو اس بند کر اپنی جا یہاں سے، میری ریل آنے والی ہے۔“ وہ پنہری سے کچھ ہی فاصلے پر تھے۔ عموماً لاہور جانے والی ریل صبح وہاں سے گزرتی تھی۔ وہ اسی کے انتظار میں تھا۔ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ خود سپردگی کے عالم میں دو قدم آگے بڑھی۔

”تو میرا کو کیسے پہچانے گا؟ اس نے میری چادر اوڑھی ہے، اپنی چادر کو میں پہچان کر تجھے بتا دوں گی۔“

”میری آنکھیں سلامت ہیں، ڈھونڈ لوں گا اسے۔“ اس کے لیے میں واضح درستی تھی۔

”دیکھ بیان، اس نے ہاتھ جوڑے، خوف، امید، متذبذب انداز میں۔ اس کا نقاب گراؤ، سننائی۔ ”مجھے اپنے ساتھ لے چل، جو جیسے تو کے گا میں کروں گا، تائی کی خدمت، مفت کی نوکرائی۔ میں تیرا دھرم بھی اپنالوں گی، مگر مجھے چھوڑ کر نہ چل۔“ وہ قدم قدم آگے بڑھی۔ اس نے انگشت سے روکا۔

”کیا رشتہ ہے۔“

سہیلی کے ذکر پر وہ یک لخت ہٹ گئی۔ ”ہاں ہاں۔ میں تو تم دونوں کی نوکرائی بن کر رہوں گی، اور میرا تو مجھے دیکھ کر خوش ہو جائے گی، اعتراض نہیں ہوگا۔“ وہ اس کی رونی صورت، جڑے ہاتھوں کو غصے سے دیکھ رہا تھا۔ ریل کی پٹری کے ساتھ ٹاپوں کی آواز آرہی تھی۔ پہلے دور پھر آہستہ آہستہ نزدیک آنے لگی۔ سہیلی نے اپنا منہ پھر سے ڈھانپ لیا۔ سوار کے بائیں ہاتھ میں ایک کرپا تھا جس کے سرے پر قندیل کی طرح آگ روشن تھی۔ سوار نے ان سے کچھ ہی فاصلے پر گھوڑے کی بالکیں کھنچیں۔ سوار کا چہرہ سامنے آگیا۔ بڑی بڑی سیاہ مونچھیں، سر پر پگ، لمبے چہرے کی استہزائیہ کھنچی جلد۔ وہ اپنا چہرہ خوب لپیٹ پیمان کی اوٹ میں ہونی کانپ رہی تھی۔ سوار نے تفحیک آمیز قہقہہ لگایا۔ کرپا ایک ہاتھ سے دوسرے میں اچھال کر پکڑا۔

”اچھا، تو یہ تو ہے۔ رات کے اندھیرے میں ڈر کر بھاگ رہا ہے۔ اکیلا، اکیلا۔ ہا۔ ہا۔ ہا بڑا جی ہے تیرا۔“

”ایک تو یہ رات نہیں، صبح چڑھنے والی ہے۔“ بیان کی گھبراہٹ آواز اسی کے طنزیہ لہجے میں ابھری تھی۔ ”دوسرا ڈر کر نہیں، تھوک کر جا رہا ہوں۔ اور تیسرے اکیلا نہیں ہوں۔“ اس کے تیسرے جملے پر وہ پوری کیننگی سے ہنسا اور گھوڑے کو دو قدم اس کی پشت کی جانب بڑھایا۔ جہاں وہ چھپ رہی تھی۔

”نظر آرہی ہے تیرے پہلو میں دہکی تیری رائی۔“

”ہنہ، بیان خفیف سا مسکرایا۔ ”لیکن تو جانتا نہیں ہے، یہ کون ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں بڑھتی

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناؤلز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

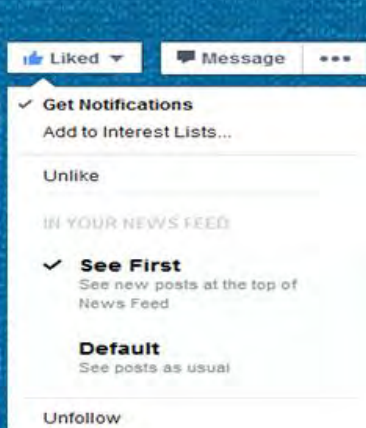
بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done



خباثت کو حقیر سے دیکھتا جان کر ایک جانب ہٹا تھا۔ وہ ایک قدم اور آگے آیا۔

”چھوڑ جا۔ ابھی آشنائی کر لیتا ہوں۔“

اس نے کینے پن سے آنکھ دباتے ہری جھلملاتی اوڑھنی کھینچ لی۔ بہت زور سے بادل کڑکا تھا یا آتش فشاں ابلا۔ لال اندھیری یا پھر شدید گردِ بادِ امرت کی آنکھوں سے نکلتی لپٹیں قندیل کی آگ سے کہیں تیز تھیں وہ ایک جست میں سیرو سے نیچے تھا۔ شدید ردِ عمل اس کے اک جھٹکے سے وہ بہت دور پتھروں پر جاگری۔ اس کا نرم ہونٹ پھٹا، لبوہنے لگا۔ امرت نے بیان کو بری طرح دیوچ کر گرا دیا تھا۔

”تیری اتنی جرأت میری بہن کو بھگا کے لے جا رہا ہے۔“

”اپنی بہن سے پوچھ بے غیرت، جو بھاگنے کے لیے مری جا رہی ہے۔“ غلیظ کالم گلوچ کے دوران وہ اس گلا دبانے کی کوشش میں تھا۔ بیان نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

”چھوڑ دے اسے امرت، اس کا قصور نہیں ہے، مجھے مار دے میں خود اس کے ساتھ نکلی ہوں، نہیں رہ سکتی اس کے بغیر۔“ سستی کی ملتجی رندھی آواز اسے گرم چابک کی طرح محسوس ہوئی۔ آنکھوں سے شعلے نکل آئے اس نے تہہ بند سے ایک خنجر نکالا اور پانڈ پوری قوت سے پیچھے لے جا کر آگے ہو بیان کو مارنے کو تھا۔ خدا جانے اس دلی پتلی سانولی لڑکی میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی اس نے بھائی کے ہاتھ سے خنجر چھینا اور آن واحد میں اس کی گردن میں گھونپ دیا۔ تڑپ کر گرتے امرت کو دیکھ کر نہ صرف بیان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں بلکہ سستی پاگلوں کی طرح اپنے ہاتھ اور بھائی کی گردن دیکھنے لگی۔ اس گردن سے ابلتے لال فوارے کو دیکھ کر بیان نے متاسفانہ کہا تھا۔

”امرت، دیکھ لیا۔ مسلمان خون کی بددعا کا اثر آج کیسے تو اپنے خون کے ہاتھوں موت کے منہ میں جا رہا ہے۔“ اس کی بند ہوئی آنکھوں کو اس نے تشغیر سے دیکھا اور تیزی سے شیرو پر سوار ہو کر اسے بھگالے

گیا۔ پاگلوں کی صورت پیشی سستی میں یک لخت جان پڑ گئی وہ اپنی اوڑھنی سنبھالتی اسے پکارتی پیچھے پیچھے بھاگی۔

”بیان۔ بیان، میری بات سن، مجھے ساتھ لے کر جا۔ واپس آجا۔“ وہ کرتی پڑتی، لڑکھاتی پڑیانی کیفیت میں اسے پکارتی پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ سبز جھلملاتی اوڑھنی ریل کی پٹری پر ہی گر گئی۔ اور وہ دھول اڑاتا بہت آگے نکل گیا تھا۔ سستی ریل کی پٹری پر سر مار کر لبوہمان ہو گئی بیان سے محبت اس کے دلغ کو چڑھ گئی تھی۔ دلغ نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا۔



آسمان پر صبح کی سفیدی پھیل رہی تھی۔ آخری تارہ ڈوبنے سے پہلے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ اگرچہ کھیتوں میں ابھی نیم تاریکی تھی۔ مناظر غیر واضح تھے کچھ دیر پہلے تاریکی میں اس کا وحشت بھر ابل پوری شدت سے دھڑکا تھا۔ غیر معمولی گھبراہٹ، سانس رک رک جاتی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دیا سلائی سے لائینن جلائی تھی۔ پھر ایک گٹھڑے سے لپٹ کر سسکنے لگی۔

”میرے سوہنے اللہ! اپنے وطن تک جانا کتنا مشکل ہے، ہجرت میں بڑی کٹھنایاں ہیں۔“ جیسے جیسے باہر صبح کا احساس جاگنے لگا۔ وہ ناند سے جڑی دیوار کے سوراخوں سے پار دیکھنے لگی۔ شاید بیان یا سستی نظر آجائے۔ باہر ملکجا اندھیرا اور ہلکی ہوا کی سرسراہٹ تھی۔ اس نے کئی بار سوچا۔ یہاں سے گھر چلی جائے۔ گھر کا رستہ آتا تھا۔ مگر ہمار کی طرح سوچ کر بیٹھ گئی۔

”کیس بیان مجھے یہاں ڈھونڈتا رہے، مجھے نہ پا کر پریشان ہوگا، جانے گھر کا خیال آئے گا بھی یا نہیں۔“ صبح کے اولین لمحے تھے۔ اوس کے قطرے جا بجا ہرے پتوں، کونپلوں کو غسل دیتے تھے۔ تازگی کی مہک چھار سو تھی۔ پرندے میٹھی آواز میں ذکر الہی میں محو اور شیطان اناشکار ڈھونڈتا تھا۔



ورنہ۔۔۔
”کیا ورنہ۔۔۔“ لہجے میں تلپاکی انداز تھی۔ ”اب کون ہے تجھے بچانے والا یہاں۔“

”میرا رب۔ وہ بچائے گا مجھے۔“ بے ترتیب سانسیں، ترحم بھری نگاہیں۔ کانپتے قدم ایک گھر میں الجھے، وہ دھڑام سے اوندھی گری لائین ہاتھ سے چھتے ہی الٹ گئی، پی پی پر ڈھکن نہیں تھا۔ تیل گرا اور جنگاری نے بڑے سے گھر کو پکڑ لیا۔ خشک کپڑے، گھاس پھوس، ایلے اور ان سب کے بیچ نسوانی چیخیں، پیمان کی پکار۔ یک لخت پھیلتی آگ دیکھ کر ارجیت خوف زدہ ہو باہر کی جانب لپکا تھا۔ اور اسے اس شور میں جلنے کے لیے چھوڑ گیا۔

آگ کے دریا میں، خوں اپنا جلایا تھا اے خاک وطن، تجھے کسے، کسے بسایا تھا کچھ ہی دیر میں اس شور کے گرد کوئی راہ بند ہو گئے۔ نہر سے بھر بھر بالٹیاں پھینکتے، شعلے پھیلتے جاتے۔ شعلے ٹھنڈے ہونے تک نسوانی آواز آتا بند ہو گئی تھی۔ ہری چرن کو خبر ہوئی۔ دل تھامے گرم جلتی بجھتی راکھ میں کود گیا۔ اندر راکھ کے سیاہ ڈھیر، دھو میں کے بادل اور کسی جسم کے جلنے کی شدید بدبو تھی۔



وہ شیرو کو بھگاتا بہت دور نکل گیا تھا۔ تقریباً حد بندی کے قریب ہی تھا جب بہت دور کوئی قافلہ جاتا دکھائی دیا۔ اس نے شیرو کو ایڑھ لگائی اور تیز بھگاتا قافلے میں جا ملا۔ خاصا دن چڑھ آیا تھا۔ ہر منظر دھوپ کی تمازت میں دھک رہا تھا۔ چند افراد سے ملتے ہی اس نے رام پت کے قافلے کو پہچان لیا۔ اسی میں اس کے ننھیالی اور اماں ثریا بھی شامل تھیں۔ صلاح الدین کی غیر موجودگی پر اس نے ماں سے استفسار کیا تو ثریا کا منہ کھلا رہ گیا۔

”وہ تو راج مگر تم دونوں کو لینے گیا ہے۔“ غالباً صلاح الدین رام پت سے تنہا آرہے تھے۔ ثریا کی والدہ کی طبیعت اگرچہ خراب تھی۔ مگر شوق دید و وطن

وہ علی الصبح راج مگر پہنچا تھا۔ چہرے سے تھکاوٹ کے اثرات زائل کرنے کے لیے نہر کنارے بیٹھ کر ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کے چھپکے مارے، کھڑے ہو کر باری باری دونوں پاؤں جوئے سمیت نہر میں ڈبو کر نکالے۔ وہ بہت عرصے بعد راج مگر آیا تھا۔ اور ماموں رندھاوا کے گھر صاف ستھرا ہو کر جانا چاہتا تھا۔ دل خوش گمان تھا شاید دروازہ سستی ہی کھولے، وہ اس کے خیالوں میں مست کیلے چہرے کو ہاتھوں سے پوچھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ہری چرن کی پر ساتی پر گئی۔ سوراخوں سے مدھم روشنی جھانک رہی تھی۔

”آج چرن بڑی صبح صبح آگیا۔“ وہ خود کلامی کرتا مڑا۔ عرصہ ہو گیا تھا ہری چرن سے ملاقات کیے، وہ حال احوال پوچھنے کی غرض سے کھنکھارتا برساتی کی جانب بڑھا۔ وہ باہر کسی موجودگی کے احساس پر ٹھکی، دل کہہ رہا تھا باہر پیمان آگیا ہے، وہ لائین والا ہاتھ اونچا کیے اپنے چادر درست کرتی باہر کی جانب نکلی۔ ”تو!“ وہ یکدم ٹھنکا۔ بے یقینی، خباثت میں ڈوبنے لگی۔ اس کی وحشت بھری آنکھیں پھیلیں۔ تڑھال بدن لرزا، دھڑکن تیز، دودھیا بے داغ رخساروں پر خوف کا سایہ۔ وہ الٹے قدموں اندر کی جانب سرکتی نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

”نہیں ارجیت۔ نہیں۔“ اس نے امرت کی زبانی مبرا کے ملکوتی حسن کے بڑے تذکرے سنے تھے۔ بہت عرصے پہلے اس گوری چٹی لڑکی کو دیکھا بھی تھا لیکن آج اس کا چہرہ شباب اس کی آنکھوں میں شیطانیت بھرنے لگا۔ اس کی غلیظ نگاہیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ سستی تو اس کے پاسنگ بھی نہیں تھی۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا آگے بڑھ رہا تھا۔

”ارجیت، مجھے ہاتھ مت لگانا“ میں تیرے دوست کی امانت ہوں۔“ اس کے چہرے پر مسخر بکھر گیا۔ ”چل کیا یاد کرے گی ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔“ وہ مزید آگے آیا۔

”ارجیت میں کہہ رہی ہوں۔ یہاں سے چلا جا۔“

بے طرح تھا۔ بھائیوں نے اگلے دن ایک قافلے کے ساتھ جانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ ثریا نے بھی صلاح الدین سے ان کے ساتھ جانے کی اجازت طلب کی۔
”میں اماں کے ساتھ چلی جاتی ہوں، بیمار ہیں دھیان رکھ لوں گی تم میرا پیان کو لیے پہنچ جانا۔“
صلاح الدین ان کے قافلے کو رخصت کرنے کے بعد راج نگر کے لیے نکلے۔ ابا کا سنتے ہی پیان کے ہوش اڑ گئے۔

”تو کیا اس سہتی کمبہنی نے میرے ساتھ جھوٹ بولا۔ پھر میرا کہاں گئی؟“ وہ وہاں سے ہی واپس پلٹنا چاہتا تھا۔ اس نے بہت کوشش بھی کی مگر ثریا رونے پینے لگ گئیں۔

”پیان الدین وہاں بہت قتل و غارت ہو رہا ہے ہم پرسوں کے نکلے راستے بدل بدل آج یہاں تک پہنچے ہیں اگر تجھے کچھ ہو گیا میں یہاں اکیلی کیا کروں گی۔“
”لیکن اماں۔ وہاں ابا اور۔۔۔ میرا جانے کہاں ہے کس حال میں ہے۔“

”میرے پتر تو فکر نہ کر، تیرا پاپ راج نگر پہنچ چکا ہو گا وہ میرا کوڈھونڈ لائے گا۔“

انہیں پاکستان کیمپ میں آئے کئی روز گزر چکے تھے۔ ہرنے آنے والے قافلے کو وہ پوری طرح دیکھتا ریڈیو پر روز اعلان کروا تا لیکن صلاح الدین اور میرا کی کوئی خبر نہیں تھی۔ ماں کے ہزار روئے منع کرنے کے باوجود وہ اس رات راج نگر جانے کی تیاری کر رہا تھا جب ملا شبیر کے قافلے نے آکر صلاح الدین اور میرا کے ختم ہونے کی اطلاع دی۔

صلاح الدین جب راج نگر پہنچے مگر خالی تھا سلاسل سمٹا ہوا اور برآمدے میں اک آدھ گھلا گھڑیڑا تھا ان کا دل غماؤف ہو گیا۔ وہ بچوں کی تلاش میں ادھر ادھر نکلے، تھمر کے رستے پر ہری چرن سے ملاقات ہوئی وہ خاصا بوکھلایا ہوا تھا۔ اس نے راز دانہ انداز میں بتایا تھا۔

”تمہارا راج بہت عرصہ تمہارا کھایا ہے، سچ کہتا ہوں فوراً پاکستان چلے جاؤ۔ یہاں حالات بہت خراب ہیں، میرا اور پیان بھی یہاں سے چلے گئے ہیں خود جاتے

دیکھا ہے۔“ اس نے اپنی برساتی میں میرا کے جل جانے کی خبر بہت ہوشیاری سے چھپائی تھی۔ مبادا وہ اسی پر شک کریں اور بدلے میں اسے یا اس کے خاندان کو جلا دیں۔ پیان کے غصے سے تو وہ خوب واقف تھا۔ اس کی بات پر شاید انہیں خاص یقین نہ آتا پر ایک دو اور ملنے والوں نے بھی ایسا ہی قیافہ لگایا۔ وہ ریل کی پٹری کے پاس سے گزر رہے تھے جب گرو میں اٹے سبز جھلملاتے آچل پر نگاہ گئی۔ وہ چونکے جھاڑ کر اٹھالیا۔ وہ یہ خود خرید کر لائے تھے کیسے بھول سکتے تھے۔ انہوں نے متلاشی نگاہ چار جانب دوڑائی۔ پھر ایک ہی خیال آیا تھا۔ ”ممکن ہے ریل پر چڑھ گئے ہوں، آچل چمک دھمک کی وجہ سے پیان نے پھٹکوا دیا ہو۔“ کیونکہ اس قسم کے واقعات سننے میں آرہے تھے ملا شبیر اپنی بیوی، بیٹی اور کئی دوسرے افراد کے ساتھ پاکستان کے لیے روانہ ہونے کو وہاں سے ریزہوں پر گزر رہا تھا صلاح الدین بھی اس میں شامل ہو گئے۔ فتنہ پرست گوروں نے پاکستان کو وہ علاقے دیے تھے جن کے اکثر راستوں میں ٹھاکروں، رانٹھوروں کے گاؤں پڑتے تھے۔ وہ پھر دل تقریباً ”ہر قافلے پر ٹوٹ پڑتے۔ اس قافلے پر بھی دھاوا بول دیا کئی افراد قتل کرنے کے بعد ایک بد بخت کی نگاہ ملا شبیر کی لڑکی پر پڑی وہ اس کا بازو کھینچنے لگا صلاح الدین سامنے آگئے۔ اس ظالم نے ان کے پیٹ میں اپنا کپڑا گھونپ دیا اور پیچھے سے کوئی خنجر اس لڑکی کے بھی آگاہ تڑپتے صلاح الدین کے بازو پر جاگری۔

بڑی غمگین، لہو رنگین ہے اک داستان ہمارے آباء نے رکھا تھا، جس کا بیٹم پاکستان کل ساتھ افراد کا قافلہ تھا جن میں سے کتنی کے چند لوگ بھاگ کر اپنی جان بچا پائے۔ انہوں نے ہی آکر صلاح الدین اور اس کے بازو پر بڑی لڑکی کا بتایا تھا۔

”نہیں نہیں چاچا، وہ میرا نہیں ہوگی۔ میرا کیسے مر سکتی ہے۔“ اس کا دل اس خبر پر یقین کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اسے کیا خبر اس کی محبت چینی چلاتی اسے پکارتی شعلوں کی نذر ہو گئی تھی۔

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہوئی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

وہ چلا چلا کر ایک ہی بات کر رہا تھا ”نہیں تجھے غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“

”کیوں پاؤں ہوا ہے“ تیرے باپ کے بازو پر بھلا اور کون ہو سکتی ہے۔ صبر کر بیان الدین صبر۔“

صبر اس سے سانس لینا دشوار تھا اس کا بس نہیں چلتا تھا ابھی راج نگر جائے اور کونہ کونہ چھان مارے، کہیں سے بھی میرا کون نکال لائے۔ لیکن ثریا نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ اسے خدا کے اپنی بیوگی کے واسطے دیتیں۔ اور دو سال یہی واسطے دے دے کر آخر اس کا نکاح زہرہ سے کروادیا۔ ان کا خیال تھا شادی ہوگی، بچے ہوں گے تو بھول پڑ جائے گی۔ بیان تو اسے کیا بھولتا خود ان کے لیے میرا کو بھلانا مشکل ہو گیا۔

سال بعد ہی اللہ تعالیٰ نے میرا کی ہم شکل ام ہانی عطا کر دی۔ جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی، ہو ہو میرا جیسی بنتی گئی۔ اسی طرح شرارتے گل لال کر لیتا۔ پلکیں جھپکتا، مسکراتے رہتا۔ یہاں تک کہ بائیں گل پر ہنستے ہوئے میرا کی طرح گڑھا پڑتا۔ ثریا اسے اپنے ساتھ لپٹا لپٹاتیں اور ساری رات اسے یاد کر کے آنسو بہتے رہتے۔ بہت سے پچھتاوے گھیر لیتے آخر ان ہی پچھتاؤں میں انہوں نے آخری ہچکی بھی لے لی۔ اور پرسکون ہو گئیں۔



پاکستان کی سیاسی قیادت کو دشمن جھمنے نہ دیتے تھے کوئی نہ کوئی مسئلہ اٹھاتا رہتا اس کمزوری کو بھانپتے ہوئے فوج نے ملک پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔ سرپرستی سے محروم دشمن پر دشمن نے رات کے سیاہ سناٹے میں اپنا دار کیا۔ قوم متحد تھی۔ ابھی کسی کے بھی زخم پوری طرح نہیں سلے تھے۔ مرد باڈروں پر جانے کے لیے تیار تھے اور خواتین گھروں میں باقاعدہ قرآن خوانی کی محفل رکھ لیتیں اپنی فوج اپنے ملک کی سلامتی کے لیے جذبے سے دعا مانگی جاتی۔ مسجدوں میں نوافل ادا کیے جاتے۔

عثمان سفید ریشم سے کڑھا کرتا اپنے اپنے بکرے

سے کھیل رہا تھا۔ سائیں کی نگاہ کڑھائی پر جمی تھی۔ زہرہ سے استفسار پر پتا چلا یہ بھی بی بی نے بنایا ہے ہمیشہ کی طرح غیر ارادی سر و نگاہ دور اس کی پشت پر گئی اور پلٹ آئی۔ ام ہانی بی بی سے اپنی چٹا گندھوا کر غسل خانے کی جانب وضو کرنے کے لیے بڑھی تھی۔ عثمان کولا پروانی سے کھیلتے دیکھ کر زور سے چلائی تھی۔

”تو نے اذان نہیں سنی جا۔ جا کے نماز پڑھ حاجت کے نفل بھی پڑھ کر آ۔“

”پڑھ لوں گا ابھی بڑا وقت ہے۔“ وہ کہہ کر بکرے کے منہ میں گھاس ٹھونسنے لگا اس نے بھائی کے ہاتھ سے گھاس کا دستہ کھینچ لیا۔

”بھول گیا کل بی بی نے کیا کہا تھا یہ وقت نہیں ہوتا مہلت ہوتی ہے کہ مجبوری کی وجہ سے اگر دیر ہو گئی تو بندہ ٹھہر کر ادا کر دے“ مجھے کیا مجبوری ہے اسے زبردستی گھاس ٹھونسنے کی۔“

اس کے لفظ اور انداز نے سائیں کو متحیر کر دیا۔ جملے مناظر سمیت آنکھوں میں ٹاپنے لگے۔ ممکن آلود پیشانی سے قطرے صاف کرتے ہوئے اونچی آواز میں ام ہانی کو پاس بلایا بمشکل رکی سانس بحال کی اور دھیرے سے کہا۔

”تو اپنی بی بی سے پوچھ وہ کس علاقے سے آئی ہے“ آخر بتاتی کیوں نہیں۔“ پھر قدرے توقف سے بہت مدھم سا بولا۔

”چچا چل رہے ہی دے۔“ بیٹی کے کندھے پر ہاتھ رکھ اٹھا اور بیرونی دروازے کی سمت بڑھا عثمان فیضان کو بھی اپنے ساتھ نماز کے لیے لے گیا تھا۔



ریڈیو پر خبروں کے ساتھ جوشیلے ترانے لگتے۔ اور ساتھ ساتھ فوجی امداد و سلمان کے لیے دعاؤں کی درخواست نشر ہوتی وہاں چندے کی اپیل بھی شامل تھی۔ مسجدوں، اداروں، اسکول اور گھروں میں بھی سب نے چندہ مہم شروع کی تھی۔ ام ہانی نے رات زہرہ کو میڈیم کی ساری تقریر سنائی جو چندہ جمع کرنے کے

لیے تھی۔ زہرہ کے پاس چند روپے تھے۔ صندوق سے نکالے دے دیے۔ بی بی نے سنا بے دم ہو کر لیٹ گئی۔ بی بی ساری رات جاگتی رہی گرم قطرے سکڑی جلد کو بھگوتے رہے ”اگر میسے کی کمی سے جنگ ہار گئے“ تو کیا ہوگا۔ بغیر جنگ کے پہلے اتنا قتل و غارت ہوا تھا اپنے بچھڑ گئے اور اب جنگ ہار جانے پر تو شاید کوئی بچے گا ہی نہیں۔ آہ! میرے پاس تو کچھ بھی نہیں جو چندے کے لیے دوں۔“

وہ روتی جاتی اور فوج کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگتی جاتی۔ آنسو پونچھتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنی ناک سے ٹکرایا۔ وہ فوراً ”اٹھ بیٹھی اور کچے میں فیصلہ کیا۔ اس نے اپنا کوا اتار دوپٹے کے پلو پر باندھا ناک ننگی ہونے کے خدشے پر کہ بہن چارپائی کی پان کا تنکا توڑ پر د لیا۔ زہرہ ہسایوں کے ہاں قرآن خالی پر گئی تھی۔ جنگ آخری مراحل میں تھی دعاؤں پر زور تھا۔ دونوں لڑکے بھی ساتھ لے گئی تھی۔ ام ہانی اور بی بی گھر رہتے تھے اس نے دوپٹے کا پلو کھول کر ام ہانی کے ہاتھ پر کوا رکھا۔ ”یہ میڈم کو چندے کے لیے دے آ۔“ وہ کچھ دیر حیرت سے دیکھتی رہی پھر پوچھا۔

”کتنے کا ہو گا بی بی۔“

”پتا نہیں، لیکن بہت قیمتی ہے۔“ اب وہ بچی کو اس کی قیمت کیا سمجھاتی۔ یہ واحد نشانی تھی لیکن ایسی نشانی کا کیا کرنا جب نشانی دینے والوں کی جانیں ہی خطرے میں ہوں۔ میڈم کا گھر چند گلیاں چھوڑ کر تھا۔ وہ دوپٹا پھیلاتی باہر نکل گئی۔ گلی کے ٹکڑ پر ہی سائیں دفتر سے آتے ہوئے مل گیا۔ بھنو میں اچکا کر پوچھا۔

”کہاں جا رہی ہے؟“ اس نے مٹھی کھول کر باپ کے سامنے کر دی۔

”بی بی نے دیا ہے چندے کے لیے۔“ اسے لگا تھا دل کئی دھڑکنیں بھول کر پھر سے دھڑکا تھا آنکھیں پھرائی قدم ایسے جم گئے جیسے میخیں گڑ گئی ہوں وہ سات سیاہ گلوں کا سونے سے بنا بڑا سالونگ تھا۔ بہت چاہت سے نکاح کے تحفے کے طور پر ڈھونڈ کر لایا تھا۔ مبرا کو تو اس کا لایا کاشا بھی دل جان سے قبول تھا لیکن

لوٹک ثریا کو بہت پسند آیا۔ اور اس کی ناک میں ڈال دیا۔ چند دن میں ہی اس کا درمیانی بڑا ٹنگ نکل کر کہیں گر گیا تھا۔ کوا برا لگنے لگا۔ مبرا نے اتار کر سنبھال لیا۔ ثریا نے ڈپٹا تھا۔

”بھری ناک ساگن کی علامت ہوتی ہے۔ ڈال اسے۔“

”لیکن تائی وہ برا لگ رہا ہے جیسے کانا ہو۔“ ثریا پہلے اس کی بات پر ہنسی پھر اس سے لے کر اسی وقت ہمسائے میں رہنے والے نجو سار کے ہاں گئیں۔ اس وقت اس کے پاس سیاہ نگ نہیں تھا۔ ثریا نے کہا۔

”پاجی کوئی بھی لگاؤ۔“ ایک زرد موٹا ساموتی تھا اس نے وہ دکھا کر اچھی طرح گاڑھ دیا۔ جب بیان نے دیکھا اسے بہت غصہ آیا۔

”اماں یہ کیا تو نے دورنگی بھدا کر دیا۔ مجھے اتروا کر ریتا میں ٹھیک کروالاؤں گا۔“ جس طرح اور بہت سے کام آج کل پر ٹلتے رہے اس کو کے میں بھی زرد موتی ٹنکا رہ گیا۔ ام ہانی کی ہتھیلی سے کوا اٹھایا۔ اپنی پوروں میں گھما تا گم صم تھا۔ پھر اسے کہا۔

”تو جا یہ میں دے آؤں گا۔“

بچی اشات میں سرخم کرتی سامنے اپنی سہیلی کے چلی گئی۔ وہ تل پر کھڑی وضو کر رہی تھی۔ اسے داخل ہوتا دیکھ کر فوراً ”چادر کھینچ کر آگے کی۔ اور پلو سے بلیاں رخسار چھپالیا۔ شاید اسی لیے آج تک کوکے پر نگاہ نہ جا سکی تھی وہ تیزی سے بڑھا اور اس کی پشت پر کھڑا ہوا۔

”کون ہو تم؟“ بی بی نے سر جھکاتے اپنا سر مزید موڑ لیا۔

”میں نے تم سے پوچھا ہے کون ہو تم اور یہ کہاں سے ملا، کس نے تمہیں دیا تھا۔“ اس کا لہجہ خاصا کرخت تھا۔ تین سالوں کے کسی ایک بل میں بھی اسے یہ گمان نہیں گزرا تھا اگر کبھی اس کی آواز سنی تو وہ ساکت بھی ہو سکتا ہے۔ کئی بار اس کے کاموں پاتوں پر ٹھٹکا اس کا گمان تھا شاید یہ راج نگر سے ہو۔ اماں نے بہت سی لڑکیوں کو قرآن پاک پڑھا رکھا تھا۔ سلائی

”باہل۔“ اس نے مسکرا کر کہا ”زہرہ کو سب پتا ہے، دوسرے یہ صرف اس کا گھر نہیں ہے، تیرے بیان کا بھی ہے۔ اور ٹھکانہ تو اس نے تیرا لیا ہے۔“

ہاں میرے بچے اور وہ میرے بچوں کی ماں ہے، میں اس کی بے حد عزت کرتا ہوں، وہ میرے سر آنکھوں پر رہتے ہیں لیکن اس دل میں صرف میری مبرا رہتی ہے، تو نے خالی کیا ہی نہیں کہ کوئی اور بسیرا کرتا، زہرہ بہت اچھی ہے، مجھے یقین ہے وہ مجھے کچھ نہیں کہے گی، وہ تو تیرے ملنے کی خود دعائیں کرتی تھی۔“

یہ تو زہرہ کا دل جانتا تھا کہ وہ کیا دعائیں کرتی تھی۔ جب جب سائیں بے قرار ہو کر رو پڑتا تو وہ بے چین ہو جاتی اور پوری شدت سے دل ہی دل میں کہتی۔

”اللہ! مبرا اس بندے کو کبھی نہ ملے، دل میں نہ سہی مگر میں اس کی آنکھوں میں تو رہتی ہوں، اگر وہ مل گئی پھر تو آنکھوں سے بھی نکل جاؤں گی۔“

اس وقت وہ دروازے کا پٹ کھولے خاصے فاصلے سے سب دیکھ اور سن رہی تھی، ٹانگیں بالکل بے جان ہو گئی تھیں، دل کی دھڑکن بہت ست تھی۔ کاش! پھوپھی مختار اس بھی بھی نہ ملتی، اس کے دل نے چٹکی بھری پھر بہت ہمت مجتمع کر کے وہ معمول کی طرح آہستہ آہستہ اندر آئی۔

”پاکستان نے تو جنگ جیت ہی لیتی ہے لیکن میں تجھ میں رہ کر بھی تیرا دل نہ جیت سکی سائیں۔“ اس نے ایک زبردستی مسکراتی نگاہ دونوں پر ڈالی اور اندر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔



وہ لڑکی حال سے بے حال تھی۔ چادر تک غائب تھی۔ زہرہ کی جدائی نے مختار اس کا دل زخمی کر رکھا تھا فوراً اس لڑکی کو سہارا دیا۔ مختار اس اور اس کے بہو بیٹے بہت خدا ترس نکلے کہ اس بی بی کو بارہ سال سے زیادہ ساتھ رکھا۔ اسے چپ لگ گئی تھی۔ اپنے بارے میں اس خوف سے نہیں بتاتی تھی کہیں اپنے بچانے سے انکار نہ کر دیں۔ بیان کے گھر وہ بالکل قدرتی پہنچی تھی لیکن بکرے کی جلد پر باپ بیٹے کی بحث نے ہر خواہش، آرزو کا گلا دبا دیا۔ اسے خوف آیا کہیں وہ اس کے کراہیت زدہ چہرے سے نفرت نہ کرے، اس کی نفرت جیتے جی مار دے گی۔ بہتر ہے اجنبی بن کر اسے دیکھتی رہوں۔ آج وہی اجنبی اس کے دونوں شانے پکڑے بے طرح جھجھوڑ کر اس کی ساری داستان سن رہا تھا۔ اس کا جی چاہا ارجحیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے، بچپن کے بعد آج پہلی بار ہری چرن اچھا لگا تھا۔ اسے مبرا پر بھی غصہ تھا اتنے برس اجنبی بن کر رہی۔

”تو اتنی کھنور نکلی، تین برسوں میں مجھ پر ایک بار ترس نہیں آیا۔“

”اور اگر تو اس ڈب کھٹی جلد سے گھن کھاتا۔ پھر؟“

”جھے چتکبرا مہنا گھر میں پسند نہیں، میں کہاں سے۔“ اس کی رندھی آواز پر اس نے بے اختیار پوری قوت سے اسے خود میں بچھ لیا۔

”میں نے تو بہت پہلے کہا تھا، تو مبرا ہے، کوئی ڈنکر نہیں، بھول گئی آخری بار کیا کہا تھا، کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا، بس تو بے اعتبار نہ ہونا،“ جھے اپنے بیان پر اعتبار نہیں تھا۔

اس نے نرمی سے اسے خود سے الگ کیا اور چہرہ ہاتھوں میں لیے آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ”جھے کس نے کہا مجھے تیرے رنگ روپ سے محبت تھی۔“

دونوں کی آنکھوں سے بے اختیار بہت سا پانی چھلکا۔ ”مجھے تجھ سے محبت تھی، محبت ہے یہ دل تیرا نام لے لے کر خامشی سے دھڑکتا ہے۔“

”لیکن بیان! تیری بیوی بچے ہیں، اگر اسے پتا چل گیا میرا یہ لہکا نا بھی چھین جائے گا۔“

سیرانِ کینز

السلام علیکم!

دل تو میرا بھی میرے بس میں نہ رہا۔
اس سارے فساد کی جڑ ”ریاض علی“ ہے انگلش
ڈیپارٹمنٹ کا ڈیشننگ سی آف۔ پوری یونیورسٹی کی
لڑکیاں اسے دیکھ کر آہیں بھرتی ہیں۔ اور ”وہ“ وہ مجھے
دیکھ کر آہیں بھرتا تھا۔ کتنا تھا۔

”سلمتی تمہیں دیکھ کر میرا دل سو برس جینے کو کرتا
ہے۔“ اور میں بڑا ہنستی تھی اس بات پر مگر آج سوچتی
ہوں تو روتی ہی ہوں۔ وقت، وقت کی بات جو ہوتی۔
پہلی بار وہ مجھے انگلش ڈیپارٹمنٹ کی اندھیری
گیلری میں ملا تھا۔ ملے اندھیرے میں وہ مجھ سے ٹکرایا
تھا اور میری ساری کتابیں زمین بوس ہو گئی تھیں۔
”دیکھ کر نہیں چل سکتے۔ خواہ خواہ شوخ بنے مست
نیل کی طرح دندنا تے پھر رہے ہو۔ کوئی میز ہوتے
ہیں ایٹی کیبٹس ہوتے ہیں مگر ناجی۔ لڑکیاں دیکھ کر
شو ضرور مارتی ہوتی ہے۔ کتابیں اٹھا کر میں اندھیری
گیلری میں آگے بڑھ رہی تھی۔ جب پیچھے سے اس کی
آواز آئی تھی۔

”آپ کی آنکھیں بہت خوب صورت ہیں“
اندھیرے میں بھی چمکتی ہیں۔“ میں ٹھٹکی تھی بہت
چاہا آگے بڑھوں مگر زمین میں گڑی رہ گئی۔ کسی پہلے کی
مانند جس کے سینے میں سوئی چھو کر زمین میں گاڑ دیا گیا
ہو۔ وہ پلٹ گیا تھا۔ اس دن آسمان پر بادل تھے۔
گرہے۔ کالے گویا آدمی رات تھی۔

”لڑکیوں کو کبھی بھی غیر مرد سے تعریف کی ”چاہ“
نہیں رکھنی چاہیے۔“ کیونکہ پھر یہی ہماری بڑی
کنزوری بن جاتی ہے۔ جیسے میری بن گئی۔ اس دن
میں نے آئینے میں اپنی آنکھوں کو نہیں سے زائد مرتبہ
تو دیکھا ہی ہوگا۔

سب سے پہلے تو معذرت کہ اتنے عرصے بعد خط
لکھ رہی ہوں۔ مگر کیا کروں بڑی مشکل میں تھی۔ مگر
پھر ہوا وہی جو آخر میں ہوتا ہے۔ ہوتا آیا ہے۔
مشکلیں اتنی پڑیں کہ آسان ہو گئیں۔

میرا بھی یہی حال ہوا۔ اور خوب ہوا۔ یوں لگا
جیسے رات دن کا چین سکون ”گروی“ رکھ دیا گیا ہو۔
مجھے تمہاری بڑی یاد آتی کینز!۔ ساری ساری رات
ہاسٹل کی کھڑکی میں بیٹھی سو دو زیاں کا حساب کتاب
رکھنا آسان تو نہیں ہوتا۔ میرے لیے بھی آسان نہیں
تھا۔

پتا ہے یہ جو ہم گاؤں کے سادہ لوح انسان ہوتے
ہیں نا، شر اگر اپنی ”اوقات“ ہی بھول جاتے ہیں۔
(معذرت کے ساتھ اوقات کا لفظ استعمال کرنا پڑا، مگر تم
سب سمجھتی ہوں نا۔) میں بھی اوقات بھول گئی
کینز!۔ بڑی مشکل سے اپنا آپ سنبھال پائی ہوں،
یہاں تم جو نہیں ہو۔ (آنسوؤں کے نشان دیکھ کر اب
تم بھی رونے نہ بیٹھ جانا تمہاری پرانی عادت ہے۔)

میں بڑی ”ناقدری“ ہوں، جب وہاں تھی تو کسی چیز
کی قدر نہ تھی، مگر اب گاؤں کی ہوا تک — یاد آتی
ہے اور وہ سکھ چیں کے پیڑ کا جھولا تو بھولتا ہی نہیں۔
میں ایک ماہ بعد اپنے فائنل امتحان دے کر آؤں گی تو
اسی جھولے پر بیٹھ کر اپنے کھاتے کھولیں گے۔
تمہیں بڑا اشتیاق ہوتا تھا نا بریکنگ نیوز کا۔ تو
سنو۔ مجھے ”محبت“ ہو گئی تھی۔

میں اچھی طرح جانتی ہوں لفظ ”محبت“ نے
تمہیں سو واٹ کا جھٹکا دیا ہو گا اور لفظ ”تھی“ نے تو
تمہاری جان ہی نکال دی ہوگی۔ جان تو میری بھی نکلی



”ایسا خاص تو کچھ نہیں، ویسی ہی ہیں جیسی سب کی ہوتی ہیں۔ عام انسانوں جیسی۔“ اور مجھے نائلہ کا جواب پسند نہیں آیا تھا، جانے کیوں۔ میں اپنی روم میٹ پر بھروسہ نہیں کیا رہی تھی، جسے میں جانتی تھی اور میں اس شخص پر یقین کر بیٹھی تھی جو میرے لیے

اور اپنی روم میٹ سے پوچھا تھا۔ ”نائلہ۔۔۔ میری آنکھیں کیسی ہیں؟“
”کالی ہیں۔۔۔“

”ارے یہ بتاؤ۔ کیا خاص بات ہے ان میں؟“ میں نے اشتیاق سے جانا جاتا تھا۔

کمل اجنبی تھا۔ صرف ایک پر کا عام سا تعلق۔
ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایسا کیوں ہوتا رہا ہے؟

دوسری بار مجھے وہ کیفے میں بیٹھا نظر آیا تھا اور وہ ہنس
ہنس کر کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ میں اور نائلہ جب برگر
اور بوتل کھالی کر کاؤنٹر پر پہنچے تو پتا چلا کوئی ہمارا بل ادا
کر چکا تھا۔ مجھے خاصی حیرت ہوئی تھی۔ میرے حلقے
میں ایسا کوئی ”مخنی“ نہیں تھا۔ پوچھنے پر پتا چلا تھا کہ
ریاض علی نے بل ادا کیا تھا۔ نائلہ کو وہیں چھوڑ کر میں
اس تک آئی تھی۔

”آپ نے ہمارا بل بے کیا۔ کیوں؟ میں آپ کو
نہیں جانتی اور آپ مجھے نہیں جانتے۔ پھر آپ
نے ایسا کیوں کیا؟“ میں نے اس سے سخت کجے میں
جواب مانگا تھا اور اس کا جواب میرے اوسان خطا کر گیا
تھا۔

”آپ کی آنکھیں ہی نہیں آپ کی تو آواز بھی
بہت مہترم۔ ہے آپ اگلے کو ”چپ“ کرا دیتی
ہیں۔“

اور میں پلٹ آئی تھی۔ ہمارے درمیان وہ پیر آن
موجود ہوا تھا اور مجھے پتھر نہیں ہونا تھا کینزراں۔ کبھی
نہیں۔ یہاں شہر کی دھوپ بھی پرانی لگتی ہے تو لوگ
کیسے اپنے ہوتے۔ مگر میں سمجھ ہی تو نہ سکی اور کینزراں!
یہ جو ہم لڑکیاں ہوتی ہیں نا، ہمیں سب خبر ہوئی
چاہیے۔ سب پتا ہونا چاہیے۔

اور پھر ایک دن مجھے ایک کتاب موصول ہوئی۔ وہ
وصی شاہ کی ”مجھے صندل کرو“ تھی۔ اس کے ساتھ
ایک رقعہ بھی تھا جو کسی قیمتی خوشبو میں بھیگا ہوا تھا۔
میں منٹوں اسے تھامے اس کی خوشبو کے سحر میں
گرفتار بیٹھی رہی۔ نائلہ سوری تھی۔ وال کلاک کی
ٹمک ٹمک کا شور تھا۔ یا پھر ہاشل کی کھڑکی کے پار سے
آتی ہوا کی آوازیں۔ میں نے دھیرے سے رقعہ کھولا
تھا لکھا تھا۔

”بیاری سنووائٹ۔“ میں نے سنووائٹ کو نہیں
دیکھا مگر تمہیں دیکھا ہے اور مجھے یقین ہے سنووائٹ

تم سے زیادہ خوب صورت نہیں ہوگی۔ اسی لیے
تمہیں سنووائٹ کہہ کر مخاطب کر رہا ہوں۔ جب سے
میں نے تمہیں دیکھا ہے یوں لگتا ہے دل کا خانہ خالی

سا ہو گیا ہو۔ ایسا کیوں ہے۔ بہت ڈھونڈا اس سوال
کا جواب، مگر نامراد ٹھہرا۔ اور پھر مجھے لگا مجھے تم سے
پوچھنا چاہیے۔ خیر۔ میں نے ایک اندازہ ضرور لگایا
ہے وہ یہ کہ شاید میری ڈکسنری میں اس کیفیت کو
”محبت“ کہتے ہیں۔ تم کیا کہتی ہو؟“

”تمہارا سنو مین“
رقعہ پڑھ کر مجھے لگا تھا جیسے زیرو واٹ کے بلب کی
ملکھی روشنی والے کمرے میں تمہارا سنو مین ڈھیروں
جگنو چمکنے لگے ہوں۔

میں پھر کہتی ہوں کینزراں۔ لڑکیوں کو جھوٹی
تعریفوں، جھوٹے لفظوں کی چاہ نہیں رکھنی چاہیے،
ورنہ بڑا نقصان ہوتا ہے۔ باقی کچھ نہیں رہتا۔

میں نے اس کے رقعے کا کوئی جواب نہ دیا۔
خاموشی اختیار کر لی تھی۔ کیا کہتی؟ کیا جواب دیتی؟
سوال بھی مشکل تھا اور جواب بھی۔ اور جب دونوں
اتنے مشکل ہوں تو خاموشی ہی بہتر ہے۔

وہ اتوار سے اگلا دن تھا جب ہم انگلش ڈ پارٹمنٹ
میں گئے تھے اور لان میں ٹمک مرچ لگا کر کھائے
جارہے تھے۔ میں سہلکتی ہوئی لطف اندوز ہو رہی تھی،
جب وہ میرے ہم قدم ہوا۔ میں رک گئی تھی۔

”میں نے سچ کہا تھا نا؟“ اس کے وجہ سے چہرے پر
پھلے یقین کو دیکھ کر مجھے خوف آیا تھا۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔ کیوں میرے پیچھے بڑگئے
ہو؟“ میرا لہجہ یہ کہتے ہوئے کپکپایا تھا۔ مجھے آج بھی یاد
ہے۔

”محبت ہو گئی ہو تو پیچھے پڑنا اشد ضروری ہوتا
ہے۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”لوگ دیکھ رہے ہیں۔“ میں ہراساں تھی اور وہ
آرام سے کھڑا تھا۔ مجھے شکل باندھے دیکھا ہوا۔
”پھر مجھ سے ملو۔ شام کو کہیں۔“ وہ مسکرتا۔ اور میں

لڑکیوں کو غافل نہیں ہونا چاہیے۔ میں غافل بھی ہوئی اور میں نے اعتبار بھی کیا۔
 ہک ہا۔ اعتبار۔ اعتبار کا کیا تاؤں کنیزاں۔ یہاں
 شہر کی زمین بخر ہے، یوں لگتا ہے یہاں اعتبار کی فصل
 اگتی ہی نہیں اور میں نے اگلی۔ بیج سڑتے رہے۔

کو نیلیں کہاں سے پھوٹیں؟

اور اس شام جب میں خوب بن سنور کر ریاض علی
 کے ساتھ جانے والی تھی اور بار بار آئینے میں خود کو دیکھ
 رہی تھی تو نائلہ نے پوچھا تھا۔ ”تنتا تیار ہو کر کہاں
 جا رہی ہو؟“ اس سوال میں کتنی حیرت تھی، مجھے پتا
 تھا۔

”کچھ نہیں، بس ایسے ہی آؤنگ کاپروگرام
 ہے۔“ میرے لہجے میں کتنی سچائی تھی، وہ واقف
 تھی۔

”اس راستے پر قید منہ رکھنا جہاں سے واپسی ناممکن
 ہو۔“ اگر وہ نصیحت تھی تو میں نے ایک کلن سے سن کر
 دوسرے سے اڑادی تھی۔

جب ہم ریاض علی کے فلیٹ پر پہنچے تو ابھی شام
 نہیں اتری تھی۔ ہم نے کافی پی اور بہت ساری باتیں
 کیں۔

”مجھے ہاسٹل چھوڑ آؤ۔ بہت وقت ہو چکا۔“ میں
 نے کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا تھا۔

”ایسے کیسے چھوڑ آؤں۔ آج رات یہیں
 گزاریں گے۔“ وہ میرے قریب تھا، میری لٹ کو
 کانوں سے پیچھے اڑس دیا۔

”نہیں پلیز۔ مجھے چھوڑ آؤ۔“ میں روہانی
 ہو رہی تھی۔ رات اترنے کو تھی۔

وہ اور میرے قریب ہوا تھا۔ ”یہاں آئی تم اپنی
 مرضی سے ہو، مگر جاؤ گی میری مرضی سے۔“ وہ
 مسکرایا تھا اور وہ ”مسکراہٹ“ میں آج تک نہیں
 بھولی۔

”پلیز ریاض۔ مجھے چھوڑ آؤ۔ میں ہاتھ جوڑتی
 ہوں۔“ وہ میرے بڑے ہاتھوں کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ

ہار گئی۔ میں نے اس کی بات مان لی تھی۔ مجھے ارد گرد
 کی نظروں سے خوف آیا تھا۔ اور یہ میری پہلی غلطی
 تھی کنیزاں۔ اور لڑکیوں کے پاس تو پہلی اور آخری
 غلطی کا ”آپشن“ ہی نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ۔ نہ

دل رمتا ہے اور نہ ہی عزت۔ میں نے بھی ”دلہ“ ہار
 دیا۔ صد شکر کہ ”عزت“ بچالی اور ہم شام کو ملے
 تھے۔ گولڈن زون کیفے میں کی گئی باتوں کی بازگشت آج
 بھی میں نہیں بھولی۔ کوشش تو بہت کی، مگر ہر کوشش
 ہریار رائیگاں بھری۔

وہ جادوگر تھا یا پھر کوئی لفظوں کا شعبہ بان۔ اور پھر
 میں ”میں“ نہ رہی۔ ”وہ“ ہو گئی۔ اور وہ میرے وجود
 پر مسلط ہو گیا۔ اور پھر مجھے بھی لگا کہ شاید میری
 دشمنی میں بھی یہ کیفیت ”محبت“ ہی ہے۔
 زمین پر چاند اترے۔ خوشبو میں مہکیں۔
 محبتوں میں یہی تو ہوتا ہے، میرے ساتھ بھی ہوا۔ اور
 بہت برا ہوا۔

”تمہاری پلکوں پر بارے ٹانگہ دوں؟“
 ”ٹانگہ دو۔“ میں ہستی۔

”تم ہستی ہو تو لگتا ہے سازبج رہے ہوں۔ اور میں
 بے بس ہو جاتا ہوں۔ مدھوشی سی طاری ہو جاتی
 ہے۔“

”چھائی۔ اتنی محبت کرتے ہو؟“
 ”جان سے بھی زیادہ۔“ وہ کہتا اور میں جیسے ہوا کی
 رتھ پر سوار ہو جاتی تھی۔

پھر وہ اور میں لاہوری میں بیٹھے روہانوی ناول
 پڑھتے ہوئے چپکے سے ایک دوسرے کو دیکھ کر آہستہ
 آواز میں باتیں کرتے۔ خشک شاموں میں روشنیوں
 سے جگمگاتے آئس کریم پارلرز میں ہم آئس کریم
 کھاتے۔ دھند بھری دوپہروں میں یونی کے واکنگ
 ٹریکس پر ہم نے بہت چہل قدمی کی ہے اور جیسے میں
 غافل ہو گئی۔ رشتوں سے۔ پڑھائی سے۔

کیا محبت ایسی ہوتی ہے؟ غفلت جیسی موزی کیفیت
 میں باندھ کر رکھ دینے والی۔

اور قریب ہوا میرے اوسان خطا ہونے لگے اور جیسے جان نکلنے لگی تھی۔

”یہ جو تم لڑکیاں ہوتی ہو نا۔ بڑی ہی سادہ لوح اور سیدھی ہوتی ہو۔ تمہیں گھیرنے میں چار لفظ لگتے ہیں۔ بس۔ چار لفظ جتنی اوقات ہے تمہاری۔“ اور میں ساکت کھڑی لفظوں کی بازگشت کے آگے

بڑھال کھڑی تھی۔ آہ۔

”آپ کی آنکھیں بہت خوب صورت ہیں۔“
”اور آپ کی آواز مجھے جکڑ لیتی ہے۔“

وہ سب قریب تھا کنیزاں۔ سب۔ اور اس شام میں بڑی مشکل سے اس فلیٹ سے بھاگی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ میری کون سی نیکی کام آئی تھی۔ محبت محرم اور نامحرم کے اور پردے کا نام نہیں ہوتی یہ تو احترام کی پہلی سیڑھی ہوتی ہے۔ ہم لڑکیاں واقعی سادہ لوح اور سیدھی ہوتی ہیں۔

یہاں کی ہوائیں یہاں کے لوگ سب اجنبی ہیں کنیزاں۔! سب۔

شاید سارے ایسے نہ بھی ہوں، مگر جو۔ مجھے ملے ہیں وہ تو اجنبی ہی تھے۔ مجھے تمہاری بڑی یاد آتی ہے۔

”میں جلد آؤں گی، بس امتحان ختم ہو جائیں۔ دل بھر آ رہا تھا تو سوچا تمہیں خط لکھ کر دل پا کا کر لوں۔“

اور ہاں۔ اب تم کوئی چار صفحوں کا دلاسوں، تسلیوں سے بھرا ہوا خط نہ لکھ دیتا۔۔۔ میں اب اس دور سے گزر چکی ہوں۔ سنبھال لیا ہے خود کو۔ تم تو اچھی طرح جانتی ہو نا کنیزاں کہ تمہاری دوست ٹھوکر کھا کر سنبھل جانے والوں میں سے ہے۔

تمہیں بڑا شوق ہے نا ہاسٹل کے قصے سننے کا، تو صبر رکھو۔ اگرچہ چیدہ چیدہ واقعات تمہارے گوش گزار کروں گی۔

اب تو شام اتر چکی ہے۔ مصنوعی روشنیاں جو شہر کی علامت ہیں، جل چکی ہیں۔ دور کہیں سے اونچی آواز میں اسٹیرلج رہا ہے اور کسی کم بخت نے بے

دھنکا اور فنسول سارنی آئٹم سانگ گار رکھا ہے۔
خیر۔ مجھے تو بڑی چڑ ساس اوٹ پٹانگ اور بے ہنگم موسیقی سے، مگر یہ اچھی طرح یاد ہے کسی زمانے میں ایسے ”دھوم دھڑکے“ تمہارے خاصے فیورٹ ہوتے تھے۔ اب کی خبر نہیں۔ عرصہ ہوا۔ لاعلم ہوں۔

اور تم تو جانتی ہو کنیزاں کہ میں تو محمد رفیع اور مہدی حسن کی شیدائی ہوں اور وہ والی غزل تو ہر ہفتے سنتی ہوں جو ہم آم کے باغ میں ریڈیو پر ”سر سہیلی“ میں سنا کرتے تھے۔

اب کے ہم چھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں تمہیں پہلے خبردار کر رہی ہوں۔ جب میں گاؤں آؤں تو مجھ سے لپٹ کر پھپک پھپک کر رونے نہ لگ جانا۔ تمہاری بڑی پرانی عادت ہے۔ خود بھی روتی ہو اور دوسرے کو بھی ریت کا ٹھل کر دیتی ہو۔ تمہاری چیزوں کی لسٹ محفوظ پڑی ہے میرے پاس۔ آؤں گی تو لے آؤں گی۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آتی یہ تم ”گلابی ربن“ تیسری بار منگوا رہی ہو۔ تمہارا تو گلابی رنگ بڑا فیورٹ ہے۔ تائی کو کہوں گی تمہاری شادی کا جوڑا بھی گلابی لے لیں۔ اس میں تم بجلیاں گراتی۔ ”مس ہنکشن“ لگو گی۔

رات ڈھل رہی ہے۔ اور نائلہ کے خراٹے ناقابل برداشت ہو رہے ہیں، آج تو کانوں پر تکیہ رکھ کر سونا پڑے گا اور سنو۔ او اس مت ہونا تم۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور ہنسنے بھی لگی ہوں۔

اب اجازت چاہتی ہوں سب تک سلام پہنچا دیتا۔ والسلام۔
تمہاری پیاری سلمیٰ





ایک بوڑھا وجود برگد کے ذریعے اپنے شکوے اپنے پیاروں تک پہنچا رہا ہے۔
 نانوپنڈی کرافٹ کا کام کرتی ہیں۔ انارکلی بازار میں وہ ایک دکان بڑی کامیابی سے چلا رہی ہیں۔ نانویشار اور باسل
 دونوں بھائیوں کی سرپرست بھی ہیں۔ یشار نفسیات کا ڈاکٹر ہے اور اپنا کلینک چلاتا ہے۔ باسل اس کا چھوٹا بھائی اس کا
 اسٹنٹ ہے۔ دونوں ایک سیمینار میں شرکت کے لیے فرانس جاتے ہیں جہاں ان کی ملاقات زمل سے ہوتی ہے۔ زمل
 اپنے ڈیڈ کی نفسیاتی کیفیت کی وجہ سے پریشان ہے۔ وہ لاتعداد ڈاکٹرز سے علاج کروا چکی ہے اور اب یشار کو آخری امید سمجھ
 کر اس کے پاس آتی ہے۔ علاج کے دوران باسل اور زمل کی کئی ملاقاتیں ہوتی ہیں جس کے باعث دونوں میں محبت کا جذبہ
 پنپنے لگتا ہے۔

حال کی گھڑکی بند ہوتے ہی ماضی اپنا دروا کرتا ہے جہاں نگار ایک جرات مند اور نڈر لڑکی موجود ہے۔ یونیورسٹی کے پہلے
 دن کے مذاق کی بد مزگی کے بعد اسے اپنے کلاس فیلوز زیان عالم اور اس کے گروپ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے
 جب زیان عالم یونین کے صدر کی حیثیت سے الیکشن لڑتا ہے تو نگار اس کے مخالف مصباح کو سپورٹ کرتی ہے۔ نگار کی
 نظر میں زیان عالم ایک برے کردار لڑکا ہے۔ جس کی والدہ گلاب عالم بھی متنازعہ شخصیت کی مالک ہیں۔ ہال میں ہوتی تقریر

Downloaded From
 Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے دوران نگار زیان کو اس کی ماں کے گھرے ہوئے کردار کا طعنہ دیتی ہے اور زیان بدلے کے طور پر نگار اور حسن کی تصویریں یونیورسٹی کے نوٹس بورڈ پر لگا دیتا ہے۔ نگار غصے میں گرم چائے کا کپ زیان کے منہ پر دے مارتی ہے۔ زیان غصے سے پاگل ہو جاتا ہے۔ وہ نگار کو اغوا کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن پروفیسر صغیر ربانی کی وجہ سے ناکام ہو جاتا ہے۔

نگار گھر آتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔ زیان عالم کا۔ یثار زمل کو پاکستان آنے کے لیے کہتا ہے کہ وہ پاکستان آکر اپنے دادا داد کی قبریں تلاش کرے۔ زمل پاکستان آچکی ہے۔ نانو زمل سے کہتی ہیں کہ وہ ان کے گھر رہ لے جس پر زمل نانو کے گھر رہنے لگتی ہے۔ باسل اور زمل میں محبت بڑھنے لگتی ہے۔ باسل زمل کو شادی کے لیے پروپوز کر دیتا ہے۔

حسن نگار کو چھوڑ کر امریکہ جا چکا ہے۔ نگار یونیورسٹی کے تمام واقعات اپنے باپ کو بتا دیتی جسے سمجھ کر وہ گلناب عالم کو زیان عالم کے رشتے کے لیے انکار کر دیتے ہیں۔ نگار کے والد یار کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے جہاں اتفاق سے زیان عالم موجود ہوتا ہے اور وہ خدا یار کا بہت خیال رکھتا ہے۔ آخر کار نگار زیان سے شادی کے لیے مان جاتی ہے۔ شادی ہو چکی ہے۔ دونوں سیر کے لیے سیاحتی مقام پر آئے ہیں۔ نگار زیان کو پسند کرنے لگی ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں وہ زیان کے ساتھ ریشب اور سدیم کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ زیان ان دونوں دوستوں کی موجودگی میں نگار کو طلاق دے کر اپنی اصلیت کا نقاب الٹ دیتا ہے۔ زیان کا چہرہ اس قدر بھیانک ہو گا۔ نگار کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ اس کی گردن دیوچ کر اس پر شراب الٹ دیتا ہے۔ تین شیطان صفت انسان حوا کی عزت پر غالب آ جاتے ہیں۔

ایک ہفتے بعد نگار اس ریسٹ ہاؤس سے نکلنے میں کامیاب ہو پاتی ہے۔ وہ رحمن رحیم ہادی خدا سے اب ”عادل“ بننے کا تقاضا کرتی ہے لیکن زیان کی بچھائی بساط میں ابھی صرف مہرے ہی آگے کو کھسکے ہیں۔ نگار کی شکست کا لبا کھیل باقی

مکمل ناول

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



ہے گلاب عالم بالا خریان کی سنانی کہانی پر یقین کر لیتی ہیں۔
نگار گھر آتی ہے تو ہمایوں بھیا اور زلیخا بی اس پر لعن طعن کرتے ہیں کہ وہ ریڈ ہاؤس میں زیان کو چھوڑ کر کسی کے ساتھ
بھاگ گئی تھی۔ ہمایوں نگار کو زبردستی گلاب عالم کے گھرا کر ان کے پیروں میں پختا ہے۔ نگار کی کسی بات کا یقین نہیں کیا
چارہا۔ اس کے آنسو بے فائدہ ہیں۔ زیان آتا ہے اور نگار پر یہ الزام ثابت کر دیتا ہے کہ وہ اس سے شادی پر خوش نہیں
تھی۔ اس نے خدایار کے کہنے پر شادی کی۔ اور اب وہ اس سے طلاق چاہتی ہے۔ نگار زیان عالم کے منہ پر تھوک دیتی
ہے۔ زیان طیش میں آ جاتا ہے اور نگار سے زبردستی کرتا ہے۔

”اللہ کی ڈھیل کو اس کی کمزوری نہ سمجھو۔“ صغیر ربانی عین موقع پر پہنچ کر زیان کے منہ پر تھپڑ مار کر کہتے ہیں۔
زلزل باسل کو شادی کے لیے ہاں کہنے کے لیے شطرنج پر ”یس“ لکھواتی ہے۔ نانوباسل اور زلزل کی محبت سے واقف
ہیں۔ مصباح کا قتل یشب نے کیا تھا۔ زلزل کو یہ بات معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ خبر اس کے لیے حیران کن اور دل توڑ دینے والی
ہے۔ اسے اپنے ڈیڈ کی معصومیت پر دکھ ہے کہ سب نے مل کر اس کے ڈیڈ کی زندگی میں زہر گھولا اور انہیں ذہنی مریض
بنادیا۔ نانوزلزل کو نگار کو کھانا دے کر آنے کا کہتی ہیں۔ تب حال کی نگار برآمد کے سامنے بیٹھا بوڑھا وجود اپنے کمرے میں چلا
رہا ہوتا ہے۔ میری عزت کے ساتھ کھینے والے وہ تین تھے۔ ”سدم میشب اور زیان عالم“ زلزل پر یہ لفظ تجلی بن کر گرتے
ہیں۔

چھٹی اور آخری قسطیں

دروازے سے باہر کھڑکی سے پرے۔ بوڑھے درخت
کے پیچھے دو محبت کرنے والے اپنی ماں، اپنے باپ کی
زندگیوں کے حساب کتاب کو پنپاتے پنپاتے اپنی محبت
ختم کرنے پر آگئے تھے۔

”پنی ماں کی صداؤں کو میں فراموش نہیں
کر سکتا۔“ جوان لڑکے کی آواز رندھی ہوئی تھی۔
کوئی بھی سننے والا ان صداؤں کو فراموش نہیں
کر سکتا تھا اور جن کے لیے وہ صدا میں تھیں، انہوں
نے انہیں جیسے سنا ہی نہیں تھا۔ ان کا کوئی جواب نہیں
دیا تھا۔ شاید وہ اس قابل ہی نہیں تھی، اسے کوئی
جواب دیا جاتا۔ خدایار زلیخا بی، صغیر ربانی کسی نے کوئی
جواب نہیں دیا تھا۔ اب اس کے پاس کیا رہ گیا تھا
آخر۔ وہ تو ان پیغامات سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔
سب چاہتیں، تقاضے فنا ہو گئے تھے۔ نگار کے آنسو
بننے لگے۔

”میں نانوا اور نگار آئی۔“ زلزل نے روہانسی آواز
میں کہا۔

چہار سو خاموشی کا راج تھا۔ ایسی جان لیوا خاموشی
میں ایک آواز اس کے کانوں میں پڑی اور اس کا سویا
ہوا وجود جاگ اٹھا۔
”تم واپس چلی جاؤ۔“ باسل نے تیز آواز کے
ساتھ کہا تھا۔

آواز پر تپش تھی، گرمانے اور جلانے والی۔ نگار
تخت پر سے اٹھی۔ کھڑکی کی سلاخ کو تھام کر اس کا
سہارا لے کر وہ کھڑکی کے قریب ہوئی۔ باسل کا لب و
لہجہ اس کی شخصیت اور نانو کی تربیت کے برخلاف
تھا۔ وہ یہ بات کس سے کہہ رہا تھا۔ نگار اچھی طرح
جانتی تھی۔

”میری ماں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا کفارہ معافی
کے الفاظ ادا نہیں کر سکتے۔“ وہ بولا۔ غصے سے، دکھ
سے، درشتی سے، اور اپنے غم کے بے انت ہونے کی
بے بسی سے۔ کیا وہ یہ سب واقعی میں زلزل سے کہہ رہا
تھا یا خود سے؟ نگار نے کھڑکی کی دیوار کے ساتھ اپنا
سر جوڑ لیا۔ اس کی اداس آنکھوں میں نمی تھی۔

کیا عدل شے کی دیواروں کی طرح بے نقاب ہونا چاہیے۔ کھڑکی کی دیوار کے ساتھ سر جوڑے نگار ساری رات یہ ہی سوچتی رہی۔



نگار خانہ کی سالانہ صفائی ہو رہی تھی۔ ملازم جھاڑ پونچھ کر رہے تھے اور ہر طرف گرد ہی گرد تھی۔ نانو نے دکان کے داخلی دروازے کو بند کیا اور کلوز کا بورڈ لٹا کر دکان کی پچھلی طرف قائم کارخانے میں چلی آئیں۔ جہاں کاریگر آئے سامنے زمین پر بیٹھے مختلف اشیاء کو ان کے طے شدہ قالب دے رہے تھے۔ کارخانہ ہتھوڑیوں کی ہلکی بھاری ضرب کی ٹھک ٹھک سے گونج رہا تھا۔ نانو کو یہ آوازیں ہمیشہ ہی سے بڑی بھلی لگا کرتی تھیں۔

لیکن آج یہ آوازیں نانو کے اعصاب پر وزنی ہتھوڑوں کی طرح برس رہی تھیں۔ اور وہاں ایک لمحہ کھڑے رہتا ان کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ ان کے پیچھے گرد تھی۔ آگے بھیا نک شور۔ اور گھر میں وحشت۔ خاموشی سے ایک کونے میں جا کر۔ کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ملازموں نے انہیں تاسف سے دیکھا اور دوبارہ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ دائیں بائیں مختلف چیزیں بن رہی تھیں۔ شور ہو رہا تھا۔ اداسی سے سب دیکھتی نانو کے آگے منظر جیسے وسیع تر ہو گیا۔ اور لمحے بھر میں وہ کارخانہ قدرت میں داخل ہو گئیں۔ جہاں ان کے کارخانے کی طرح ہی زندگیوں کو مختلف اشکال دی جا رہی تھی۔ وہاں بھی بہت کچھ بن رہا تھا۔ دونوں کارخانوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ نانو کسی خواب کے عالم میں سب دیکھنے لگیں۔

ہاں بعض زندگیاں اس نیلے جیٹ کی شطرنج جیسی ہی تو ہوتی ہیں۔ بیک وقت اپنے اندر جیت اور ہار کو سمیٹے ہوئے۔ بعض ان سنگی جانوروں کی طرح۔ جن کے نصیب میں وہی باتیں درج ہوتی ہیں۔ کھیلنا اور ٹوٹنا۔ کچھ شکار و رک کی طرح کی بھی ہوتی ہیں۔

”ان دونوں سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں۔“ باسل نے غصے سے اسے روکا اور نشن کی دھڑکنیں بھی جیسے رک گئیں۔ گلی میں استادیام کے درخت جھومنے لگے۔ وہ جھوم جھوم کر جیسے کسی کو بلارہے تھے۔ کس کو؟ کہیں اس کو۔ نگار کو تو نہیں کہ وہ آئے۔ تیس سال بعد قدم باہر رکھے اور درخت تلے ہوتی اس جمع تفریق کو اختتام تک جانے سے روک لے۔ نگار خاموشی سے وہیں کھڑی رہی۔ اس کے پیروں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ باہر جاسکتی۔ اس کی آواز بھی بند ہو چکی تھی اور وہ کسی جانے والے کو صدا دے کر روک نہیں سکتی تھی۔ انصاف کے تقاضوں نے اس کا گلا خشک کر دیا تھا۔

دھاڑ سے دروازہ بند ہونے کی آواز اس نے سنی۔ باسل اندر آچکا تھا۔ رات ڈھل رہی تھی اور بہت سے رازوں وعدوں اور جذبول کو نگل چکی تھی۔ باسل اپنے کمرے میں جانے کے بجائے مکان کے اس حصے میں چلا آیا۔ جہاں مور تھے فاختا میں تھیں۔ تالاب کا کالی زہ پانی تھا۔ اور برگد بھی۔ باسل درخت کی موٹی شاخ پر ہاتھ ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ پتوں کے سائے کچھ دن کی کم ہوتی روشنی اور کچھ لمبی لمبی جٹاؤں نے اسے اپنے اندر سمولیا تھا، لیکن نگار دیکھ سکتی تھی کہ اس کے کھڑے ہونے میں کیسی شائستگی ہے۔ وہ اس اندھیرے میں نہ جانے کیا کھوج رہا تھا۔ نگار بھی ادھر ہی دیکھنے لگی۔ گردوونوں کے لیے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

باسل نے اتنے دنوں میں جو فیصلہ کیا اس پر عمل بھی کر دیا اور نگار اس نے تو کبھی کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کے لیے قدرت نے ہر فیصلہ کیا تھا اور ان فیصلوں کے نتیجے میں دونوں کے وجود اب اندر باہر سے سیاہ تھے۔

”میرے ڈیڈ کو ان کے کیے کی سزا مل گئی۔ انہوں نے پوری زندگی بہت تکلیف میں گزار دی۔“ زمل کے آنسوؤں میں بہتے فقرے کی بازگشت ابھی تک گونج رہی تھی۔ باسل سر جھٹکتا ہوا باہر نکل گیا۔

کا ہوا بنایا نمونہ دیکھ کر ہی تو تیار کیا ہے۔“ کارمگر ملازم نے قیامت خیز راوعیاں کیا۔

”کیا۔؟“ اور سارا کارخانہ جیسے تانوکے وجود پر
 اُگرا۔

”جی۔ یہ۔۔۔۔۔“ ملازم نے ایک تیار شدہ اور سوکھ چکا چوکھا، نہیں دکھایا۔

”آپ نے ہی تو کہا تھا کہ اس جیسے اور پس تیار کر لیے جائیں۔“ ملازم بول رہا تھا۔ اور نانو کا دل اس بری طرح دھڑکنے لگا تھا جیسے وہ بیدل پوری دنیا کا چکر لگا کر آئی ہوں۔ دوسرے تمام ملازم بھی اپنے اپنے کام روک کر انہیں دیکھنے لگے۔ چند لمحے تو نانو کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کیا بولیں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اس چوکھٹے کو گھورتی رہیں جو بقول کاریگر کے — انہوں نے بنایا تھا۔ اور جس کو بنانے کا وقت ان کو یاد نہیں آ رہا تھا۔

”دکب کی بات ہے یہ۔“ نانوں نے کانپتی آواز سے پوچھا۔

”وہ دن پہلے کی۔“ مانو نے اپنا سر تھام لیا۔ تو کیا وہ اب ناکارہ ہو چکی تھیں؟ ان کے ذہن نے کام کرنا بند کر دیا تھا؟ اور ایسا کیا تھا کہ وہ اب اپنے دل پسند کام کو کرنے کے قابل بھی نہیں رہی تھیں۔

”آپ ٹھیک کر لیں اسے بھی۔ مجھ سے یہ غلط بن گیا ہے۔“ نانو کی آواز میں شکست تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھیں۔

”یہ اب ٹھیک نہیں ہو سکتا۔“ ملازم مسکرایا۔
 ”آپ جانتی ہیں اپنے کام کو۔ اب یہ صدف ٹوٹ تو
 سکتی ہیں لیکن اپنی جگہ سے اکھڑ نہیں سکتیں۔“ ملازم
 شاید اس بات کے ذریعے انہیں دلاسا دینا چاہ رہا تھا۔
 ”میرا کام ویسا نہیں رہا۔ یہ آسانی سے اکھڑ جائیں

ملا تا دو بھر ہو رہا تھا۔
دکان میں اس قدر گرد اڑ رہی تھی جیسے وہاں کوئی

سالوں ایک دیوار پر شگے رہنا اور نو سیدہ ہونے کے بعد گھر سے باہر پھینک دیا جانا۔

ان کی اپنی زندگی کیا تھی۔ وہ سوچنے لگیں اور اپنی زندگی کا نمونہ تلاش کرنے لگیں۔ کیا مرمر کا وہ پہلا جام۔ جسے صرف اس لیے کبھی استعمال نہیں کیا جاتا کہ ٹوٹ نہ جائے۔ اور اس ڈر کے باعث جام اور استعمال نہ کرنے والا دونوں تشنہ رہتے ہیں۔ چاندی کا لیپ۔ جو ہزاروں لاکھوں چوٹیں سہ کر بھی خوشنما دکھائی دیتا ہے۔

اس کارخانے کا شور یہاں کے شور سے کچھ زیادہ تھا۔ کوئی ایک ضرب ثانوی سماعت کی رگ پر بڑی اور چونک کر انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ مکمل حواسوں میں آنے میں انہیں بہت دیر لگ گئی۔ کسی نے انہیں بلا کر پریشان کرنا مناسب خیال نہ کیا۔

”یہ۔۔۔ یہ آپ کیا بتا رہے ہیں۔؟“ نانو نے ایک کاریگر کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ جو تصویر کا چوکھٹا صدف اور کوڑیوں سے سجا رہا تھا۔ کاریگر نے اپنے کام سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”دکھا ہے۔ ذرا یہ مجھے۔“ نانو نے کہا۔ ملازم نے تقریباً ”تھمل ہو جاؤ گا چونکہ ان کی طرف بڑھایا۔ نانو پہلی نظر میں ہی جان گئی تھیں کہ کام بالکل غلط ہو رہا ہے۔ غار مو لے سے ہٹ کر۔“

”یہ کیا کیا ہے آپ نے۔۔۔ بالکل غلط بتایا ہے۔“ تانوں نے نرمی اور ماسف سے کہا۔

”صدف کو آپ نے کناروں پر لگا دیا ہے۔ اور آدھا باہر بھی نکال دیا ہے۔ یہ دیکھیں اس سے چوکھٹے کے خط میں کتنا فرق پڑا ہے۔ اور پائیداری میں بھی۔ کناروں پر صرف کوٹیاں لگتی ہیں۔“ نانوں نے سمجھانے والے انداز سے کہا۔

”باورھے گا۔ کوڑیاں صدف سے نازک ہوتی ہیں۔ لیکن چوکھٹے کے خطر پر آنچ نہیں آنے دیتیں۔ نہ پائیداری پر اور نہ ہی خوب صورتی پر۔“ نانہ پیارے سمجھاتی گئیں۔ کارگر سہلانے لگا۔

شماره ۶۱-۵

روکا۔ نانوں کی صورت دیکھنے لگیں۔
 ”ہاں ٹھیک ہے۔“ انہوں نے آمادگی ظاہر کی۔
 باسل سے مزید کوئی سوال پوچھنے کا ارادہ ترک کرتے
 ہوئے۔ وہ کہاں تھا، کیوں چلا گیا تھا؟ ان سوالوں سے
 کہیں بہتر بات نہ تھی کہ بالا خروہ ان کے ساتھ تھا۔

واپسی کا سفر خاموشی سے طے ہوا۔ نانوں بار بار باسل کو
 دیکھ رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ باسل ان سے کوئی
 بات کرے۔ اور وہ اس کی ایک بات کے بدلے میں
 اس سے جی بھر کے باتیں کر لیں۔ لیکن وہ خاموش تھا۔
 گھر میں بھی ویسی ہی خاموشی چھائی تھی۔ پرانے
 قلعوں کے کھنڈرات جیسی۔ نانوں کو ٹھن کا احساس ہوا۔
 اس گھر میں کچھ ہو کر گزر چکا تھا۔ جس کا وہ اندازہ
 نہیں لگائی تھیں۔

”زل سے ملے ہو؟“ گھر کے اندر داخل ہوتے
 ہوئے انہوں نے پوچھا۔

”مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے نانوں۔“ اس نے
 الگ ہی بات کی۔ نانوں — مسکرا دیں۔

”میں ابھی انتظام کرتی ہوں۔“ منہ ہاتھ دھو کر وہ
 کچن میں کھانا بنانے کے لیے چلی گئیں۔

زل پچھلے کافی دنوں سے کچن میں آکر ان کی مدد
 کر دیا کرتی تھی۔ یا ان کے آنے سے پہلے تھوڑا بہت
 ضروری کام کر کے رکھ دیا کرتی تھی۔ لیکن آج کچن
 میں کوئی بھی چیز تیار نہیں تھی۔ انہوں نے زل کو پکارنا
 مناسب نہ سمجھا اور خود ہی کھانا بنانے لگیں۔

باسل باہر دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھے شیشے
 جڑے گلدان اندر ٹھن میں منتقل کرنے لگا۔ رات کی
 نمی ان کی گوند کو خراب کر سکتی تھی۔ اس کام سے فارغ
 ہونے میں اسے بڑی دیر لگ گئی۔ ایک ایک گلدان کو
 پکڑتا۔ کچھ سوچتا۔ پھر اندر رکھتا۔ پھر سے سوچتا،
 کھڑے رہتا۔ باہر آتا، دیر تو لگتی ہی تھی۔ پھر شیشے کے
 ننھے ننھے گول ٹکڑوں میں نظر آتا اپنا ہی عکس اپنا
 اداس چہرہ۔ حالانکہ جیسا اس نے سوچا تھا، فیصلہ کیا
 تھا بالکل ویسا ہی کیا تھا۔ پھر یہ افسردگی تو بے سبب
 تھی۔ اس کے پاس اپنی اس کیفیت کا کوئی جواز نہیں

صحرائی طوفان آیا ہو۔ یہ اتنی ڈھیر ساری گرد و کان میں
 کب اکٹھی ہو گئی تھی۔ انہیں پتا ہی نہیں چلا تھا۔ وہ
 ایسی لاپرواہ ہرگز نہیں تھیں۔ دکان کی صفائی کے
 معاملے میں وہ کبھی سستی نہیں کرتی تھیں۔ صغیر ربانی
 کی ڈائری میں درج یہ الفاظ انہیں کبھی بھولے ہی
 نہیں تھے۔

”جگہیں گرد آلود ہو جائیں تو پھر وہاں فرشتوں کے
 بجائے شیطان بسرا کر لیتے ہیں اور شیطانی جگہوں پر اللہ
 کی رحمت نازل نہیں ہوتی۔“

تو یعنی اب خدا کی رحمت ان پر ختم ہونے والی تھی یا
 ہو گئی تھی؟

”دروازہ کھول دو۔ اور پنکھا بھی چلا دو۔ کس قدر
 مٹی جمع ہو گئی ہے دکان میں۔“ انہوں نے تیز آواز میں
 کہا۔ آمنے سامنے سیڑھی پر چڑھے دونوں ملازموں
 نے ایک دوسرے کو دیکھا اور خاموش رہے۔

”پنکھا چل رہا ہے۔ اور دروازہ بھی کھلا ہوا
 ہے۔“ کسی نے ان سے کہا تھا۔ آواز کچھ جانی پہچانی
 سی تھی۔ گرد کے باعث انہیں کہنے والے کا چہرہ نظر نہ
 آیا۔ پھر رفتہ رفتہ منظر واضح ہونے لگا۔ ان کے سامنے
 باسل کھڑا تھا۔ بڑے دنوں کے بعد اسے اپنے سامنے
 کھڑا دیکھ کر نانوں ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ سے ہل بھی
 نہ سکیں۔

”باسل! تم آگئے۔“ خوشی کے مارے نانوں پوری کی
 پوری کانپ گئیں۔ آگے بڑھ کر انہوں نے باسل کو
 والہانہ اپنے گلے سے لگالیا۔ ان کی آنکھیں نم
 ہو گئیں۔ وہ جذباتی ہو رہی تھیں۔ باسل بھی نانوں کے
 گلے سے لگا رہا۔

”کہاں چلے گئے تھے باسل؟“ انہوں نے اپنے
 آنسو پونچھتے ہوئے باسل سے شکوہ کیا۔

”اب آگیا ہوں نا۔“ باسل نے جواب دیا۔ نانوں
 سمجھ گئیں وہ اس معاملے پر مزید بات نہیں کرنا چاہتا۔

”تمہیں پتا ہے میں کتنی پریشان رہی۔ نگار میثار
 اور زل تو۔“

”گھر چلتے ہیں نانوں۔“ اس نے انہیں درمیان میں

تھا۔ ”چند دن گزریں گے اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے خود کو تسلی دی۔ یہ تسلی کس حد تک اطمینان بخش تھی۔ یہ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔
یشار بھی کلینک سے آگیا تھا اسے باسل کی آمد کا علم تھا۔ دوپہر میں فون پر اسی نے تو باسل کو بتایا تھا کہ زل
شام کے وقت قبرستان سے واپس آتی ہے۔
تھوڑی دیر بعد دونوں ڈائینگ ٹیمیل پر بیٹھے تھے۔
نانو برتن لگانے لگیں۔

”زل کو بھی بلا لاؤ۔“ نانو نے دونوں سے ہی کہہ دیا تھا۔ یشار نہیں اٹھا۔ باسل اب گھر واپس آگیا تھا تو بہتر تھا کہ وہ اپنے حواسوں میں بھی واپس آجائے اور یہ کام خود کرے۔ لیکن باسل بدستور اپنی جگہ پر بیٹھا پلیٹ میں چچ کھڑا کھنے کی مشق کرتا رہا۔
نانو ٹرے میں کھانا رکھ کر نگار کو دینے چلی گئیں۔ پھر انہوں نے ٹیمیل پر لا کر کھانا رکھا اور زل کو اس کے کمرے سے بلانے خود ہی چلی گئیں۔ چند لمحوں بعد وہ گھبرائی ہوئی آئیں۔

”زل کمرے میں نہیں ہے۔“ نانو نے تیزی سے آتے ہوئے کہا۔ یشار چونک کر نانو کو دیکھنے لگا۔
”کمرے میں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟“
”وہ قبرستان سے واپس لوٹی تھی کہ نہیں؟“ نانو نے پوچھا۔ یشار نے باسل کی طرف دیکھا۔ گھر پر صرف وہ ہی تھا۔
”باسل!“ یشار نے اسے پکارا۔

”ہاں۔“ باسل نے چونک جانے کی بھرپور اداکاری کی۔

”کیا زل گھر آئی تھی۔“ باسل بات سن کر دوبارہ پلیٹ چچ کے ساتھ مصروف ہو گیا۔
”ہاں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔
”تو پھر کہاں ہے؟“

”وہ واپس چلی گئی ہے“ اس نے دونوں میں سے کسی کی بھی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”واپس!“ نانو نے حیرانی سے پوچھا باسل کو دیکھا۔ اور اس سے بھی زیادہ حیرانی سے وہ سوچنے لگیں۔

”کیا زل کے پاس واپسی کے لیے بھی کوئی جگہ ہے۔ کیا وہ ہمیشہ سے یہیں نہیں رہتی آرہی!!“
”ہاں واپس۔“ فرانس۔“ اس نے دونوں لفظوں پر زور دے کر کہا۔ نانو کو ایک چکر سا آیا۔ یشار بنا پلکیں جھپکائے باسل کو دیکھنے لگا۔
”کیوں؟“

”مجھے نہیں پتا۔“ وہ بے زار ہوا۔
”کب گئی وہ؟“ نانو نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”آپ شاپ پر تھیں۔ اس نے اپنا سامان پیک کیا اور وہ چلی گئی۔“
”تم کیا کہہ رہے ہو باسل! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ وہ رو ہانسی ہوئیں۔

”وہ واپس چلی گئی ہے نانو۔ ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے۔ اتنی سی بات آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آرہی۔“ وہ جواباً چلایا اور

پوری قوت سے پلیٹ پر چچ دے مارا۔ پلیٹ دو ٹکڑے ہو گئی۔ نانو اس کے اس طرح چلانے اور اس کے رویے پر خاموش ہو گئی تھیں۔ اور یشار کو ساری بات سمجھنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگا تھا۔

”تو تم نے اسے روکا کیوں نہیں؟“ بڑی دیر کے بعد نانو نے اس سے پوچھا۔ باسل ٹوٹے ٹکڑوں کو دیکھتا رہا۔

”جواب دو باسل!“

”میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ وہ یہاں سے چلی جائے۔“ اور نانو شاید یہ ہی سنتا چاہتی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرے۔ باسل کو یہ منظر دیکھ کر غصہ آیا۔ نانو پر اور اس ساری صورت حال پر وہ زل کے لیے آنسو بہانے والی ہمدردی رکھتی تھیں۔ اس بات نے باسل کو سخت طیش دلایا۔ اس کا دل چاہا کہ پورا ٹیمیل الٹ دے۔ اور گھر کے سارے دروازے کھڑکیاں توڑ ڈالے۔

یشار اس ساری گفتگو کے دوران خاموش رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زل کی ذرا سی بھی طرف داری باسل کو اس

سے بدظن کر دے گی۔ اور باسل کی حمایت مانو کو نگار اور گزرے گی۔

کھانا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اور مانو کا کرسی پر بیٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ جیسے کھڑی تھیں۔ ویسے ہی کھڑی رہیں۔ پھر ان کے وجود سے رندگی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ جس میں شکوے کی رمت تھی۔

فرانس کا شہر۔ پیرس۔

”تم اتنے بڑے کب سے ہو گئے باسل۔ تم اتنے بڑے کب سے ہو گئے۔“ وہ چادر میں منہ چھپا کر روتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

ٹرے میں رکھا ہوا کھانا جوں کا توں پڑا تھا۔ باہر سے نانو اور باسل کی آوازیں اندر آرہی تھیں۔

”آئی سی بات آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آرہی۔“ باسل چلا رہا تھا۔ اس کی آواز کے ساتھ شور بھی اٹھا تھا۔ نگار آہستگی سے تخت پر سے اٹھی۔

”تم نے اسے روکا کیوں نہیں۔؟“ مانو کے سوال میں التجا، غم، دکھ، آس سب کچھ شامل تھا۔ نگار چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ باسل کے پاس مانو کے سوال کا جواب تو تھا لیکن ان کے دکھ کا علاج نہیں۔ یہ علاج خود نگار کے پاس بھی نہیں تھا۔

”تم اتنے بڑے کب سے ہو گئے باسل؟“ وہ اب

باقاعدہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ اور پھر تیزی سے جلتے ہوئے اسی طرف آئی تھیں۔ اپنے کمرے کی طرف۔ اندر داخل ہونے سے پہلے وہ رگیں۔ انہوں نے نگار کے کمرے کی طرف دیکھا۔ دروازے میں

کھڑی نگار کو دیکھ کر بے اختیار انہیں جیسے مزید رونا آگیا۔ اور وہ اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئیں۔ نگار

بے بسی سے انہیں دیکھتی رہی، پھر اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ مانو کے روتے کی گھٹی گھٹی آواز دروازے کے پار سے آرہی تھی۔ نگار نے ان کے دروازے پر

دستک دینی چاہی لیکن پھر رک گئی۔ اور باہر آگئی۔ ڈانٹنگ میبل سے اشار بھی اٹھ کر جا چکا تھا۔ صرف باسل بیٹھا ہوا تھا اور وہ بھی کھانا نہیں کھا رہا تھا۔

باسل نے آہٹ۔ سر اٹھا کر نگار کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ عکس تھا جس کے بارے میں مفروضے کشف اور پیش گوئیاں بھی بے کار ثابت ہوتی ہیں۔ نگار باسل سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ کیا کہنا چاہتی تھی اسے یاد نہ آیا۔ یاد ہی نہ آیا۔

دریائے سین بہہ رہا تھا۔ روز کی طرح سورج کی کرنوں کو چائے مغرب کی طرف۔ وہ بہہ رہا تھا۔ اس کے آنسوؤں کی طرح بھی جن کا اندرونی بیرونی۔ حجم اب اس قدر زیادہ ہو چکا تھا کہ دو اور دریا موجوں سمیت بہہ سکتے تھے۔ اس نے اس دریا پر کوئی بند نہ باندھا۔ اپنے آنسو اس نے صاف نہ کیے بنے دیے۔

جب وہ چھوٹی تھی تو سدیم انکل اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے ذرا بڑی ہوئی تو می نے اسے چھوڑ دیا۔ اس کے جذبے، لگن، تحریک یہ سب بھی باری باری اس سے اپنا دامن چھڑاتے رہے۔ کیا ذات کا خراج یہاں تک کافی نہ تھا۔ کیا اس کی تقدیر کو اس سے زیادہ محصول چاہیے تھا جو ڈیڈ نے بھی اسے چھوڑ دیا ہمیشہ کے لیے۔ وہ اس کی زندگی کا واحد سہارا تھے۔ واحد رشتہ تھے ٹھیک ہے اس نے اس جدائی پر بھی صبر کر لیا تھا۔ وہ اللہ کی مرضی کے آگے چپ ہو گئی تھی۔ لیکن باسل؟ باسل نے اسے کیوں چھوڑ دیا؟ اسے زندگی میں محبت ملی ہی کب تھی جو وہ محبت میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے تجربے سے واقف ہوئی۔ اس کے باوجود وہ اس محبت میں بہت احتیاط سے آگے بڑھی تھی۔ اور منزل پر پہنچ کر ساری احتیاطیں بے کار ثابت ہوئی تھیں۔ محبت میٹھے کا جام تھی جو بالآخر ٹوٹ گیا تھا اور اس کے ہاتھ ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بھی نہ آسکے۔ سب پلک جھپکتے ہی فنا ہو گیا تھا۔

اس نے ہتھیلیوں سے۔ اپنے آنسو صاف کیے یہ محبت اتنی جلدی اور صرف آنسوؤں سے دھلنے والی نہیں تھی۔ ابھی اسے سبر کا مظاہرہ کرنا تھا۔ یہ محبت

اس کی جان ہی لے کر — چھوڑنے والی تھی۔ پاکستان سے واپس آئے لے ایک ماہ گزر چکا تھا۔ گھر کی میڈز اور بٹلرز زبان عالم کی وفات اور اس کی حالت دیکھ دیکھ کر افسردہ تھے۔ خاص طور پر ڈیوڈ۔ وہ کافی عرصے سے زبان عالم کے قریب تھا۔ ان کے آخری سالوں میں تو بے حد قریب رہا تھا۔ اس ساری صورت حال نے گھر کی فضا کو سوگوار بنا دیا تھا۔ ماتم کا چاند طلوع ہو کر غروب ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بے تحاشا روشنی کے باوجود بھی اسے سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا نظر آتا۔ جیسے تمام درودیاؤں پر کسی نے تار کول کالپ کر دیا ہو۔

خاموشی میں اسے ہنسی کی آوازیں آتیں۔ خوفناک ہنسی کی آوازیں۔ وہ بری طرح ڈر جاتی۔ اسی خوف نے اسے کمرے میں قید کر کے رکھ دیا۔ ملازما میں اسے کھانے پر بلاتیں۔ کمرے سے باہر نکلنے کا کہتیں لیکن وہ انکار کر دیتی۔ این جی او کی طرف سے بھی مسلسل فون آرہے تھے۔ وہ شہر کے اندر اور شہر سے باہر ہونے والے کسی تار میں اس کی موجودگی چاہتے تھے، لیکن فی الحال وہ خود میں کسی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

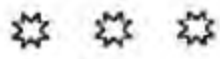
ڈیڈ کی موت کی خبر ملی کو بھی ہو چکی تھی۔ انہوں نے زل کو فون کیا تھا۔ سیل فون پر اور گھر کے نمبرز پر۔ بار بار۔ وقفے وقفے سے مگر زل نے بات نہیں کی۔ انٹرنگ مشین پر اس نے مہی کے دو پیغام سن لیے تھے، جن میں طویل خاموشی اور مختصر تسلی تھی۔ ان کے لیے اور اس کے لیے یہ ہی کافی تھا۔

ایک پیغام ریشب انکل کی طرف سے بھی تھا۔ جس میں اسے حوصلے سے کام لینے کی تلقین کی گئی تھی، پیغام کے — بس پر وہ پیغام کچھ اور تھا۔ وہ چاہتے تھے زل زبان عالم کی پر یاد ہو چکی کمپنی ان کو بیچ دے۔ زل سن کر ہنسنے لگی تھی۔ کمپنی خرید کر ریشب انکل کیا کرنے والے تھے؟ سدیم انکل اور ڈیڈ کے بعد ریشب انکل کا انجام بھی اب زیادہ دور کہاں رہ گیا ہو گا۔ حوصلے کی ضرورت یقیناً ”مہی کو پڑنے والی تھی اور بہت جلد

دونوں میں سے کسی ایک نے بھی اسے اپنے پاس آنے کے لیے نہیں کہا تھا اور وہ ان سے اس بات کی توقع بھی نہیں کر رہی تھی۔ اگر وہ اسے اپنے گھر آکر رہنے کی دعوت دیتے بھی تو انکار کے علاوہ کچھ اور نہ سنتے۔ اس کے باوجود اسے دکھ ہوا تھا۔

وہ مدتوں بعد دریائے سین کو ایک بار پھر سے ایسے دیکھنے لگی جیسے اس سے اپنے ساتھ روار کھے گئے ظلم کا حساب کتاب مانگ رہی ہو۔ یا جیسے سین اپنے اندر کسی پرانے رجسٹر میں اس کی محرومیوں کا اندراج چھپائے بیٹھا ہو۔ ایک اور عورت کو وہ جانتی تھی۔ جو یہاں سے بہت دور حبیب اللہ روڈ کے پرانے گھر کے کمرے میں بیٹھی کھڑکی کی سلاخوں کو تھامے مدتوں سے برگد سے جواب کی آس لگائے بیٹھی تھی۔ اور ایک وہ خود تھی۔ جو سین کو امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ ہی کچھ بول دے۔ انسان جب ہر طرح کے انسانی سہاروں سے محروم ہو جاتا ہے تو شاید ایسی ہی چیزوں کو اپنا سہارا سمجھ لیتا ہے۔ اسے چیخوف کی وہ کہانی بھی یاد تھی جس میں ایک کو جوان کو جب اپنا غم سنانے کے لیے کوئی نہیں ملتا تو وہ اپنے گھوڑے کے گلے لگ کر ہی رونا شروع کر دیتا ہے۔

غم کے مارے زل کو ہنسی سی آگئی۔ یہ سین بھی اس بوڑھے برگد کی طرح خاموش تھا۔ بے اثر سا۔ یہ خاموش چیزیں اندر ہی اندر انسانوں کا خوب مذاق اڑاتی ہوں گی۔ ان کے صبر کا پورا پورا امتحان لینے کے بعد۔ دکھ سے اس نے سوچا اور ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔



نگار کو کھانا دینے اس دن بھی وہ خود ہی آیا تھا۔ وہ پہلے بھی یہ کام اکثر کر لیا کرتا تھا، لیکن اب جو حالات اگر گزر چکے تھے۔ اس کے بعد وہ کم از کم رات کا کھانا دینے تو ضرور ہی آتا تھا۔

وہ چھٹی کا دن تھا جب باسل دوپہر میں اس کے پاس

آیا۔ کمرے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ نگار کے قریب ہی تخت پر بیٹھ گیا۔ کھانے کی ٹرے اس نے اپنے اور اس کے درمیان رکھ دی۔

”کھانا کھالیں۔“ اس نے نرم آواز سے کہا۔ پھر نجانے اس کے دل میں کیا آیا کہ وہ رومال میں سے روٹی نکال کر اس کا نوالہ بنانے لگا۔ وہ نگار کو باہر سب کے ساتھ کھانا کھانے پر راضی تو نہیں کر سکتا تھا۔ نجانے کون کون سی مسافعتیں تھیں جو نگار کو طے کرنی تھیں۔ اب نہ وہ طے ہوتی تھیں۔ نہ فاصلے مٹتے تھے یا یہ کمرہ ہی آسیب زدہ تھا جو اپنے سائے سے نگار کو باہر جانے ہی نہیں دے رہا تھا۔

لیکن وہ یہاں تو فاصلہ ختم کر سکتا تھا۔ نگار نے باسل کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور اپنے لب کھولے۔ لیکن کھانے کے لیے نہیں۔

”زل۔“ وہ ذرا رک رک کر بولی۔ باسل نے اٹھا ہاتھ جھکالیا۔ اسے زل کا نام سن کر سخت کوفت ہوئی تھی۔

”زل کہاں ہے؟“ نگار نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ باسل نگار کی شکل دیکھا رہ گیا تھا۔ اتنے ڈھیر سارے سالوں بعد انہوں نے اس کی زندگی میں دخل دیا بھی تھا تو کس نام سے۔ جسے اب وہ سننے کا بھی روادار نہیں رہا تھا۔ کہاں اس کے متعلق باتیں کرنے کا۔

کیا زل ایسی ہی ساحرہ تھی جس نے چند ماہ میں ہی سب پر اپنا سحر طاری کر دیا تھا۔ وہ جاچکی تھی، لیکن پھر بھی کوئی اس کے سحر سے نکلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ نانوں نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ پھر بھی ان کے رویے سے اسے سرد مہری جھلکتی ہوئی نظر آتی تھی۔ وہ ہر وقت انہیں مشکوک نظروں سے دیکھتا رہتا۔ ان کی محبت تو تھا۔ اسے ان کا رویہ منافقانہ اور دوغلا لگنے لگا تھا۔ صرف ایک زل کی وجہ سے۔

شاید زل اپنی ذات میں واقعی ساحرہ تھی۔ اس نے پہلی نظر میں باسل کے سارے خیالات کو بھی تو جکڑ لیا تھا اور اب اس کی نظروں کے سامنے اس کی ماں تھی

جن کی نظروں کی تپش وہ برداشت نہیں کیا رہا تھا۔ سب جانتی تو ہیں یہ۔ پھر آخر کیوں پوچھ رہی ہیں کہ زل کہاں ہے تاکہ اس سوال کے جواب کے بعد وہ اس موضوع کو شروع کر سکیں۔ پھر سے۔ یعنی ایک ماہ گزرنے کے بعد بھی یہ معاملہ جوں کا توں ہی ہے۔ ان سب کے نیسے۔ حالانکہ اس نے تو اس سارے معاملے کو اپنی دانست میں ختم کر دیا تھا۔

”وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔“ اس نے تیز لہجے میں جواب دیا۔ اس انداز سے کہ اگر وہ اس کی واپسی کی کوئی آس بھی لگائے بیٹھی ہیں تو اسے ختم کر دیں۔ نگار چند لمحے کچھ بول نہ سکی۔ کمرے میں باسل کے غصے کے علاوہ ہر چیز پرسکون تھی۔

”باسل۔“ نگار نے پار سے اس کا نام پکار کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ جو کہنے والی تھی باسل جانتا تھا۔

”نہیں امی۔ خدا کے لیے نہیں۔ کچھ مت کہیے گا۔ وہ اس آدمی کی بیٹی ہے جس۔“

”تم میری خاطر۔“

”آپ میری خاطر پریشان نہ ہوں۔“ اس نے نگار کی بات کاٹی۔ نگار خاموش ہو گئی۔

”گور میں جانتا ہوں یہ آپ نہیں بول رہیں۔ یہ نانوں بول رہی ہیں۔ آپ بھی زل کو بھلا اس گھر میں کیسے برداشت کر سکتی ہیں۔ نانوں نے کہا ہے نا آپ سے یہ سب کہنے کو؟“ اس نے پوچھا اور نگار کو جواب دینے کی مہلت دیے بغیر پھر شروع ہو گیا۔

”انہوں نے آپ کو اپنی زندگی بھر کی خدمت کا واسطہ دیا ہوگا۔ ہماری پرورش کرنے کا۔ اس گھر کو چلانے کا۔ آپ کی دیکھ بھال کرنے کا۔ اور آپ ماں لگیں۔ آپ اپنے دل پر ضبط کر کے مجھے اجازت دے رہی ہیں کہ میں آپ کی خاطر۔“ اس نے توقف کیا۔

”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے امی! زل سے مجھے محبت نہیں تھی۔ بس صرف پسندیدگی تھی۔ اب وہ بھی نہیں ہے۔“ بڑی نفاست سے اس نے جھوٹ بولا اس ہستی کے آگے جو برگد کے ایک ایک ریزے بھی واقفیت رکھتی تھی۔

باقی کا وقت خاموشی میں گزرا۔ نگار نے مزید کوئی بات نہ کی۔ باسل بھی چپ رہا اور آرام آرام سے اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتا رہا۔ اس دوران دونوں کی آنکھیں نم رہیں۔

کھانا کھلا کر وہ برتن رکھنے کچن میں آیا۔ جب کچن کے شیف پر دھرے پیاموں کی جوڑی پر اس کی نظر پڑی۔ جن کے اندر زل کے ہاتھوں سے بنی ہوئی کمچیل تھیں۔

”نانو۔ اس کے ساتھ چاول بواٹل کیجیے گا۔ جب کھائیں گی تو مجھے یاد ہی کریں گی۔ تین ماہ بعد میں تو ہوں گی نہیں آپ کے پاس۔“ اسے زل کی بات یاد آئی۔

”اور اگر تم بھی یہاں ہوئیں تو۔“ اس نے شوخی سے پوچھا تھا۔ زل کوئی جواب نہیں دے سکی تھی۔ یہ سب یاد کر کے وہ مسکرا بھی نہیں سکا۔ حالات بعض اوقات اس طور بدلتے ہیں کہ انسان خوش گوار یادوں پر بھی خوش نہیں ہو سکتا۔ وہ یادیں مرتبانوں میں بند خراب اچار کی طرح تلخ اور بدبودار ہو جاتی ہیں۔

اس نے دونوں پیاموں کو دیکھا۔ نانو شاید آج رات میں یہ ہی ڈش کھلانے کا ارادہ رکھتی تھیں تب ہی وہ کالی خوش تھیں۔ اور باقی ساری تیاری بڑے جی جان سے کر رہی تھیں۔ باسل کو دونوں باتوں پر غصہ آیا۔ ان کی خوشی پر بھی اور ان کی تیاری پر بھی۔

کچے بھر رک کر سوچے بنا اس نے ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے دونوں پیاموں کو شیف سے نیچے گرا دیا چھٹکے کی آواز گونجتی ہوئی باہر نکل گئی۔ سفید اور سیاہ ٹکڑے ٹوٹ کر آپس میں مل گئے اور ان کے اندر سے کمچیل نکل کر فرش پر پھیل گئیں۔

”کیا ہوا؟“ نانو تیز تیز چلتی ہوئی کچن میں آئیں۔ سفید سیاہ ٹکڑے اور کمچیوں کے بکھرے ہونے کا منظر انہوں نے دیکھا اور وہاں کھڑے باسل کو۔

”ہاتھ لگا اور یہ جار کر گئے۔“ اس نے بنا شرمندگی کے کہا۔ ”بتا ہی نہیں چلا بس۔“ نانو کچھ کچھ تو بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھتی رہیں۔ پھر پلیٹ پیچ پکڑ

کر انہوں نے اوپر اوپر والی کمچیل اٹھا لینی چاہی تھیں۔ باسل ان کی اس پھرتی پر اپنے ناگوار تاثرات چھپانہ سکا۔ یہ اس کی غضب ناک نظروں کی تپش ہی تو تھی شاید جو نانو نے کام ادھورا۔۔۔ ہی چھوڑ دیا۔

”یہ خراب ہو گئی ہیں۔ دیکھو۔ دیکھو ان میں کیڑے بڑ گئے ہیں۔“ انہوں نے پلیٹ باسل کے آگے کی۔ ایک ناگوار بدبو باسل کے ناک میں تھسی۔

”جی۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔ اور منہ پرے کر لیا۔ وہ نانو کے ساتھ اس نقصان پر ماتم کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ حالانکہ نانو کی آنکھوں سے پھلکتے آنسو اسے نظر آ گئے تھے۔ پلیٹ ہاتھ میں پکڑے وہ لیس دار گودے کو یوں گھورے جارہی تھیں جیسے ان کا سب ہی کچھ لٹ گیا ہو اور صرف یہ ہی باقی بچا ہو۔ کیا انہیں بدبو نہیں آرہی تھی۔

اسے نانو کے اس دکھ کی وجہ سمجھ میں نہ آ سکی۔ کیا نانو کے آنسو اس باعث تھے کہ دونوں پیام ٹوٹ گئے تھے جو باسل نے انہیں دیے تھے یا ان آنسوؤں کی وجہ کمچیوں کا خراب ہو جانا تھا جو زل نے بنائی تھیں۔



چھ ماہ بعد

پیرس۔

”ناراض ہو۔“ وہ پیار سے پوچھ رہا تھا۔ زل نے چہرہ اس کی طرف نہ کیا۔ وہ آج آیا تھا۔ پورے سات ماہ بعد۔ اسے اتنا طویل انتظار کروانے کے بعد۔ یہ کچھ خدا کا کریم ہی تھا کہ اب تک اس کی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ آنکھوں میں شکوے اور آنسو لیے۔

”کیا نہیں ہونا چاہیے۔؟“ الٹا اس نے سوال کیا۔ اس کے انتظار میں اس نے جوازیت خود کو دی تھی اب اسے وہ رہ رہ کر یاد آرہی تھی۔ انسان جب خود پر افسوس کرنے لگے تو اس وقت وہ سب سے زیادہ ترس کے قابل ہوتا ہے۔

”ہونا چاہیے۔ ضرور ہونا چاہیے۔ میں نے جو

پھر اب تم کیوں اتنی سنگدل بن رہی ہو۔“
 ”سنگ دلی وراثت میں تھوڑی نا ملتی ہے باسل!
 جس کے وارث صرف تم ہی ہو سکتے تھے، کچھ جذلوں
 کے سوا اگر زبردستی اسے آپ کو فروخت کر دیتے
 ہیں۔“

”ہانو جیسی باتیں کرنے لگی ہو۔“
 ”تنا عرصہ ان کے ساتھ رہی اثر تو لیتا ہی تھا۔“
 ”اور جو اثر اس سے پہلے کے تھے کیا انہیں تم
 نے بھلا دیا؟“

”وہ مجھ سے کھو گئے۔“
 ”او انہیں دوبارہ تلاش کرتے ہیں۔“ اس نے
 اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے
 اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ زل کا سارا وجود
 بھر بھری مٹی بن گیا۔ بے اختیار ہی باسل کے کندھے
 پر اپنا سر رکھ کر وہ رونے لگی۔ جیسے میلوں پیدل چل کر
 آ رہی ہو اور یہاں آ کر اس نے دم لیا ہو۔

وہ جاوٹی خوشبو والے پھولوں کے ان باغات میں گم
 ہو گئی جہاں سے باہر نکلنے کے راستے انسان ہمیشہ ہی کھو
 دیتا ہے۔ وہ نظر ابھی جائیں تو انہیں نظر انداز کر دیا جاتا
 ہے۔ آگے ہی آگے بڑھا جاتا ہے۔ کندھے پر سر رکھے
 وہ لمبی نجانے کتنی دور نکل گئی تھی۔ واپس لانے کے
 لیے میڈ کو بھر پور قوت سے اسے ہلانا پڑا۔

”مس زل!“ وہ اسے ہلاتے ہوئے مسلسل پکار
 بھی رہی تھی۔ جھٹکے سے زل نے اپنی آنکھیں
 کھولیں۔ اپنے ارد گرد دیکھا اور پھولوں سے سجایا
 اس کی آنکھوں کے آگے جل کر خاستر ہو گیا۔

”مس زل!“ میڈ نے افسردگی سے اسے پکارا۔ وہ
 چند لمحے بیگانگی سے اسے دیکھتی رہی۔ جیسے پہچان نہ
 پارہی ہو۔

کرسی پر جھولتے جھولتے ہی وہ نجانے کب سو گئی
 تھی۔ ملازمہ نے اس پر کبل ڈال دیا تھا۔ وہ اب اسی
 کبل میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اگر اس نے اسے
 چھوڑ ہی دیا تھا تو وہ اس کے ساتھ کیوں چلا آیا تھا۔ کیوں
 اس کی خوشبو گھر میں چاروں طرف پھیلی تھی۔ اس کی

کیا غلط کیا۔ لیکن میری غلطی میری محبت سے ہوئی
 ہرگز نہیں ہے۔“ باسل نے کھڑکی کے پٹ پر رکھے
 اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اتنی مضبوطی سے
 رکھا کہ وہ چاہ کر بھی اپنا ہاتھ نکال نہ پائی اور سسک کر وہ
 گئی۔ مہینوں بعد ایک بار پھر سے۔ کیا وہ یہ ہی نہیں
 چاہتی تھی کہ وہ سٹے۔ دوبارہ بکھرے اور دوبارہ سٹے
 اپنے خیالات پر اسے رونا آیا۔
 ”میں اس وقت غصے میں تھا۔ یہ سب نہ کرتا تو کیا
 کرتا؟“

”سب کچھ کرتے مگر میری محبت کو رسوا نہ
 کرتے۔“ اس نے سوچا پر کہہ نہ سکی۔

”لیکن مجھے بعد میں احساس ہوا کہ میں غلط ہوں۔
 تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔ کسی کا بھی قصور نہیں تھا۔
 شاید وقت کا قصور تھا اور پھر جب وہ قصور وار برا وقت
 گزرا تو مجھے احساس ہوا کہ۔“

”یہ احساس کس نے دلایا تمہیں باسل۔“ اس
 نے پوچھا۔ ”ہانو نے“ نگار آئی نے یا یثار بھائی
 نے۔“

”تمہائی نے۔“ اس نے اسے کندھوں سے تھام
 کر اس کا رخ اپنی طرف موڑ لیا جیسے پتھر کے مجسمے کو
 اس نے اپنی طرف موڑا۔

”میری طرف دیکھو زل۔“ تھوڑی کو چھو کر اس
 نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ زل کی آنکھیں چھلکیں۔

”سب بھلا دو زل۔“ وہ التجا آمیز محبت بھرے لہجے
 میں بولا۔ باری باری اس نے اس کی دونوں آنکھیں
 صاف کیں۔

”وقت گئے گا باسل۔“

”ہانو انتظار کر رہی ہیں۔ امی یثار اور میں بھی۔“

”میں ابھی تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی باسل۔“

”ستار ہی ہو۔ بدلہ لے رہی ہوتا“

”سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

”مجھے؟“

”نہیں محبت کو۔“

”میں آگیا ہوں نا واپس۔ سو رہی بھی بول دیا ہے

باتیں۔ اس کے قہقہے سب اس کے ساتھ ہی چلے آئے تھے۔ ان سب سے اس کا دامن نہیں چھوٹ رہا تھا۔ وہ کفن میں لپیٹ کر قیامت تک کے لیے دفن کر دیتی، اگر یہ بات اس کی سمجھ میں آجاتی کہ وہ کفن میں کس کو لپیٹے یا دوں کو یا خود کو؟

میڈ کافی دیر تک اس کے چپ ہو جانے کا انتظار کرتی رہی تھی۔
”وہ نہیں آئیں گے لیکن آپ کو جانا ہے۔“ میڈ نے کہا۔

”کہاں؟“ اس نے باقی ماندہ آنسو بھی کبیل میں جذب کیے۔
”سیٹی نار میں۔ آپ نے ان سے ”ہاں“ کہا تھا۔“

”ہاں۔ ٹھیک ہے۔ میں جاؤں گی۔“ اپنے اوپر سے کبیل پرے دھکیل کر وہ ایک عزم سے اٹھی۔ اگر اس نے مجھے بھلا دیا ہے تو میں بھی اسے بھلا دوں گی۔ میں اب آگے بڑھوں گی۔ یہ ناکام محبت میرا راستہ نہیں روک سکتی۔“ وہ اپنے کمرے میں آئی اور وارڈ روم کھول کر آج کے لیے لباس منتخب کرنے لگی۔ اس کے ہاتھ وہ ڈریس بھی آیا جو نانوں نے اس کے بیماری سے صحت یاب ہو جانے کے بعد اسے پہننے کے لیے کہا تھا۔ وہ آج بھی اسے پہن لیتی۔ اگر مکمل صحت یاب ہو چکی ہوتی۔

پاکستان سے آنے کے بعد کافی ہفتوں تک اس کے پیگڈ ویسے ہی بند پڑے رہے تھے۔ میڈ نے اس سے بارہا ان کے بارے میں پوچھا تھا اور اس نے کبھی کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا تھا۔ میڈ نے ایک دن وہ کام خود ہی کر لیا تھا۔ اسے اس بات کی پروا بھلا کب تھی کہ اس کی کون سی چیز اس گھر میں رہ گئی تھی۔

لیکن آج بڑے عرصے بعد اپنے وارڈ روم کی جانچ کرتے وقت اسے اندازہ ہوا کہ اس کی ایک ذرہ برابر چیز بھی وہاں نہیں رہ گئی تھی۔

”کیا آپ وہاں سے بہت عجلت میں نکلی تھیں چیزیں بری طرح پیگڈ میں ٹھوسی ہوئی تھیں۔“ میڈ

نے اس کے پیگڈ کھولنے کے بعد اسے کہا تھا۔ یہ عجلت اس نے نہیں باسل نے دکھائی تھی اور ایسی عجلت میں بھی اس نے اس کی تمام چیزوں کو اس کے ہمراہ کیا تھا۔ مکمل ایمانداری سے۔ یا پھر وہ اپنے گھر میں اس سے ’جڑی‘ اس کی یاد دلانے والی کوئی چیز رکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن کیسی عجیب بات تھی اس نے سلمان میں وہ آرائشی بول تو رکھی ہی نہیں تھی جو اس نے خود اسے دی تھی۔ جس کے بادبان پر سنہری تحریر رقم تھی۔ اس کو تا عمر اپنا لینے کی۔ کیا وہ آرائشی بول زل کی نہیں ہو گئی تھی۔ کیا باسل سارے تعلقات ختم کرنے کے بعد بھی اتنا حق رکھتا تھا کہ اس کو دی گئی چیز اپنے قبضے میں واپس رکھ سکے۔

ایک جھوٹی آس سے وہ بول۔ تلاش کرنے لگی، پھر اس نے میڈ کو وہاں بلایا۔

”کیا پیگڈ کا تمام سلمان یہاں موجود ہے؟“
”جی مس زل۔“ میڈ نے جواب دیا۔ چند لمحوں بعد جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔

”کچھ اور بھی تھا۔ وہ باہر ہال کے کیبن میں ہے۔“ دونوں باہر ہال میں نکل آئیں۔ میڈ نے کیبن کھول کر اسے ایک وزنی پارسل تھمایا۔ جسے دیکھ کر وہ دھک سے رہ گئی۔ شطرنج کی وہ پیکنگ کھلی ہوئی تھی جو اس نے خصوصی طور پر تیار کروائی تھی۔
”کیا اسے آپ نے کھولا ہے۔“

”نہیں مس زل۔ یہ ایسے ہی تھا۔“ زل نے ڈبے سے شطرنج نکال لی۔ سلیمانی زرد کی بسات کے اندر سنگ سرخ سے لکھے ہوئے تین لفظ۔ نقوش اور محبت کا جوڑ۔ زل کو بے اختیار ہنسی آئی۔ یقیناً باسل اس کا سلمان پیک کرتے وقت اس شطرنج کو دیکھ چکا تھا۔ کارڈ کے اوپر اسی کا نام تو لکھا ہوا تھا۔ اس نے اسے کیسے نہ دیکھا ہو گا۔ اور اس نے جذلوں اور لفظوں دونوں کی لاج نہیں رکھی تھی۔

”ایسی شطرنج پھر کبھی کبھی نہیں جائے گی۔ اس پر کوئی بازی نہیں لڑی جاسکے گی۔“ کار میگر نے اس سے کیا خوب بات کہی تھی جس کا اندازہ اسے اب ہو رہا

تھا۔ ”ایسی شطرنج صرف محبت کرنے والوں کے لیے ہوگی اور اس پر کون سی بازی لڑی جانی ہے۔ وہ بخوبی جانتے ہوں گے۔“ تب اس نے سوچا تھا۔ خود کو جواب دیا تھا۔ ایک جواب اس سے بھی بڑھ کر باسل نے اسے دیا تھا۔ اس نے واقعی اس پر وہ بازی لڑی تھی جس کی اگلی چال زبل کے پاس نہیں تھی۔ وہ پہلی ہی چال کے بعد ہار گئی تھی۔

اس نے شطرنج کو اپنے سینے سے لگالیا۔ ٹھیک ہے۔ اب وہ بھی باسل سے جڑی۔ اس کی محبت کی یا اس گھر کی یاد دلانے والی ہر چیز اپنی زندگی سے ختم کر دے گی۔ وہ شطرنج سینے سے لگائے باہر جانے لگی تو میڈ نے اسے روک لیا۔ ”مس زبل ایک یہ بھی ہے۔“ میڈ کو اس کے ارادے کہاں پتا تھے۔ اس نے ایک سلیمانی کاہی کا ہرن اس کی طرف بڑھایا جو نانوں نے اسے دیا تھا۔ پہلی ملاقات پر۔ اس نے اسے بھی پکڑ لیا۔ ”یہ باسل کی نظروں سے کیسے بچا رہ گیا۔ کیا یہ باسل کی فیاضی ہے یا بھول۔ جو بھی تھا اب اسے ان دونوں چیزوں کی ضرورت نہیں تھی۔ دونوں چیزوں کو تھامے گھر سے باہر نکل کر پیدل چلتے ہوئے وہ دریاے سین کے بل تک آئی۔

شطرنج کو اس نے — آخری بار دیکھا۔ آنکھیں میچ کر آنسو ضبط کیے اور دریا کی طرف اجماع دیا۔ چھپا کے کی مدھم سی آواز آئی اور پلک جھپکتے میں شطرنج ڈوب کر غائب ہو گئی۔ طمانیت کا سانس اس کے وجود سے برآمد نہ ہو سکا۔ بڑی دیر تک وہ ڈوب چکی شطرنج پر گزرتے پانی کو دیکھتی رہی۔ وہ یہ سب کر کے سب بھلا دے گی۔ اس کی سوچ غلط تھی۔ اسے احساس ہو گیا۔ پھر بھی اس نے اپنی سوچ پر زیادہ دھن نہ کیا۔ گھرے سبز ہرن کو بھی اس نے ایک آخری بار دیکھا۔

”اس کا رنگ تمہاری آنکھوں سے بھی ملتا ہے۔“ کلای رنگ۔“ نانوں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ یاد

اس کا رنگ نانوں کی آنکھوں سے بھی ملتا ہے۔“

کلای رنگ۔“ نانوں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ یاد

وہ بیسرو جو دکان کے مشرکے ساتھ توڑیاں تھا وہ سرانجام
جنہیں کار سے نکلنے وقت وہ شیشے کی دیوار سے پرے
نہون پر کسی سے باتیں کرتے ہوئے اور زار زار روتے
ہوئے دیکھ چکا تھا۔ دروازہ کھول کر یشار دکان کے اندر
داخل ہوا تو نانوا سے دیکھ کر گھبرا سی گئیں۔ وہ شاید فون
بند ہی کرنے والی تھیں۔ یشار کو اپنے سامنے کھڑا کر
انہوں نے یہ کام جلد ہی کر لیا۔ انتہائی تیزی سے۔
یشار بغور انہیں دیکھتا رہا۔

جھلسا۔
”تی او اس مت ہوں نانوا! آپ ہی تو کہتی ہیں کہ
پاسل پہلے کام خراب کر دیتا ہے۔ بعد میں ہنس کر
دکھاتا ہے۔ شرمندہ بھی نہیں ہوتا۔“
”زندگی جوٹ کا گلہ ان نہیں یشار! کہ کام خراب
ہو گیا تو درست بھی ہو جائے گا۔ بل کے ابھاروں کے
اوپر اگلے بل کے ابھار نہ بھی ہوئے تو سلسلہ چلتا رہے
گا۔“

”چھا تو پھر زندگی کیا ہے؟“ اس نے مصنوعی
مسکراہٹ سے پوچھا۔ وہ نانوا کا دھیان ہٹانا چاہتا تھا۔
”شاید مور پٹل۔“ نانوا سوچتے ہوئے بولیں۔ ”بیک
وقت نازک بھی خوشنما بھی اور نظر کا دھوکا بھی۔ جنہیں
سمیٹ کر رکھنے کے لیے ہر وقت بڑی احتیاط کی ضرورت
رہتی ہے۔“ نانوا خلا میں دیکھنے لگیں۔
”وہ آپ سے ناراض نہیں ہے آپ جانتی ہیں۔
صرف غلط قسمی کا شکار ہے۔“

”بے لوث محبت میں غلط فہمیاں بلا وجہ نہیں
پہنچیں۔ دھرتی میں پیوند ہوتا ہے۔ تب ہی غلط فہمی
کی فصل اگتی ہے۔“ یشار خاموش ہو گیا۔ اس کے پاس
نانو کی باتوں کا جواب نہیں تھا۔
”چلتے ہیں نانوا“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ دونوں کار میں جا بیٹھے
”دکان پر یہ بیسرو کیوں لگا ہے نانوا؟“ کار اشارٹ
کرنے سے پہلے یشار نے پوچھا تو نانوا کھڑکی سے باہر
دیکھنے لگیں۔

”تم نے پڑھ تو لیا ہے اسے یشار۔“ نانوا نے
بے چارگی سے کہا۔

”ہاں۔ لیکن۔“ یشار پوچھتے پوچھتے درمیان میں
ہی خاموش ہو گیا۔ نانوا کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ
اس موضوع پر گفتگو ہی نہیں کرنا چاہتیں۔



پاسل اب وقتاً فوقتاً ”ہمایوں ہمایوں“ سے بات چیت
کرتا رہتا تھا۔ گھر میں اتنا سب کچھ ہو گیا تھا۔ ہمایوں

”کس کا فون تھا نانوا؟“ اس نے پوچھا۔
”کسی کا نہیں۔“ نانوا نظریں پچرائیں۔ یشار کی
تشویش مزید بڑھی۔

”آپ رو رہی ہیں۔“ نانوا نے کوئی جواب نہ دیا اور
دائیں بائیں نجانے کیا تلاش کرنے لگیں۔
”نہیں جتنا چاہتیں؟“ اس نے یہ کہہ کر پھر سے
پوچھنا چاہا۔

”کہنا نا کسی خاص کا نہیں۔“ اس کی فکر مندی کو
نظر انداز کر کے نانوا نے کاؤنٹر کی دروازے سے دکان کی
چابیاں نکال لیں۔ یشار خاموش ہو گیا۔ وہ زبردستی
جواب نہیں مانگ سکتا تھا۔

کاؤنٹر سے باہر نکل کر نانوا نے ایک ایک کر کے
ساری بچیاں بجھائیں۔ کار خانے کا دروازہ بند کیا۔ پھر
دکان سے نکل کر دکان کا دروازہ بھی لاک کرنے لگیں۔
”تم مت آیا کرو یشار مجھے لینے۔ سارا دن کلینک
میں سر کھپاتے ہو پھر یہاں آتے ہو۔ اگر وہ نہیں آتا
چاہتا تو کوئی بات نہیں میں آجایا کروں گی رکشے میں۔“
”پھر سے وہی بات کہنا میں کلینک میں اتنا بھی
نہیں تھک جاتا کہ آپ کو لینے نہ آسکوں اور رہی بات
”اس کی“ تو یہ آپ دونوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ وہ پہلے
بھی آپ سے کئی بار ناراض ہو چکا ہے اور آپ اس
سے۔“ یشار نے ہمارے کہا۔ اس دوران وہ فون والی
بات کو بے معنی خیال کرتے ہوئے یکسر فراموش کر چکا
تھا۔

”میں تو نہیں ہوں ناراض اس سے۔ وہ ہی نجانے
کیوں دور ہو گیا ہے مجھ سے۔“ نانوا کی آنکھیں

حوالے سے اپنا رد عمل ملے ہی نہیں کر پایا تھا۔ کبھی وہ باسل پر غصہ ہوتا چاہتا۔ کبھی وہ اس بات کا باسل سے ہی واسطہ سمجھتا۔ وہ زل کے وقوع میں بولنا چاہتا تھا۔ نانو کی نسبت سے اور اپنی نسبت سے بھی۔ کچھ حقیقتیں اگرچہ نئی تھیں، لیکن پرانی جڑوں کی طرح بہت مضبوط تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ باسل اس سے بات کرے۔ زل کے حوالے سے۔ جو کچھ ہوا اس متعلق باسل نے یشار سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ جواباً "باسل کی حالت کے پیش نظر یشار نے بھی اس موضوع پر بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"میں آج ہی نانو سے بات کروں گا۔" باسل کہہ کر جانے لگا۔

"ہاں۔ ویسے بھی نانو نگار خانہ بیچ رہی ہیں۔" یشار نے باسل کو بتایا اور آفس سے باہر نکلتے اس کے قدم رک گئے۔

"کیا۔؟ نانو نگار خانہ بیچ رہی ہیں؟"

"ہاں۔"

"لیکن کیوں؟"

"پتا نہیں، تم نانو سے ہی پوچھ لو۔"

"نانو۔ ایسا کیسے کر سکتی ہیں۔ نگار خانے کا نام امی کے نام پر ہے اور نانو کو اختیار نہیں کہ وہ اسے بیچ دیں۔" باسل کی بات سن کر یشار کو دھچکا لگا۔ اس نے باسل کو اس لیے آگاہ کیا تھا کہ شاید یہ سن کر وہ نانو کے حوالے سے اپنے رویے میں لچک لے آئے، لیکن باسل کا رویہ اس کی سوچ کے بالکل الٹ ثابت ہوا تھا۔ وہ نانو کے اور خلاف ہو گیا تھا۔ یشار کو اپنی بات پر پچھتاوا ہوا۔ اب نجانے مزید کیا ہونے والا تھا۔

"نگار خانے کا نام نانو نے ہی رکھا ہے۔ تم نے یا میں نے نہیں۔" یشار نے اسے جتلیا۔ باسل سر جھٹکتا ہوا باہر نکل گیا۔

گھر آتے وقت اس نے کار کا رخ انارکلی کی طرف موڑ لیا۔ یشار ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دکان کے باہر "برائے فروخت" کا بلیئر لٹک رہا تھا۔ تب ہی نانو بھی باہر نکلی تھیں۔ انہوں نے باسل کی کار کو ٹوک لیا اور پیدل چلتے

ماحول نہ صرف دور تھے بلکہ ہر چیز سے بے خبر بھی تھے۔ ان کا باخبر ہونا بھی بے کار تھا۔ وہ بھلا کیا کر سکتے تھے۔ انہوں نے باسل کی ساری بات سنی تھی اور وہ پھر بھی خاموش رہے تھے۔ وہ ان تمام حالات پر کسی طرح رد عمل ظاہر کریں ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

اس کے باوجود باسل جب جب انہیں فون کرتا وہ بڑی توجہ سے اس کی باتیں سنا کرتے۔ وہ بے شک دور تھے، لیکن انہیں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ باسل کے پاس اپنی بات سننے کے لیے ان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ اس بات چیت کے دوران انہوں نے باسل کو آج یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ سب کراچی شفٹ ہو جائیں۔ کلیننگ اور ہنڈی کرافٹس۔ دونوں کام کراچی میں بھی کیے جاسکتے ہیں اور دونوں کا اسکوپ یقیناً کراچی میں زیادہ بھی ہے۔

ہمایوں پہلے بھی بارہا یشار اور باسل کو کراچی شفٹ ہو جانے کا کہتے رہے۔ جس پر دونوں نے ہی کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا، لیکن اس بار ان کا یہ مشورہ جیسے باسل کی ضرورت بن گیا تھا۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس شہر نے اسے بے زار کر کے رکھ دیا تھا یا شاید کسی اور نے۔

اس نے اسی وقت یشار سے اس حوالے سے بات کی۔

"ٹھیک ہے، اگر نانو کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بھی راضی ہوں۔" یشار نے رضا مندی دے دی تھی۔ باسل جس ذہنی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اسے اس کا بخوبی اندازہ تھا۔ وہ ان دنوں کم ہنس رہا تھا۔ کم بول رہا تھا۔ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ جیسا یشار اسے کبھی دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ کام بھی ذمہ داری سے کرنے لگا تھا۔ کلیننگ میں وقت کی پابندی سے آتا جاتا تھا۔ پھر بھی نجانے کیوں یشار اسے اپنی مطلوبہ ڈیمانڈ کے مطابق دیکھ کر بھی خوش نہیں ہو سکا تھا۔ وہ خود بھی باسل کی طرح ان دنوں عجیب طرح کے حالات سے گزر رہا تھا۔

باسل نے زل کو گھر سے نکال دیا تھا۔ اس بات کو سات ماہ کا طویل عرصہ گزر چکا تھا اور وہ ابھی تک اس

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہوئے بازار کے اختتام تک پہنچ کر کشتہ روکنے لگیں۔
وہ شاید آج گھر جلدی جا رہی تھیں۔ باسل ان کے پیچھے
پیچھے تھا، لیکن اس نے انہیں نہیں پکارا۔
تھوڑی دیر بعد جب وہ گھر واپس آیا تو اسے یہ دیکھ کر
حیرت ہوئی کہ نانوا بھی تک گھر نہیں آئی تھیں اور اس
سے بھی زیادہ حیرت اسے رات میں ہوئی۔ جب نانوا
یشار کے ساتھ ہی گھر واپس لوٹیں۔ بات اتنی بڑی
نہیں تھی، لیکن باسل کو نانوا کی سرگرمیاں مشکوک سی
لگی تھیں۔



بدلتا موسم سرگم کے راگوں کی طرح آہستہ آہستہ
پروان چڑھ رہا تھا۔ دھیریں لطیف سی گرم تھیں اور
راتیں خواب ناک سرد۔ نانور موسم کا کوئی اچھا یا برا اثر
نہ تھا۔ جو موسم گھر پر اپنے نیچے گاڑے بیٹھا تھا۔ اس
نے انہیں باہر کے موسم کو محسوس کرنے کے قابل
نہیں چھوڑا تھا۔

اپنے کمرے میں بیٹھی وہ دھلے ہوئے کپڑے تہہ
کر رہی تھیں جب کمرے کے دروازے پر کوئی آکر
کھڑا ہو گیا۔ نانو نے سراٹھا کر دیکھا۔ وہ نگار تھی۔
”نگار۔“ نانو نے خوشی سے پکارا اور اپنی جگہ سے
اٹھیں۔

”اندر آؤ نا۔ اوھر بیٹھو۔“ نگار آہستگی سے چلتی
ہوئی اندر آئی۔

”بیٹھو نا یہاں۔“ نانو نے کہا۔ نگار ان کے بیڈ پر
بیٹھ گئی اور دائیں بائیں دیکھنے لگی۔

”کچھ کتنا چاہتی ہو؟“ نانو خود بھی بیڈ پر اس کے
قریب بیٹھ گئیں۔ انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں
میں لے لیا۔

”آپ نگار خانہ بیچ رہی ہیں۔“ نگار نے پوچھا۔ نانو
ایک لمحے کو گھبرا گئیں۔

”ہاں۔“ فرش کو دیکھتے ہوئے انہوں نے سچ بتایا۔ وہ
بھلا جھوٹ کیسے بول سکتی تھیں۔

”آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔“

”میں اب نگار خانے کو نہیں سنبھال سکتی نگار۔“
”آپ خود کو سزا دے رہی ہیں۔“
”خدا کی سزا ختم ہوگی تو خود کو سزا شروع کروں گی۔“
”ممت کریں ایسا۔“

”میں تھک چکی ہوں نگار! میری ہمت جواب دے
چکی ہے۔ میں نے ہی اسے عروج پر پہنچایا اور اب اس
کے زوال کی ذمہ دار بھی میں ہی ہوں گی۔ مجھ سے اب
کوئی کام نہیں ہوتا۔ میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ
کر کیا ہے۔ میں سب کچھ بھولنے لگی ہوں اور میں
اس سزا کے خلاف اپیل نہیں کر سکتی۔“ نانو کہہ کر چپ
ہو میں پھر دھیرے دھیرے آنسو بہانے لگیں۔

نگار کو مزید کچھ کہنا چاہیے تھا۔ کیا کہنا چاہیے تھا،
اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ روتی ہوئی نانو کو دیکھتی
رہی۔ جس کام کو کسی وقت میں انہوں نے بہت لگن
سے شروع کیا تھا آج روتے ہوئے اس کا اختتام کر رہی
تھیں۔

بعض اوقات ہمارے وجود کا سامنا ان ہواؤں سے
ہوتا ہے جن میں برچھیاں، کٹاریاں اور درختیاں پروٹی
ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ ہوا میں ہمارے وجود کو کوئی گزند
نہیں پہنچاتیں، لیکن ہمارے من کو زخمی کر دیتی ہیں۔
وہ چیزیں جن سے کچھ عرصہ پہلے تک ہمیں محبت ہوتی
ہے۔ پھر ان ہی سے خوف آنے لگتا ہے۔ نانو کو بھی
ایسا ہی خوف لاحق ہو گیا تھا۔ نگار خانہ کی برپاوی کا۔
ان کی نظر میں اب یہ برپاوی ہو کر رہی رہی تھی۔ خواہ
ان کے ہاتھوں ہوئی یا نگار خانہ کو بیچ کر۔

لیکن نگار خانہ بننے سے پہلے ہی ان کے پاس زل کا
فون آگیا۔ جس نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔



اس دن شام کو باسل جلدی ہی گھر آگیا تھا۔ وہ تھکا
تھکا سا نظر آ رہا تھا۔ اس لیے یشار نے ہی اس سے کہا
تھا کہ وہ گھر چلا جائے۔ کلینک سمیت پوری دنیا میں اس
کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ کوہو کے نیل کی طرح طے
شدہ اوقات بسر کر رہا تھا۔ وہ آج نانو سے بھی بات کرنا

چاہتا تھا کہ اب انہیں جلد ہی کراچی شفٹ ہو جانا چاہیے۔ پچھلے ایک ہفتے سے یہ بات کرنے والا معاملہ بھی لٹکا ہوا تھا۔

نانو آج دکان پر نہیں گئی تھیں۔ انہوں نے چھٹی کی تھی اور شاید اس وقت وہ اپنے کمرے میں تھیں یہ سوچ کر وہ نانو کے کمرے کی طرف بڑھا۔ لیکن ان کے کمرے تک پہنچنے سے پہلے ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہی اس کے قدم رک گئے۔ اندر سے آتی دو نسوانی آوازیں نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا تھا۔ ایک آواز نانو کی تھی اور دوسری۔ وہ اس آواز کو اتنی جلدی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

وہ باہر ہی کھڑا رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد زل باہر نکلی۔ دروازے پر اسے کھڑا دیکھ کر وہ چونکی اور ساکت رہ گئی۔ باسل نے اپنی نظریں چرانے کی کوشش نہ کی نہ اس پر سے ہٹانے کی۔

شام جس میں ہلکی آج کی رات تھی اچانک سے اس میں تیز آج کا ابال آگیا۔ ان دونوں کے درمیان سے نکل کر اندھیرا باہر ہر سو چھانے لگا۔ غیر ارادی طور پر ہی سہی۔ دونوں ایک دوجے کے اتنے قریب ہو چکے تھے کہ ایک دوجے کی سانسوں کی آواز کو گہرائی سے محسوس کر سکتے تھے۔ وہ لمحہ بڑا طویل تھا۔ اور اس لمحے میں ماضی کے کسی سنہری لمحے کی خوش بو تھی۔

زل کی آنکھوں میں کوئی سوال نہیں تھا۔ کوئی مطالبہ نہیں تھا۔ وہ محسوس مٹی کی طرح بے تاثر تھی۔ پھر بھی اس لمحے کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے اس کی آنکھوں کی نمی اندھیرے میں چمکی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی ذات کے مزید بھید باسل پر آشکار کرتی۔ بنا کچھ بولے وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔ باسل بہت دیر تک وہیں کھڑا رہا۔

”زل یہاں کیا کرنے آئی تھی؟“ اسے اس سوال کا جواب شدت سے چاہیے تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ اس بات کو غصے سے سوچے۔ زل کے یہاں آنے پر اپنی برہمی کا اظہار کرے لیکن وہ ایسا کرنے سے خود کو حد درجہ نارمل رکھتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم کے اندر

داخل ہوا۔ اور ایک بار پھر سے ٹھٹھک کر رہ گیا۔ نانو رو رہی تھیں۔ باسل کو دروازے میں کھڑا دیکھ کر انہوں نے جلدی جلدی چادر سے اپنے آنسو صاف کیے۔ جیسے باسل نے انہیں کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا ہو۔ وہ باسل سے ڈر گئیں۔ دروازے میں کھڑا وہ انہیں غضبناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ”آگئے باسل تم۔“ نانو نے بمشکل مسکراتے ہوئے پوچھا۔ باسل کو مزید غصہ آیا۔ پھکی مسکراہٹ اور ہمیشہ کا رٹا رٹایا جملہ ”آگئے باسل“ نانو کے پاس اس کو خوش آمدید کہنے کے لیے صرف یہ ہی بچا تھا۔ فریبی جذبے اور اپنے اصل خزانے وہ زل کی آمد پر خرچ کر رہی تھیں۔

نانو کا اٹھ کر اس کے قریب سے گزرتے ہوئے باہر جانا مشکل ہو گیا۔ نانو جانتی تھیں وہ آج کل ان کی محبت کو خوب تول رہا ہے۔

”ٹھٹھک ہے۔ وہ نانو کی کچھ لگتی ہے۔ اور نانو کو اس سے کبھی کبھی مل لینے کا حق ہے۔“ اپنے کمرے میں آکر منہ پر پانی کے چھپاکے مارتے ہوئے باسل سوچنے لگا تھا۔



”زل یہاں ہے۔ پاکستان میں۔“ یہ بات اس کے ذہن سے نکل نہیں پاری تھی۔ اس کا کلام بھی اس کی طرح انتشار کا شکار ہونے لگا تھا۔ جھنجھلاتے ہوئے وہ اٹھا اور اس نے کھڑکی کے بلائینڈز اٹھا دیے۔ باہر کی تیز دھوپ اندر آکر اس کی آنکھوں میں چھپی۔

ٹھٹھک ایک سال پہلے یشار نے یہاں پر ہی اسے اپنا آئی ڈی ”ہیک کرتے ہوئے“ پکڑ لیا تھا۔ تب اسے زل تک رسائی حاصل کرنے کی کس قدر چاہ تھی۔ اور کیسا عجیب اتفاق ہوا تھا کہ وہ خود ہی یہاں آگئی تھی۔

”تم اسے ایئر پورٹ سے پک کر کے کسی اچھے سے ہوٹل میں چھوڑ آنا۔ اس کے لیے یہ جگہ یہ شہر بالکل نیا ہے۔ اسے کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔“ یشار نے اسے تاکید کی تھی۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس

”نگار میری بیٹی۔ بشار باسل میرے بچو! مجھے معاف کر دینا۔ الوداعی ملاقات کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس لیے خط لکھ رہی ہوں۔“

یاد کرنے لگوں تو یہ جیسے کل کی ہی بات لگتی ہے۔ لیکن اس بات کو اٹھائیس سال گزر چکے ہیں۔ جب میں اس گھر میں آئی تھی۔ نگار سے معافی مانگنے کے لیے اور پھر یہیں رک گئی کفارہ ادا کرنے کے لیے۔ ایک بیٹے کی تربیت مجھ سے غلط ہو گئی تھی۔ اس کی تربیت میں میں نے بڑی کوتاہیاں برتی تھیں۔ مجھے اس کا ازالہ کرنا تھا۔ لیکن ازالہ کرنے کے لیے نجانے کتنی زندگیاں درکار تھیں۔ اور میرے پاس وقت کم تھا۔ اس لیے نازالہ ہو سکا نہ کفارہ ہی ادا ہو سکا۔

میں نے خدا سے صبر مانگا مجھے صبر دے دیا گیا۔ ہمت مانگی ہمت دی گئی۔ کاش میں خراج کی قبولیت بھی مانگ لیتی۔ خود پر اتنا زعم نہ کرتی کہ یہ کام خدا کی رضا کے بغیر ممکن ہو جائے گا۔ میں نے سوچا تھا کہ دو بیٹوں کی تربیت کر کے ایک غلطی کو درست کر لوں گی۔ لیکن اس گھر نے جہاں صغیر ربانی جیسے درویش انسان کا سایہ شفقت تھا مجھ سے یہ کام بھی نہ لیا۔

یہ ان کی ذات کا وصف ہی تھا جو اس گھرانے نے میرا کوئی احسان لینا گوارہ نہ کیا۔ اور جس نے مجھے بھی بدل دیا۔ میں گلاب عالم سے نانوبین گئی۔ ایک آزاد خیال عورت سے اللہ کی حدود کی پہچان رکھنے والی عورت۔ یہ قرض روز قیامت تک ادا نہیں ہونے والا۔

نگار کو میری ضرورت نہ تھی۔ اس کے پاس بے شمار قیمتی اثاثہ تھا۔ صغیر ربانی کی باتیں ان کی یادیں اور ان کے فلسفے وہ اس اثاثے کے سہارے جی سکتی تھی۔ پھر بھی اس نے مجھے اس گھر میں رہنے کے لیے جگہ دی۔ بشار اور باسل کو ایک ملازمہ کی حیثیت سے میں نے گود میں اٹھایا۔ لیکن پھر نجانے کب ان کا خون میری رگوں میں دوڑنے لگا۔ میری جان دونوں میں خنجر ہو گئی۔

رشتے صرف سکے یا خنجر نہیں ہوتے۔ میں نے

نے کوئی پریشانی اس کے قریب نہیں آنے دی تھی۔ اور اب خود پریشان ہو کر بیٹھا تھا۔ ایک ایک کر کے اسے سب کچھ یاد آنے لگا۔ یا وہ انہیں خود یاد کرنے لگا۔

”آپ اسے یہاں رکھ لیں نانوا! ہمارے گھر وہ ہم سب کے ساتھ رہ لے گی۔“ اور نانو نے اس کی بات مان لی تھی۔ یاد کر کے اسے ہنسی آئی۔ پھر اپنی ہنسی پر غصہ کاش نانوا اس کی بات نہ مانتی۔ انکار کر دیا ہوتا۔ خود بھی تو ٹوٹ گئی ہیں اب۔ وہ کس کو دوش دیتی ہوں گی؟ شاید باسل کو ہی۔

ٹیمبل پر پڑا بشار کا موبائل ایک دم سے بجا تو اس کے خیالات کی دھند خود بخود ہی چھٹی۔ بلائینڈرز دوبارہ گرا کر وہ ٹیمبل تک آیا۔ گھر کے نمبر سے نانو کی کال آرہی تھی۔ باسل نے ریسیو کرنا چاہی لیکن پھر یہ سوچ کر موبائل واپس رکھ دیا کہ ”نانو کو بشار سے ہی کام ہو گا۔ اگر انہیں مجھ سے کوئی بات کرنی ہوگی تو وہ میرے نمبر پر کال کر لیں گی۔“ پچھلے کافی مہینوں سے جو سرو مہری دونوں کے مابین چلی آرہی تھی۔ وہ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ کم از کم باسل کی طرف سے۔

موبائل بند ہو کر پھر سے بجنے لگا۔ بشار آفس کے اندر آیا تو اسی نے فون ریسیو کیا۔ ”جی نانوا!“

”بشار!“ نرمی مگر عجلت سے اس کا نام پکارا گیا۔ اور یہ آواز نانو کی نہیں تھی۔

”گھر آؤ۔ جلدی باسل کو بھی لے آنا۔“ بشار کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

”کیا ہوا؟ کیا کہہ رہی ہیں نانو۔“ باسل نے بظاہر غیر دلچسپی سے پوچھا جبکہ حقیقتاً اس کی ساری توجہ بشار کی ہی طرف تھی۔

”نانو ہمیں امی کی کال تھی۔“ اس نے باسل کو بتایا۔ انہوں نے فوراً ”بلایا ہے۔“ دونوں کے چہرے حیرت اور پریشانی سے سُرخ ہو گئے۔



نانو کا خط۔

اس گھر سے کوئی چیز لے کر نہیں جا رہی۔ میرے ہاتھ خالی ہیں۔ دل بکرا ہوا ہے۔ تم سب کی یادوں سے۔ نگار میری بیٹی! یثار باسل میرے بچوں! مجھے معاف کر دینا، سالوں میں اپنا بنائے رکھا اور آخر میں میں خود غرض ہو گئی۔ اس خود غرضی کو میری مجبوری سمجھ کر مجھے معاف کر دینا۔

تمہاری نانوں۔

یثار نے اونچی آواز سے خط پڑھا۔ جسے باسل نے آسانی سے سن لیا۔ الفاظ اثر رکھتے ہیں۔ اسے اس چیز کا ادراک تھا۔ لیکن الفاظ سانس بند کر دینے کی طاقت بھی رکھتے ہیں یہ جان لیوا سچائی آج اس پر آشکار ہوئی تھی۔ دھپ سے وہ بیڈ پر گر۔ یثار سارا خط پڑھ لینے کے بعد بھی اسے چھوڑ نہ سکا اور نگار بے تاثر چہرہ لیے سامنے دیکھتی رہی۔ خط کی عبارت اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ یثار باسل کے آنے سے پہلے وہ یہ خط پڑھ چکی تھی۔ تینوں اپنی اپنی جگہ سوچ کے ایک ہی نقطے پر ٹھہر گئے تھے۔ سمندر کے ماہر ماہی گیر بھی چاہ عظیم میں جانے سے ڈرتے ہیں۔ وہ تو پھر عام انسان تھے۔ جس چاہ عظیم میں نانو انیس چھوڑ کر چلی گئی تھیں وہ اس کے گرداب سے بھلا کیسے نہ ڈرتے۔

کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا بولے۔ ایک دوچے سے اور خود سے۔ سب اپنے بیٹھے رہے جیسے اس گھر میں ابھی ابھی کوئی نقب زنی کی دارات ہوئی ہو۔ اور نقب زن نے نہ تو گھر کے شیشے توڑے ہوں اور نہ ہی کوئی مال اسباب چرایا ہو۔ بلکہ انتہائی مہارت سے دیواروں کی بنیادوں کو کھینچ لیا ہو۔ اور اب دیواروں کی اینٹ کا ہر زردہ ہوا کے تیز جھونکے سے خوف کھا رہا ہو۔

بڑی دیر کی خاموشی کے بعد کمرے میں ایک گھٹی گھٹی سی سسکی کی آواز گونجی یثار نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ باسل کی آواز تھی۔ اسے اس آواز پر بے ساختہ حیرت ہوئی تھی۔

”اب کیوں رو رہے ہو باسل۔ یہ سب تمہاری

جانا، رشتے تو تو کیلئے پھولوں کی طرح کے ہوتے ہیں۔ جو انہیں تراشتا ہے وہ ان کے ہو جاتے ہیں۔ پھر انہیں خود سے جدا کر کے بھی انسان ان سے جدا نہیں ہو پاتا۔ یہ سب سے اذیت ناک مرحلہ ہوتا ہے۔ آج میں اس اذیت سے گزر رہی ہوں۔

ان اٹھائیس سالوں میں ان گنت پیغام نگار نے باندھے۔ برگد کی جٹاؤں سے، شکوؤں کے اور اتنے ہی پیغام میں نے باندھے۔ خدا کی بارگاہ میں اپنے بیٹے کی مغفرت کے، خدا جانے ان پیغامات کی قبولیت ہوئی یا نہیں۔ میرے گناہوں کی آگ شاید مجھ تو چکی ہے پر اس میں ابھی بھی تپش باقی ہے۔ اس تپش کو ٹھنڈا کرنے کے لیے مجھے مزید ریاضت کی ضرورت ہے۔

اٹھائیس سال میں اپنے خون سے بے خبر رہی۔ اب اس کی موت کے بعد نہیں رہ سکتی۔ اس خون کا ایک ننھا قطرہ تنہا ہے۔ زل۔ اب اسے میری ضرورت ہے۔ مجھے اس کے پاس جانا ہے۔ مجھے ڈر ہے۔ حادثات اور ان دکھوں کی وجہ سے وہ نگار بن جائے گی یا زیان۔ میرے لیے دونوں وجود تکلیف دہ رہے۔ ایک نگار غم کی وجہ سے دیوانی ہوئی۔ ایک زیان تنہائیوں کے باعث مر گیا۔ میں زل کے لیے ایسا کچھ نہیں چاہتی۔ اس لیے میں اس کے ساتھ جا رہی ہوں۔

اٹھائیس سال پہلے بنا اجازت اس گھر میں آئی تھی۔ آج اٹھائیس سال بعد بنا اجازت جا رہی ہوں۔ بغیر معافی لیے بغیر کفارہ ادا کیے یہ کام اونٹ کی ہڈی پر نقش ابھارنے جیسا تھا۔ میں اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اپنی ناکامی پر مجھے آخری سانس تک ملال رہے گا۔

”نگار خانہ شروع سے ہی نگار کے نام تھا۔ یہ گھر یثار اور باسل کے، دکان کی چابیاں خط کے ساتھ پڑی ہیں۔ ایک فائل بھی ہے جس میں تمام ضروری کاغذات ہیں۔ بینک میں موجود رقم اور دکان کے مال کی تفصیل بھی درج ہے۔ رجسٹر میں کارنگروں کی اجرت کاریکارڈ ہے۔

وجہ سے تو ہوا ہے۔" یثار نے نرم آواز سے باسل کو اس کا جرم بتایا۔ باسل نے گروں موڑ کر یثار کو دیکھا۔ "میری وجہ سے؟" رندھی آواز کے ساتھ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

"جس شخص کی بیٹی تمہارے لیے قابل قبول نہیں تھی، پھر اس کی ماں کے جانے پر افسردگی کیوں؟" وہ یثار کی بات سمجھ گیا۔ اس سے کوئی جواب نہ دیا گیا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ یثار خود بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ خط کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اس میں سے نانو کی شکل تلاش کر رہا ہو یا انہیں پکارنا چاہتا ہو۔ اور نگار؟ کیا اس نے آج بھی پورے دن سامنے ہی دیکھتے رہنا تھا؟

"نانو اس طرح کیسے کر سکتی ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہیں۔ ہمیں چھوڑ کر کیسے جاسکتی ہیں۔" باسل بڑبڑایا۔ اس کے تینوں سوالوں کے جواب دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں تھے۔

"نانو کو تلاش کرتے ہیں یثار! وہ زل کے ساتھ ابھی یہی کہیں کسی ہوٹل وغیرہ میں ہی ہوں گی۔" باسل نے تھوڑے وقفے کے بعد کہا۔

"کیا فائدہ انہیں تلاش کرنے کا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو یثار؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ وہ مل بھی گئیں تو ہمیں یہ ہی کچھ سننا پڑے گا جو وہ خط میں لکھ کر گئی ہیں۔ بہتر ہے کہ انہیں پریشان نہ کیا جائے۔ وہ فیصلہ کر کے گئی ہیں اس گھر سے ان کے فیصلے کا احترام کرو ان کی برسوں کی ریاضت کا کچھ صلہ تو دو انہیں۔" آخری جملے میں طنز تھا۔

"تم یہ سب اس لیے کہہ رہے ہو تاکہ تمہیں مجھ پر غصہ ہے۔"

"ہاں مجھے تم پر غصہ ہے۔" یثار تیز لہجے میں بولا تھا۔ "اور اب میں تمہارا رویہ سمجھ نہیں پا رہا۔"

"تم مجھے کیوں قصور وار ٹھہرا رہے ہو؟"

"کیا تم نہیں ہو؟"

"میری غلطی صرف اتنی ہے کہ میں نے زل کو اس گھر سے جانے کے لیے کہا۔"

"چلو تم نے اپنی غلطی تو تسلیم کی۔"

"ہاں میں غصے میں تھا۔ مجھے جو سمجھ میں آیا میں نے وہ ہی کیا۔" باسل نے چلاتے ہوئے بے چارگی سے کہا۔ مہینوں بعد اس نے آج بات کی تھی اور یثار کو اپنے چھوٹے بھائی پر بے تحاشا پیار آیا تھا۔ وہ ایک دم سے نرم پڑا تھا۔

"میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتا ہوں باسل۔ لیکن جو کچھ ہوا اس میں بیچاری زل کی تو کوئی غلطی نہیں تھی۔ کاش تم اسے نانو کے احترام میں ہی معاف کر دیتے۔"

"میں نے یہ بھی سوچا تھا، لیکن مجھ سے نہیں ہو سکا۔ میں کیا کرتا پھر۔" وہ پوچھنے لگا۔ یثار کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ دونوں پھر سے خاموش ہو گئے۔ خاموشی کے اس وقفے کے گزر جانے کے بعد نگار کی آواز آئی تھی۔

"نانو کو اس گھر میں واپس لاؤ یثار۔" یثار نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

"میں اس گھر میں واپس لاؤں۔" نگار نے پھر سے اپنی بات دہرائی۔ وہ خلا میں جیسے کسی غیر مرئی شے کو دیکھ رہی تھی اور اب تو یثار کو یہ کام جیسے ہر صورت کرنا ہی تھا۔

سیل فون نکال کر اس نے باسل سے پوچھ کر اس ہوٹل کا نمبر ملایا جہاں زل نے پہلی بار پاکستان آنے کے بعد قیام کیا تھا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ زل نے اس بار بھی وہیں قیام کیا تھا پر اب وہ وہاں موجود نہیں تھی۔

"مس زل زیان عالم چیک آؤٹ کر کے جا چکی ہیں۔"

"کتنی دیر پہلے؟"

"صبح نو بجے۔" دوسری کال یثار نے ایئر پورٹ انکوائری پر کی۔

"فرانس کے مسافروں کے لیے اگلی فلائٹ چار گھنٹے بعد کی ہے۔" اسے بتایا گیا۔

"کیا اس فلائٹ میں لناب عالم اور زل زیان عالم

کے نام کی سیٹیں بھی کھڑی ہیں؟ اس نے پوچھا۔
جواباً اسے انتظار کرنے کا کہا گیا۔ یشار گو یہ انتظار
اپنی زندگی کا سب سے طویل ترین انتظار محسوس ہوا
تھا۔

”جی، یہ دونوں نام بھی شامل ہیں۔“ چند لمحوں بعد
اسی آواز نے کہا۔ اور یشار کے ہاتھ سے موبائل
کرتے کرتے بچا۔



ایئرپورٹ زیادہ دور نہیں تھا۔ فاصلہ بھی چند ہی
منٹ کی مسافت کا تھا۔ پھر بھی یشار بڑی عجلت میں
گاڑی چلا رہا تھا۔ اسے خود پر قابو رکھنا بہت مشکل لگ
رہا تھا۔ وہ خود کو پرسکون نہیں کر پا رہا تھا۔ وقفے وقفے سے
وہ کبھی کبھی بیک ویو مرر سے باسل کو بھی دیکھ لیتا تھا۔
اس کے دیکھنے میں کوئی تاثر واضح نہیں تھا۔ پھر بھی یشار
کے اس طرح بار بار دیکھنے نے باسل کو اس ساری
صورت حال کا مجرم بنادیا تھا۔ یہ بات کسی حد تک تو
درست تھی۔ لیکن نانو کے اس اقدام پر وہ نہ صرف
گنگ رہ گیا تھا۔ بلکہ اسے دکھ بھی ہوا تھا۔ انہوں نے
سب سے پوشیدہ رکھا تھا کہ وہ جاری ہیں وہ ایسی گیت
ایسی برسرِ آر تو نہیں تھیں۔ یا وہ ایسی ہی تھیں؟

زل کے دو دن پہلے اس گھر میں آنے کی وجہ سے
اب پتا چل چکی تھی۔ وہ نانو کو اپنے ساتھ لے جانے
کے لیے ہی آئی تھی۔ ممکن ہے یہ سب بہت پہلے ہی
طے پا گیا ہو۔ یقیناً یہ کارروائی پچھلے کئی ہفتوں سے کی
جاری تھی۔ اور آج آخر کار جانے کا دن آ گیا تھا۔

گاڑی ایئرپورٹ کی طرف گامزن تھی اور باسل
کے دل کی دھڑکنیں بڑھنے لگی تھیں۔ وہ نانو سے کیا
کہے گا کہ وہ رک جائیں نہ جائیں۔ وہ انہیں کیا کہہ کر
روکے گا۔ یا ان پر چیخے گا۔ چلائے گا۔ اگر اس نے
نانو کے پاس ان کے اس فیصلے کے علاوہ اور کوئی راستہ
نہیں چھوڑا تھا تو بدلے میں نانو نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔
اس کے ساتھ اور باقی سب کے ساتھ۔

وہ واپسی کے رستے بند کر چکی تھیں۔ ان تک

جاہلے والے تمام راستے سرنگیں بن گئے تھے۔ باسل کو
کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”گاڑی واپس موڑ لو یشار!“ ایئرپورٹ کی عمارت
نظر آنے لگی تھی جب نانو نے آہستگی سے کہا۔
”کیا؟“ یشار نے حیرت سے پوچھا۔ اسے لگا اس
سے سننے میں کوئی غلطی ہو گئی ہے۔

”گاڑی واپس موڑ لو قبرستان کی طرف۔“ وہ اسی
نری سے گویا ہوئی۔ اس بار یشار نے مزید کوئی سوال نہ
پوچھا اور گاڑی کا رخ قبرستان کی طرف موڑ دیا۔



اپنے دونوں نازک ہاتھوں سے ڈیڈ کی قبر کو پھولوں
سے ڈھکتے ہوئے زل رونے لگی تھی۔ سُرخ پھول گلی
مٹی پر پڑے تھے۔ اور اس کی آنکھوں کی مٹی اس کے
سُرخ گالوں پر بہہ نکلی تھی۔ اس قبر کو وہ آخری بار دیکھ
رہی تھی۔ اس قبر کی یاد یا تصور کو وہ اپنے ساتھ لے کر
جانے والی نہیں تھی۔ فرانس والے گھر میں ڈیڈ ابھی
زندہ تھے۔ وہ وہاں اسے چلتے پھرتے ہوئے نظر آتے۔
غصہ کرتے ہوئے۔ اس پر بگڑتے ہوئے چیزیں
توڑتے ہوئے۔ وہ اس کے لاشعور میں جس حال میں
زندہ تھے۔ وہ حالت ہر حال میں اس حقیقت سے بہت
بہتر تھی۔ یہاں سے ان کی قبر کے تصور کو اس گھر میں لے
جا کر وہ انہیں پھر سے مارنا نہیں چاہتی تھی۔

تمام پھول ختم ہو گئے تو وہ نرم گھاس پر نانو کے
قریب بیٹھ گئی۔ یہ پچھلے کافی مہینوں کی محنت تھی یا
آنے والے سفر کی۔ وہ نانو کے کندھے پر سر رکھ کر
ڈھسے سی گئی۔ نانو نے اس کے گال تھپتھپائے۔ خود ان
کے گال تھپتھپانے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ زل کے آنسو
تو صاف کر رہی تھیں۔ اسے چُپ ہو جانے کی تلقین تو
کر رہی تھیں۔ لیکن خود کو نہیں۔ انہوں نے اپنے
بتے آنسوؤں کو پینے دیا۔ ان آنسوؤں میں کہیں فریب
بھی تھا۔ نانو جانچا تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے سچے
آنسو نہیں بہا رہی تھیں۔ اس احساس نے انہیں
ڈھکی کر دیا۔ وہ کس کی قبر پر بیٹھی رو رہی تھیں؟ بیٹے کی

پرائی یا ہل کی، پچھلے اٹھائیس سالوں کی یا اپنے فیصلے کی۔

انہیں علم تھا۔ اندر ہی اندر یہ آنسو نگار، یشار، باسل اور ”نگار خانہ“ کے لیے بہہ رہے تھے۔ جدائیوں کے فیصلے مشکل سے ہوں یا آسانی سے۔ ان پر عمل یقیناً انسان کو آدھا مار دیتا ہے۔ وہ جان کنی کے فحشوں سے گزر رہی تھیں۔

زل نے انہیں چند ہفتے پہلے فرانس سے کال کی تھی۔ آدھے گھنٹے کی گفتگو میں وہ زیادہ تر وقت روتی رہی تھی۔ اس نے انہیں یاد دلایا تھا۔ یا احساس دلایا تھا کہ وہ ان کے سکے بیٹے کی بیٹی ہے۔ ان کا خون ہے۔ ”مجھے اب کسی اپنے کی ضرورت ہے۔“ وہ روتے روتے بس یہ ہی کہے جا رہی تھی۔ انہیں زیان کی بات بھی یاد تھی۔ جو اس نے مرنے سے پہلے ان سے کی تھی۔

”وعدہ کریں۔ میرے مرنے کے بعد آپ زل کا خیال رکھیں گی۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ نے نگار کا رکھا۔ اپنی بیٹی سمجھ کر۔“ اس نے ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا تھا۔ لیکن اب مشکل یہ تھی کہ وہ دونوں بیٹیوں کا خیال ایک ساتھ نہیں رکھ سکتی تھیں۔

وہ رات نانو پر بہت بھاری گزری۔ پرائی کھڑکیوں کے رنگین شیشوں والے پٹ ساری رات آپس میں ٹکراتے رہے۔ دروازے نہ جتے رہے اور بیل پودے چٹکھاڑتے رہے۔ صبح ہونے تک مطلع صاف تھا۔ نانو فیصلہ کر چکی تھیں کہ وہ اب زل کے ساتھ رہیں گی۔ وہ باسل سے اس معاملے میں زبردستی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ اپنی زندگی کے اہم فیصلے کسی دباؤ کے زیر اثر نہ کرے، نانو ایسا ہی چاہتی تھیں۔ اور پھر اس سب کے بعد ان کے پاس صرف ایک ہی حل بچتا تھا۔ انہوں نے اسے قسمت کا لکھا سمجھا کر قبول کر لیا۔ وہ زیان کی موت کے بعد بھی اس سے دور نہیں رہنا چاہتی تھیں۔ زل کی خاطر آج وہ اس گھر سے نکل آئی تھیں۔ جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے اٹھائیس سال گزار دیے تھے۔

”اٹھو زل! ہمیں درہوری ہے۔“ انہوں نے زل سے کہا۔ زل اپنی جگہ سے ہل سکی نہ خود نانو ہی اٹھ سکیں۔ وہ وہاں سے نکل تو آئی تھیں۔ لیکن اب یہاں سے جا نہیں پار ہی تھیں۔ انہیں لگا زیان کے ساتھ ساتھ آج یہاں ایک قبران کی بھی بن جائے گی۔ ان کا زندگی بھر کا خوف رائیگاں نہیں گیا تھا کہ جوں ہی ان کا گھونسلہ مکمل ہو گا کوئی دوسرا اس پر قابض ہو جائے گا۔ یا ان کے بچوں کو ان سے چھین لے گا۔ اور اب ایسا ہو گیا تھا۔ لیکن مختلف انداز سے۔ دوسرا کوئی قابض نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی ان کے بچوں کو ان سے چھینا گیا تھا۔ اس گھونسلے کو انہوں نے خود ہی ہاتھ مار کر گرا دیا تھا۔ چاندی کی شیٹ کا دس ہزار پتوں والا خاکہ مکمل نہیں ہو سکا تھا۔ شیٹ برباد ہو گئی تھی۔ لیپ جیسے روشن ہونے سے پہلے ہی بجھ گیا تھا۔ اوزار کی دھار اپنی حدود سے باہر نکل گئی تھی اتنی کہ جڑیں ہی کٹ چکی تھیں۔

یشار اور باسل ان کی روح تھے۔ اور اب وہ بے روح سی ہو کر بیٹھی تھیں۔

”بس کرو زل۔ چلو چلتے ہیں۔“ انہوں نے پھر زل سے کہا یا شاید خود سے۔ زل نے بہتے آنسو خشک کیے۔ خود پر ضبط کیا۔ اور اٹھ گئی۔ سہارا دے کر اس نے پھر نانو کو اٹھایا۔ جنہیں اٹھانے کے لیے آج ہزاروں ہاتھوں کی ضرورت تھی۔ ایک آخری بار قبر کو دیکھتے ہوئے نانو مڑیں۔ اور پھر ایک قدم بھی مزید آگے نہ بڑھا سکیں۔

وہ یقیناً ”یشار تھا۔ جو آہستگی سے چلتا ہوا ان کے نزدیک آ رہا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں آج کیا کچھ نہیں تھا۔ اس کے پیچھے باسل تھا۔ اور سب سے آخر میں نگار۔

تیس سال بعد وہ آج اپنے گھر سے باہر نکلی تھی۔ نانو جانتی تھیں۔ ساری فضا اس کے لیے اجنبی تھی۔ دھوپ کی ایسی تیزی کی اس کے جسم کو عادت نہیں تھی۔ ایسی کھلی ہوا، کہیں اس کی سانپوں کا دم ہی نہ گھونٹ دے؟ نانو کو دوسو سالوں نے آکھیرا۔ وہ چل بھی

چوٹ کی اور کیا خوب چوٹ کی۔ نالوث کر رہ گئی تھیں۔

”جوٹ کی روح سے بھی واقفیت رکھتی تھیں نا آپ۔ اس سے بھی رشتہ قائم کرتی تھیں۔ تو اس رشتے کی آپ کی نظر میں اتنی بھی اہمیت نہیں تھی۔“ وہ پوچھ رہا تھا۔ یثار کی طرح نالو اسے صرف آنسوؤں کا جواب نہیں دے سکتی تھیں۔ اور نہ بولتے بولتے وہ آج چپ ہونے والا تھا۔

”در اصل آپ کا سارا پیار ایک دھوکا تھا۔ آپ کی باتیں صرف باتیں تھیں۔ آپ کے فلسفے کھوکھلے تھے۔ تمام عمر آپ اپنے پیٹے کو یاد کرتی رہیں۔ ہم دونوں میں اپنا بیٹا تلاش کرتی رہیں۔ اسے سمجھ کر آپ ہمیں پیار کرتی رہیں۔ ہمارے چروں میں اس کا عکس دیکھ کر نفیض یاب ہوتی رہی ہیں نہ آپ۔؟“ یاسل بولتا چلا گیا تھا۔ نالو اس کی سوچ پر تڑپ کر رہ گئی تھیں۔

”ایسی بات نہ کرو باسل۔ خدا کے لیے۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اتنا بڑا الزام نہ لگاؤ مجھ پر۔ تم دونوں سے میں نے سچا پیار کیا ہے۔ تمہارا خون۔“

”بس کروں نالو! اگر یہ حقیقت ہے تو آپ اس طرح سے نہ کرتیں پھر ہمیں چھوڑ کر جانا آپ کے لیے ناممکن ہوتا۔ آپ کو صرف کفارہ ادا کرنا تھا اگر ایسا ہی تھا تو ہمیں اپنا کیوں بنایا؟ اور اب اس بات کا کفارہ کون ادا کرے گا؟“ اس نے غضب کا سوال پوچھا۔

”اب زل کو میری ضرورت۔“ روتے روتے انہوں نے وضاحت کرنی چاہی لیکن ان سے بولا نہ گیا۔ وہ پھر سے روتے لگیں۔ انہیں اس طرح سے رونا دیکھ کر یثار اور باسل کے دل کو۔ کچھ ہوا۔ لیکن دونوں کو ہمت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کر نالو کو چپ کروا سکیں۔

نگار بھی ان تک پہنچ چکی تھی۔ اس کا ہاتھ شاید فرشتوں نے تھام رکھا تھا۔ جو اجنبی نشن کے لاتعداد گڑھوں نے اسے نگل نہیں لیا تھا۔ وہ باسل اور نالو کی

ایسے رہی تھی جیسے قدم قدم پر ٹھوکروں کا سامنا کر رہی ہو۔ نالو کو بے اختیار رونا آگیا۔ وہ کیا کر رہی تھیں۔ کیوں کر رہی تھیں۔ اللہ اب ان سے کیا چاہتا تھا۔ وہ خود سے کیا چاہتی تھیں؟

پہلے یثار ان تک پہنچا تھا۔ اس کی آنکھوں کے بعد اب اس کے چہرے کی خفگی بھی نالو کو نظر آگئی تھی۔ وہ کیسے نہ گھبراتیں؟

یثار کو نالو سے کیا کہنا تھا۔ اسے زیادہ سوچنا نہیں پڑا تھا۔ قبرستان کے دروازے سے یہاں تک آتے آتے وہ پہلی بات سوچ چکا تھا۔ اس نے اپنی بات کہنے سے پہلے نالو کی حالت پر توجہ دینا بھی ضروری نہ سمجھا۔ نالو نے ان کے ساتھ غلط کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ باسل کے ذہن میں بھی یہی بات سالی ہوئی تھی۔

”بے جان چیزوں کو تراشتے تراشتے۔ ان میں جان ڈالتے ڈالتے۔ آپ نے جان داروں کی جان نکالنے کا فن کہاں سے سیکھ لیا نالو۔“ وہ بولا اور نالو کا دل کٹ کر رہ گیا۔

ایسا بھیانک شگوفہ؟ زل نظریں جھکائے کھڑی رہی۔

”اتنا بڑا فیصلہ کر لیا آپ نے اور ہمیں بتانے کے لائق بھی نہ سمجھا۔“ وہ پوچھ نہیں رہا تھا۔ شرمندہ کر رہا تھا۔ نالو کے پاس آنسوؤں کے علاوہ اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ چند لمحوں میں باسل بھی وہیں پہنچ گیا۔ نالو نے خود کو مضبوط کرنے کے سارے حربے آزما لیے۔ اس کے الفاظ یقیناً ”یثار کے لفظوں سے کئی گنا زیادہ تیز دھار ثابت ہونے والے تھے۔ نالو کا اندازہ غلط نہ نکلا۔ حالانکہ دل ہی دل میں وہ اس گمان کے غلط ہو جانے کے لیے دعا گو بھی تھیں۔ باسل چند لمحے تو نالو کو دکھاتا رہا۔ پھر بڑے تحمل سے اس نے بات کا آغاز کیا۔

”چھوڑ کر جا ہی رہی تھیں تو خط لکھ کر جانے کی کیا ضرورت تھی نالو! آپ چلی جاتیں۔ بنا بتائے جیسے اپنے بچے کو چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ ہم بھی کچھ عرصہ آپ کو تلاش کرتے پھر مبر سے بیٹھ جاتے۔“ اس نے

گفتگو سن چکی تھی۔ اس کا سنا ہوا چہرہ جڑے ہوئے ہوئے
طرح پر مشروط تھا۔

فضا میں خاموشی چھا گئی۔ ماسوائے ان پرندوں کی
آوازوں کے جو وہ پہر کی راگنی الاپ رہے تھے۔
کیا اب نگار بھی کچھ ایسا ہی بولنے والی تھی جو نانو کی
باقی ماندہ جان کو سلب کر سکتا تھا۔ نانو نگار کے بولنے کا
انتظار کرتی رہیں۔ اٹھائیس سال پہلے بھی ایک روز
انہوں نے یہ انتظار کیا تھا۔ تب نگار کی خاموشی نے
انہیں انتہا درجے کی تکلیف دی تھی۔ اس کی خاموشی
آج بھی ایسا ہی کر رہی تھی۔ لیکن اندر ہی اندر نانو کو
اس کے بولنے کا خوف بھی تھا۔ اپنی ذات میں قید ایک
لباعرہ گزار کر نگار نے لب کھولے تھے۔

”جس ہستی کو میں نے ایک وقت میں سب کے
سامنے برا کہا تھا۔ بُرا جانا تھا۔ اسی ہستی نے میری
زندگی کو خراج تحسین ادا کیا۔“ نانو نے سراٹھا کر نگار کو
دیکھا۔ چونک کر کیا وہ یہ ان ہی سے کہہ رہی تھی؟
ہاں۔ وہ یہ سب ان ہی سے کہہ رہی تھی۔ ”آپ اس
وقت میری زندگی میں آئیں جب مجھے آپ کی
ضرورت نہیں تھی اور اب اس وقت جاری ہیں۔
جب مجھ سمیت میرے بچوں کو بھی آپ کی ضرورت
ہے۔“ نانو نگار کی طرف دیکھتی رہ گئی تھیں۔
”آپ نے کہا تھا کہ آپ نگار کی ماں ہیں۔ زلیخا
کی طرح۔ پھر اب آپ بھی مجھ سے دور جا رہی
ہیں۔“

”اب زل۔ میری مجبوری۔ تم تو سمجھو نگار۔“
”آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔“ نگار نے
کہا ”نہ ہی زل کو۔“ زل کا ہاتھ نگار نے اپنے ہاتھ میں
تھام لیا۔ زل ان کے قریب ہو گئی۔ باقی سب میں سے
کوئی کچھ نہ بولا۔

”صغیر ربانی کہتے تھے کہ انسانوں کی طرف سے دل
پتھر کے کرلو تو ایک دن انسان خود بھی پتھر کا ہو جاتا ہے“
جیسے میں ہو گئی۔“ باسل کا ہاتھ پکڑ کر نگار نے وہ ہاتھ
باسل کے ہاتھ میں دے دیا۔ باسل نے ایک نظر انہیں
دیکھا تھا۔

”اب میں کسی اور کو نگار بننے ہوئے نہیں دیکھ
سکتی۔“ باسل نے گردن جھکا لی۔ پھر وہ نانو کی طرف
متوجہ ہوئی۔

”آپ مت جائیں۔ ابھی مجھے آپ سے بہت
کچھ سیکھنا ہے۔ صبر، برداشت، ایثار، محبت۔ اور۔
اور۔ قربانی۔“ نگار کی آنکھ سے آنسو بہہ نکلے، نانو
نے آگے بڑھ کر وہاں نگار کو اپنے گلے سے لگالیا۔
قبرستان کی خاموشی میں دونوں کے رونے کی آواز
پھیلنے لگی۔



یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ دونوں اتفاقاً پیچھے
رہ گئے تھے یا انہوں نے شعوری کوشش کی تھی۔
سب گھروالے اندر جا چکے تھے۔ دروازے میں سے
باسل پہلے اس کے گزرنے کا انتظار کرنے لگا اور وہ
باسل کا۔ نتیجتاً ”دونوں ہی آئے سائے ٹھہر گئے اور
جیسے جلد ہو گئے۔“

باسل دیکھ رہا تھا کہ زل زمین کو دیکھ رہی ہے اور
زل محسوس کر سکتی تھی کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ بڑی
ہمت کر کے اس نے نظریں اوپر اٹھائیں اور دونوں کی
بصارت کے خط ایک ہو گئے۔ ہوا میں موجود ذرہ ذرہ
روشن ہو کر چمکنے لگا۔

زل۔ محبت، عظیم سلطنت کے تخت کا تاج ہے۔
میں اس تاج کو تاعمر پہنے رہوں گی۔

باسل۔ قدموں تلے پھول کھلاتے موسم کو میں
اب نجر نہیں ہونے دوں گا۔
ایک دوجے کا ہاتھ تھامے دونوں ایک ساتھ اندر
داخل ہوئے تھے۔



بالآخر کتبہ تیار تھا۔ پورے ایک ہفتے کی محنت کے
بعد۔ سنگ مرمر کا وہ کتبہ سب نے مل کر تیار کیا تھا۔
زل نے کہا تھا کہ وہ فرانس میں ”کھلی کتاب“ کی
طرز کے کتبے دیکھ چکی ہے۔ سنگ مرمر کے بڑے
ٹکڑے پر ڈیزائن اسی نے بنایا تھا۔ کھلی کتاب جیسا

ڈیزائن۔ باسل نے اس ڈیزائن کو مہارت سے کاٹا تھا۔ اس بار اس نے نانو کا کام خراب نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اس نے نانو کو اپنا سر کھجا کر اور ہنس کر دکھایا تھا۔ کھلی کتاب کی مطلوبہ شیب نکل آئی تو یشار نے خطاطی کر کے اس پر تحریر لکھ دی۔ یشار کی خطاطی بہت اچھی تھی۔ وہ اسکوئ کے زمانے سے ہی خطاطی کا شوق رکھتا تھا۔ پھر اس تحریر کو اس نے اوزاروں سے کندہ کر دیا۔ نانو نے منقش ہوئی تحریر کے گڑھوں میں سُرخ سیاہ اور سبز روشنائی بھری۔ پھر سنگ مرمر کی سطح کو انہوں نے رگڑ رگڑ کے ہموار کر لیا۔ کھلی کتاب والا کتبہ تیار تھا۔

یہ کتبہ زل کے ڈیڈ کے لیے نہیں تھا۔ یہ کتبہ مگناب عالم کے بیٹے زیان عالم کے لیے بھی نہیں تھا۔ یہ کتبہ نانو کے بیٹے کے لیے تھا جس کی چمک بھرتی رخ کو دیکھتے ہوئے وہ اب اپنے دل کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”یشار کل جا کر اسے قبر پر لگوا دینا۔ مائیں زندہ ہوں تو بیٹوں کی قبروں کو زیادہ دن تک بے نشان نہیں رہنا چاہیے۔“ نانو نے کہہ کر کتبے پر اپنا سر رکھ لیا۔ اپنے بیٹے کے نام کے حرفوں پہ۔ انگلی پھیرتے ہوئے بے اختیار ہی ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اور تحریر کے گڑھے میں جذب ہونے لگے۔ جھکتے تصورات کو اکٹھا کرتے ہوئے وہ خود سے بولی تھیں۔

”اللہ وانا الیہ راجعون۔“



راکھ روکھی ہوئی سب بستیاں
در اندر ان گنت ہستیاں
بے طلب بے وجہ کی یہ فیاضیاں
ایک پیال ساز کی کرم سازیاں
قوس دار کھڑکی کے شیفٹ پر نگار گلہ ان رکھ کر ان
میں سفید پھول سجا رہی تھی۔ جب اس کے ہاتھ رک
گئے۔ نگار کا دل بڑی زوروں سے دھڑکنے لگا۔ پھر

اچانک کیس سے بجلی کے ساتھ ایک طوفانی جھونکا آیا۔ بادل گرے، آندھی چلی، سب دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ہوا کا دوسرا جھونکا ہلے سے بھی زیادہ شدید تھا۔ نگار کی سماعت میں جیسے جھکڑ چلنے لگے۔ ایسا شور اٹھا کہ کانوں کو ہرہ کر دے۔ بہت سی آوازیں تھیں۔ زلخانی کی۔ خدایا رکی۔ صغیر ربانی کی۔ سب جیسے اس کے پیغاموں کا جواب دے رہے تھے۔ ارض و سما جنہوں نے سیاہ چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ چادر جیسے اتار دی گئی۔ سب بے نقاب ہو کر بیکار رہے تھے۔ اور ان سب آوازوں پر غالب کچھ اور بھی تھا۔ نگار کو وہ سمجھنے کی چاہ تھی۔ پھر یک لخت اس شور پر سکوت طاری ہوا۔ تو کیا وقت آگیا تھا؟۔ نگار اپنی جگہ دم بخود رہ گئی۔ گہرے اندھیرے میں جیسے کوئی روشنی کی کرن پھیل گئی۔ جس نے آہستہ آہستہ سارے اندھیرے کو نکل لیا۔ نگار کے دل پر اطمینان چھا گیا۔

ظلم ہوا۔ اور جہ بڑھایا

کار جہاں یہ سوال اٹھایا۔

برگد کی طرح صائقہ بھی جھوی۔ ہوا کے سنگ

آج سارے اہتمام تھے

بے صبر بے قدر پیا

عجب نام سے اس نے بلایا۔

کھڑکی کی سلاخوں پر نگار کی گرفت مضبوط نہ رہ

سکی۔ بے جان ہو کر وہ تخت پر بیٹھی۔ اس کے آنسو جو

بھر آئے تھے متواتر ہو گئے۔

سر مئی رنگ خود کوٹ کوٹ بھروایا

اگر چہ پیال کو بھی تھا سبز ہی اگلیا



WWW.PAKSOCIETY.COM

سہری حنائی صبح

آئیے گا۔^۱ اسی نسوانی آواز نے مجھے بغیر دروازہ کھولے باہر سے ہی اڑھایا۔

”رے بی بی! میں کہاں جاؤں گا میں ملکن سے آیا ہوں۔ آنے سے قبل میری شرافت حسین صاحب سے بات ہو گئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا آپ جس دن بھی آئیں گے آپ کو رہائش مل جائے گی۔“ میں ہلٹا کر بولا۔

یہاں اعصاب کو شل کر دینے والی گری میں میرا کھڑے رہنا دشوار ہو رہا تھا کجا کہ ایک گھنٹہ انتظار کرنا۔ میرا تو یہاں کوئی دوست یا رشتہ دار بھی نہ تھا جو وہاں چلا جاتا۔

”تو آپ کو کراچی اسٹیشن پر اترنے سے پہلے ابو جی کو کل کرنا تھی نا“ آپ نے انہیں یقیناً ”انفارم“ نہیں کیا ہو گا تب ہی تو وہ کام سے نکل گئے۔ اب یہ آپ کا درو سر ہے کہ آپ ایک گھنٹہ کہاں گزاریں گے ابھی گھر میں کوئی نہیں ہے۔ اس لیے میں آپ کو اندر نہیں بلا سکتی۔ سوری۔“ بند دروازے کے پیچھے سے مجھے نکا سا جواب دے کر شاید وہ اندر کی جانب قدم بڑھا رہی تھی کیونکہ قدموں کی چاپ مجھے دور ہوتی سنائی دے رہی تھی۔

”ہیلو!“ میں نے بھنا کر دروازہ پیٹ ڈالا۔ ”میرا یہاں کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہے جو کسی کے گھر جا کر بیٹھ جاؤں۔ آپ دروازہ کھولیں میں سیدھا اوپر والے پورشن میں چلا جاؤں گا۔“ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس بے ہودہ لڑکی کا گلا دبا دوں۔ ایک تو یہ پکھلا دینے والی گری اور اوپر سے اس بد تمیز اور بد اخلاق لڑکی کا رویہ۔

گرمیوں کی قیامت خیز اور جھلسا دینے والی دوپہر میں ایک قدرے پرانی طرز کی ایک منزلہ عمارت کے آگے کھڑا بیٹے میں شرابور عمارت کے باہر اوپر والے تختی پر کندہ نام کو بہ غور پڑھنے کی ناکام سی کوشش کر رہا تھا۔ ناکام یوں کہ تختی خاصی بلندی پر نصب تھی اور شاید کافی پرانی بھی تھی تب ہی اس کے حروف کچھ مٹے مٹے تھے۔ دھوپ کی شدت سے آنکھیں چندھیاری تھیں۔ تختی کو بہ غور دیکھنے پر شروع کے ”شر“ اور آخر کے ”سین“ نے میرے مطلوبہ ایڈریس یعنی ”شرافت حسین 316 N“ کی تصدیق کر دی تھی۔

ایک اطمینان بھرا سانس خارج کرتے ہوئے میں نے سینے میں بھگی شرٹ کو چنگی سے پکڑ کر کمرے علیحدہ کیا اور گردن آدو بالوں کو ہاتھوں سے سیٹ کرتے ہوئے کل بیل پر انگلی رکھ دی۔ اندر سے چڑیا کی چوں چوں تو اتر سے آنے لگی اور میرے انگلی ہٹاتے ہی وہ آواز آنا بند ہو گئی۔ کچھ لمحے انتظار کے بعد ابھی میں دوبارہ کل بیل کی جانب ہاتھ بڑھا ہی رہا تھا کہ اندر سے آتی کڑکتی نسوانی آواز پر میرا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا۔

”کون ہے؟“ اندر سے کڑک لہجے میں پوچھا گیا۔ ”جی میں مستقیم۔“ بوکھلاہٹ میں میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

”کون مستقیم؟“ آواز میں مزید کڑختی آگئی۔ ”جی وہ مجھے شرافت حسین سے ملنا تھا۔ آپ کا اوپر والا پورشن کرائے پر حاصل کرنے کے لیے۔“ میں نے جلدی جلدی اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ ”ابو جی ابھی گھر نہیں ہیں۔ اب ایک گھنٹہ بعد



Downloaded From
paksocietyty.com

WWW.PAKSOCIETYTY.COM

کی شعلہ فشانہ ابھی تک جاری و ساری تھی۔ شاید یہ ہی وجہ تھی کہ پارک ابھی تک سنسان تھا۔ میں پاؤں پیار کر آرام سے نیم دراز ہو گیا۔ ٹھنڈی ہوا کے فرحت بخش جھونکوں سے میں وقتی طور پر کچھ منٹ قبل کی ساری کلفت بھول گیا۔



ابھی یوں گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ میرا موبائل گنگنا اٹھا۔ موبائل جیب سے برآمد کر کے دیکھا۔ شرافت حسین کا نام جلی حروف میں جگمگا رہا تھا۔ پچھلے ایک گھنٹے سے میں ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر وہ ریسپو نہیں کر رہے تھے۔ شاید کہیں مصروف تھے۔

ایک طمانیت بھرے احساس کے ساتھ میں نے کال ریسیو کی۔ معلوم ہوا کہ وہ گھر تشریف لائے ہیں یعنی کہ گھریں ختم۔ میں نے سلمان اٹھایا اور ان کے گھر کی جانب چل دیا۔ اب کی بار پہلی ہی دفعہ گھنٹی بجانے پر شرافت حسین صاحب باہر تشریف لے آئے۔ بہت پر تپاک طریقے سے ملے اور انتظار کی زحمت اٹھانے پر بار بار معذرت خواہ بھی ہوئے۔ بعد ازاں مجھے فوراً "سے پچھڑائے سلمان سمیت اوپر پورشن میں جانے کی اجازت بھی مل گئی۔"

دو کمروں، ایک کچن اور الٹی چلبا تھہر پر مشتمل چھوٹا، مگر بہت صاف ستھرا سا پورشن تھا۔ کمروں کی پچھلی سائیڈ پر بالکونی بھی تھی جو گلی کی جانب تھی۔ سلمان رکھتے ہی میں نے واش روم کا رخ کیا۔ واش روم میں ضرورت کی ہر چیز مثلاً "صابن" تولیہ اور بالٹی وغیرہ موجود پا کر میں بے ساختہ مسکرایا۔

اور شرافت صاحب کی شرافت کا دل سے قائل ہو گیا۔ وہ اس بات سے باخبر تھے کہ میں فی الحال تنہا ہی ان کے گھر رہائش پذیر ہوں گا اسی لیے انہوں نے بالکل خالی گھر حوالے کرنے کے بجائے ضرورت کا کچھ سلمان مہیا کر کے مجھے قبضہ دیا تھا۔

ابھی میں فریش ہو کر سوٹ کیس کھول کے بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ دروازہ کھولا تو

"آپ مرد ہیں محض نہیں جو کسی کے گھر بیٹھنا ضروری ہو۔ گلی کے اختتام پر راسیں ہاتھ پر مڑ جائیں وہاں سامنے آپ کو پارک نظر آجائے گا۔ وہاں چلے جائیں۔ درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر انتظار کریں اور ہاں ایک گھنٹہ گزارنے کے بعد ابوجی سے کانٹیکٹ کر کے ہی یہاں آئیے گا۔" اس کے ساتھ ہی اس کے قدموں کی چاپ دور ہوتی سنائی دی اور میں حق دق اس کے جملوں پر غور کرتا رہ گیا۔

اور جب ہوش آیا تو مانو میرے سر پر گلی اور کمروں پر بھی "نیو ایڈیٹ" ایک مکا دروازے کی جانب لہرا کر میں نے بادل نخواستہ اپنا چھوٹا سوٹ کیس اور سفری بیگ اٹھایا اور اس کے بتائے ہوئے پارک کی جانب چل دیا۔

پارک میں پہنچ کر قدرے گھنے درخت کے سائے تلے موجود سنگی بنچ پر بیٹھ کر، گھر والوں کے متعلق سوچنے لگا۔ گھر والے کیا ایک عدد چھوٹی بہن اور امی، جب کہ ابو دو سال قبل رضائے الہی سے انتقال کر چکے تھے۔ میں کراچی ایک جاب کے سلسلے میں آیا تھا۔ میرے ایک دوست کے توسط سے مجھے یہاں جاب اور اسی کے توسط سے یہ گھر بھی کرائے پر ملا تھا۔ پہلے وہ بھی کراچی میں جاب کرتا تھا اور اسی محلے میں اس کی رہائش تھی۔

شرافت حسین صاحب سے اس کی اچھی سلام دعا ہو گئی تھی۔ پھر چند وجوہات کی بنا پر وہ دوبارہ ملتان شفٹ ہو گیا تھا، مگر شرافت حسین صاحب کا کانٹیکٹ نمبر اس کے پاس موجود تھا سو اس نے ان سے کسی کرائے کے مکان کی بابت دریافت کیا تو انہوں نے اپنے گھر کا اوپر والا پورشن خالی ہونے کی نوید سنائی اور یوں میرا مسئلہ حل ہو گیا۔ مجھے کل سے آفس لازمی جوائن کرنا تھا اور اگلے ماہ میں نمہ اور امی کو بھی کراچی بلا لیتا تب تک وہ فی الحال ماموں کے گھر قیام پذیر تھیں۔

میں نے اپنا سلمان بنچ کے نیچے گھسایا۔ مہا کوئی مجھے خراب کار سمجھ کر پارک سے بے دخل نہ کر دے۔ پارک میں رش نہیں تھا اور لوگ نہ ہونے کے برابر ہی تھے۔ شام کے پارک بنچ چکے تھے، مگر سورج

شرافت حسین صاحب چائے بسکٹ اور سوسوں کی
ٹرے ہاتھ میں تھامے کھڑے تھے۔

”ارے انکل! یہ کیا تکلف کیا آپ نے؟“ ان کے
ہاتھ سے ٹرے تھامتے ہوئے میں حقیقتاً ”ان کے
حسن اخلاق سے زیر بار ہو کر شرمندہ ہو گیا۔

ارے بیٹا! تکلف کیسا؟ پہلا پہلا دن ہے اور گھر
میں کوئی خاتون خانہ بھی نہیں ہے۔ ایسے میں میں نے
سوچانی الحال ابھی کچھ ہلکا پھلکا لے آؤں۔ کچھ دیر بعد
کھانا بن جائے گا تو وہ بجھوا دوں گا۔“ انہوں نے
میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رومان سے کہا۔

”نہیں انکل! میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا آپ زحمت
نہ کیجیے گا پلینز۔“

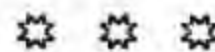
”زحمت کیسی بیٹا! جب تک آپ کی فیملی نہیں
آجاتی آپ کھانا نیچے ہی کھائیے گا۔ ویسے کب تک
آجائے گی آپ کی فیملی؟“ شرافت انکل کے اس طرح
استفسار کا مطلب میں بخوبی سمجھ سکتا تھا۔

وہ اپنی اکلوتی جواں سال لڑکی کی وجہ میرے یہاں
تہا قیام پر متروک تھے اور چونکہ ان کی اہلیہ نہیں تھیں اور اولاد
میں صرف ایک بیٹی ہی تھی اسی لیے وہ میرے اکیلے
رہنے پر ہچکچاہٹ کا شکار ہو رہے تھے۔ پہلے میرا ایک
ماہ بعد امی اور نمرو کو بلانے کا ارادہ تھا مگر انکل کا تردد دیکھ
کر میں نے انہیں جلد ہی بلانے کا فیصلہ کر لیا۔

”جی جی بس دس پندرہ دن بعد میں انہیں لے
آؤں گا۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف
بتا دینا۔“ یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑ گئے۔

میں نے بھی گرم گرم چائے اور لوازمات سے
بھرپور انصاف کر کے کچھ دیر آرام کرنے کی ٹھانی اور
سوٹ کیس کھولنے کا ارادہ کل پر موقوف کر کے سفر کی
ٹکان اتارنے کی غرض سے لیٹ گیا۔



صبح خلاف معمول بہت جلد آنکھ کھل گئی۔ شاید نئی
جگہ کی وجہ سے ایسا ہوا تھا۔ میں نے نماز بجاوا کی اور
کپڑے نکال کر پرہیز کرنے لگا۔ پھر کچن میں جا کر ناشتا

پنیا اور آفس کے لیے تیار ہونے چل پیا۔ چونکہ آج
پہلا دن تھا اور راستوں اور جگہوں سے فی الحال ناواقف
تھا تو سوچا تھوڑا جلدی نکلا جائے تاکہ وقت مقررہ پر پہنچ
سکوں۔ ویسے تو شرافت انکل نے راستوں کے متعلق
کافی راہنمائی کر دی تھی مگر پھر بھی میں چاہتا تھا کہ پہلے دن
تاخیر کا شکار نہ ہوں۔

تیار ہو کر میں نے جلدی سے رات کے کھانے کے
برتن اٹھائے جو انکل رات عشاء کے بعد دے گئے
تھے۔ سوچا نیچے اتر رہا ہوں تو دیتا ہوا ہی چلا جاؤں۔
سیڑھیاں اتر کر ایک دروازہ باہر گلی میں کھلتا تھا اور ایک
گھر کے اندر گھر کے اندر والے دروازے پر میں نے
ہلکی سی دستک دی جو اب ”اسی کرخت نسوانی آواز نے خیر
مقدم کیا۔

”کون ہے؟“ حالانکہ اندرونی حصے کا دروازہ بند رہا تھا
تو یہ تو معلوم ہی ہو گا کہ کون ہے۔
”مستقیم۔“ میں نے بھی مختصر جواب دینا ضروری
سمجھا۔

”فرمائیے۔“ الفاظ شائستہ اور لہجہ ناشائستہ (اونہہ!)
چنگیز خان کی ہمشیرہ)

”فرماتا نہیں ہے یہ برتن واپس کرنے آیا تھا آپ
کے لیے لیجئے۔“ جواب میں تھوڑا سا دروازہ وا ہوا اور
دو بچے میں سے بمشکل ہاتھ برآمد ہوئے۔
”الائیجئے۔“ اور برتن ہاتھ میں آتے ہی ہاتھ
غراب سے اندر اور دروازہ کھٹاک سے بند۔

”اونہہ! میں کون سا دیکھنے کے لیے مرا جا رہا ہوں
ہٹ کر کی جانشین۔“ میں منہ میں بدبڑا تاہا ہر نکل گیا۔
واپسی پر میں مختلف قسم کی سبزیاں اور پھل لے کر
شرافت انکل کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ انکل پھل
اور سبزیاں لینے میں بہت متاثر تھے مگر میں نے بھی
انہیں شاپر زتھا کر ہی دم لیا۔ ساتھ ہی میں نے خرچے
کی مد میں تھوڑی رقم بھی ان کے حوالے کرنا چاہی تو وہ
خاصے برا فروختہ ہوئے اور رقم لینے سے مسلسل

انکاری۔ میں نے مجبوراً انہیں ان کے گھر سے کھانا نہ
کھانے کی دھمکی دے ڈالی۔ دھمکی کارگر تو ثابت

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- Open Paksociety Page.
- Click Liked.
- Select Get Notifications.
- Select See First.

All Done

Like Liked Message

Get Notifications

Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First

See new posts at the top of News Feed

Default

See posts as usual

Unfollow

ہوئی مگر پوری رقم انہوں نے پھر بھی نہ لی۔

اشفاق تھا۔ کیونکہ کل رات ہی میں امی اور نمرو کو ملتان سے لے آیا تھا۔ سو راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ امی اور نمرو اگلے دن شام میں ہی اپنے مالک مکان کے ہاں ملنے پہنچ گئیں اور جب سے وہاں سے ہو کر آئی تھیں مسلسل شرافت حسین صاحب کی صاحبزادی کو مل کی شان میں رطب اللسان تھیں۔ مجھے تو یہ جان کر کہ ان موصوفہ کا نام ”گول“ ہے بہت ہی عجیب لگا۔ یعنی باپ اسم بامسی تھے تو بیٹی اپنے نام کی متضاد تھیں۔

مگر امی تو کوئی اور ہی فسانہ سنار ہی تھیں مثلاً ”بڑی خوش گفتار بچی ہے اور انداز مخاطب تو انتہائی شائستہ ہے وغیرہ وغیرہ اور مجھے ان کے ان ریمارکس پر خوب ہی ہنسی آتی۔

”ارے والدہ محترمہ! آج پہلا پہلا دن ہے نا تو موصوفہ تھوڑی تہذیب کے دائرے میں نظر آرہی ہوں گی۔ کچھ دن اور گزرنے دیں علی تھیلے سے باہر لائی جائے گی۔“ امی میری مبہم سی باتوں پر ناہمی سے میری جانب دیکھ کر بولیں۔

”ارے لڑکے! کیا اول فیل کے جارہے ہو اس بچی کے بارے میں تہذیب، تھیلا، ملی آف!“ امی نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور مجھے خشمگین نگاہوں سے گھورتی ہوئی بچن کی جانب چلی گئیں۔



پھر کئی ماہ گزر گئے، مگر نمرو اور امی کے آنے کو مل کے بارے میں خیالات رتی بھر بھی ادھر سے ادھر نہ ہوئے اور نہ ہی میرے۔ عجیب بات تھی وہ لڑکی مجھ سے کبھی کبھار ضرور ”نا“ بھی کچھ بات کرتی تو کٹ کھانے کو دوڑتی اور امی وغیرہ پر جانے کون سا منتر پڑھ کر پھونکا تھا کہ وہ ہر دم اس کی قصیدہ گوئی میں مصروف رہتیں۔

اور ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ امی کو مل پر فریفتہ ہیں یہ تو مجھے ان پانچ مہینوں میں انہوں نے اچھی طرح باور کروا دیا تھا، مگر اس بُری طرح فریفتہ ہیں کہ اسے اپنی ہونہارنے پر قائل جائیں گی اس کا مجھے ہرگز اندازہ نہ

شام میں چائے کا کپ لے کر میں یوں ہی بالکونی میں کھڑا ہو گیا۔ گلی میں سبزی والا بہت سی عورتوں سے بھاؤ تاؤ میں مصروف تھا۔ تب ہی جانی پہچانی سی دنیا سے بے زار آواز سنائی دی۔

”آلو کس حساب سے دے رہے ہو؟“ انداز ایسا تھا گویا تقیثی افسر ملزم سے پوچھ رہا ہو۔ ”کب سے یہ دھندہ کر رہے ہو؟“ اپنی اس خود ساختہ لیشہ پر میں دل ہی دل میں خوب ہنس۔

”باجی! چالیس روپے کلو۔“ سبزی والا دانت نکوس کر بولا۔

”تیس روپے لگاؤ اور ایک کلو دے دو۔“ (لگتا ہے شرافت صاحب کی صاحبزادی میں شرافت نام کو نہیں ہے)

”میں باجی۔! کیا کہہ رہی ہو؟ تیس روپے تو ہماری خرید چھی نہیں ہے۔ آپ کو کیسے تیس روپے لگاؤں۔“ سبزی والا دروازے کی اوٹ میں چھپی دو شیرہ کو متجسس ہو کر دیکھنے کی کوشش میں مسلسل سر اور دیدے گھما رہا تھا۔

”چھا! تو پھر یہ برابر والی پڑوسن تمہاری خالہ لگتی ہے جو تم نے ابھی اس کو ساٹھ روپے میں دو کلو آلو دیے ہیں۔“ آواز کے ساتھ ساتھ کان بھی بڑے تیز تھے محترمہ کے، میں بالکونی سے نیچے جھانکتے ہوئے بڑی دلچسپی سے ان کی تکرار سن رہا تھا۔

”وہ تو۔ اچھا چلو لے لو۔“ سبزی والا اپنی بغلیں جھانک کر رہ گیا۔

”وہ سامنے بچہ کھڑا ہے نا اس کے ہاتھ بھیج دو آلو پیسے میں اس بچے کے ہاتھ بھیج دوں گی۔ ٹھیک ہے؟“ دروازہ دھاڑ کی آواز کے ساتھ بند ہوا تو میں لمبی مسکراتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔



آج صبح میں کافی دنوں بعد بہت پر سکون نیند لے کر

اسی اور شہرین میں وہ واقعہ رونما ہوا جس نے میری دنیا ہی بدل دی۔

اس دن میں اپنے ایک آفس کولیک اور دوست عمار سے ملنے اس گھر گیا تھا۔ کئی دنوں سے وہ اصرار کر رہا تھا کہ کسی دن شام کی چائے پر میں اس کے گھر آؤں۔ گھر چونکہ نزدیک ہی تھا سو میں پیدل ہی روانہ ہو گیا۔ عمار کے گھر پہنچ کر میں نے دروازے پر زور سے دستک دی۔ پہلی ہی دستک پر ایک مترنم آواز نکلی دی۔

”کون؟“

”جی میں مستقیم ہوں۔ عمار کا دوست۔“

”اچھا! مگر عمار تو گھر پر نہیں ہے۔“ وہی شیریں اور گنگنائی آواز کانوں میں پڑی تو ایک لمحے کو تو میں کھوسا گیا۔

”کوئی ضروری کام تھا آپ کو؟“ وہی شہد آگئیں لہجہ مجھے ہوش کی دنیا میں واپس لایا۔

”جی کام تو کوئی خاص نہ تھا بس وہ کئی دنوں سے اپنے گھر آنے پر اصرار کر رہا تھا تو بس اس سے ملنے ہی آیا تھا۔“ میں نے ٹھہر ٹھہر کر نپے تلے انداز میں کہا۔

”اچھا تو پھر ایسا کیجیے آپ اندر آجائیے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ویٹ کر لیں۔ عمار مارکیٹ تک گئے ہیں سو دسلف لینے کے لیے بس آتے ہی ہوں گے۔“ جی تو چاہا اس آفر پر صدق دل سے آئنا و صدقا کہہ کر اندر چلا جاؤں مگر میز بھی کوئی شے ہوتی ہے۔ سو میں ازراہ تکلف بولا۔

”جی نہیں شکریہ۔ میں پھر کسی دن آجاؤں گا۔“

”ارے نہیں آپ ویٹ کر بیٹھے پلیر! عمار کو پتا چلے گا تو وہ بہت خفا ہوں گے۔“ اب تو انکار کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔

عمار کی بیوی نے دروازہ پورا کھول دیا اور خود دروازے کی اوٹ میں ہو کر بولی۔ ”جی دامیں ہاتھ پر ڈرائنگ روم ہے۔ آپ وہاں تشریف لے جایئے۔“

میں نیچی نگاہ کیے تیزی سے دامیں جانب مڑ گیا۔

ہوسکا تھا۔ جب امی نے اس ناور شہابی خیال کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے مجھ سے رجوع کیا تو میں نے تو سنتے ہی بے ساختہ ”لاحول ولا“ پڑھی اور کانوں کو ہاتھ لگا کر سر کو دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے زبان دانتوں تلے دبالی۔

”اے لڑکے! پاؤ لے ہو گئے ہو کیا۔؟ تم تو ایسے کر رہے ہو جیسے میں نے کومل کو تمہاری دلہن ہٹانے کی بات نہ کر دی ہو، کوئی فحش گلی دے دی ہو؟“ امی ناراضی سے بولیں۔

”سمجھ میں نہیں آتا امی! آپ کی سوئی اسی ایک لڑکی پر آکر کیوں انگ گئی ہے؟ یہ سارے گٹس آپ کو

اسی میں ہی نظر آتے ہیں؟ ذرا باہر نکلیں ادھر ادھر بھی چھان پھنگ کریں۔“

”کوئی اللہ! باہر کی لڑکی۔؟ اچھا آ آ آ۔ تو یہ ماجرہ ہے۔ کون ہے وہ لڑکی؟“ امی اپنے سین بات کی تہ تک پہنچیں۔

”لاحول ولا قوہ۔“ میرا دل سرپیٹ لینے کو چاہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تو بس یوں ہی ایک بات کی تھی۔“

”اچھا تو پھر کیا برائی ہے اس رشتے میں اتنی حلیم الطبع اور نیک اطوار کی حامل بچی ڈھونڈے سے بھی نہ ملے، تم ہاں کر دو تو میں جھٹ شرافت بھائی صاحب کے آگے جھولی پھیلا دوں، مجھے یقین ہے وہ انکار نہیں کریں گے۔ اتنا ہونہار اور برسر روزگار داما کون نہیں چاہتا اور پھر تم بتا رہے تھے نا کہ تمہارے پاس تمہاری محنت اور لگن سے متاثر ہو کر چھ سات ماہ میں تمہاری ترقی کر دیں گے اور تمہیں کمپنی کی طرف سے گھر اور گاڑی بھی مل جائے گی اور۔“

”امی امی۔ ریلیکس اپنی طرف سے ہی سب کچھ فرض کیے بیٹھی ہیں آپ۔ بس میں اس بات کا ذکر بھی دوبارہ نہ سنوں۔“ میرے اس طرح سختی سے کہنے سے امی کو میرے واضح انکار کا اندازہ ہو گیا تھا تب ہی وہ خفا ہو کر چپ ہو گئیں۔ میں بھی وہاں سے فوراً اٹھ گیا۔

ڈرائنگ روم پر ایک ستائشی نظر ڈال کر میں ایک سنگل صوفے پر براجمن ہو گیا۔ ڈرائنگ روم کے دو دروازے تھے۔ ایک وہ جہاں سے میں ابھی داخل ہوا تھا اور دوسرا یقیناً گھر کے اندرونی حصے میں کھلتا تھا۔ جہاں ایک بھاری پردہ لٹک رہا تھا۔ پردہ ہوا کے دوش پر اڑتا تو گھر کا اندرونی حصہ دکھائی دینے لگتا۔ میں گاہے بگاہے اس جانب نگاہ ڈال لیتا کہ شاید وہ خوب صورت آواز کی مالک لڑکی دکھائی دے جائے۔

”رے۔ رے۔ رے۔ آپ شاید مجھے دل پھینک یا آوارہ مزاج شخص سمجھ رہے ہوں گے۔ پلیز مجھے ایسا ہرگز مت سمجھیں، گوکہ میری تمام حرکات و سکنات مذکورہ صفات پر پوری اترتی دکھائی دے رہی ہیں، مگر یقیناً جانچے شاید میں اس لڑکی کی مسکور کن آواز کے سحر میں وقتی طور پر گرفتار ہو گیا تھا۔ ورنہ میں اتنا گرا ہوا ہرگز نہ تھا کہ ایک اجنبی لڑکی بالخصوص دوست کی بیوی کے بارے میں اس طرح کے احساسات رکھوں، بہر حال اس وقت میں واقعی خود کو بڑا بے بس محسوس کر رہا تھا۔

عمار کی شادی کو محض چھ ماہ ہی ہوئے تھے اور وہ اپنے گھر والوں سے علیحدہ اپنی بیوی کے ہمراہ اس کرائے کے مکان میں رہائش پذیر تھا۔ وہ دن میں پچھتر مرتبہ مجھے ضرور یہ بتاتا کہ اس کی بیوی دنیا کی حسین ترین عورت ہے اور اس حسین ترین عورت کی حسین ترین آواز کے باعث میں دل ہی دل میں اس کے ناہیدہ حسن کا معترف ہو چکا تھا۔

”یہ لے بیچے پلیز۔“ وہ پردے کے اندر سے ہاتھ نکال کر دستک دینے کے ساتھ ساتھ مجھے مخاطب کر کے بولی۔ میں یک دم اپنے خیالوں سے باہر آیا تو دیکھا ایک خوب صورت حنائی ہاتھ جو درجن بھر چوڑیوں سے بھرا ہوا تھا چائے اور دیگر لوازمات سے بھری ٹرے تھاے ہوا تھا۔

میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر ٹرے تمام کر کہا۔ ”رے“ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ ابھی آپ عمار کو تو آنے دیتیں، ساتھ ہی بی لیتے چائے۔“

جواباً اس کا نفرتی قہقہہ گونجا۔ ”چائے سے تو عمار کو خدا واسطے کامیاب ہے، اسی لیے میں نے ان کا انتظار نہیں کیا۔“

”جی جی۔ درست فرمایا آپ نے۔ میں بھول گیا تھا۔“ اب میں کیا کہتا کہ آپ کی آواز کے سحر میں جکڑ کر میں واقعی یہ بات بھول گیا کہ وہ چائے بالکل بھی نہیں پیتا۔ میں نے ٹرے تھامی تو پردہ ہوا سے ہلکا سا اڑا تو میں نے اس پری ویش کی ہلکی سی جھلک دیکھی۔ اور واقعی میں مبہوت رہ گیا۔

اتنا مکمل حسن!! عمار اگر اس پر دل و جان سے فدا تھا تو کچھ غلط نہیں تھا۔ بہر حال میں چائے سے تو کیا خاک لطف اندوز ہوتا۔ الٹا میرے دل کی حالت عجیب و گریوں ہو گئی۔ شاید ہمارے مذہب میں تنہائی میں دو نامحرم افراد کی موجودگی کو اسی لیے انتہائی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ بہر حال میں اب جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا ورنہ غالب گمان یہ ہی تھا کہ شیطان مجھ سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ کروادے جس کے باعث میں ساری عمر عمار سے نظریں نہ ملا سکوں۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھا اور داخلی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

”رے رکیے تو۔ عمار سے مل کر چائے گانا“ وہ بے۔“ پیچھے سے عمار کی بیوی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”جی وہ میری ضروری کال آگئی ہے۔ مجھے فوراً جانا ہو گا پھر کبھی سہی۔“ میں بتار کے کہتا ہوا نکلتا چلا گیا۔ ”ف خدا یا!“ باہر نکلا تو خیالات کی یورش کچھ تھی۔ یوں جیسے میں کسی طلسم کدے سے باہر نکلا ہوں۔ تمام راستے خود کو لعنت ملامت کرتا رہا کہ میں آج جو کر کے آ رہا ہوں وہ کسی شریف النفس انسان کا طرز عمل ہرگز نہیں ہو سکتا۔



آج میں آفس سے ذرا جلدی اٹھ آیا تھا۔ طبیعت بھی کچھ بوجھل سی ہو رہی تھی اور آفس میں بھی کوئی خاص کام نہ تھا۔ گھر میں داخل ہو کر جوں ہی میں نے

اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھائے تو نمرو کی آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔ وہ برابر کمرے میں موجود کسی سے میرا تذکرہ کر رہی تھی۔ میں نے یوں ہی جھانک کر دیکھا، میرے بالکل سامنے نمو بیٹھی تھی اور نمو کے بالکل سامنے کوئی لڑکی تھی۔

”جانتی ہو، مستقیم بھائی تمہیں ہلا کو خان کی جائیں اور ہٹلر کی پوتی اور بھی نہ جانے کن کن القابات سے نوازتے ہیں۔“ نمو کے ساتھ بیٹھی لڑکی یقیناً (القابات کے تناظر میں) کوئل ہی تھی جو شاید میرے آفس میں موجودگی کے باعث اوپر آئی تھی۔

”اچھا؟“ وہ دھیرے سے ہنسی (کوئل اور ہنسی۔ یا حیرت)

”تم ہنس رہی ہو؟ میں تو سمجھی تھی کہ تم یہ سب بن کر بہت خفا ہوگی۔“ نمو حیرت سے بولی۔ میں لاؤنج میں پڑی کرسی پر بیٹھ گیا، مگر یہاں بھی ان کی آوازیں واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔

”خفا میں تب ہوتی جب تمہارا بھائی میرے بارے میں کوئی تعریفی کلمات کہتا۔“

”ہیں۔۔۔؟“ نمو کی طرح میں بھی حیرت زدہ رہ گیا۔

”ہاں اور میں خوش ہوں کہ جو تاثر میں نے دینا چاہا تھا میں اس میں سو فیصد کامیاب رہی۔“ کوئل کے ان الفاظ نے مجھے بُری طرح الجھا دیا۔

”مگر کوئل۔۔۔؟“ نمو نے استفسار کیا۔

”جب میں کالج میں تھی تو ہماری اسلامک سٹری کی ٹیچر نے ایک حدیث ڈسکس کی تھی۔ جس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ ”غیر مرد سے نرمی مت برتاؤ، ان سے سختی کے ساتھ پیش آنا کرو تاکہ وہ تمہاری جانب ملتفت نہ ہو سکیں۔“ ہماری ٹیچر نے ہمیں اس سے متعلق ایسا متاثر کن لیکچر دیا کہ بس میں نے یہ بات گھر سے باندھ لی اور آج تک میں اس نصیحت پر عمل پیرا ہوں اور واقعی میں نے دیکھا کہ میرے اس طرز عمل سے بہت سے نٹ کھٹ لڑکوں کے قدم پیچھے ہٹ گئے۔

ابو جی کے آفس جانے کے بعد میں اور امی اسیلی رہا کرتی تھیں۔ میرے اس طرز عمل نے بہت

سے مردوں کے قدم ہمارے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی متزلزل کر دیے اور اب کم از کم میرے محلے کے مرد مجھ پر جب نگاہ ڈالتے ہیں تو ان نگاہوں میں اشتیاق کے بجائے بے زاری جھلکتی ہے، جو میرے گرد تحفظ کا حصار باندھ دیتی ہے۔ یہ وہ کوئل تو نہ تھی جس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ تو کوئی بہت سلیجھی ہوئی اور شائستہ لب و لہجے کی مالک لڑکی تھی۔

پہلی ملاقات یاد آتے ہی میرے لبوں تہے ساختہ مسکراہٹ چمکی۔ اس کے بعد ————— وہ تمام واقعات میرے سامنے کسی فلم کی مانند کھوم گئے۔

اور وہ واقعہ بھی جو عمار کے گھر پیش آیا۔ اگر عمار کی بیوی مجھ سے یوں شہد آگیں لہجے میں مخاطب نہ ہوتی تو

میں اس کے بارے میں یوں گھٹیا خیالات ذہن میں نہ لاتا۔ اگر وہ بھی کوئل کی طرح سختی سے پیش آتی تو میری جسارت نہ بڑھتی اور خاص کر کسی غیر مرد کو گھر میں بے دھڑک بلا لیتا، یہ بھی عورت کے لیے ایک غلط فعل ہے۔

ہر مرد کی فطرت مختلف ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ جسے ہم شریف سمجھ رہے ہوں وہ حقیقت میں بھی ویسا ہی ہو۔

نفس اور شیطان انسان کے انہی دشمن ہیں لہذا عورت ہو یا مرد، دونوں کو ہی اسلامی حدود و قیود کا خیال رکھنا چاہیے۔

میں کوئل جیسی باحیا اور باکردار لڑکی کو کیا سمجھے بیٹھا تھا۔ اب اور اک کا درواہا تو دل سے ساری کدورت جاتی رہی اور اسی لمحے میں نے وہ فیصلہ کر لیا۔ جی ہاں۔ کلنی سمجھ دار ہیں آپ لوگ۔ کوئل کو اپنی نصف بہتر بنانے کا فیصلہ۔

مطلع صاف ہوا تو آسمان بھی روشن روشن اور نکھرا نکھرا سا لگنے لگا اور کوئل بھی۔ گو کہ میں نے اب تک اسے دیکھا نہ تھا، مگر مجھے اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کردار کی مضبوطی ہم سب کے لیے سب سے اہم ہونی چاہیے۔ کیوں؟ کیا خیال ہے آپ

کا؟

خوشیوں کا موسم

”بالکل ساسوں والا سلوک کرتی ہیں امی میرے ساتھ۔ ابھی رخصت ہو کر پھوپھو کے کھرگئی نہیں اور ٹارچر اپنے ہی کھر سے شروع ہو گیا۔ امی کم ساس زیادہ لگتی ہیں۔“

”جب سے آئی ہوں ایشال! تمہارے ہی دکھڑے سن رہی ہوں، کچھ کھانے کو ہی پوچھ لو۔“ سحر نے مداخلت کی، اس سے پہلے کہ ایشال کی داستان جبر مزید طویل ہو جاتی۔

ٹاؤلیٹ

”میرا یہاں دل جل رہا ہے اور تمہیں کھانے کی پڑی ہے۔“ ایشال نے صدمے سے اپنی خالہ زاد کو دیکھا جو فریج میں کھانے کو کچھ تلاش کر رہی تھی۔

”کوئی بات نہیں، بس ہانڈی نہ جلا دینا۔ ویسے بنا کیا رہی ہو؟“ سحر اس کے قریب آئی، ہاتھ میں کیک کی پلیٹ بھی جو فریج سے برآمد کر چکی تھی۔

”بریانی۔“ ایشال نے منہ بتاتے ہوئے چولہے کی آنچ آہستہ کی۔

”آج کی تاریخ میں بن جائے گی؟“ سحر نے اس پھیلاوے کو دیکھا جو ایشال نے سارے کچن میں پھیلا



Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From
paksocietyty.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

رکھاتا تھا۔
پچن میں آنے سے اس کی جان جاتی تھی اور آج تو
گرمی سے بری حالت ہو رہی تھی۔

”برائی بنانے کی اچھی پریکٹس کر لو اب تم۔ ویسے
بھی جبران بھائی کی فلو رٹ ہے۔“

”ہر مشکل ڈش ہی جبران کی فلو رٹ ہے۔ لوگوں کو
اب بے ہوئے چاول، ابلے وال اور ہٹا نہیں کیا کیا پسند ہوتا
ہے۔ ایک میرے سرال والے ہیں، کھانے پینے کے
شو قین، چٹورے۔“ ایشال کے جملے بھنے انداز پر سحر کو
نہی آئی۔

”شرم کرو پھوپھو ہیں تمہاری۔“
”چٹورے ہیں تو چٹورے ہی کہوں گی۔“

”وہ تم بازار چلنے کا کہہ رہی تھیں، کب جاتا ہے۔“
سحر کو یاد آیا۔

”ہوں کل چلیں گے آج تو میری حالت تمہارے
سامنے ہے۔“

”لینا کیا ہے۔“ سحر نے برتن دھوتے ہوئے پوچھا۔
”سونیا ٹریٹ دے رہی ہے اپنی مقلی کی خوشی میں

اور میرے پاس کوئی جوڑا نہیں ہے۔ سارے کپڑے
پرانے ہو چکے ہیں، ایک اچھا سا جوڑا لیتا ہے اور بھی

کچھ چیزیں لیتی ہیں۔“ سحر ہلا کر ان برتنوں کی طرف
متوجہ ہوئی جو ایشال گندے کر چکی تھی۔ ایشال نے تیز

تیز ہاتھ چلانے شروع کیے۔ امی کے گھر آنے سے پہلے
اسے برائی بتانی تھی۔



سورج سوانیزے پر تھا۔ دھوپ اور گرمی سے بدن
جھلس رہے تھے۔ مگر بازاروں میں رش معمول کے

مطابق تھا۔ ایشال اور سحر کپڑوں کی دکان میں کھڑی
کپڑے دیکھ رہی تھیں۔

”ایشال دیکھو اب یہ پرنٹ کتنا خوب صورت ہے۔“
”ہوں بس ٹھیک ہی ہے۔“

”مجھے تو پسند آیا ہے، تم بھی کوئی پسند کر لو۔“ سحر
نے اس کا ہاتھ ہلا کر متوجہ کیا جو دوسرے سیکشن کی

طرف نظریں گاڑے بیٹھی تھی۔
”نہیں، بھئی میں تو کوئی اچھا سا کڑھائی والا براہیڈ

سوٹ لول کی کسی اچھے ڈیزائنر کا۔“ سحر نے اس کے
منہ بنانے پر گہرا سانس لیا۔ جانتی تھی کہ اسے ڈیزائنر

جوڑے لینے کا کتنا شوق ہے۔ دکان دار کو جوڑا پیک
کرنے کا کہہ کر وہ ایشال کے ساتھ دوسرے سیکشن کی

طرف آگئی۔
”سحر یہ دیکھو کتنا خوب صورت ہے۔ کڑھائی بھی

پجاری ہے اور یہ کوہنوشن کتنا اچھا لگ رہا ہے۔“
سارے میں گھوم پھر کر دیکھنے کے بعد آخر کار ایشال کو

ایک سوٹ پسند آئی گیا۔
”واقعی پیارا تو لگ رہا ہے۔“ سحر نے بھی تائید

کی۔ مگر قیمت جان کر اس کے ہوش اڑ گئے۔
”تو ہزار کا سوٹ۔ ایشال اتنے پیسے ہیں تمہارے

پاس۔؟“
”پر یہ سوٹ ہے کتنا خوب صورت۔ کاش نو ہزار

ہوتے۔ تمہارے پاس کتنے ہیں۔“ ایشال نے پُر امید
ہو کر پوچھا۔

”جی نہیں، اتنے نہیں ہیں اور میں نے سووا بھی
خریدنا ہے ابھی۔“ سحر فوراً بدی، وہ پہلے ہی شکر ادا

کر رہی تھی کہ ایشال کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں،
ورنہ اس سے کیا بعید جتنے ہوتے لگاتاری۔

”چلو کوئی اور دیکھ لو، مناسب قیمت والا۔“ سحر نے
اس کا دھیان ہٹانا چاہا۔

”یہ دیکھو اچھا لگ رہا ہے۔ ہے بھی دو ہزار کا۔“
”میں قیمت دیکھ کر نہیں پسند کرتی اور ویسے بھی

اس کا وہ ٹالان کا ہے۔ مجھے شیفون کے دوپٹے پسند
ہیں۔“ اس کے خریٹے انداز پر سحر تپ گئی۔

”ہاں جی ہو تو تم کسی ریاست کی شہزادی جو قیمت
دیکھنے سے شان گھٹ جائے گی۔“

”ہوں نہیں تو کیا ہوا۔ اچھا سوٹ پہن کر شہزادی
ہی لگوں گی۔“ ایشال نے اتر کر کہا۔ اب وہ پھر سے

اپنے لیے کوئی سوٹ ڈھونڈ رہی تھی۔ دو گھنٹے بعد وہ

”بھئی میں تو اپنی حیثیت کے مطابق شائیکہ کرتی ہوں“ اپنی غلطی میرے کھاتے میں مت ڈالو۔“ سحر نے بے نیازی سے کہا۔ ایشال نے بچن کی طرف دیکھا، جہاں سے ابھی بھی ساجدہ بیگم کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

”باپ کی کمائی کی قدر نہیں، شوہر کی خاک کرے گی۔ میری ہی تربیت پر حرف آئے گا“ یہ بی بی بنو تو چلا چکیں سسرال کا نظام۔“ ساتھ ہی نور، نور سے برتن رکھنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔

بچن سمیٹ کر اس نے ایک نظر دیکھا، کہیں کوئی چیز رہ نہ گئی ہو، پھر مطمئن ہو کر اپنا چائے کا کپ اٹھا کر کمرے کی طرف چل پڑی۔ امی اور ابو کو وہ پہلے ہی چائے دے آئی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے مخصوص رنگ ٹون کی آواز سنائی دی جو کافی دیر سے بج رہی تھی۔ ایشال نے مسکراتے ہوئے موبائل اٹھایا۔ دوسری طرف سے جبران کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو السلام علیکم! کہاں تھیں بھئی، میں تو مایوس

دکان سے باہر نکلیں۔ دونوں اپنی پسند کے سوٹ لے چکی تھیں۔

”ایشال یہ جو چھ ہزار کا تم نے سوٹ لیا ہے۔ ٹا۔ خیر مناؤ اپنی، اب خالہ نے تمہیں گھسنے نہیں دینا گھر میں۔“

”ہائے مجھے تو وہ سوٹ یاد آ رہا ہے، کیا کمبائنیشن تھا۔“ ایشال کے حسرت بھرے انداز پر سحر نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”باقی چیزیں کیسے لوگی۔ جو خالہ نے منگوائی تھیں ہو جائیں گے میسے پورے۔؟“

”وہ۔ ہتا نہیں دیکھتی ہوں۔“ ایشال فکر مندی سے باقی ماندہ رقم گننے لگی جو باقی اشیاء کی خریداری کے لیے خاصی کم تھی۔ اس کے چہرے پر فکر مندی کے تاثرات دیکھ کر سحر نے افسوس سے سر ہلایا۔ وہاں دکان کے کاؤنٹر پر بھی ایشال نے اس کی ایک سہ سنی تھی۔

”کچھ خدا کا خوف کرو بی بی، خزانے نہیں دفن اس

گھر میں، جو میں نکال نکال کر تمہیں دیتی رہوں اور تم ان اللوں تللوں میں اڑاؤ پھو۔“ ایشال سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ساتھ ہی سحر بیٹھی پسینہ سکھا رہی تھی۔ اس کے لیے اب یہ عام سی بات تھی۔ جب بھی ایشال اس قسم کی خریداری کر کے آتی تھی خالہ اسی طرح جلالی روپ اختیار کرتی تھیں۔ ”میں اب باقی چیزیں کہاں سے پوری کروں۔“

”لو متاؤ باپ کی محنت کر کر کے ہڈیاں گھس گئیں اور یہ لاث صاحب کی اولاد بنی خون پسینے کی کمائی لٹا رہی ہیں۔ سحر بھی تو ہے ہمیشہ مناسب خریداری کرتی ہے، کچھ اسی سے سکھ لو۔“ اچھی خاصی کلاس لینے کے بعد وہ بچن میں چلی گئیں۔ ایشال نے سحر کو دیکھا جو خاموش بیٹھی سکے کو گھور رہی تھی۔

”شہاری وجہ سے زیادہ ڈانٹ پڑتی ہے مجھے اور لو

ستاسا جوڑا۔“

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

کی جانب سے بہنوں کے لیے خوشخبری
خواتین ڈائجسٹ کے ناول گمریشے حاصل کریں

30 فی صد رعایت پر

طریقہ کار ناول کی قیمت کے 30 فی صد کاٹ کر
ڈاک خرچ۔ 100/- روپے فی کتاب مئی آڈر کریں۔

منگوانے اور دتی خریدنے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216351

ہو کر فون بند کر لیا تھا۔“
 ”کچن میں تھی۔ آج کھانا لیٹ کھایا جس اسی لیے
 کچھ دیر ہو گئی۔ تم کیسے ہو اور تمہارا دہن؟“
 ”ہم دونوں ٹھیک ٹھاک ہیں۔ پاکستانیوں کو شدت
 سے یاد کر رہے ہیں۔“

”سفید جھوٹ ہے یہ۔ بلکہ مجھے بھلانے کا اچھا
 طریقہ ہے۔ روز فون تو کرتے نہیں ہو۔ ایک سونیا کا
 منگیتر ہے دن میں چار چار دفعہ فون کرتا ہے۔“ ایشل
 نے شکوہ کیا ”ساتھ ساتھ وہ چائے بھی پی رہی تھی۔“
 ”یقیناً“ وہ کچھ کرتا نہیں ہوگا، ورنہ نوکری کرنے
 والا بندہ اور اس قدر فراغت میں مان ہی نہیں سکتا۔
 چلو چھوٹو۔ اپنی بات کرتے ہیں۔ تم سناؤ کیا ہو رہا ہے
 آج کل۔“ جبران نے موضوع تبدیل کرنا چاہا۔

”میرے اوپر تو ظلم ہی ہو رہا ہے اور ظلم توڑنے والی
 تمہاری ساس ہیں۔ جب سے ہمارا نکاح ہوا ہے تب
 سے اسی کوشش میں تھیں کسی طرح مجھے کچن میں
 ٹھسیں۔ اب جب سے یونیورسٹی ختم ہوئی ہے
 میری تو شامت آگئی ہے۔ صرف تمہاری فیورٹ ڈشز
 بنوائی ہیں، وہ بھی اتنی مشکل، مشکل۔“ ایشل کے
 لہجے کی مسکنت محسوس کر کے جبران ہنس دیا۔
 ”تم ہنس رہے ہو۔ میری جگہ ہوتے پھر پوچھتی
 میں۔“ ایشل خفا ہوئی۔

”سوٹ مائی۔ کتنا خیال ہے انہیں میرا، تم بھی
 اچھی طرح سیکھ لو آخر کو مزد کے دل کا راستہ معدے
 سے ہو کر گزرتا ہے۔“ ایشل نے کب ایک سائڈ پر
 رکھ کر بالوں کو کچھو سے آزاد کر کے تکیے پر سر رکھا
 اور آرام وہ انداز میں لیٹ گئی۔ ”ہائے میں تو ساری
 زندگی معدے میں ہی پھنسی رہوں گی۔“
 ”اتنی ٹینشن کیوں لے رہی ہو، بس بریانی سیکھ لو
 میرے لیے کافی ہے۔“ جبران کو اس کی پکلی حالت کا
 اندازہ تھا جس کی کچن میں جانے سے جان جاتی تھی۔
 ”اتنا تو میں تمہارے لیے کر ہی سکتی ہوں، بریانی
 اچھے سے سیکھ لی ہے۔“ ایشل مسکرائی۔ ”آج بازار
 گئی تھی۔ آف کیا تباؤں اتنا پیارا جوڑا پسند کیا، مگر لے

”اب یہ سب کون ہیں؟“
 ”بڑے بڑے ڈیزائنر ہیں، جن کے برائڈ جوڑوں کا
 میں ذکر کر رہی ہوں۔“ ایشل نے اپنا سر پیٹ لیا۔ یعنی
 موصوف کو ڈیزائنرز کا بھی نہیں پتا۔
 ”اوہ۔ اچھا ہوں گے۔ مجھے کیا پتا میں کوئی ان
 کے ساتھ بچپن میں کھیلا ہوں۔“ ایشل نے سر دھو
 بھری۔ چند ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس نے فون رکھ
 دیا۔



موسم خوش گوار تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔
 ایشل خالہ کی طرف آئی ہوئی تھی۔ سحر چائے کے
 ساتھ پکڑے بتالائی تھی۔ اب دونوں بیٹھی موسم کا مزہ
 لے رہی تھیں۔

”کیسی رہی سنیا کی دعوت۔“
 ”بہت اچھی۔ اس کی منگنی کے بعد اب جا کر ملاقات ہوئی۔ خوب گپیں لگائیں۔“ ایشال نے مزے سے پکڑے کھاتے ہوئے بتایا، اس کے سیاہ لمبے بال ہوا سے اڑ رہے تھے جن کو اس نے آدھا باندھا ہوا تھا۔



”شادی کب ہے اس کی؟“ سحر نے چائے کا کپ لیوں سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

”سات مہینوں بعد ہے۔ اتنے اچھے نئی کلیمکشن کے جوڑے لے کر آئی تھی، ہر برائڈ کا جوڑا تھا۔ اور وہ یاد ہے گل احمد کا نو ہزار کا جوڑا جو مجھے اس دن پسند آیا تھا، وہ بھی تھا اس کے پاس۔ میری نظریں تو اس جوڑے پر سے ہی نہیں ہٹ رہی تھیں۔“ ایشال نے ٹھنڈی آہ بھری آواز سے پھر سے وہ جوڑا یاد آگیا تھا۔

”وہ افورڈ کر سکتی ہو گی، اتنے مہنگے ڈیزائنڈ سوٹ۔ ہمارے پاس تو اتنے فالٹو پیسے نہیں ہیں جو صرف کپڑوں پر لگا دیں۔“

”تمہاری دوستوں نے ہی خراب کیا ہے تمہیں۔ ان کے ساتھ چار سال گزار کر تم اپنی برائڈ کونفیشنس ہو گئی ہو، ورنہ پہلے تو تمہیں ایسا کوئی شوق نہیں تھا۔“ سحر نے اس کے لئے لیے۔ ایشال نے منہ بنایا۔

”اب تم امی کا رول ادا نہ کرنے لگ جانا۔ تمہیں کیا پتا برائڈ ڈیزائن کا اپنا ہی مزا ہے۔ میرا تو دل چاہتا ہے ہر چیز برائڈ ڈیزائن۔“

”کچھ نہیں ہو سکتا تمہارا۔“ سحر نے افسوس سے سر ہلایا۔

”اچھا چھوڑو۔ میں سوچ رہی ہوں جا ب کر لیتے ہیں فارغ ہی تو ہوتے ہیں۔“ ایشال کو نیا خیال آیا۔

”جا ب۔“

”ہوں کسی اکیڈمی میں جا ب کر لیتے ہیں۔ ادھر قریب ہی ایک نئی اکیڈمی کھلی ہے وہاں پتا کرتے ہیں۔ ویسے بھی شام کی کلاسز ہوں گی۔ کیا خیال ہے؟“ ایشال نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”ایڑیا تو اچھا ہے۔ امی ابو سے پوچھ کر ہی کچھ کہہ سکوں گی۔“ سحر نے پائے کے خالی کپ اٹھا لیے۔ ایشال بھی خالی پلیٹ اٹھا کر اس کے ساتھ اندر کی طرف چل پڑی۔

دوپہر کا کھانا تیار کر کے وہ سلاو بنانے کے لیے لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی۔ ابو کے آنے سے پہلے وہ ساری تیاری مکمل کر لیتی تھی۔ کھانا کھا کر انہیں پھر فتر جانا ہوتا تھا۔ وہ پاز کٹ رہی تھی جب احمد داخل ہوئے وہ انہیں ہلکا سا بجا کر اندر آیا۔ ایشال نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کمال ہے گیٹ کھلا چھوڑ رکھا ہے۔ میرے جیسے شریف انسان کے بجائے اگر کوئی چور گھس آتا پھر۔“

”پھر وہ دوپہر کا کھانا کھا کر جاتا۔ وہ بھی بیٹنگن کا سالن۔“ ایشال نے منہ بنایا، اسے سبزیاں کچھ خاص پسند نہ تھیں۔

”خیر، بناؤ کیا میرے کام کا۔؟“

”مبارک ہو فیاض صاحب کی اکیڈمی میں ٹیچر کی اشد ضرورت ہے۔ میں ان سے خود مل کر آیا ہوں۔“ احمد نے سلاو کی پلیٹ سے ٹماٹر اٹھا کر کھاتے ہوئے اطلاع دی۔

”لگتا کب ہے ان سے؟“ ایشال رُجوش ہوئی۔

”کل چلی جانا کلاسز سے پہلے پانچ بجے پہلی کلاس شروع ہوتی ہے۔ چار ساڑھے چار بجے تک چلی جاتا۔“ احمد بات کرتے ہوئے نظریں دوڑا رہا تھا۔ بار بار نظر ہٹک کر بچن کی طرف جارہی تھی۔ ایشال نے اس کی یہ حرکت نوٹ کر لی۔

”واپس آجاؤ نہیں آئی وہ۔“ ایشال کے کہنے پر وہ بوکھلایا۔

”نہیں وہ میں۔ تو مای کو دیکھ رہا تھا، نظر نہیں آرہی۔“

”معلوم ہے مجھے کس کو دیکھ رہے تھے، بنو نہیں اب۔ آخر ہو سکن چکروں میں۔ پتا بھی ہے پھوپھو اور خالہ کی آپس میں کبھی نہیں بنی۔ ایسے میں تم کسی

خیال کو دل میں جگہ نہ ہی دو تو بہتر ہے۔" ایشال نے وارن کرنے والے انداز میں کہا۔ احمرید مڑا ہوا۔

"ایک تو میری سمجھ میں نہیں آتا تمہاری خالہ نے اگر میرے چچا کے رشتے سے انکار کر دیا تھا تو اس میں اتنی لمبی ناراضی پالنے والی کون سی بات ہے۔ مسرت آنٹی کو فہیم انکل پسند تھے۔ اس میں بھی کوئی بری بات نہیں تھی۔"

"ہوں کہہ تو صحیح رہے ہو۔" ایشال نے سر ہلایا۔ پھر احمر کو گھورتے پا کر ٹھکی۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو اور اگر تم وہ سوچ رہے ہو جو میں سمجھ رہی ہوں تو بہت میری طرف سے صاف انکار ہے۔"

"کچھ تو خیال کرو، بھابھی ہو میری۔ تم نہیں چاہتیں تمہاری دوست دیورانی بن کر ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے۔" احمر نے بیٹھے لمبے میں جذباتی وار کرنے کی کوشش کی مگر سامنے بھی ایشال تھی۔

"بھابھی ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں تم پر قربان ہو جاؤں۔ کم از کم میں تو پھوپھو کو نہیں سمجھا سکتی۔ میرے اپنے تعلقات خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔"

"مخود غرضی کی حد ہے، صرف اپنی فکر ہے۔" احمر نے افسوس سے سر ہلایا۔

"تم واقعی سحر کے لیے سنجیدہ ہو؟" "تمہیں کیا لگتا ہے۔"

"بس پھر خود جا کر پھوپھو سے بات کرو اپنی جنگ خود ہی لڑو۔" ایشال نے ہمت دلانے والے انداز میں کہا۔ احمر جھک کر جانے کے لیے مڑ گیا۔

"کھانا تو کھا کر جاؤ۔" ایشال نے آواز دی۔ "مجھے نہیں کھانا۔" یہ کہتے ہوئے احمر وہاں سے نکل گیا۔



وہ اکیڈمی سے واپس آئی تو پھوپھو آئی بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی خوش ہو گئیں۔

"کیسی ہے میری بیٹی۔" پھوپھو نے اسے پیار

کرتے ہوئے اپنے پاس بیٹھا لیا۔ "بالکل ٹھیک! آپ کیسی ہیں؟" ایشال مسکراتے ہوئے آرام دہ انداز میں بیٹھ گئی۔

"اللہ کا شکر ہے۔ جب سے آئی ہوں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اتنے دن ہو گئے ملے ہوئے۔ تمہارے انکل بھی یاد کر رہے تھے کہ ایشال بیٹی نے چکر نہیں لگایا۔"

"پھوپھو میں ضرور آؤں گی۔ اکیڈمی میں جب شروع کر دی ہے تو شام میں گھر پر نہیں ہوتی، کسی دن صبح کے وقت آؤں گی۔"

"روز اسی وقت آتی ہے کیا۔ یہ قریب ہی اکیڈمی ہے۔" ساجدہ بیگم نے بتایا۔

"احمر تیار ہوا تھا۔ چلو اچھا ہے، فارغ وقت کو کچھ کام میں ملاؤ۔"

"احمر کی نوکری کا کیا بننا۔" ساجدہ بیگم نے پوچھا۔

"دو جگہ انٹرویو دے کر آیا ہے، دیکھو اب کیا بننا ہے۔ کوئی اچھی نوکری ملے تو یہ جو چار چار جگہ ٹوشن پڑھاتا ہے، اس سے جان چھوٹے۔" پھوپھو نے گہرا سانس لیا۔

"اللہ نیک سبب کرے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" ساجدہ بیگم نے تسلی دی۔

"لا پروا سا ہے، فکر ہی لگی رہتی ہے اس کی طرف سے۔"

"بڑا سمجھ دار بچہ ہے آپ۔ ٹھیک ہے، مزاج میں شوخی ہے، مگر باپ کا ہاتھ بٹانے کی کوشش تو کر رہا ہے۔ بس اس کی نوکری ہو جائے تو اس کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ لیں۔"

"ہوں آرامہ تو یہی ہے جبران اور اس کی شاوی ساتھ ہی کروں۔ مگر کوئی لڑکی ملے تب نہ۔" پھوپھو نے سر دھڑکائی۔ ایشال کی نظر کافی دیر سے اس شاہر پر تھی جو پھوپھو کے قریب پڑا تھا۔ ان دونوں کی بات لمبی ہوتے دیکھ کر اس نے بے صبری سے پوچھ ہی لیا۔

"پھوپھو اس شاہر میں کیا ہے۔" ایشال کے پوچھنے پر ساجدہ بیگم کے چہرے کے تاثرات بگڑے۔ "اے

ہاں مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔“ پھوپھو نے مسکراتے ہوئے شاہر اس کی طرف بڑھایا۔ ”میری بیٹی کی سالگرہ آرہی ہے اس لیے میں نے سوچا کوئی تحفہ لے جاؤں۔“ ”تھینک یو پھوپھو۔“ ایشال نے امی کی گھوری کی پروانہ کرتے ہوئے پر جوش انداز میں جلدی سے شاہر گھولا۔ اندر سے دو جوڑے برآمد ہوئے جو شیٹ میں پیک تھے۔

”ایک میری طرف سے، دوسرا تمہارے انکل کی طرف سے۔“ پھوپھو نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ جوڑے دیکھ کر ایشال کی خوشی ماند پڑ چکی تھی۔ وہ عام سے لان کے برنڈ تھری میں سوٹ تھے۔ ”اس کی کیا ضرورت تھی آیا۔“ ساجدہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ ایشال کے مابوس کن تاثرات پہلے ہی دیکھ چکی تھیں۔ اس سے پہلے کہ آپا بھی نوٹ کرتیں انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ایشال سے کچھ بعید نہ تھا کہ کچھ الٹا سیدھا بول دیتی۔ ویسے بھی بیٹی کے بے دھڑک انداز انہیں ناپسند تھے۔

”تم بچ میں نہ بولو۔ اپنی خوشی سے لائی ہوں۔“ پھوپھو خوش دلی سے مسکرائیں۔ ”جیسی آپ کی خوشی آپا بہت اچھے برنٹ ہیں۔ جب بننے کی تو آپ دیکھیں گے۔ جاؤ ایشال کپڑے تبدیل کرو اور انہیں بھی سنبھل کر رکھو۔“ انہوں نے کتے کے ساتھ آنکھوں سے تنبیہ بھی کی۔ ایشال خاموشی سے جوڑے اٹھا کر چلی گئی۔ ”نمو اور بچوں کا کیا حال ہے؟“ پھوپھو اب ایشال کی بڑی بہن کا پوچھ رہی تھیں جو شادی شدہ تھی اور دوسرے شہر میں رہتی تھی۔

”بہت ناشکری ہو تم۔ اچھے خاصے تو ہیں مسئلہ کیا ہے۔ برنٹ اور رنگ دونوں ہی اچھے ہیں۔“ ”اتنے ہی اچھے لگ رہے ہیں تو تم رکھ لو۔“ ایشال نے فٹ سے پیش کش کی، پہلے ہی وہ جلی بیٹھی تھی، اوپر سے سحر کی تعریفیں۔

”ضرور لے لیتی، اگر تمہاری ساس نے نہ دیے ہوتے۔ شرم کرو پھوپھو بھی ہیں تمہاری، کتنی محبت اور خلوص سے لائی ہوں گی۔“ سحر نے شرم دلانا چاہی۔ ”اب تم مت شروع ہو جانا۔ امی سے لبا لیکچرسن چکی ہوں۔“ ایشال کے انداز میں آکٹا ہٹ تھی۔ ”پتا ہے تمہارا مسئلہ کیا ہے ایشال۔ تم براڈ کونشمس ہو۔ یہی جوڑے اگر کسی مشہور براڈ کی پیکنگ میں ہوتے تو تم بخوشی لے لیتیں۔ مگر اس صورت میں یہ تمہارے لیے ناقابل قبول ہیں۔“ سحر نے آئینہ دکھانا چاہا۔

”آف بس کرو۔ لعنت ہے مجھ پر جو جبران کو اور خاص طور پر تمہیں کچھ بتائے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ ایشال نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”جبران بھائی سے بھی ایسا کہا۔ مطلب یہ سب۔“ سحر کو پریشانی ہوئی۔ ”نہیں۔“ سحر نے شکر ادا کیا۔

”ویسے یہ سارا خناس تمہاری دوستوں کا بھرا ہوا ہے وہی دماغ خراب کرتی ہیں تمہارا۔“

”جیسے کہ تم۔ کب سے دماغ کھار ہی ہو۔ کھانے کے لیے ہی کچھ لے آؤ۔ جوس ہی لاؤ۔“ ایشال نے منت کرتے ہوئے اسے کچن کی طرف دھکیلا۔

”آپ لاؤنج میں جا کر بیٹھیں، خالہ آرہی ہیں۔“ سحر نے دوسری مرتبہ اس سے کہا۔ جب سے آیا تھا کچن میں کھڑا تھا۔

”ایشال کہاں ہے۔“ ”وہ نہار ہی ہے۔“ سحر نے رخ موڑا۔ سالن دم پر

”ہائے میری قسمت، میری ساس نے یہ جوڑے دیے ہیں اور ایک سونیا کی ساس ہیں، ممکن ہے ماریہ بی کے جوڑے لائی تھیں۔“ ایشال اس وقت سحر کے سامنے غمگین صورت بنائے بیٹھی تھی اور سرود آہیں بھرتے ہوئے پھوپھو کی طرف سے ملے کپڑے دکھا

رکھا تھا جو ایشال اس کے ذمے لگا گئی تھی۔
 ”آپ کو کچھ چاہیے۔“ احمر کو وہیں جمادیکھ کر سحر
 نے ضبط سے کہا۔ اس کی نظروں سے وہ ڈسٹرب ہو رہی
 تھی۔

”جی وہ۔ پانی مل جائے گا۔“ احمر کتنا کچھ چاہتا تھا
 زبان سے کچھ اور نکل گیا۔ سحر نے جب چاب گلاس
 بھر کر اس کے سامنے رکھا، تاکہ کسی طرح تو نکلے۔ پانی
 پی کر احمر نے بولنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ سحر بول
 پڑی۔

”میں چائے لاتی ہوں۔ آپ لاؤنج میں تشریف
 رکھیں۔“

”وہ۔ میری چاب لگ گئی ہے۔“
 ”مبارک ہو آپ کو۔“ سحر نے محل سے کہا۔
 ”مٹھائی لایا تو تھا۔“ احمر نے بوکھلاہٹ میں ارد گرد
 دیکھا۔

”جی یہ شاید آپ کے ہاتھ میں ہے۔“ سحر نے اس
 کے ہاتھ میں پکڑے شاپر کی طرف اشارہ کیا۔ احمر کی
 پیشانی پسینے سے چمکی۔ اس وقت شرم سے ڈوب مرنے
 کا دل کر رہا تھا۔ سحر سے کچھ خاص کہنے کا ارادہ تھا، مگر
 بوکھلاہٹ میں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لاؤنج سے
 مای کی آواز سن کر جلدی سے شاپر میز پر رکھ کر کچن سے
 باہر آ گیا۔ سحر نے شکر ادا کرتے ہوئے چائے کا پانی
 رکھا۔

”مبارک ہو بیٹا۔ اللہ کامیابیاں اور خوشیاں عطا
 فرمائے۔“ ساجدہ بیگم نے خوش ہوتے ہوئے احمر کو دعا
 دی۔

”کیوں دیور جی! مٹھائی بھی لائے یا خالی خولی
 بارک وصول کرنے آ گئے۔“ ایشال بھی کمرے سے
 نکلے ہوئے یہ خبر سن چکی تھی، پٹ سے بولی۔
 ”تو یہ کرو جس کی تمہارے جیسی بھابھی ہو وہ خالی
 تھ آسکتا ہے، فکر نہ کرو مٹھائی لایا ہوں۔“

”جم جم آؤ بیٹا! اپنا گھر ہے تمہارا۔ اسے تو تم رہنے
 دو، ایسی الٹی سیدھی باتیں کرتی رہتی ہے۔“ انہوں
 نے ایشال کو تنبیہی نظروں سے دیکھا۔ ”آپا کو بڑی

فکر تھی تمہاری۔ اب خیر سے چاب لگ گئی ہے۔
 اچھا ہے، کوئی اچھی لڑکی مل جائے تو جبران اور تمہاری
 اکٹھے ہی شادی ہو جائے۔“

”بس مائی، پھر تو آپ بھی امی کے ساتھ اس مہم میں
 جت جائیں۔ اور میرے لیے کوئی پری وش ڈھونڈ
 نکالیں۔“ احمر نے زیر لب مسکراتے ہوئے شرارتی
 انداز میں کہا۔ نظریں بڑے لاتی سحر پر تھیں۔

”پری وش۔ امی ذرا پوچھیں تو یہ پری وش کون
 ہے۔“ ایشال نے پری وش پر زور دیا۔ سحر جو احمر کے
 اس طرح دیکھنے پر نئے سرے سے تملاتی تھی، جھٹ
 سے بولی۔

”خالہ کہیں یہ اس پری وش کی بات تو نہیں کر رہے
 جو تیسری لین میں رہتی ہے، انکل نعیم کی بیٹی۔“ وہ احمر
 کی بات کو صرف اس کے شوخ مزاج کے تحت مذاق
 میں لے رہی تھیں۔ سحر کی بات سن کر چونکیں۔
 ”نہیں۔ نہیں۔ مائی میں تو ایسے ہی مذاق کر رہا
 تھا۔“ احمر گھبرا گیا۔ کیسے وہ عجیب سمجھ کرا می سے ہی نہ کہہ
 دیں۔ ایشال نے ہنسی دیا۔ سحر چائے رکھ کر اپنے گھر
 جانے کے لیے اٹھ گئی۔ احمر کے ہوتے ہوئے اس کا
 مزید رکنے کا ارادہ نہیں تھا۔ ایشال مزے سے گلاب
 جامن کھا رہی تھی۔



”تمہارے کزن کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے۔“ سحر
 کے اچانک سوال پر ایشال چونکی۔ آج ایشال کی سالگرہ
 تھی اور اسی خوشی میں دونوں کچھ خاص بنانے کے چکر
 میں کچن میں مگسی ہوئی تھیں۔ سحر چاکلیٹ کیک بنا
 رہی تھی اور ایشال پاستا۔

”کون۔ احمر کی بات کر رہی ہو؟“
 ”ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ میرا معصوم بھائی ہے،
 اس کو تو کہنے سے رہی۔“

”ساری لڑکیوں کو اپنے بھائی معصوم ہی نظر آتے
 ہیں۔“ ایشال نے مسکراتے ہوئے سحر کو دیکھا جو کیک
 کے آمیزے کو پیٹن میں ڈالنے کے بعد اوہن میں رکھ

رہی تھی۔
 ”یہ مذاق کی بات نہیں ہے ایشال۔ اپنے کزن کو سمجھا لو ورنہ کسی دن میں اس سے بہت بری طرح پیش آؤں گی۔“ سحر کیک رکھنے کے بعد اب ہاتھ باندھے شیف سے ٹیکہ لگا کر کھڑی تھی۔

”کم آن سحر! اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بے چارے نے کیا کیا ہے۔ تمہارے سامنے اس کی بولتی ویسے ہی بند ہو جاتی ہے۔“
 ”اور وہ جو گھور گھور کر عجیب نظروں سے مجھے دیکھتا ہے وہ کیا ہے۔ وہ تو میں بات ہی ایسے کرتی ہوں کہ اس کی ہمت نہیں ہوتی، کوئی ایسی ویسی بات کرنے کی۔“ ایشال نے ہنسی دہائی۔
 ”عجیب نظروں سے نہیں محبت بھری نظروں سے دیکھتا ہے وہ معصوم تو۔“

”اس سے کہو اپنی ان محبت بھری نظروں سے کسی اور لڑکی کو پٹائے۔ میں تو اس کا دماغ درست کر دوں گی۔“ سحر تپ اٹھی تھی۔
 ”احمر کوئی فلرٹ کرنے والا لڑکا نہیں ہے۔ تم پہلی لڑکی ہو جسے وہ پسند کر بیٹھا ہے اور بہت سنجیدہ ہے تمہارے لیے۔ شادی کرنا چاہتا ہے۔“ ایشال نے احمر کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

”میرا اور اس کا ساتھ ممکن نہیں ہے۔ پہلی بات تمہاری پھوپھو ہمارے گھر رشتہ لانا ہی نہیں چاہیں گی اور دوسری۔ مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔ لہذا اپنے اس چھچھورے کزن سے کہو اپنی ان فضول حرکتوں سے باز آجائے۔“
 ”دیکھو۔“ ایشال بات کرتے ہوئے مڑی، مگر کچن کے دروازے کے ساتھ احمر کو کھڑا دیکھ کر چپ ہو گئی۔ زبان گویا تالو سے چپک گئی۔ سحر اس کے اس طرح خاموش ہونے پر مڑی۔ احمر کو دیکھ کر اسے بھی شاک لگا۔ احمر کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ بہت کچھ سن چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ ایشال اسے روکتی کچھ کہتی وہ خاموشی سے وہاں سے چلا گیا۔

”احمر کو تو۔“ ایشال کو جیسے ہی ہوش آیا بیرونی
 ”جبران تم سے کم از کم مجھے یہ امید نہیں تھی۔“
 ”جبران کیسا لگا؟“ دوسری طرف سے آتی جبران کی آواز پر ایشال کو اس کے بیچے ہوئے ہینڈ بیگ اور پرفیومز یاد آ گئے۔

”جبران تم سے کم از کم مجھے یہ امید نہیں تھی۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



”کیوں بھئی ایسا کیا کرویا میں نے۔“ جبران حیران ہوا۔

”گفت کی بات کر رہی ہوں، مجھے نہیں معلوم تھا تمہاری چوائس ایسی ہے۔“ ایشل نے ”ایسی“ پر زور دیا تھا۔ کہنا تو فضول چاہتی تھی مگر لحاظ کر گئی۔

”سنا تھا بیویاں کسی حال میں خوش نہیں ہوتیں، آج یقین بھی آگیا۔“ تا صرف تمہاری برتھ ڈے یاد رکھی بلکہ اپنی طرف سے اچھا سا گفت بھی بھیجا۔ بجائے اس بات پر خوش ہونے کے تم الٹا خفا ہو رہی ہو۔“

”ہاں تو بندہ گفت دیتے ہوئے دوسرے کی پسند ہی پوچھ لیتا ہے۔“ ایشل کو مزید تاؤ آیا۔

”اور دوسرے کو وہ محبت کیوں نہیں نظر آتی جس محبت و پیار سے گفت دیا گیا ہے۔ کم از کم اس کے بولس مارکس تو ملنے چاہئیں مجھے۔“ جبران کے مسکراتے لہجے پر ایشل کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”تھکن لگانے پر نبرک بھی سکتے ہیں۔“

”یہ ممکن نہیں مسز جبران! یہ محبت ہے۔ چلو ایسا کرتے ہیں تم اپنی پسند تاؤ، اگلی مرتبہ تمہاری پسند کا پورا خیال رکھوں گا۔“ جبران نے اسے راضی کرنے کے لیے مصلحت کی راہ اپنائی۔ اس کے پوچھنے پر ایشل خوش ہو گئی۔

”ہوں۔ ہینڈ بیگ ایم کے اور فیکسٹ کے اچھے ہوتے ہیں اور پرفیومز میں ہوپ اور آہسشن ٹائٹ مجھے بہت پسند ہے۔“

”آہسشن ٹائٹ ہے تمہارے پاس۔“ جبران کے سوال پر ایشل کا منہ بن گیا۔

”ہے تو نہیں، مگر پسند ہے بہت۔“ سونیا استعمال کرتی ہے، ”اف کیا خوشبو ہے اس کی۔“ جبران نے گہرا سانس لیا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ وہ واحد خرابی جو اس کے گفتگو میں تھی، وہ ان کا براہنڈ نہ ہونا تھا۔ جس کے باعث ایشل کو بے کار اور لواشیٹنڈرڈ لگ رہے تھے۔

”اس سب کے لیے پانچ چھ سال انتظار کر لو۔ تب بھی اگر تمہارا شوہر لینڈ لارڈ بن گیا، پھر ہی ممکن ہو سکتا ہے کہ گھر میں پانی تک براہنڈ آئے۔“ جبران نے شرارتی انداز میں کہا۔

”مذاق ہی اڑانا ہے تو۔ میں فون بند کر رہی ہوں۔“

”مذاق کب اڑا رہا ہوں۔ الٹا میں تو معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ مستقبل میں کام آسکتی ہیں۔ کیا پتا حالات کا پانی بھی براہنڈ ہونا صحت کے لیے مفید ثابت ہو۔ کیا نام تھا تمہارے ان براہنڈ کا وہ گل خان ٹائپ کے۔“ جبران پر اس کی فون بند کرنے والی دھمکی کا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ تب ہی اس کے چڑنے سے حفا اٹھا رہا تھا۔

”بہت فصول ہو تم۔ مجھے بات ہی نہیں کرنی تم سے۔“ ایشل نے کل کٹ کر موبائل بیڈ پر پٹا تھا۔ دوسری طرف جبران آوازیں دہتا رہا گیا تھا۔ اب جبران پھر سے نمبر ملا رہا تھا۔ تھکن سے اس کا برا حال تھا۔ مگر ایشل کو ناراض کر کے وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔



”آئے کیوں نہیں اتنے دنوں سے۔“ ہفتے بعد احمر کی شکل دیکھنے کو ملی تو ایشل بے اختیار پوچھ بیٹھی۔ آج بھی وہ پھوپھو کے کام سے آیا تھا۔

”بس مصروف تھا۔“ احمر سامنے صوفے پر بیٹھا قالین پہ بنے نقش و نگار کو دیکھ رہا تھا۔

”احمر اس دن کے لیے ایم سوری۔ میں جانتی ہوں تمہیں برا لگا ہے، مگر سحر کا یہ مطلب نہیں تھا وہ تو۔“ ایشل نے بات تو شروع کر دی، لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بات سنبھالے۔

”وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔“ احمر نے اس کی بات کاٹی۔ احمر کا انداز ہی ایسا تھا کہ ایشل گڑبڑاتی اور تھوک نکلتے ہوئے بولی۔ ”ایسی بات نہیں ہے۔ اس نے تمہیں نہیں تمہاری حرکت کو نا پسند کیا ہے، بلکہ وہ تو بڑی شرمندہ ہو رہی تھی تمہارے اس طرح سے جانے

”اگر تھوڑا آگے ہوا چہرے پر چمک اٹھی تھی۔
پہلے والی بھی سمجھی سی کیفیت ماند پڑی تھی۔
”کیا کہہ رہی تھی؟“ ایشل مزید سیٹھائی۔ ”شرمندہ
ہو رہی تھی اپنے الفاظ پر کہہ رہی تھی کتنا ہرٹ ہوا
ہو گا احمر۔“

”اور۔“ احمر کے رُشوق تاثرات دیکھ کر ایشل
نے خود کو مزید جھوٹ بوتلے سے روکا۔

”اے چھوٹو، تم اسے مارنے کے بجائے ہمت
کر کے پھوپھو سے بات کرو۔ ویسے بھی سحر کو تمہارا
یوں جذبے لٹاتی نظروں سے دیکھنا سخت ناپسند ہے۔
اس لیے اس سے ہرگز کچھ مت کہنا پرویز کر بھی دو
گے تب بھی وہ یہی کہے گی کہ رشتہ بھیجھو۔“ ایشل کے
لٹاڑنے پر احمر شرمندہ ہوا۔

”پتا نہیں امی کیسے ری ایکٹ کریں۔ جبران سے
بات ہوئی تھی وہی بات کرے گا امی۔“

”ہاں جی، بیو کا رفل وہی تو ادا کریں گے۔“ ایشل
نے رفل میں سوچا پھر احمر کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

”اچھی بات ہے چلو میں ذرا سالن دیکھ لوں دم پر
رکھ کر آئی تھی۔“ ایشل اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

”مائی کدھر رہ گئیں۔“

”وہ کڑھائی والی چادر ہی ڈھونڈ رہی ہوں گی جو
پھوپھو کو چاہیے تھی۔ دیکھ لو کمرے میں جا کر۔“

ایشل کچن میں چلی گئی۔ احمر بھی سر ملانا کمرے کی
طرف بڑھ گیا۔



”بڑے اچھے وقت پر آئی ہیں پھوپھو آپ۔
شاپنگ دکھاتی ہوں، آج ہی کر کے آئی ہوں۔“ ایشل

پھوپھو سے کہہ کر کمرے سے شاپر زائٹھالائی۔ سحر بھی
اس کی مدد کی خاطر ساتھ ہوئی تھی۔ کچھ شاپر اس نے
لا کر میز پر رکھے۔

”ارے کیا کیا لے آئیں۔“ شاپر زکا ڈھیر دیکھ کر
پھوپھو نے پوچھا۔

”بہت سی چیزیں ملائی ہوں۔ تنخواہ لی تھی تو میں نے

سوچا کچھ چیزیں لے لوں۔ کپڑے، جوتے، بیگ، پرفیومز
اور چھوٹی موٹی چیزیں ضرورت کی۔“ ایشل نے کپڑوں
والے شاپر کھولتے ہوئے کہا۔

”ایشل پہلے چائے بناؤ۔ پھر دکھاتی رہتا ابھی تو
آئی ہیں کیا۔“ ساجدہ بیگم نے مداخلت کی، انہیں پہلے
ہی ایشل کی لاپرواہی پر تاؤ آ رہا تھا۔

”سحر پکیزہ۔ تم چائے بناؤ۔ میں پھوپھو کو شاپنگ
دکھاتی ہوں۔“ ایشل نے جھٹ سے سحر کو آگے
کر دیا۔ ایشل کے بہانے بازیوں سے وہ اچھی طرح
واقف تھی۔ لہذا چپ چاپ چائے بنانے کے لیے
اٹھ گئی۔ جب تک سحر چائے کے ساتھ لوازمات لے
کر آئی۔ ایشل سب چیزیں دکھانے کے ساتھ ساتھ
ان کی قیمتیں بھی پھوپھو کے گوش گزار کر چکی تھی۔

اس کی اتنی مہنگی شاپنگ پر پھوپھو کے چہرے کے
زاوے بگڑے ہوئے تھے۔ جبکہ ساجدہ بیگم لاؤنج میں
نہیں تھیں۔

”بیٹا! اتنی مہنگی خریداری کرنے کی کیا ضرورت
تھی۔“

”تھوڑی مہنگی ہیں، مگر دیکھیں ساری چیزیں براہِ رُو
ہیں۔ اچھی کوالٹی کی۔“ ایشل نے کہتے ہوئے
پرفیوم کو کوئی چوتھی بار سونگھا۔ پہلی مرتبہ وہ یہ پرفیوم
خرید کر لائی تھی۔

”کچھ بچایا بھی ہے یا ساری تنخواہ لگا دی۔“

”آئی چائے لیں۔“ سحر نے ان کے بگڑے موڈ کو
دیکھ کر چائے کی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ ساتھ ہی بسکٹ
اور باقی لوازمات بھی ان کے آگے رکھے۔

”کہاں۔ یہی تو افسوس ہے وہ آٹھ ہزار والا سوٹ
پہلے نظر آ جاتا تو لے لیتی، آخر میں پیسے ہی نہیں
بچے۔“ ایشل کے بے نیازی سے کہنے پر پھوپھو کا
چائے کی طرف جانا ہاتھ رک گیا۔ ایشل کی ساری توجہ
چیزیں سمیٹنے میں تھی۔ سحر نے ایک بار پھر انہیں چائے
کی طرف متوجہ کیا۔ پھوپھو گرا سانس لیتے ہوئے اس
کی طرف مڑیں۔

”جس رہنے والے کسی چیز کا دل نہیں چاہ رہا۔ چائے

جس رہنے والے کسی چیز کا دل نہیں چاہ رہا۔ چائے

جس رہنے والے کسی چیز کا دل نہیں چاہ رہا۔ چائے

جس رہنے والے کسی چیز کا دل نہیں چاہ رہا۔ چائے

جس رہنے والے کسی چیز کا دل نہیں چاہ رہا۔ چائے

جس رہنے والے کسی چیز کا دل نہیں چاہ رہا۔ چائے

جس رہنے والے کسی چیز کا دل نہیں چاہ رہا۔ چائے

جس رہنے والے کسی چیز کا دل نہیں چاہ رہا۔ چائے

ہی کافی ہے۔" ہاتھ سے ہائی چیزیں پیچھے کھسکا نہیں۔
 "خالہ آمنی چائے پی لیں۔" کمرے سے ساجدہ بیگم کو نکلتا دیکھ کر سحر نے فوراً کہا۔ پھوپھو کے بگڑے موڈ سے وہ پریشان ہو گئی تھی۔ "سحر تم نے بھی کچھ لیا۔" ساجدہ بیگم نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے چائے کا کپ اٹھایا۔

"جی خالہ امی ابو کے لیے سوٹ لیے ہیں اور اپنے لیے ہینڈ بیگ۔" سحر نے قریبی صوفے پر رکھے شاپر کھول کر دکھائے۔

"میں نے اتنا کہا کوئی جوڑا لے لو۔ اتنی اچھی سلیکشن آئی ہوئی ہے آج کل۔ مگر یہ انتہائی نجوس ہے۔" ایشال کمرے میں سامان رکھ کر آئی تھی اور آتے ہی شروع ہو گئی۔

"کنجوسی کی بات نہیں ہے ابھی تو امی نے سیزن کے سوٹ بنوا کر دیے تھے۔ جب ضرورت ہوگی لے لوں گی۔" سحر نے سادگی سے وضاحت کی۔

"کیا ہی اچھا ہو ایشال کی عقل میں بھی یہ بات آجائے۔" ساجدہ بیگم نے گہرا سانس لیتے ہوئے ایشال کو دیکھا جو مزے سے نمکو کھانے میں مصروف تھی۔ انہیں اب پھوپھو کے جانے کا انتظار تھا۔ تاکہ ایشال کی کلاس لے سکیں۔ زند کے تیور بھی انہیں کچھ اچھے محسوس نہیں ہو رہے تھے۔



آج پھوپھو کے ہاں انکل کے دوست اور ان کی فیملی دعوت پر مدعو تھے۔ صبح سے پھوپھو کی طبیعت ناساز تھی۔ دعوت بھی کینسل نہیں کی جاسکتی تھی۔ ساجدہ بیگم کو جیسے ہی پھوپھو کا فون آیا فوراً ایشال کو بھیجنے کا کہہ دیا۔ ایشال نے بہانے بنانے کی بہت کوشش کی مگر وہ کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ مجبوراً ایشال پھوپھو کی طرف آگئی۔ ساتھ سحر کو بھی گھسیٹ لائی۔ یہاں آکر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ ابھی اتنی ماہر نہیں ہوئی تھی کہ بیس افراد کا کھانا تیار کر سکتی۔ ساتھ ہی تاؤ آ رہا تھا۔ اچھا بھلا پھوپھو کسی اچھے سے

ریسٹورنٹ کا پوچھ رہی تھیں۔ کھانا منگوانے کے لیے مگر امی نے زبردستی اسے بھیج دیا کہ زیادہ سے زیادہ چھ سات لوگ ہوں گے۔ باہر سے کیا منگوانا۔ اصل تعداد تو یہاں پہنچ کر معلوم ہوئی تھی۔

سحر کا ساتھ غنیمت تھا۔ وہ کھانا بھی اچھا بنا لیتی تھی اور اپنے گھر کی دعوتوں میں سارا اہتمام وہ اور خالہ مل کر کرتی تھیں۔

"جلدی ہاتھ چلاؤ کہیں وہ لوگ آئی نہ جائیں" انہیں اینڈ بھی تو کرنا پڑے گا۔ کولڈ ڈرنکس سرو کرنی ہوں گی۔" سحر نے مصروف انداز میں ایشال سے کہا وہ خود سلاو بنا رہی تھی۔ ساتھ آہستہ آہستہ آنچ پر رکھی کھیر میں چچہ بھی چلا رہی تھی۔

"مگر تو رہی ہوں۔ اتنا زیادہ بنانے کا پہلا تجربہ ہے میرا" پتا نہیں کیا بنے۔" ایشال کے کنبے میں بے چارگی تھی۔

"خیر سے مٹن کڑائی بن رہی ہے پاپائے پک رہے ہیں۔" سحر نے دائیں طرف والی شیفت پر جھانکا جہاں ایشال اپنی عادت کے مطابق چیزیں پھیلا چکی تھی۔ سحر نے گہرا سانس لیا، جانتی تھی وہ پھیلاوا بھی اسے ہی سہنا تھا۔

"مٹن کڑائی بنانے کی کیا تک بنتی ہے۔ اس سے اچھا تھا چکن کڑائی بنالیتی جلدی تو بنتی۔" ایشال کو وہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ بس نہیں چل رہا تھا چکن سے بھاگ جائے۔ اتنی گرمی میں چکن میں کھڑے ہونا امتحان سے کم نہیں تھا۔

"چکن کا مغلائی قورمہ جو بنایا ہے۔" ایشال کچھ اور بھی کہنے والی تھی مگر پھوپھو کو آتے دیکھ کر خاموش ہی رہی۔

"بیٹا کتنا کام رہ گیا۔"

"ارے آنٹی آپ کیوں آگئیں آپ آرام کریں" سب ہو جائے گا۔ بس کچھ دیر میں تیار ہو گا سب۔" سحر بھی انہیں دیکھ چکی تھی فوراً بولی۔

"بس بیٹا اب جا کر جسم کا درد کم ہوا ہے۔ جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔" اٹھنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اب

دوا کا کچھ اثر ہوا ہے۔ ”پھوپھو نے بولتے ہوئے ایک طائرانہ نظر بچن پر ڈالی۔ سحر چونکہ ان کے سامنے والی شیفٹ کے پاس کام کر رہی تھی اس لیے پہلی نظر اس پر پڑی تھی۔ مگر ایشال کے پھیلاوے پر ان کی نظر ابھی پڑی تھی۔

”پھوپھو مٹن کڑا ہی تیار ہونے والی ہے۔“ پھوپھو کو اپنی طرف دیکھتا پا کر ایشال نے انہیں مطمئن کرنا چاہا۔

”کیا کیا بتایا۔“ ایشال نے گڑبڑا کر سحر کو دیکھا۔ کیونکہ باقی چیزیں تو اسی نے بنائی تھیں۔ ایشال کو تو مٹن کے ساتھ ہی اتنا ٹائم لگ گیا تھا۔

”آئی مغلانی قورمہ اور پلاؤ تیار ہے۔ سلاؤ اور کھیر بھی بس تیار ہونے والے ہیں۔ ٹرانسفل شروع میں بنا کر فریج میں رکھ دیا تھا۔ اب کباب فراہمی کرنے ہیں اور ٹیبل سیٹ کرنا ہے۔“ سحر کی بات سن کر پھوپھو کچھ مطمئن ہو گئیں۔ ورنہ ایشال کو کام کرنا دیکھ کر وہ خاصی فکر مند ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر وہ دونوں کو ناقدانہ نگاہوں سے دیکھتی رہیں۔ سحر کافی سلیقے سے کام کر رہی تھی۔ جبکہ اس کے مقابلے میں ایشال نے ہر چیز الٹ پلٹ کر کے رکھ دی تھی۔



”آئی کیا حال ہے آپ کا۔“ سحر نے ان کا حال چال پوچھا۔ خریداری کرتے ہوئے اچانک ہی اس کی نظر ان پر پڑی تھی۔

”اللہ کا شکر ہے۔ تم اکیلی آئی ہو۔“ پھوپھو نے اسے تنہا دیکھ کر دریافت کیا۔

”امی ساتھ ہیں گھر کا سودا خرید رہی ہیں۔“ سحر کے کہتے ہی باتیں طرف سے مسرت ان کی طرف آئیں۔ بہن کی منہ کو دیکھ کر ہمیشہ کی طرح خوش اخلاقی سے ملیں۔ سحر کو حیرت ہوئی، آج تو پھوپھو بھی خوش دلی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ جبکہ پہلے تو صرف سلام دعا کی حد تک تعلق تھا۔ سحر خاموشی سے دونوں کو باتیں کرتا دیکھ رہی تھی۔ بات گھوم پھر کر اس دن کی دعوت پر آگئی۔

”سحر کے ہاتھ میں دست ڈالنا ہے۔ سب ہی تعریف کر رہے تھے کھانے کی۔ تمہارے انکل کو مغلانی قورمہ بے حد پسند آیا۔“ پھوپھو کے ستائی انداز پر سحر مسکرائی۔

”شکریہ آئی۔ میں انکل کے لیے ضرور بنا کر بھیجوں گی۔“

”کوئی کنگ کا سحر کو ہمیشہ سے شوق ہے جس اسی لیے ہر وقت کھسی رہتی ہے نئی سے نئی چیزیں بنانے کے لیے۔“ مسرت کی بات پر پھوپھو مسکرائیں۔ ”ماشاء اللہ۔“

”امی! میں جیم اور اینڈے لے کر آتی ہوں۔“ سحر انہیں بتا کر دوسرے سیکشن کی طرف چلی گئی۔

”بیٹیوں سے ہی گھر میں رونق ہوتی ہے۔ بڑا سہارا ہوتا ہے بیٹی کا۔“ انہیں ہمیشہ بیٹی نہ ہونے کا ملال رہا تھا۔ مسرت نے تائید میں سر ہلایا۔

”صحیح کہہ رہی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے ایک ہی بیٹی دی، مگر نیک اور احساس کرنے والی۔ پھر آج کل بیٹا بیٹی ایک برابر ہیں۔ فرحان تو ابھی چھوٹا پھر ہاسٹل میں ہوتا ہے۔ دوسرے شہر سے آنا جانا بھی کم ہی ہوتا ہے۔ ایسے میں سحر ہی ہے جو ہر بات کا احساس کرتی ہے۔ جب سے نوکری کی ہے تنخواہ لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیتی ہے کہ آپ کا اور ابو کا اس پر سب سے زیادہ حق ہے۔ پر فہم کہتے ہیں اپنے پاس رکھو، کل کو ہمارے یا تمہارے ہی کام آئیں گے۔“ مسرت کے لہجے میں بیٹی کے لیے فخر تھا۔

”اللہ سب کو نیک اور فرماں بردار اولاد دے۔ میں چلتی ہوں، آخر آگیا ہو گا۔ تم چکر لگانا کسی دن۔“ پھوپھو نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی ضرور آپ بھی آئیے گا۔“ دونوں الوداعی کلمات کہتی اپنے اپنے راستے چل دیں۔



ایشال کافی دیر سے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ ساجدہ بیگم نے سہری کاٹتے ہوئے حیرت سے اپنی

آوازیں آرہی تھیں۔ "یقیناً" دونوں وہیں تھے۔ ایشل نے دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا، لیکن اپنا نام سن کر ٹھٹھک گئی۔

"سچ پوچھیں تو میں ایشل کو بوہنا کر پچھتا رہی ہوں۔ پچھتا نہیں گیا اس کا اور سلیقہ تو کسی چیز کا ہی نہیں۔ دعوت والے دن بھی ایک سالن بنانے میں اتنا وقت لگا دیا۔ چیزیں الگ پھیلا دیں۔" پھوپھو کی آواز میں ناگواری تھی جو ایشل کو ان کی شکل دیکھے بغیر بھی محسوس ہوئی۔

"چلیں خیر ہے، ابھی تو سیکھ رہی ہے، آہستہ آہستہ کر لے گی سب۔" اکل نے جواب دیا۔

"اتنے مہینوں سے سن رہے ہیں، سیکھ رہی ہے اور پھر کام کرنے کا کوئی طریقہ ہوتا ہے یہ نہیں کہ سر سے اتار پھینکا۔ بنایا بھی گزارے لائق ہی تھا۔ دوسری بچی بھی تو تھی۔ اتنے سلیقے سے سب کر رہی تھی۔ وہ نہ ہوتی تو کچھ بھی تیار نہ ہو پاتا۔ کھانا تھا بھی بہت مزے دار، سب ہی تعریف کر رہے تھے اور پھر صرف یہی وجہ نہیں ہے ایشل سے متغیر ہونے کی۔ مجھے نہیں لگتا وہ سمجھ داری سے گھر چلا پائے گی۔ انتہا کی فضول خرچ ہے۔ اپنی تنخواہ ایک دن میں اڑا آئی۔ میاں کی کمائی کا پتا نہیں کیا حاصل کرے گی۔

حرم مجھے بہت اچھی لگی۔ خاصی سمجھ دار ہے ایشل کے مقابلے میں۔ میں صحیح معنوں میں اس سے متاثر ہوئی ہوں۔ مسرت نے بڑی اچھی تربیت کی ہے بیٹی کی۔" پھوپھو، سحر کی تعریف میں کچھ اور بھی کہہ رہی تھیں۔ ایشل اتنا کچھ سن چکی تھی کہ اور سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ مجھے چہرے کے ساتھ وہ واپس مڑ گئی۔

"کیا ہو گیا ہے بیگم۔ مت بھولیں کہ ایشل آپ کی بیٹی پہلے ہے، باقی رشتے بعد میں آتے ہیں۔ کل تک یہی پچھتا آپ کو بھاتا تھا جو آج آپ کی نظروں میں کلک رہا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ رشتہ جبران کی پسند سے جوڑا گیا ہے۔ اس طرح کی باتیں کر کے اپنا اور بیٹے کا دل میلانہ کریں۔ ساری زندگی بھائی بھائی نے

چھوٹی اولاد کو دکھا جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھی تھی۔ کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کیا، جب رہا نہ گیا تو پوچھ بیٹھیں۔

"خیر تو ہے، کیا سوچ رہی ہو۔" ان کے پوچھنے پر ایشل چونک کر سیدھی ہوئی۔

"امی! کل رات شاوی کے فنکشن میں پھوپھو کچھ اکٹری اکٹری سی لگیں۔ آخر میں بھی ملے بغیر ہی چلی گئیں۔ ایسا بھی ہوا نہیں پہلے۔" ایشل الجھن کا شکار تھی۔

"ہوں۔ محسوس تو مجھے بھی ہوا کچی کچی سی تھیں۔"

"یہ وجہ کیا ہو سکتی ہے۔"

"گفتنی بات تم سے کہا کہ اپنے آپ کو بدل لو، یہ پچھتا بے ڈھنگا انداز، ہر چیز کے لیے چل جانا، یہ سب ٹھیک نہیں، پر نہ جی ماں کی بات ماننی ہی نہیں ہے۔ یہی وجوہات ہوں گی آپا کی ناراضی کی۔ اس دن جب گھر آئی تھیں تمہاری وہ فضول خرچی دیکھ کر خوش ہو کر نہیں گئی تھیں۔ مگر تم اپنی ہی دھن میں رہتی ہو۔ آگے پیچھے دیکھو تب نا۔" امی نے اسے ٹھیک ٹھاک سنا دیا۔

"میری تنخواہ تھی، میری مرضی، جہاں چاہے خرچ کروں۔" ایشل چپچی تھی۔

"خرچ کرنے کا بھی سلیقہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ جہاں مرضی اڑا دیے۔ اپنی حیثیت کے مطابق ہی خرچ کرنا چاہیے۔" ساجدہ بیگم نے افسوس سے ایشل کو دکھا جو تھکاسی اٹھ گئی تھی۔ وہ گہرا سانس لیتی پھر سے سبزی کی طرف متوجہ ہو میں۔ جانتی تھیں ایشل کو سمجھانا مشکل تھا جو دل میں آتا وہی کرتی۔

اتوار کی چھٹی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایشل پھوپھو کی طرف آگئی تھی۔ احمر سے دروازے پر ہی ملاقات ہو گئی۔ اس کا دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ کا پروگرام تھا۔ پھوپھو کو ڈھونڈتی ہوئی وہ اندرونی حصے کی طرف آگئی۔ لاؤنج میں خاموشی تھی۔ کچن سے ہوتی ہوئی وہ کمروں کی طرف بڑھی۔ اکل اور پھوپھو کی باتوں کی

خاموش دیکھ کر بولا۔

”حیرت ہو رہی ہے نا۔ مجھے بھی ہوئی تھی، بلکہ سمجھو سکتے ہی ہو گیا تھا۔ امی نے خود مجھ سے کہا۔ تعریفیں کیے جا رہی تھیں سحر کی۔ میری خاموشی پر سمجھیں شاید میں منع کرنا چاہتا ہوں۔ انہیں کیا معلوم میں تو تیار بیٹھا ہوں۔ دلی خواہش پوری ہو رہی ہے۔ سوچ لیا تھا اگر سحر نہیں تو کوئی اور بھی میری زندگی میں شامل نہیں ہو سکتی۔ ارادہ کر لیا تھا اس کے لیے جنگ بھی لڑنی پڑی تو لڑ لوں گا۔“

”سحر مجھے بہت اچھی لگی۔ خاصی سمجھ دار ہے ایشال کے مقابلے میں، صحیح معنوں میں اس سے متاثر ہوئی ہوں۔ اتنے سلیقے سے سب کر رہی تھی وہ نہ ہوتی تو کچھ بھی تیار نہ ہوتا۔“ پھوپھو کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

”سکتے تو نہیں ہو گیا۔ کچھ بولو۔“ احمر نے اسے خاموش دیکھ کر اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ ہلایا۔
”احمر تم انکار کرو۔ منع کرو پھوپھو کو رشتہ لے جانے سے۔“ احمر نے حیرت سے ایشال کو دیکھا۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں نیچے تھیں۔
”کیوں۔“ احمر نے تھوک نگلا۔

”سحر کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ وہ رشتہ لانے والا ہے، جلد ہی ان کی منگنی ہو جائے گی۔ تم سحر کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔“
”تم مذاق کر رہی ہو نا؟“ بمشکل احمر کے منہ سے الفاظ نکلے۔

”نہیں، یہ مذاق نہیں ہے، حقیقت ہے۔“
”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ پہلے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تم نے۔“ احمر کے لیے یقین کرنا مشکل تھا کچھ دیر پہلے جو چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا وہ اب تاریک ہو چکا تھا۔

”مجھے بھی چند دن پہلے ہی پتا چلا ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ تم کیسے بتاؤں۔“ ایشال گڑبائی۔ احمر نے ہونٹ سختی سے جھنجھکے۔
”کچھ کتنا چاہتا ہو، پھر لے

مکے کا مان دیا ہے آپ کو۔ ایشال کو ہوس نہیں، بیٹی سمجھیں۔“ شوہر کے قتل سے سمجھانے پر وہ شرمندہ ہوئیں۔ بیٹی کی خواہش پر بڑے مان سے انہوں نے بھائی کے سامنے دست سوال دراز کیا تھا۔ ایشال کو بیٹی بنانے کا دعویٰ کیا تھا۔ کل تک ایشال انہیں بے حد عزیز تھی، مگر اس کی چند خامیوں نے انہیں ساس بننے پر مجبور کر دیا تھا۔

”ہوں، ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔“ ان کے لہجے میں شرمساری تھی۔

”اور یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ آپ سے سب سیکھ لے گی۔ وقت کے ساتھ سمجھ بھی آ جاتی ہے اور پھر ماشاء اللہ جبران بہت سمجھ دار ہے۔ آپ خواہ مخواہ فکر مند ہو رہی ہیں۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر مسکرائے تھے۔

”میں چاہ رہی ہوں احمر کا رشتہ لے جاؤں سحر کے لیے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟“
”نیک کام میں دیر کیسی گھم کی جی ہے۔ احمر سے پوچھ لیں۔ راضی ہوتا ہے تو بخوشی لے جائے۔“ انہیں اخبار اٹھا تا دیکھ کر پھوپھو چائے کے خالی کپ اٹھا کر کمرے سے چلی گئیں۔ ابھی کھانے کی تیاری کئی تھی۔



”زبردست خبر لایا ہوں تمہارے لیے۔“ ایشال نے سوالیہ نظروں سے احمر کو دیکھا۔ ”ماں کہاں ہیں۔“ احمر نے پن میں جھانکا۔
”نماز پڑھ رہی ہیں۔ تم بتاؤ خبر کیا ہے۔“
”گیس کرو۔“ احمر کے لبوں پر خوب صورت مسکراہٹ تھی۔

”رہنے دو پہلے ہی ڈھنگ سے کچھ ہوتا نہیں۔ گیس کیا لگاؤں گی۔ تم بتاؤ۔“ اپنی خوشی میں احمر اس کے کنبے میں چھپی افسردگی محسوس نہ کر سکا۔

”امی! سحر کے لیے میرا رشتہ لے کر جانا چاہتی ہیں۔“ خوشی سے احمر کا چہرہ چمک رہا تھا۔ ایشال کو

لے ڈگ بھرتا وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ ایشال ابھی تک اسی جگہ نظریں مرکوز کیے بیٹھی تھی جہاں سے وہ گیا تھا۔



”کہاں ہوتی ہو۔ اتنے سارے دن ہو گئے بات ہی نہیں ہو پائی۔ کل بھی کل کر رہا تھا۔ تم نے پک نہیں کی، مہسج ہی کر دیتیں۔“ جبران نے شکوہ کیا۔
”ہوں، بس ایسے ہی مصروف تھی۔“ ایشال نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے جواب دیا۔

”واہ جی! اس قدر بے نیازی۔ مسز صاحبہ میں ادھر آپ کی آواز سننے کو بے تاب و بے قرار اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے انتظار کر رہا تھا اور یہاں کوئی پروا ہی نہیں، صحیح کہتے ہیں آج کے دور میں محبت بھرے دلوں کی کوئی قدر ہی نہیں رہی۔“ جبران نے شرارتی لہجے میں اسے چھیڑا تھا۔

”قدر تو واقعی نہیں ہے، نہ چیزوں کی، نہ انسانوں کی۔“ ایشال نے گہرا سانس لیا۔

”کیا ہوا؟ تم اداس ہو۔ سب ٹھیک ہے نا۔ کوئی بات ہے تو بتاؤ مجھے۔“ جبران کے لہجے میں تشویش تھی۔ وہ اس کے مزاج کے سب ہی موسموں سے واقف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی آواز میں چھپی افسردگی کو اس نے فوراً بھانپ لیا۔ ایشال گڑبلائی۔
”نہیں، بس ایسے ہی دل تھا سا ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کا دل افسردگی کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ بس آج یہی کیفیت ہے۔“ ایشال کے سنجیدگی سے کہے گئے الفاظ پر جبران ٹھٹکا۔

”خیریت۔ ایسی کیا بات ہوئی ہے جو اس قدر ثقیل گفتگو کرنے کی نوبت آگئی۔ کوئی بات ہوئی ہے۔“
”بتایا تو ہے دو تین دنوں سے دل اداس ہے اور کچھ نہیں۔ ایک بات پوچھوں جبران۔؟“

”پل پل حیران کر رہی ہو آج بھلا تمہیں اجازت کی ضرورت کب سے پڑی وہ بھی مجھ سے بات کرنے

کے لیے۔“ جبران حیران ہوا۔
”تم کبھی مجھ سے بدگمان تو نہیں ہو گئے، وجہ کوئی بھی ہو۔“ ایشال نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔
”کم آن ایشال، کیا ہو گیا ہے۔ ہوں اب سمجھا۔ ضرور کوئی ٹریجک ڈراما دیکھ لیا ہے۔ تب ہی ایسی ہنسی ہنسی باتیں کر رہی ہو۔“

”جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔“ ایشال بگڑی۔
”تم میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں تم سے کبھی بدگمان ہو سکتا ہوں۔ یہ سب ڈانٹا گزرا ہے کی ہیروئن سنا چاہ رہی ہوگی۔ ویسے ہیرو نے یہ بولے یا نہیں۔“ جبران نے شرارتی انداز میں کہا۔

”ظاہر ہے تمہارے جیسا بدذوق نہیں ہوتا ہر کوئی۔“

”کاش کہ اس وقت میں تمہیں دیکھ سکتا تے ہوئے چہرے کے ساتھ تو اور بھی حسین لگتی ہو۔“ جبران کے خوب صورت انداز پر ایشال کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ آگئی۔

”تم چاہتے ہو میرا موڈ خراب رہے۔ غصے سے جلی بھنی رہوں۔“ ایشال اب خود کو فریٹش محسوس کر رہی تھی۔ اتنے دنوں کی افسردگی ختم ہو گئی تھی۔
”بھئی اب خوب صورت مناظر دیکھنے کے لیے تو ایسی حرکتیں کرنی پڑتی ہیں۔“ جبران مظلوم ہوا۔
”ابو سے بات ہوئی، وہ پوچھ رہے تھے۔“ ایشال کو یاد آیا۔

”ہوں ہوئی تھی۔ اچھا وہ احمر آیا تھا۔ میں اسے کب سے ٹرائی کر رہا ہوں، فون بند ہے اس کا۔ امی سے بات ہوئی تو کہہ رہی تھیں صبح سے غائب ہے، بس ایک مہسج کر دیا تھا کہ لیٹ آؤں گا۔“ جبران کی بات سن کر ایشال کے چہرے کے تاثرات تیزی سے بدلے تھے۔ بولی تو آواز بست تھی۔

”صبح آیا تھا تھوڑی دیر کے لیے۔“ جبران شاید کچھ اور بھی کہہ رہا تھا، مگر ایشال کی آنکھوں کے سامنے منظر والا منظر تازہ ہو گیا تھا۔ احمر کے چہرے کی چمک اس

کی خوشی ہے جگر جگر کرتی آنکھیں بدلتے تاثرات،
چہرے کی تاریکی۔ ایشال نے اپنی سوچوں کو جھٹک کر
جبران کو سننے کی کوشش کی۔

جب سے آئی تھی پھوپھو کا خراب موڈ نوٹ کر رہی
تھی۔ ”کیا ہوا پھوپھو کوئی بات ہوئی ہے۔ آپ پریشان
سی لگ رہی ہیں۔“ ایشال نے جھجکتے ہوئے پوچھ
لیا۔ پھوپھو گہرا سانس لیتے ہوئے بولیں۔

”بس کیا بتاؤں۔ احمر نے پریشان کر رکھا ہے۔ رشتہ
لے کر جا رہی تھی سحر کے لیے من بھی گیا تھا۔ پھر اللہ
جانے دل میں کیا سمائی صاف منع کر دیا کہ نہ جاؤں
میں پر بھی کوئی شادی وادی نہیں کرنی مجھے۔ مان لی
اس کی بات نہیں لے کر گئی رشتہ پھر بھی منہ پھلائے
پھر رہا ہے اتنے دنوں سے گھر میں بھی نہیں نکلتا۔
عجیب اولاد ہے آج کل کی کسی حال میں خوش نہیں
ہوتی۔“ پھوپھو اپنے دل کی بھڑاس نکال کر ہنسیا دیکھنے
کے لیے اٹھ گئیں۔ ایشال انہیں اپنے جانے کا ہتاکر
بو جھل دل لیے واپس چلی آئی۔

وہ کافی دیر سے دیکھ رہی تھی امی کسی گہری سوچ میں
تھیں۔ چہرے پر تفکرات کا جال سا تھا۔
”امی کیا سوچ رہی ہیں۔“ بالآخر ایشال نے پوچھ ہی
لیا۔ امی اس کی طرف مڑیں۔

”تمہارے ابو کو کچھ رقم کی ضرورت ہے۔
بس یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوں کہ آخر رقم کا انتظام
ہو گا کیسے۔ جو کمیشن ڈالی تھی وہ بھی اس بار کسی اور کو مل
گئی۔ مہینے کا آخر آنے والا ہے اور اس سے پہلے رقم کی
ادائیگی کرنی ہے۔“ ایشال کو بھی پریشانی ہوئی۔ رات
سے ابو بھی کچھ پریشان سے تھے۔ ان کی پریشانی کی وجہ
اب سمجھ میں آرہی تھی۔ رات جب وہ چائے دینے
گئی تب وہ کسی رقم کی ادائیگی کی بات کر رہے تھے۔

”تمہارے پاس کتنی رقم ہوگی۔ کچھ ہی کم ہے۔
باقی کا انتظام تو تمہارے ابو نے کر لیا تھا۔ سیونگزم

آگئیں۔“ انہوں نے خیال آنے پر پوچھا۔
”میرے پاس۔“

”ہاں وہ تمہاری تنخواہ جو آئی تھی۔“ امی کے چہرے
پر امید تھی۔

”تنخواہ۔“ جی وہ تو شاپنگ کر لی تھی میں نے اب تو
ایک ہزار ہی بچا ہے۔“ ایشال کو شرمندگی محسوس
ہوئی۔ آج اگر اس کے پاس پیسے ہوتے تو وہ امی ابو کی
پریشانی کو دور کر پاتی، مگر اس نے تو ایک ہی دن میں اپنی
ساری تنخواہ شاپنگ میں لگا دی تھی۔

”اچھا! میں مسرت سے معلوم کرتی ہوں، اگر وہ مدد
کر سکے۔ بس تیس ہزار تو شاید دے ہی سکے۔ اللہ
مالک ہے، کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔“ ساجدہ بیگم
ٹھنڈی سانس بھرتی اٹھ گئیں۔

”کیسا رہا ماموں کے گھر کا ٹرپ۔“ ایشال نے ایلٹے
ہوئے پانی میں پی ڈالتے ہوئے پوچھا۔ سحر فریش سی
کاؤنٹر پر بیٹھی بسکٹ کھا رہی تھی۔ ایشال کے پوچھنے پر
تفصیل بتانے لگی۔

”بہت ہی اچھا۔ فرح اور فاریہ بھی آئی ہوئی تھیں
ہوشل سے۔ خوب کپیں لگائیں۔ روز رات کو ہم
تینوں واک پر نکلتے تھے۔ ایک دن تو ماہی بھی گئی تھیں۔
آکس کریم کھانے کے شوق میں۔ اور فاریہ کی برتھ
ڈے بھی تھی نا تو بڑے شان دار طریقے سے
سیلبریشن کی ہم نے۔ میں تو تمہیں بھی کہہ رہی
تھی ساتھ چلو، سب پوچھ رہے تھے ایشال کیوں نہیں
آئی۔“

”ہم دونوں ایک ساتھ اکیڈمی سے چھٹی بھی تو
نہیں کر سکتے تھے۔ بس اسی لیے۔“
”اور یہ تمہیں ہوا کیا ہے۔“ سحر نے جانچتی نظروں
سے اسے دیکھا۔

”کچھ نہیں، کیا ہونا ہے۔“ ایشال نے چائے کپ
میں اٹیڈ لی۔

”عجیب سی لگ رہی ہو۔ آٹھوں میں چمک نہ

چہرے پر رونق اور اس قدر سنجیدگی۔ خیر تو ہے کہیں جبران بھائی سے جھگڑا تو نہیں ہوا۔ ”سحر کے لہجے میں شرارت تھی۔

”نہیں تو۔“ ایشال سٹپائی۔

”کوئی بات تو ہے۔“ سحر ابھی۔

”کہہ تو رہی ہوں ایسی کوئی بات نہیں۔ وہم ہے تمہارا۔“ ایشال چائے کے کپ اٹھا کر لاؤنج کی طرف چل پڑی۔

سحر بھی کندھے اچکاتی اس کے پیچھے ہولی۔

”اور تمہارے اس کزن کو کیا ہوا ہے۔ جب سے اس نے ہماری باتیں سنی تھیں نظریں جھکائے سلام کرتا ہوا چلا جاتا تھا مگر آج راستے میں آنا سامنا ہوا تو عجیب سا ہی لگا۔ بارہ بجے ہوئے تھے۔ پہلے کی طرح سلام بھی نہیں کیا۔ اجنبی نظروں سے دیکھ کر چلا گیا۔“

”پتا نہیں۔“ ایشال نے نظریں چرائیں۔

”ایشال اس دن میں کچھ زیادہ تو نہیں بول گئی تھی۔ دیکھی سالگا مجھے وہ عجیب الزام دیتی ہوئی سی نظریں تھیں یا شاید کچھ اور۔ اور اس تھا شاید۔“ سحر نے پرسوج انداز میں کہا۔

”تمہیں اس کی فکر کیوں ہو رہی ہے۔“ ایشال نے چائے کا کپ لیوں سے لگاتے ہوئے غور سے اسے دیکھا۔

”فکر نہیں ہو رہی جس ایسے ہی خیال سا آیا کہ شاید میں کچھ زیادہ بول گئی تھی۔ چلو چھوٹو ماہی نے تمہارے لیے گفٹ بھیجے ہیں وہ دکھاتی ہوں۔“ سحر سر جھکاتی ہوئی ایشال کے کمرے میں گئی جہاں وہ شاہرہ رکھ کر آئی تھی۔

”پی انمو آپی کا فون تھا کہہ رہی تھیں جلد چکر لگائیں گی۔“ ساجدہ بیگم نے محض سر ہلایا۔ وہ سالن کے لیے بھنڈی کٹ رہی تھیں۔ ایشال نے ادھر ادھر دیکھا۔

”طالب علی گئیں؟“

”ہوں پریشان تھی۔ بس کیا کریں پریشانی تو ہر بندے کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ مسئلے زندگی کے ساتھ ہی چلتے ہیں۔“

”کیسا مسئلہ؟“ ایشال چونکی۔

”سحر کے رشتے کے لیے فکر مند ہے۔ کوئی مناسب رشتہ نہیں آ رہا۔ ایک دو آئے ہیں مگر کوئی بھی تسلی بخش نہیں لگا۔ اللہ مقدر اچھے کرے اتنی اچھی بچی ہے کوئی نیک سبب ہو۔“ ایشال چپ چاپ قریبی صوفے پر بیٹھ گئی۔

”میرا بڑا دل تھا تمہاری پچھو“ سحر کے لیے مانگ لیتیں۔ گھر کا وہ کھا بھالا بچہ ہے۔ اب تو خیر سے اچھی نوکری کر رہا ہے۔ اچھا جوڑ ہوتا۔ لیکن آپا اتنی پرانی بات دل سے لگا کر بیٹھی ہیں۔ مسرت کے ہاں تو بھی نہیں کرس گی۔“ ایشال کو دل کا بوجھ بڑھتا محسوس ہوا

”کیا کہہ سکتے ہیں۔ بس اللہ بہتر کرے۔“ ساجدہ بیگم کی بات جاری تھی۔

وہ چکر لگاتے ہوئے مختلف شاپ کو دیکھتی اپنی مطلوبہ چیز تلاش کر رہی تھی۔ وہ چمکی بار اتنے بڑے سپراسٹور میں آئی تھی۔ یہاں کھانے پینے کی چیزوں سے لے کر برتنوں اور ڈیکوریشن بس سب جیسی اشیاء کی بھی بہت زیادہ ورائٹی موجود تھی۔ نیا کھانا اس لیے پہلے چکر نہ لگا تھا۔ آج بھی وہ درزی کو کپڑے دے کر آ رہی تھی جب راستے میں بورڈ دیکھ کر اندر چلی آئی۔ وہ مرتبہ گھوم پھر کر ایک ہی جگہ پہنچ گئی۔ ابھی وہ مڑی ہی تھی کہ بائیں طرف سے آتی آواز پر رک گئی۔ پیچھے ایک درمیانی عمر کی خاتون نے اسے مخاطب کیا تھا۔

”آپ کچھ ڈھونڈ رہی ہیں کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔ اصل میں آپ دو سری دفعہ اس طرف آئیں تو لگا شاید آپ کو اپنا مطلوبہ کارڈ ڈھونڈنے میں دشواری ہو رہی ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

”جی مجھے رازا ساس چاہیے وہی تلاش کر رہی ہوں۔ آپ بتا سکتی ہیں وہ کارنٹر کس طرف ہے۔“ سحر نے بھی جلدی سے اپنا مسئلہ بتایا پہلے ہی دیر ہو رہی تھی مغرب ہو چکی تھی اور اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ ایشال کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے اسے اکیلے ہی آنا پڑا۔

”آئیے میں لے چلتی ہوں۔“ وہ خوش اخلاقی سے کہتی اپنی نرالی دھکیلنے لگی۔ سحر بھی اس کے پیچھے ہوئی۔ سحر اس کے ساتھ چلتی رہی۔ اس کی تیز رفتاری سے تو یہی لگ رہا تھا کہ وہ یہاں آتی رہتی ہے۔ کافی آگے جا کر وہ رکی تھی۔

”یہاں پر رازا ساس بھی مل جائے گا اور دوسری ساسز باونیز چٹنیاں وغیرہ بھی۔“

”آپ کا بہت شکریہ۔“ سحر اس کی مشکور ہوئی۔

”کوئی بات نہیں۔ یہاں پہلی بار آئی ہو۔“

”جی گزر رہی تھی تو سوچا رازا ساس بھی لے لوں اور اندر سے دیکھ بھی لوں۔“ سحر کو وہ خوش اخلاق سی خاتون بہت اچھی لگی تھیں۔ وہ سحر کے ساتھ مختلف سوسز دیکھتی رہیں پھر موبائل پر کسی سے بات کرنے لگیں۔ تو سحر تھوڑا آگے چلی گئی۔ بات ختم کر کے وہ سحر کے قریب آئیں۔

”سحر آپ ایک فیور دوگی مجھے۔“ سحر نے سواہی نظروں سے انہیں دیکھا۔ ”میں بل پے کر کے چیریں وہاں رکھوا جاتی ہوں۔ تم آدھے گھنٹے بعد لے کر باہر آجانا میں تم سے دکان کے باہر سے لے لوں گی۔“

”مجھے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔ آپ رکھوا دیں کاؤنٹر کے پاس۔“ سحر نے معذرت کی وہ لیٹ ہو چکی تھی اور تھی بھی اکیلی۔

”اصل میں میرے شوہر ساتھ والی دکان میں بلارہے ہیں وہاں سے ضروری کچھ لینا ہے در بھی ہو رہی ہے۔ بیس منٹ تو میرے کاؤنٹر پر ہی لگ جائیں گے پھر وقت بھی کم ہے میں باہر تم سے لے لوں گی۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد تم لے کر باہر آجانا۔ پلیز یہ چھوٹا سا فیور دے دو ہم تمہیں بھی ڈراپ کر دیں

”لو کے بس لیٹ نہ کیجئے گا۔“

”فکر نہ کرو میں لیٹ نہیں ہوں گی تھینک یو سحر۔ وہ سامنے ہی کاؤنٹر ہے۔ میں تمہارا انتہیں بتا دیتی ہوں۔“ وہ خوش ہوتی ہوئی کاؤنٹر کی طرف چلی گئی جہاں بل ادا کرنا تھا۔ سحر رازا ساس تو لے چکی تھی۔ اب مجبوراً چٹنیاں وغیرہ دیکھنے لگی۔ ساتھ زوسیہ پر نظر ڈال لیتی جو کاؤنٹر پر کھڑی تھی اور مسکرا کر اس پر بھی نظر ڈال لیتی تھی۔ پھر وہ کاؤنٹر والے بندے سے بات کرتی رہی پھر اس کی طرف اشارہ بھی کیا۔ کاؤنٹر والے کے دیکھنے پر سحر نے بھی زوسیہ کو اوکے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد سیلز گرل اس کے پاس آئی۔

”میم اپنا آئی ڈی کارڈ مجھے دے دیں میں کاؤنٹر پر رکھوا دیتی ہوں آپ جاتے ہوئے لے لیجئے گا۔“

”آئی ڈی کارڈ۔“ سحر حیران ہوئی۔

”دیکھیں میم ایسا ہوتا نہیں ہے مگر آپ کو فوراً دے رہے ہیں۔ آپ آئی ڈی کارڈ رکھوا دیں گی تو ہمیں تسلی رہے گی۔“ سحر نے ایک نظر زوسیہ کو دیکھا جو ابھی تک وہیں کھڑی تھی پھر آئی ڈی کارڈ نکال کر سیلز گرل کو تھما دیا۔ سحر کلائی پر بندھی کھڑی دیکھ کر ایک بار پھر شفٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ آخر وقت بھی تو گزارنا تھا۔ سحر نے موبائل نکال کر دیکھا مگر بیٹھی حتم ہونے کی وجہ سے موبائل بند ہو چکا تھا۔ امی ابو کا سوچ کر اسے پریشانی ہو رہی تھی۔ پتا نہیں ان کا پریشانی سے کیا حال ہو گا۔ درزی کے ہاں سے نکلے اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب تو وہ یہاں آنے پر ہی بچھتا رہی تھی۔ ٹائم پورا ہوتے ہی وہ کاؤنٹر کی طرف آئی۔

”وہ سلمان اور آئی ڈی کارڈ دے دیں۔“ اپنا بل پے کر کے سحر نے کہا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے غور سے اسے دیکھا۔ آئی ڈی کارڈ آپ کو اسی صورت میں ملے گا جب آپ پہلے والا بل پے کریں گی۔

”کون سا بل۔“ سحر چونکی اس نے سحر کو بل تھمایا۔ ”میں اپنا بل پے کر چکی ہوں۔ میں مس زوسیہ کے

مسلمان کی بات کر رہی ہوں جو وہ چھوڑ کر گئی تھیں۔“

”مسلمان وہ ساتھ لے گئی ہیں اسی لیے تو آپ کا آئی ڈی کارڈ رکھنا رٹاؤ کہہ رہی تھیں ان کے پاس رقم کم ہے اور مسلمان کسی کو پہنچاتا ہے۔ میری بہن کا آئی ڈی کارڈ رکھ لیں آپ دونوں بہنیں ہیں۔ آپ اپنی بہن کو فون کریں وہ کسی بندے کے ہاتھ پیسے بھجوانے کا کہہ رہی تھیں۔“ اس کی بات سنتے ہی سحر کا اطمینان رخصت ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ یہ سب کیا ہو گیا تھا۔ تھوک نپٹتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑا مل دیکھا۔ چالیس ہزار کابل دیکھ کر اس کے رہے سے اوسان بھی خطا ہو گئے۔

”دیکھیں یہ میرا بل نہیں ہے ان خاتون کا ہے اور میں ان کی بہن نہیں ہوں وہ یہیں مجھے ملی تھیں اور انہوں نے کہا تھا کہ میں ان کا سامان پک کر لوں۔“ سحر نے بمشکل انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ اب بولے پتا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ بے وقوفی تو وہ کر رہی چکی تھی۔ اس شخص کے تاثرات لمحے میں بدلے۔

”مس یہ ہمارا مسئلہ نہیں آپ اپنا بل ادا کریں بات ختم۔ بھلا ہم کیسے مان لیں۔ بغیر کسی جان پہچان کے آپ نے اپنا آئی ڈی کارڈ رکھوا دیا۔ یہ فاول گیم ہمارے ساتھ نہ کھیلیں۔“

”میں سچ بول رہی ہوں میں انہیں نہیں جانتی۔“

”آپ کیا سمجھ رہی ہیں ان ڈراموں سے ہم اپنے پیسے چھوڑ دیں گے آپ یا تو بل ادا کریں یا ہمارا سامان واپس کریں ورنہ ہم ابھی پولیس کو بلا لیں گے۔“

”میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“ سحر روہانسی ہوئی۔

پولیس کا نام سن کر رنگ اڑ گیا تھا۔

”بل ادا کریں اور جائیں۔“ اس کے چہرے پر سختی آگئی۔ پریشانی سے اس کا دماغ مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ موبائل پہلے ہی بند تھا۔ کسی اور کامو بائل نمبر یاد نہیں تھا۔ ایک گھر کا لینڈ لائن نمبر یاد تھا جس کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ آج کل خراب تھا۔

”یہ فون بڑا ہے اگر آپ رقم منگوانا چاہتی ہیں تو کر لیں۔“ قریب کھڑی سیلز گرل نے اسے مخاطب کیا۔

کیا سحر نے پریشانی سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ سب لوگ اپنی اپنی خریداری میں مصروف تھے۔ بچے خوشی سے چکر لگا رہے تھے۔ اجنبی چہروں کو دیکھ کر اسے رونا آنے لگا۔ دل ہی دل میں اللہ سے فریاد کی کہ وہ اس مشکل کو ٹالے اور بے شک اللہ مدد کرنے والا مہربان ہے۔ ایک شناسا چہرے کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔

”احمر۔“ سحر بے اختیار اسے پکار بیٹھی مگر فاصلہ ہونے کی وجہ سے آواز اس تک پہنچ نہیں سکی تھی۔ ”وہ میرے رشتہ دار ہیں انہیں بلا دیں پلیز!“ سحر نے سیلز گرل کو اشارے سے احمر کا بتایا۔ اسے پتا تھا کہ کاؤنٹر والا بندہ تو اسے یہاں سے ملنے بھی نہیں دے گا۔ سیلز گرل سر ہلاتی جلدی سے احمر کے پیچھے گئی جو آگے جا رہا تھا۔ وہ اب احمر کو روک چکی تھی۔ اس نے کچھ کہا تھا جس پر احمر نے چونک کر اس طرف دیکھا پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا سحر کی طرف آ رہا تھا۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر سحر کو حوصلہ ہوا۔

”سحر آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ احمر نے حیرت سے اسے دیکھا جو رات کے اس وقت یہاں اکیلی کھڑی تھی۔ چہرے پر پریشانی بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

”وہ میں اکیلی ہوں یہاں ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“

”کیا ہوا ہے کھل کر بتائیں۔“ احمر اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سحر نے جلدی جلدی اسے ساری بات بتائی۔ احمر سنجیدگی سے سنتا رہا۔

”اچھا! میں بات کرتا ہوں آپ پریشان نہ ہوں۔“ اسے تسلی دیتا وہ کاؤنٹر والے شخص سے بات کرنے کے لیے آگے بڑھا۔

”احمر۔“ اپنے پیچھے آواز سن کر مڑا۔ ”کہاں رہ گئے ہو میں آگے جا رہا تھا مڑا تو تم غائب تھے۔“

”طاہریار ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“ احمر نے مختصراً اسے ساری صورت حال سمجھائی۔ ساری بات سن کر وہ احمر کے ساتھ کاؤنٹر والے شخص کے پاس آیا۔ دونوں نے اسے بات سمجھانے کی کوشش کی۔ سحر

خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ سحر کے آنے سے اسے کانٹا ڈھارس ملی تھی۔

”گر یہ سچ ہے تب بھی ہمارا نقصان کون بھرے گا۔ ہم بھی آگے جواب دہ ہیں۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن اس وقت ان صاحبہ کو بیچ میں ڈالنے کا کیا فائدہ۔ میرا کارڈ رکھ لیں آپ۔ میں اے ایس بی آفیسر ہوں۔ میں خود اس کی انوسٹمنٹیشن کرواؤں گا۔“ طاہر کے بات مکمل کرتے ہی احمر بولا۔

”ورنہ ہم آپ کا نقصان ادا کریں گے آپ فکر نہ کریں۔“ دونوں بات مکمل کر کے سحر کی طرف آئے تھے۔ احمر نے آئی ڈی کارڈ اس کی طرف بڑھایا جسے اس نے خاموشی سے تمام لیا۔ ”مس آج تو آپ خوش قسمتی سے بیچ گئیں مگر آئندہ ایسی غلطی مت کیجئے گا۔“ طاہر کے کہنے پر سحر شرمندہ ہوئی۔ احمر نے اپنی مسکراہٹ دہائی۔ وہ اسے مزید شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سحر نے محض سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا ورنہ دل تو چاہ رہا تھا فوراً ”غائب ہو جائے۔“

”احمر چلو تم اپنی کرن کو لے جاؤ پھر ملتے ہیں۔“ طاہر الوداعی کلمات کہہ کر چلا گیا۔ وہ دونوں بھی خاموشی سے چلتے ہوئے دکان سے باہر نکل آئے۔



رات کے نو بج رہے تھے۔ سڑک پر ٹریفک معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ چاروں طرف جگمگاتی روشنیاں تاریکی کو لت دے رہی تھیں۔ سحر کو فٹ پاتھ پر رکتے دیکھ کر احمر اس کی طرف مڑا۔

”تھینک یو آپ نے میری بہت مدد کی۔ آپ نہ آتے تو پتا نہیں میں اس مشکل سے کیسے نکل پاتی۔“ سحر حقیقتاً اس کی مشکور تھی۔ احمر اس کی بات سننے ہوئے خاموش کھڑا تھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے نظریں جھکائے سنجیدہ چہرے کے ساتھ سحر کے چپ ہونے پر اس نے لب کشائی کی۔

”آپ کی مشکلی کب ہے؟“ اتنے غیر متوقع سوال پر

سحر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ جواب سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”جی! اسے لگا شاید سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔“ سنا ہے آپ کی مشکلی ہو رہی ہے جس کو آپ پسند کرتی ہیں اس کے ساتھ۔“

”کیسی کوئی بات نہیں، میری کوئی مشکلی ونگنی نہیں ہو رہی۔“ سحر کو کہنا ہی پڑا۔ وہ تو اس کے سوال پر ہی حیران تھی۔

”سیوسلی۔ آپ مذاق تو نہیں کر رہیں؟“ اب حیران ہونے کی باری احمر کی تھی۔ مگر اس حیرانی میں بے یقینی بھی تھی۔

”میں آپ سے مذاق کیوں کروں گی؟“

”آپ کسی کو پسند نہیں کرتیں؟“ احمر نے کنفرم کر لیتا چلا۔

”جی نہیں۔“ سحر نے بے چینی سے ارد گرد دیکھا بھلا احمر اس سے ایسے سوال کیوں کر رہا تھا۔

”آپ مجھ سے مشکلی کریں گی؟“ بے اختیار ی میں اس کے منہ سے نکلا تھا۔ سحر نے بے یقینی سے اسے دیکھا خوشی سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ احمر کو اپنے فقرے کے غلط ہونے کا احساس ہوا۔

”میرا مطلب ہے شادی کریں گی مجھ سے؟ امی کو آپ کے گھر بھیجوں۔“ سحر نے غور سے اسے دیکھا۔ اچھا خاصا پنڈ سم تھا وہ۔ اور اس کے ساتھ کا خواہش مند بھی۔ اپنی خوب صورت آنکھوں میں محبت سمونے والے مسکرت نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سحر کی رضامندی اس کے لیے اتنی اہمیت رکھتی تھی۔ سحر کے دل کی دھڑکن مس ہوئی۔

”سحر آپ کچھ کہیں گی نہیں۔ کیا میں آپ کو پسند نہیں۔“ اس کے چہرے کا ماند پڑنا سحر کو اچھا نہیں لگا تھا۔

”کیا سڑک پر کھڑے کھڑے ہی پروپوز کریں گے؟“ سحر کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ دیکھ کر وہ حیرت و خوشی کی ملی جلی کیفیت کا شکار ہوا تھا۔

”آپ اجازت دیں گی تو کہیں پہ بھی پروپوز کروں

گلابات تو آپ کے سامنے کی ہے۔ ”گلاب کی بار احمد
بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔
”ویسے ایک بات کہوں۔“ سحر نے سوالیہ نظروں
سے اسے دیکھا۔ ”میں نے سنا تھا بلکہ میرا ذاتی خیال
بھی یہی تھا کہ آپ کافی سمجھ دار ہیں مگر آج آپ نے
خاصی معصومیت کا ثبوت دیا ہے۔“ احمد کے لہجے میں
چھپی شرارت دیکھ کر سحر شرمندگی سے سرخ ہوئی۔
احمد نے بڑے شوق سے اس کے رنگ بدلتے چہرے کو
دیکھا، سحر نے گلا صاف کیا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اسے آنا پڑا تھا، یہاں آکر وہ
خالہ اور امی کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ مگر کچھ دیر بعد ہی سحر
آگئی۔ ساجدہ بیگم سے مل کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے
کمرے میں لے گئی۔ ایشل مجبوراً ”آگئی اور کوئی چارہ
بھی نہیں تھا۔ سحر کے چہرے پر کسی قسم کی خفگی کا شائبہ
تک نہیں تھا۔ وہ خوش تھی یہ کوئی بھی اسے دیکھ کر بتا
سکتا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ سحر نے اسے اپنی طرف
دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں حیران ہو رہی ہوں اتنی جلدی یہ سب ہوا
کیسے۔“ سحر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔
”بس مجھے بھی پتا نہیں چلا چکی بجائے ہو گیا ہو۔
جیسے۔ ہمارا نصیب ایک ساتھ تھا تب ہی تو اچانک
سے فیصلہ ہو گیا۔“ پھر سحر اسے اس دن کا سارا واقعہ
سناتی چلی گئی کہ کس طرح احمد نے اس کی مدد کی۔ ایشل
کے جھوٹ اور احمد کے منگنی والے سوال کو گول
کر گئی۔

”احمد نے مجھے پروپوز کیا تو میں نے سوچا بندہ برا
نہیں ہے۔ یہ سمجھو کہ اچانک سے دل کو اچھا لگ
گیا۔“ سحر جھینپ کر بولی۔ اس کے چہرے پر بڑے
خوب صورت رنگ تھے۔ ایشل نے نظریں
چراغیں۔ شرمندگی سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ سمجھ
میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ سحر کو بھلے سے احمد نے
کچھ نہ بتایا ہو مگر وہ خود تو اس کے جھوٹ تک پہنچ گیا
ہو گا۔ تب ہی تو بات یہاں تک پہنچی تھی۔ کچھ دیر میں
پھپھو لوگ آگئے کھانے کے بعد بیٹوں نے دعا کرنے
کے ساتھ ہی نکاح کی تاریخ بھی مقرر کر دی۔ ایشل

”آپ نے بتایا نہیں کس نے بتایا میری منگنی
کا۔“ سحر کو بروقت یاد آیا۔
”ایشل نے کہا تھا۔ مگر وہ ایسے کیوں کہے گی؟
مطلب غلط بیانی کیوں کی اس نے جبکہ وہ تو میرے
جذبات سے بھی واقف تھی۔“ سحر ہنسی۔
”ایشل نے۔“ احمد کے حیرت سے دیکھنے پر
گڑبڑائی۔

”چھا!۔۔۔ میں سمجھ گئی۔ اصل میں میں نے
بذائقہ کیا تھا اس سے اور وہ کچھ نیچھی اور کوئی بات
نہیں ہے۔“ سحر ہنسی مسکرائی۔

”متھینک گاڈ! یہ خبر سننے کے بعد سے میرا موڈ آف
تھا۔“ احمد مطمئن ہوا۔ ”چلیں میں آپ کو گھر چھوڑ
دوں۔“ سحر سر ہلائی اس کے ساتھ ہوئی۔ احمد اسے اپنی
گاڑی کے متعلق بتا رہا تھا جو حال میں ہی کمپنی کی طرف
سے ملی تھی۔ مگر سحر کا دھیان ابھی تک ایشل کے
جھوٹ میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ ایشل کو جھوٹ بولنے کی کیا
ضرورت تھی؟

احمد اور سحر کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ یہ خبر جب سے
امی نے سنی تھی۔ خوشی سے پھولی نہیں سارہی تھیں
اور ایشل شاک کی کیفیت سے نکل نہیں پارہی تھی۔
کل تک اسے اپنا جھوٹ سینے میں اٹکے بوجھ کی طرح
محسوس ہو رہا تھا۔ جبکہ اب یہ سوچ سوچ کر دل غ کی
رگیں پھٹ رہی تھیں کہ آخر یہ سب ہو ہیے گیا۔

”کوئی مسئلہ نہیں یار۔“ احمر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ دونوں باتیں کرتے کچن سے چلے گئے۔



وہ اپنے آپ کو شرمندگی کی اچھا گہرائیوں میں گہرا محسوس کر رہی تھی۔ جب سے واپس آئی تھی کسی پل چین نہیں تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھرنی جارہی تھیں۔ جنہیں وہ بے دردی سے ہاتھ کی پشت سے صاف کرتی جاتی۔

”یہ میں نے کیا کر دیا۔“ کمرے میں چکر لگا کر تھک گئی تو بستر پر بیٹھ کر سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ سحر میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔ وہ تو میری بچپن کی دوست ہے میری بہن ہے پھر اپنی سب سے پیاری دوست کے ساتھ کیوں کیا میں نے ایسا۔ اور اس نے کوئی شکوہ تک نہیں کیا۔ کچھ تو کہتی برا بھلا ہی کہہ دیتی۔ لڑائی کرتی سوال کرتی۔ الٹا اس نے کچھ جتایا تک نہیں یہ سب سوچیں اس کا دلغ ماؤف کر رہی تھیں۔ مسلسل بجتے موبائل نے اسے سوچوں سے نکالا۔ اسکرین پر جبران کا نام جگمگا رہا تھا۔ ایشل نے نہ چاہتے ہوئے بھی فون اٹھالیا۔

”کیا ہو رہا تھا۔ جناب! اکیلے اکیلے ہی تم لوگ دے گئے خیر کر آئے۔“ جبران کی فریش سی آواز آئی تھی۔

”چانک ہو گیا سب۔“ ایشل نے لب کھولے۔
”احمر سے بات ہوئی بہت خوش تھا۔ نکاح بھی طے کر دیا امی ابونے۔ بہت فاسٹ جارہے ہو سب۔“
”ہوں۔“

”ایک میں بے چارہ دور بیٹھا ہوں۔ تم لوگوں کی تصویروں کا انتظار کر رہا تھا۔ احمر نے تو بس ابو لوگوں کی بھیج دی ہیں۔ میں اسے کہہ رہا تھا ایشل کی اور امی کی بھی بھیج دیتے۔“ جبران اپنی کہے جارہا تھا۔ ایشل محض ہوں ہاں کرتی رہی۔ ”اپنی تصویر ہی بھیج دو۔“ جبران نے فرمائش کی۔

”نہیں یار۔ خیال ہی نہیں آیا۔“ ایشل نے دیکھتے

چائے بنا رہی تھی۔ سحر پھپھو کے پاس بیٹھی تھی۔
”میں کپ سیٹ کر کے وہ مڑی احمر کو کچن میں آتے دیکھ کر اس کے ہاتھ ساکن ہوئے۔ آج تو اس کی جھب ہی نرالی تھی۔ آنکھوں میں چمک اور چہرے کی مسکراہٹ اس کی خوشی صاف ظاہر تھی۔“

”تم کہاں چھپی بیٹھی ہو تمہیں تو سب سے پہلے مجھے مبارک باد دینی چاہیے تھی۔ میں فون کا ہی انتظار کرتا رہا۔ جانتا تھا سب سے زیادہ تم اور جبران خوش ہو گے۔ آخر میرے ہم راز جو ہو۔“ احمر نے مزے سے گلاب جامن پلیٹ سے اٹھایا جو ابھی ایشل نے نکالے تھے۔ اس کے لہجے میں کسی قسم کا طنز نہیں تھا۔ ایشل کو حیرت ہوئی۔

”بہت مبارک ہو۔ میں مل کر ہی وش کرنا چاہتی تھی۔“ ایشل بڑی مشکل سے مسکراہٹ چہرے پر لائی ورنہ تو شرمندگی کے مارے اس کا سامنا کرنا ہی سب سے مشکل لگ رہا تھا۔

”دیکھ لو! پھر میرے سچے جذبے رنگ لے آئے ورنہ تم نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔ شکر ہے اس دن سحر سے ملاقات ہو گئی۔ اور میں نے خود ہی اس کی منگنی کا پوچھ لیا۔ مگر اس نے کہا وہ بات تو مذاق میں کہہ دی تھی تم سے۔ میں بھی حیران تھا بھلا تم میرے ساتھ ایسا مذاق کیوں کرو گی۔“

”سحر نے تم سے کہا کہ وہ مذاق کر رہی تھی۔“ ایشل بے یقین تھی۔

”ہوں۔ تمہیں بتایا ہی ہو گا اس نے۔“
”ہاں پوچھا تھا میں نے اس سے۔ یہ فرحان کہاں رہ گیا نرے لے جاتا۔“

”باہر گیا تھا کوئی بات نہیں میں لے جاتا ہوں۔“ ایشل نے نرے اسے تھمائی۔ اس کے چہرے کے تاثرات عجیب سے ہو رہے تھے۔ لیکن احمر کچھ محسوس نہ کر سکا وہ اپنی خوشی میں مست تھا۔ اسی وقت فرحان کچن میں آیا۔

”احمر بھائی آپ رہنے دیں میں لے کر چلتا ہوں۔“ فرحان نے احمر کے ہاتھ سے نرے لے لی۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار جہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہوئے سر پر ہاتھ رکھا۔
 ”یہ کیسے ہو گیا۔ تم نے اور تصویر نہیں لی۔ خیریت
 تو ہے۔“ جبران نے اسے چھیڑا۔ ”احمر نے تو اپنی بھی
 چار پکچریں لی ہیں۔“

”تم یہاں بیٹھی ہو تیار کیوں نہیں ہوئیں۔ صبح سے
 سحر کے کئی فون آچکے ہیں۔ کل اس کا نکاح ہے اور تم
 یہاں بیٹھی ہو۔ ناراض ہو رہی تھی سحر۔ شام تک
 فرح اور فاریہ بھی پہنچ جائیں گی۔“ نمروہ آپلی اسے بستر پر
 لیٹے دیکھ کر بولیں ”دونوں ہو گئے تھے انہیں میکے آئے
 ہوئے۔“

”تمھوڑی دیر میں اٹھتی ہوں۔“ ایشال ٹیکے سے
 ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

”امی بتا رہی ہیں تم نے کوئی جوڑا بھی نہیں لیا نکاح
 کے لیے امی نے میے دیے ہیں کہ شام کو جا کر لے
 آؤ۔“ نمروہ آپلی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھیں۔

”واپس کر دیں امی کو۔“
 ”کیوں؟“ اچھا اب سبھی کل تنخواہ جو آئی ہے
 تمہاری۔“

نہیں ایسی بات نہیں ہے، پہلے ہی اتنے سوٹ
 بڑے ہیں۔ میرے اپنے نکاح کا جوڑا ہے۔ ابھی گلشن
 آنٹی کی بیٹی کی شادی میں بنوایا تھا۔ وہ سوٹ بھی ہے اور
 بھی ہیں بہت سے۔“ ایشال نے عام سے لہجے میں
 جواب دیا۔ نمروہ آپلی نے حیرت سے اپنی چھوٹی بہن کو
 دیکھا جو شاپنگ کی شوقین تھی۔ بچپن سے شوق تھا
 اسے ہر فنکشن پر نئے کپڑے جوئے چاہیے ہوتے
 تھے جس برامی سے ہمیشہ ڈانٹ پڑا کرتی تھی۔

”منسورج کہاں سے نکلا ہے آج۔ خیر تو ہے کیا ہوا۔
 کل سے دیکھ رہی ہوں منہ فچھلا رکھا ہے۔ چلو شاپاش
 جتاؤ جلدی سے کیا بات ہے۔“ نمروہ آپلی حیران تھیں۔
 اسی لیے اسے اکسایا تاکہ وہ اپنی پریشانی بتائے۔
 ”بات تو کوئی نہیں ہے بس مجھے لگتا ہے میں بہت
 فضول خرچ ہو گئی ہوں۔“

”اور یہ کس نے کہا؟“ وہ ٹھنکیں۔

”ہوں۔“ ایشال اتنا ہی کہہ سکی۔
 ”کیا بات ہے ایشال۔ تمہاری آواز بھی عجیب سی
 ہو رہی ہے پہلے تو میں اپنا وہم سمجھا تھا پر اب لگ رہا
 ہے کوئی بات ہے ضرور۔“
 ”کوئی بات نہیں ہے۔“ ایشال کی آواز میں نمی
 کھلی۔

”تم رو رہی ہو۔ کیا ہوا ہے۔“ جبران کو تشویش
 ہوئی۔ ایشال پہلے ہی اب سیٹ تھی۔ جبران کی ہمدردی
 پا کر سب کچھ بتاتی چلی گئی۔ سب کہہ دینے کے بعد
 اسے اپنا دل ہلکا ہوتا محسوس ہوا تھا۔ اپنی غلطی کا
 اعتراف بھی کبھی کبھی انسان کے دل کے بوجھ کو کم
 کر دیتا ہے۔ دوسری طرف جبران بالکل خاموش تھا۔
 ”جبران۔“ ایشال نے دھیرے سے پکارا۔

”تم اتنی خود غرض کیسے ہو سکتی ہو سحر تمہاری بچپن
 کی دوست ہے۔ تم کیسے اس سے عناد پال سکتی ہو۔ تم تو
 کہتی تھیں تمہاری بہن ہے سحر۔ اور امی کو اگر اس کی
 خوبیاں پسند آئیں تو اس میں پراگتے والی کیا بات ہے
 اور احمر۔ تم اچھی طرح جانتی تھیں وہ کتنا سنجیدہ تھا۔
 سحر کے لیے کچھ بھی۔ وہ کس قدر اب سیٹ رہا ہے۔
 میں جانتا ہوں۔ وہ میرا بھائی ہے ایشال۔ یہی سوچ لیا
 ہوتا۔“ جبران بکڑا تھا۔

”میں نے پلاننگ سے نہیں کہا کچھ بھی بتا ہی نہیں
 چلا سب غلط ہو گیا۔“ ایشال نے بمشکل اپنی صفائی
 دینے کی کوشش کی۔

”خود سے کچھ نہیں ہوتا کیا جاتا ہے۔ تم نے ٹھیک
 کرنے کی کوشش بھی تو نہیں کی۔ اس دن اگر احمر سحر
 سے نہ ملتا تو تم کبھی یہ اعتراف نہ کرتیں۔ اور احمر وہ تمام
 عمر نامراد ہی رہتا۔“ ایشال خاموش ہی رہی، کہنے کے
 لیے کچھ بھانپ رہی تھی۔ ”بہت مایوس کیا تم
 نے مجھے لگتا تھا مجھ سے جڑا ہر رشتہ تمہیں عزیز

”کفرم نہیں ہے۔“ ایشال نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”میری بات نہیں ہوئی۔“ اب وہ کیا بتاتی کہ یہ
 ایک اور ہی کہانی تھی۔



”فزع اور فار یہ خود بھی کھانے بیٹھ گئی ہوں گی۔ اتنا
 نہیں ہوا کہ ہمیں بھی پوچھ لیتیں۔“
 ”بھوک لگی ہے تو میں لے آتی ہوں۔“ ایشال نے
 دلہن بنی سحر سے پوچھا۔ سحر نے ڈل گولڈ کے ساتھ ریڈ
 کے خوب صورت کامبینیشن کاغذ ارا پہنا ہوا تھا۔
 میک اپ نے خوب صورت نقوش کو اور بھی نکھار دیا
 تھا۔

”نہیں رہنے دو بعد میں ہم دونوں چیخ کر کے
 کھائیں گے اور یہ تم مجھے گھور کیوں رہی ہو۔ میک
 اپ زیادہ تو نہیں ہو گیا۔ منع بھی کیا تھا ہیوی میک اپ
 نہ کرے۔“ ایشال کو اپنی طرف دیکھتے پا کر سحر کو تشویش
 ہوئی۔ اسے میک اپ کی ہی فکر لگی ہوئی تھی۔ نکاح
 سے پہلے تک مسلسل یہی پوچھتی رہی کہ کہیں اوور
 تو نہیں لگ رہی۔ نکاح کی تقریب گھر میں منعقد کی گئی
 تھی۔ چند قریبی لوگ ہی مدعو تھے۔ نکاح کی رسم فوراً
 ہی ادا کر دی گئی تھی۔ پھر سحر اور احمر کو بٹھا کر تصاویر لی
 گئیں اور اب کھانا کھلایا جا رہا تھا۔

”گھور نہیں رہی دیکھ رہی ہوں۔ تم بہت پیاری
 لگ رہی ہو ماشاء اللہ۔“ ایشال نے اپنی تھوڑی کے نیچے
 ہاتھ رکھ کر خوراسے دیکھا سحر جھپنی

”تم بھی کم نہیں لگ رہیں اور جبران بھائی بھی
 تو آئے ہیں ان کی نظریں تو تمہارا ہی طواف کر رہی
 ہوں گی۔“ سحر نے بھی اسے چھیڑا ایشال نے لب بھینچ
 لیے نکاح سے ایک دن پہلے رات کی فلائٹ سے جبران
 پہنچا تھا۔ ایشال کی اس سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔
 بلکہ آج محض اسے دور سے دیکھا تھا۔ نہ اس نے
 ایشال سے کوئی بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک بار
 سنجیدہ سی نظر ڈال کر نگاہ پھیری تھی۔ ایشال اس کے
 رویے سے بہت ہرٹ ہوئی تھی اور اس سے بات نہ

”کسی نے نہیں بس احساس ہوا ہے کہ انی ٹھیک
 کہتی ہیں پیسہ بڑی محنت سے کمایا جاتا ہے اس کی قدر
 کرنی چاہیے۔ اپنی پہلی تنخواہ میں ایک ہی دن میں
 خرچ کر آئی تھی۔ پھر جب امی کو ضرورت پڑی تو
 میرے پاس انہیں دینے کے لیے پیسے نہیں تھے اس
 دن بڑی شرمندگی ہوئی مجھے۔ یہ احساس بھی ہوا کہ اتنی
 محنت سے کمائے پیسے ہی اڑا دیے۔ ابو بھی تو کتنی
 محنت سے کماتے ہیں آئی۔

میں تو صرف تین گھنٹے پڑھاتی ہوں وہ تو سارا سارا
 دن ہمارے لیے محنت کرتے ہیں اور میں اتنے ہنگے
 ڈیزائن سوٹ لیتی رہی۔ امی کتنی مشکل سے بجٹ
 چلاتی ہیں وہ بھی میری وجہ سے۔ میں ہمیشہ برانڈڈ چیزوں
 کے شوق میں زیادہ پیسے مانگا کرتی تھی۔“ ایشال اداس
 ہوئی۔

”چھاتی اداس مت ہو دیر سے ہی سہی سمجھ تو
 آگئی نا۔ ویسے بھی اللہ تعالیٰ کو فضول خرچی پسند
 نہیں۔“ نرمو آپی نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے
 ساتھ لگایا۔

”اب میں نے فیصلہ کیا ہے کوئی برانڈڈ جوڑا نہیں
 لوں گی۔“ ایشال کی سوئی وہیں اٹکے دیکھ کر نرمو آپی کو
 ہنسی آئی۔

”چھاب قسم کھانے کی بھی ضرورت نہیں ہے
 کبھی عام کپڑے لیتے ہیں کبھی ڈیزائنڈ لیکن اس کا
 مطلب یہ نہیں کہ آٹھ دس ہزار والے جوڑے لیتا
 شروع کرو اپنی حیثیت کے مطابق لینے میں کوئی حرج
 نہیں ہے۔ میں بھی ایسے ہی کرتی ہوں۔ بس برانڈڈ
 کونشمیں نہیں ہونا چاہیے کہ یہ نہیں تو کوئی
 نہیں۔ میرا سوٹ دیکھو یہ عام سا ہے مگر میں نے خود
 ایسے ڈیزائن کیا ہے کہ اچھا لگ رہا ہے۔“ ایشال نے ان
 کے سوٹ کا جائزہ لیا۔

”واقعی آپی بہت اچھا لگ رہا ہے۔ آپ نے خود
 ڈیزائن کیا ہے۔“

”بالکل۔“ جلو اب موڈ ٹھیک کرو۔ اور ہاں اجبران
 سے بات ہوئی تمہاری۔ پچھو کہ وہی نہیں ان کا آنا

کرنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا۔ ایشال نے سر جھٹکا۔
”کیا ہوا؟“ سحر نے اس کے سنجیدہ تاثرات نوٹ کیے۔ ایشال اٹھ کر سحر کے قریب آئی۔

”سحر آئی ایم سوری۔“
”ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟“ سحر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھایا۔

”تمہیں معلوم ہے میں نے احمر سے جھوٹ بولا تمہارے متعلق۔“ ایشال نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ آج وہ فیصلہ کر کے آئی تھی کہ سحر کو سب بتا دے گی۔ اس کے بے چین دل کو اسی طرح قرار آ سکتا تھا۔ سحر نے گہرا سانس لیا بولی کچھ نہیں وہ ایشال کو سننا چاہتی تھی۔

”سچ تو یہ ہے کہ پچھو کے منہ سے اپنی پرائیاں اور تمہاری خوبیاں سن کر میں تم سے جھلس ہو گئی تھی۔ پچھو ہمیشہ مجھ سے پیار اور لاڈ سے ملتی تھیں۔ مگر اچانک سے ان کے رویے کا بدلہ لانا بھی اس لیے کہ وہ تم سے متاثر ہوئی تھیں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ ایسے میں احمر نے پچھو کے رشتہ لے کر جانے کا بتایا تو بس میرے منہ سے نکل گیا اور میں نے ایک کہانی بنا کر اسے سنادی۔ بعد میں بہت پچھتائی۔ دل پر بوجھ سا آ پڑا تھا۔“

پھر جب مجھے پتا چلا تم سب جانتی ہو اور مجھ سے نہ لڑیں نہ کوئی بات کی بلکہ یہ احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ تم سب جانتی ہو تو میں اس قدر شرمندہ ہوئی۔ دل چاہتا تھا زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں اور تو اور تم نے احمر کو بھی سچائی نہیں بتائی۔“ اس کی آنکھوں میں نمی جھلملاتے دیکھ کر سحر رول پڑی۔

”چھابس کرونا۔ اتنی پیاری لگ رہی ہو سارا میک اپ خراب کر لوگی۔ مجھے پتا تھا جو بھی بات ہوگی تم خود بتا دو گی بھلا مجھ سے چھپا سکتی ہو کچھ۔ جہاں تک احمر کی بات ہے اسے کیوں بتائی میں۔ ہمارا ساتھ کوئی دودن کا تھوڑی ہے بچپن کی دوستی ہے۔ پھر میں کیوں نہ پردہ رکھتی بات تو ہمارے درمیان ہی ہونی چاہیے تھی۔“

”تم ناراض تو نہیں ہو۔“ ایشال نے اپنی انگلی سے آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

”دوستی میں کیسا سوری۔ ایک بات تھی ختم ہو گئی۔“ سحر مسکرا کر اس کے ساتھ لگی۔ ”اچھا بتاؤ میک اپ اچھا لگ رہا ہے۔ پہلی بار ایسا میک اپ کرایا ہے عجیب ہی لگ رہا ہے۔“ سحر کو پھر سے فکر ہوئی۔

”میرا خیال ہے احمر کو بھیجتی ہوں وہی بتائے گا۔“ سحر کی میک اپ کی تکرار سن سن کر تینوں کزنز ہی اکتا چکی تھیں۔

”یہ مطلب نہیں تھا میرا۔ تم لوگ جو بار بار گھورتے ہو اسی لیے کونشیس ہو رہی ہوں۔“ سحر تلملائی۔

”ارے واہ ہم کوئی احمر ہیں جو گھوریں گے۔ اسی کی نظر تم پر سے نہیں ہٹ رہی تھی۔ اتنا چھیڑا ہم نے اسے مگر وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی ہے۔“ ایشال محفوظ ہوئی۔

”ہاں تو کیوں نہ دیکھیں۔ اب میرے علاوہ کسی اور کو دیکھنا بھی نہیں چاہیے۔“ ایشال نے خوشی سے اترا تھی سحر کو دیکھا اس روپ میں دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ اور بھی پیاری لگ رہی تھی۔

”جبران بھائی بھی تو تمہیں ہی دیکھ رہے ہوں گے۔“ ایشال کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ”جبران بھائی کے ذکر پر سنجیدہ کیوں ہو جاتی ہو۔ لڑائی ہوئی ہے؟“ سحر نے کرید۔ ایشال نے مختصر لفظوں میں اپنی اور جبران کی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ سحر نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”ان کو بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہماری آپس کی بات تھی انہیں کیوں بتایا۔“

”میں اپ سیٹ تھی پھر تم سے بھی تو کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔ ایسے میں فون آگیا بس کہہ دیا میں نے چھوٹو تم عین بھی مری نہیں جا رہی اس سے بات کرنے کو نہ کرے میری بلا سے۔“

”میں بات کروں گا جبران بھائی سے۔“
”باسک نہیں۔ چھوٹو اس قہرے کو۔ میں ذرا

دیکھوں یہ فرح اور فادیہ وہیں تک گئی ہیں۔ لگتا ہے ساری دیکوں کا خاتمہ کر کے ہی آئیں گی۔ ایشال اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں پتا کرو یہ لوگ کھانا کھا کر کب جائیں گے اب تو بھوک سے حالت خراب ہو رہی ہے۔ نی پی بھی لو ہو سکتا ہے جلدی آئے۔“ سحر نے التجا کی۔ صبح اس نے ٹھیک سے ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ اب بھوک اور تھکن دونوں ہی حملہ آور ہو چکی تھیں۔ ایشال تسلی دیتی کمرے سے نکل گئی۔



سامنے سے آتے جبران کو دیکھ کر اس نے بے نیازی سے گزر جانا چاہا۔ جبران اس کے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔ ایشال نے سائیڈ سے نکلنا چاہا مگر وہ راستہ روتا بٹا۔ تنگ آکر وہ اس سے مخاطب ہوئی۔

”راستہ چھوڑیں میرا۔“

”مگر نہ چھوڑوں؟“ جبران نے اپنے سینے کے گرد ہاتھ باندھتے ہوئے پُر شوق نظروں سے تنہا ایشال کو دیکھا۔ بلیک اور سلور امتزاج کے سوٹ میں ہلکے میک اپ کے ساتھ وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کی خفگی بھری آنکھوں میں دیکھتے جبران کو اپنا دل ڈوب کر ابھرنا محسوس ہوا تھا۔

”مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔ جائیں یہاں سے۔“ ایشال یہاں سے غائب ہونے کے لیے پرتل رہی تھی لیکن وہ اس کے راستے میں حائل تھا۔

”مجھے تو کرنی ہے۔“ جبران کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

”ٹھیک ہے پھر میں ہی چلی جاتی ہوں۔“ ایشال جانے کے لیے مڑی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ واپس جاتی جبران نے فوراً اس کی کلائی تھام لی۔ ایشال جھٹکے سے مڑی اس نے چھڑانے کی کوشش کی پر دوسری طرف گرفت سخت تھی۔

”آپ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔ کوئی بات نہیں سنی مجھے۔“ ایشال تنگ آکر بولی۔ جبران

مظبوط ہوا ناراضی میں وہ آپ جناب پر آگئی تھی۔

”کیوں نہیں کر سکتا بالکل کر سکتا ہوں۔ بات تو سنی ہی پڑے گی۔ ایسے تو یہاں سے ہٹنے نہیں دوں گا۔“ ایشال نے ناگواری سے اسے گھورا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ جبران نے شکر کیا آخر وہ بات کرنے پر راضی تو ہوئی چاہے ناراضی سے ہی سہی۔

”آئی ایم سوری۔ مجھے احساس ہے تمہاری ناراضی کا۔ تم ہرٹ ہوئی ہو۔ اس دن میں واقعی بست روڈ ہو گیا تھا۔“

”کوئی بات نہیں کرنی مجھے اس دن کی۔ میری طرف سے ناراض ہی رہیں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ ایشال نے منہ پھیرا۔

”میری طرف دیکھ کر کہو کہ فرق نہیں پڑتا۔“ جبران نے نرمی سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اپنی طرف موڑا۔ ایشال زیادہ دیر اس کی طرف دیکھ نہیں سکی۔ نظرس جھکا گئی۔

”یہ کیا شرافت ہے دن دھاڑے میری بھابی کو چھیڑ رہے ہو۔“ پیچھے سے آئی احمر کی آواز پر جبران نے اپنا ہاتھ ہٹایا۔ وہ تیزی سے مڑا۔ دوسرے ہاتھ میں ابھی بھی ایشال کی کلائی تھام رکھی تھی۔ ایشال کا چہرہ شرم کے احساس سے سرخ ہو گیا۔ اس نے کلائی چھیننے کی کوشش کی مگر جبران کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ایشال دل مسوس کر رہ گئی۔ نظرس مزید جھک گئیں۔

”زیادہ اور ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سامنے والے کمرے میں تمہاری بیوی موجود ہے جا کر ملاقات کر لو۔“ جبران نے اسے یہاں سے بھیجنے کے لیے کہا۔ احمر کی باچھیں کھل گئیں۔

”اچھا۔ میں ایشال سے یہی کہنے آ رہا تھا۔ کوئی ملاقات ہی کرادے۔“

”ٹھیک بیٹا۔ شکریہ بعد میں ادا کرنا۔ فی الحال یہاں سے کٹو۔“ احمر خوش ہوتا چلا گیا۔

”یہ کیا کیا سحر ناراض ہوگی۔“ ایشال نے احمر کو جاتے ہوئے دیکھ کر پریشانی سے کہا۔ احمر ہنس دے رہا تھا۔

”بہت خوش ہوگی اچھا ہے چند باتیں ہی کرے گی

تمہیں وہ تمہاری دوست کا سنگت رہ بھی اسے ایسے نہیں مانتا۔ جبران شرارتی انداز میں اس کی طرف جھکا۔ ایشال نے اسے پیچھے دھکیلا۔

”زیادہ اپنی تعریفیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں ہوں ہی اتنی اچھی جو اتنی جلدی مان گئی بغیر کوئی فرمائش کیے۔“

”اچھی تو تم ہو اس بات سے تو میں انکاری ہوئی نہیں سکتا۔ پر مانتا مجھے بھی آتا ہے۔ اگر ایسے نہیں مانتیں تو میں وہ کیا نام ہے تمہارے ڈیرائنوز کا۔ ہاں وہ میرا جی ٹکل خان سفینہ بنا وغیرہ ان کے سوٹ لانا میں۔ بس پھر فٹ سے مان جانا تھا تم نے۔“ جبران کے بولنے پر ایشال کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ بمشکل ہنسی روک کر بولی۔

”نام تو پہلے ٹھیک سے یاد کر لو۔“

”نہیں! سیرسلسلی یہ نام نہیں تھے؟“ جبران کے سنجیدگی سے کہنے پر ایشال کو ہنسی آرہی تھی۔ ”جو بھی ہوں۔ تم بس ایسے ہنستی رہو اور میں تمام عمر تمہیں یوں ہی دیکھتا رہوں۔“ جبران کا خوبصورت لہجہ ایشال کے دل میں بہت سے پھول کھلا گیا تھا۔ زندگی اس کے سنگ یوں ہی ہنستے مسکراتے گزرنے والی تھی۔

تم ان کی فکر چھوڑو اپنی اور میری بات کرو۔ اب مان بھی جاؤ۔ تمہیں پتا تو ہے احمر مجھے کس قدر عزیز ہے۔ اور پھر بات بھی اس کے دل کی خوشی کی تھی۔ غصہ اگیا تھا اسی لیے۔“

”بس ایشال کی پروا ہے اور کسی کی نہیں۔“ ایشال کے لبوں پر شکوہ مچلا۔ جبران بھرپور انداز میں مسکرایا اور گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

”پروا ہے تب ہی تو اتنی دیر سے کھڑا منانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ اسی وقت فرح اور فاریہ کھنکھارتی ہوئی آئی تھیں۔

”یہاں کیا راز و نیاز چل رہے ہیں۔“

”یار مسئلہ کیا ہے ہر تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی نازل ہو جاتا ہے۔“ جبران نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا۔ جو صرف ایشال ہی سن پائی۔ وہ مسکراہٹ دہائی دونوں کی طرف متوجہ ہوئی۔

”تم لوگوں کو کسی نے بتایا نہیں جب میاں بیوی بات کر رہے ہوں تو بیچ میں نہیں بولتے۔ پھر ہم تو پرانے ہو گئے ہیں۔ تم دونوں سامنے والے کمرے میں چھپا مارو۔ وہاں نیلی میز ٹیبل تم لوگوں کی ناک کے نیچے ملاقات کر رہا ہے۔ جاؤ جا کر بھاری سائیک لو اپنے احمر بھائی سے۔“ جبران نے مزے سے مشورہ دیا۔

”مشورہ تو آپ کا بہت اچھا ہے۔ چلیں آپ انجوائے کریں ہم ذرا دھاوا بولتے ہیں جا کر۔“ دونوں محفوظ ہوتی ہوئی چلی گئیں۔

”اب احمر کی شامت آنے والی ہے۔“ ایشال بھی جبران کے ساتھ ہنسی تھی۔

”جج میں ہنستی ہوئی تم اور بھی خوب صورت لگتی ہو۔“ جبران نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”اور جو غصہ دلاتے ہو وہ۔“ ایشال بھی مسکرائی تھی۔

”میرا کیا قصور تم ہر روپ میں ہی پیاری لگتی ہو۔ ہر بار دل کے زیادہ قریب محسوس ہوتی ہو۔“ جبران کے محبت سے کہنے پر ایشال جھینب کر بیچھے ہوئی۔

”کوئی لو بھرماتی ہوا لٹم محبت سے ملایا ہے۔“

ہستی پلا لکھنؤ



شہرہ بخاری

قیمت - 300 روپے

32735021

185 2016

نومبر

آکدہ لکھنؤ

گا۔ ”اس کے دل نے سرگوشی کی۔ وہ روز جامن کے نیچے بچے تخت پر لیٹ کر پیڑ کو دیکھتی سوچتی۔ اسے موسم کا انتظار تھا جب جامن کے پھل سے لطف اندوز ہوگی۔

”اری او شاہ بخت! میں بازار جا رہی ہوں، کچھ سودا سلف لینا ہے۔ کل کے مہمانوں کے لیے کچھ اسپیشل بنالینا۔ کیا پتا اس دفعہ تیری قسمت کھل جائے۔“ اماں نے چادر سر پر ڈالتے ہوئے اسے سوچوں کے دریا سے نکالا۔

”اسپیشل بنالینے سے۔ میں خود اسپیشل نہیں ہو جاؤں گی۔“ اماں نے اسے گھورا۔

”دودھ دلاری بنا کر رکھ لینا۔ ساتھ میں شامی کباب، دھجھیل رول، آلو کے سمو سے۔“ انہوں نے جاتے جاتے اپنا منہ بتایا۔

”ایک تو ہماری اماں۔ ان کی خاطر داریاں اور امیدیں۔ بھلا بتاؤ! دودھ دلاری بنانے سے میں مہمانوں کی راج دلاری بن جاؤں گی۔ بھلا رہوں گی تو وہی سیاہ بخت!“ اس نے سخن میں لگے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر خود ہی مذاق اڑایا۔ پھر اچانک نظر پڑوس میں منڈیر سے جھانکتے چہرے پر پڑی تو حلق تک میں کڑواہٹ کھل گئی۔

جب سے اس مکان میں نئے لوگ شفٹ ہوئے تھے اور اس کی عزیز از جان اکلوتی سہیلی نے یہاں سے ہجرت کی تھی۔ اس کا مزاج برہم رہتا تھا۔ جیسے قصور ان نئے لوگوں کا ہو۔ اس نے ایک کھلی نگاہ اس چہرے پر ڈالی۔ جو دن میں چار بار سخن میں جھانکنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

کوئل کی سریلی کوک۔
چڑیوں کی چھماہٹ۔
سخن میں لگے جامن کے پیڑ کے نیچے بچھا تخت۔
اور اس پر لیٹی پیڑ کی ڈالیوں کو دیکھتی شاہ بخت۔
نام تو نصیبوں والا اور قسمت۔ یک ہاف۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ نصیب پر شاید گہرے رنگ کی سیاہی پھر گئی ہے۔ جامن کے رنگ کی طرح پکے رنگ کی لڑکی ہو تو قسمت ”شاہ“ نہیں۔ ”سیاہ“ ہو جاتی ہے۔

وہ ”رائی نہیں نوکرانی ہو جاتی ہے۔“ ایسی رائی جس پر دنیا اور لوگوں کی تیز دھار زبانوں کی نوکیں چبھتی رہتی ہیں اسے زخم زخم کرتی ہیں۔ داغ دار کرتی ہیں۔ چر کے لگاتی ہیں۔ طعنے دیتی ہیں۔ مذاق اڑاتی ہیں۔ کوک۔ کوک۔ کوئل کی دلکش آواز نے اسے سوچوں کی دنیا سے نکالا۔

”یہ کوئل بھی تو کالی ہے۔ لیکن سب اس کی خوب صورت آواز کو پسند کرتے ہیں۔ آواز تو میری بھی اچھی ہے۔ لیکن سب مجھے رنگت کے سبب ناپسند کرتے ہیں۔“ خود ترسی اور حسرت سے کوئل کو دیکھ کر سوچا۔

ہوا چلی۔ تپے سر سرائے۔ یہ جامن کا درخت بھی بغیر جامنوں کے کیسے آدھا اُدھورا بے رونق اور نامکمل لگتا ہے، کب اس پر تانہ، ریلی، مزے دار جامنیں آئیں گی۔ میرے دل کی طرح دیر ان لگتا ہے۔ سوچیں بھٹک رہی تھیں۔

”بے موسم، پھل نہیں لگتا۔ وقت آئے گا تو کونپلیں پھولیں گی، خوشبو بکھرے گی۔ پھل لگے



WWW.PAKSOCIETY.COM

”ہوتا میرا کوئی ہمانی۔ تو اب تک ٹانگیں توڑ چکا ہوتا تمہاری۔“ وہ بیڑا تکی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اس سے بڑی دو بہنیں اور اس سے چھوٹی ایک بہن کی شادی ہو چکی تھی۔ تینوں بہنوں کی رنگت صاف تھی۔ سوائے اس کے۔ اور بیسیوں رشتے صرف اس کی رنگت کی وجہ سے اسے مسترد کر چکے تھے۔ یہ رشتے، رشتہ کرانے والی کے توسط سے آئے تھے اور اب بھی آرہے تھے اور اماں ”پوستہ رہ“ شجر سے امید بہار رکھ“ کے مصداق ان رشتے کے لیے آنے والوں کی خوب خاطر تواضع کرتی تھیں۔ جبکہ وہ بار بار ٹھکرائے جانے کی وجہ سے بے پناہ حساس اور مخ مزاج ہو گئی تھی۔ اب تو اسے اپنا نام بھی برا لگنے لگا تھا۔ ”اماں! کیا ضرورت تھی یہ لڑکوں والا نام رکھنے کی، اور اوپر سے مطلب تو دیکھو بادشاہوں والا نصیب۔ میرا مقدر تو کھوٹے سکے کی طرح ہے۔“ ایک دن اس نے اماں سے کہا۔

”شاہ بخت! شکر ادا کیا کر۔ جوان، صحت مند ہے۔ خدا انخواستہ معذور نہیں ہے۔ کوئی بیماری نہیں ہے۔ رنگت اور نصیب اللہ کی دین ہے، مقدر تیرا اب بھی اچھا ہے، آگے بھی اچھا ہوگا، اس بات پر یقین رکھ، مایوس، بدگمان مت ہو اور ناشکری کے کلمات منہ سے مت نکال اور نام تیرا ہم نے پہلے سے سوچا ہوا تھا۔ تمہارے ابو کو بیٹے کی چاہت تھی۔ اب اللہ نے نعمت دی یا رحمت، اس کی مرضی۔ نام جو سوچا تھا تمہارے ابا نے وہی رکھ لیا! کیا برائی ہے نام میں۔؟“

”فوف۔ اماں کا لیکچر۔“ اس کی نظریں جامن کے پیڑ پر بٹک رہی تھیں۔ اور پھر موسم سرما گزرا۔ پیڑ کے خزاں رسیدہ سوکھے پتے صحن میں گرتے وہ انہیں صاف کرتی اور اسے اپنا آپ ان خزاں رسیدہ سوکھے پتوں کی طرح لگتا جسے لوگ اپنے پیروں تلے کچل کر چلے جاتے تھے۔ آمد بہار۔ پیڑ پر لگے نئے پتے۔ پھوٹی کونپلیں، کھلے پھول، مگر اس کا نصیب سویا ہوا تھا۔ بہار بھی گزر گئی۔

اگلے برساتا سورج۔ جھلتے پتے۔ کچا پھل۔ شام کو وہ صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کرتی۔ اپنے سگی، ساٹھی، دوست جامن کے پیڑ کے نیچے جھپے تخت پر بیٹھ کر ٹھنڈی سکونچہین سے لطف اندوز ہوتی تو کبھی ٹھنڈی ٹھار لسی۔ کبھی تربوز کا شربت، تو کبھی فالے کا کھانا میٹھا شربت۔ بہنیں اس کے لیے مختلف ڈائجسٹ لائیں۔ جن کے آخر میں بیوی گائیڈ، رنگت نکھارنے کے طریقے ہوتے۔ کھانا پکانے کی نت نئی ٹر ایکس۔ پہلے پہل دلچسپی سے سب پر عمل کرتی تھی۔ اب ان کے مشوروں سے بے زار ہو جاتی۔

”کوئی فائدہ نہیں۔“ وہ بہنوں سے کہتی۔ نقوش میں جاذبیت تھی اور جب کوئی ترکیب رسالے سے پڑھ کر چہرے پر لگاتی تو رنگت میں نکھار بھی پیدا ہو جاتا۔ لیکن کچھ دنوں بعد چھوڑ دیتی۔ اب اکثر شام کو وہ تخت پر نیم درازان رسالوں کی ورق گردانی کرتی رہتی۔ گریجویشن کر چکی تھی۔ اور کافی عرصے سے گھرداری میں مصروف تھی، کیونکہ اماں کی صحت ان کو کام کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

کچھ عرصے سے وہ شام اچھی چہرہ بھی عاتب ہو چکا تھا۔ کچھ خلا سا پیدا ہو گیا تھا کیونکہ عادت ہو گئی تھی۔ اس چہرے کو دیکھنے کی؟ ارے نہیں۔ اس چہرے کو کوٹنے کی۔

”اللہ رے تیری شان! اس مرد کو گوری رنگت دے دی اور جو مجھ کم نصیب کو ذرا سی صاف رنگت دے دیتا تو دنیا والوں کی تمسخرانہ نگاہوں سے تونج جاتی۔ پھیکا شلجم! جب وہ جامن کے پتوں سے چھینر جھاڑ کر ناجوان کی چھت تک جاتے تھے تو وہ جل کر خاک ہو جاتی۔ جیسے پیڑ، پتوں، جامنوں پر صرف اس کا حق ہے۔ ایسا لگتا تھا وہ اس کی غصے بھری نگاہوں سے لطف اندوز ہوتا ہے اور رشتے کے لیے آنے جانے والے مہمالوں کو تو ضرور ایک دفعہ جھانک کر دیکھتا۔“

”میری کم مائیگی۔ کم نصیبی کا مذاق اڑاتا ہے۔
 پھیکا شلجم! اپنے آپ کو ہوتا نہیں کیا سمجھتا ہے جیسے کسی
 قلم کا ہیرو ہو۔ ان لڑکوں کی فرمائشوں کی وجہ سے تو کم
 صورت لڑکیوں کے رشتے نہیں ہو رہے۔ ذرا سی
 موٹی۔ ذرا سی چھوٹی۔ ذرا سی سانولی ہو تو ان کی اماں
 بہنیں رنجھکت کر کے چلی جاتی ہیں۔ انہیں بیوی
 چاہیے تو کترینہ کیف جیسی۔“ سارا غصہ اس لڑکے
 کی رنگت کی وجہ سے اس پر نکلتا جیسے سب چیزوں کا
 قصور وار وہی ہو۔ شاہ بخت کو لگتا وہ نظروں ہی نظروں
 میں اس کا مذاق اڑاتا ہے اس کا تماشا دکھاتا ہے۔

”اللہ کرے اسے موٹی بھدی سانولی بیوی
 ملے۔“ ایک دن اس نے جامن کے پیڑ کی ڈال ہلائی تو
 بہت ساری جامنیں اس کی گود میں آ گئیں۔ تب
 اس نے یہ بددعا بہت جل کر کھس کر دی تھی۔
 ہاں بعد میں ان ریشمی جامنوں کو مزے لے لے کر
 کھایا تھا۔ بھلا جامنوں سے کیسی دشمنی۔ اچھا خاصا
 پنڈ سم لڑکا تھا۔ اب کافی عرصے بعد وہ چہرہ دوبارہ نظر آیا
 تھا۔ کچھ بجھا بجھا پریشان سا۔

”اماں! یہ پڑوس کا لڑکا چھت سے جھانکتا ہے آپ
 نے ڈانٹا نہیں اسے۔“ ایک دن اماں سے کہا۔
 ”ہائیں۔ بے چارہ شریف لڑکا۔ چھت پر
 طوطے رکھے ہوئے ہیں انہیں دان پانی ڈالنے آتا ہے۔
 ان ہی کو دیکھتا ہے۔ اسے کیا ضرورت پڑی ہے
 ہمارے گھر چھانکنے کی؟“

”اف! اماں کی سادہ دلی۔
 ”شریف لوگ ہیں اکلوتا بیٹا ہے۔ لیکن بے
 چارے کا کہیں رشتہ نہیں ہو رہا۔ تھوڑا سا ہکلا کر بولتا
 ہے۔ زیادہ نہیں۔ ایک دو لفظ دہرا کر بولتا ہے۔
 بس یہ کمی لڑکی والوں کو ہضم نہیں ہوتی۔ سو ہر جگہ
 سے انکار ہو جاتا ہے۔“ وہ بہت افسوس سے بتا رہی
 تھیں۔

”اس کی والدہ بیمار تھیں۔ خیریت پوچھنے گئی تھی
 تب انہوں نے مجھے سب باتیں بتائیں۔“

”اس کی والدہ بیمار تھیں۔ خیریت پوچھنے گئی تھی
 تب انہوں نے مجھے سب باتیں بتائیں۔“

”یہ بھی میری طرح بے چارہ ہے۔“ ہمدردی اٹھ
 آئی۔

”س۔ سوری۔ میں بے بی کو بھگا رہا تھا۔ وہ
 طوطوں کو تنگ کر رہی تھی۔ اسی چکر میں اسے کنکر مارا
 تو اس کے کودنے سے آپ پر جج جامنیں آ گئیں۔“
 اس نے معذرت کی۔

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے بے نیازی دکھائی۔
 ”آپ کو کھانی ہیں تو پیڑ پر سے جامنیں اتار بیجیے
 گا۔“ ایک اور نوازش۔ وہ ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس نے اس
 کے ہکلا کر بولنے پر نہ تو ہنسی اڑائی تھی۔ استہزیاء ہنسی
 جو اکثر اس کے بولنے پر لوگوں کے چہروں پر آ جاتی
 تھی۔ نہ حیرت کا اظہار کیا تھا۔

”کچھ دن بعد پڑوس سے اس کا رشتہ آیا تھا۔ اسی
 لڑکے حارث کا۔ اس کی والدہ آئی تھیں۔ وہ حیران
 ہوئی اس کی حیرانی دیکھ کر اماں نے کہا۔“

”بیٹا جاں پیری ہو وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔“
 ”لیکن ہمارے گھر جامن کا پیڑ ہے۔ اور پتھر مارنے
 سے رسی کی تانہ مزے دار جامنیں گرتی ہیں۔“ وہ
 سوچ کر مسکرائی۔

”مجھے حارث پسند ہے۔ اپنا جنرل اسٹور ہے اچھا
 کماتا ہے۔ تھوڑی سی کی خدا کی دین ہے ایسی نہیں
 کہ اسے انکار کر دیا جائے۔“ امں نے اپنا خیال ظاہر
 کیا۔
 ”اور کی تو مجھ میں بھی ہے۔“ اس نے سوچا۔ یہ
 کی زبانے والوں کی نظر میں تھی۔ ورنہ اللہ نے مکمل
 بنایا تھا اور ہر انسان کو بہترین صورت سے نوازا ہے۔
 مختلف صلاحیتوں کے ساتھ۔



شاہ بخت نے ہاں کر دی۔ جامنیں پک چکی
 تھیں۔ اس کے انتظار کا موسم ختم ہو گیا تھا۔ وقت
 مقررہ سے پہلے پھل نہیں پکتا۔ وقت آیا تو کونسلین
 پھوٹیں۔ پھول کھلے۔ خوشبو بکھری۔ تانہ رس بھرا
 پھل آیا۔

”وقت سے پہلے اور نصیب سے زیادہ کسی کو نہیں
 ملتا۔“ اب چاہے تو اس وقت اس انتظار کو صبر و شکر
 سے گزارا جائے چاہے تو شکوہ شکایت مایوس ہو کر یہ
 انسان پر منحصر ہے۔

مٹکنی کے فنیکشن میں دونوں کے چروں پر الوہی
 چمک اور خوشی تھی۔ اور دونوں کا پل بے حد خوب
 صورت لگ رہا تھا۔ اپنے آپ کو جامن کے رنگ کی
 طرح کہنے والی لڑکی کا بخت۔ ”شاہ“ ہی تھا۔
 ”حارث“ کی ہرانی میں۔ یہ بات مقدر بنانے والے
 نے بہت پہلے لکھ دی تھی کیونکہ ایک کی کے سوا وہ ہر
 لحاظ سے ایک آئیڈیل لڑکا تھا۔

”مم مجھے نہیں پتا تھا کہ ت تم میرے رشتے پر ہاں
 کر دو گی۔ مم مجھے یقین تھا کہ ت تم انکار کر دو گی۔“
 حارث نے آہستہ سے شاہ بخت سے کہا۔ شاہ بخت
 نے ساتھ بیٹھے اس وجہ اور پنڈ سم لڑکے کو دیکھا

جسے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ہٹلا کر بولتا
 ہے۔
 ”مجھے بھی کچھ ایسا ہی گمان تھا کہ کہاں تم اور کہاں
 میں۔“ شاہ بخت نے سوچا، لیکن بولی نہیں صرف
 مسکرا دی۔
 ”غ غصیلی لڑکی۔ مسکراتے ہوئے تو اور بھی
 اچھی لگتی ہے۔“ حارث بولا۔
 ”اور مجھے تو بہت پہلے سے اچھی لگتی تھی۔“ اپنا
 ایک راز کھولا۔

شاہ بخت کو بے حد حیرانی ہوئی۔ ”کیا کوئی اسے پسند
 بھی کر سکتا ہے؟“ لیکن حارث کی نگاہوں سے چھلکتے
 جذبول نے مرثبت کر دی کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔
 دونوں کے چروں پر خوشی تھی۔ اطمینان تھا۔
 حارث نے اسے بتایا کہ وہ اسپینج تھرائی کے ذریعے
 بڑی حد تک اپنی خامی پر جلد ہی قابو پالے گا۔ اس کے
 سیشن جاری ہیں۔

جامنوں سے محبت کرنے والی۔ تھوڑی کھٹی
 تھوڑی میٹھی، تھوڑی نمکین لڑکی۔ جو اپنے آپ کو
 جامن جیسی رنگت کا کہتی تھی۔ اسے حارث نے بتایا
 کہ جامنی رنگت قوت، بادشاہت، شاہی مرتبہ اور
 دولت کی علامت ہے اور شاہ بخت ان شاء اللہ اس کے
 لیے لکی ثابت ہوگی۔ شاہ بخت حارث کی مثبت سوچ،
 اچھی امید اور اپنے نصیب پر حیران تھی اور خدا کے
 حضور اس کا دل سجدہ ریز تھا اور اپنی ناشکری پر توبہ بھی
 کر رہی تھی۔

”زندگی کے درخت پر نصیب کا پھل اپنے وقت
 مقررہ پر لگتا ہے۔ بس اک ذرا انتظار، صبر، شکر، یقین
 کامل، دعاؤں کا سرمایہ ہم سفر ہونا چاہیے۔ راستہ
 سہل ہو جاتا ہے اور دل مطمئن و شاکر۔“
 یہ رمز دیر سے سنی۔ شاہ بخت کی سمجھ میں آ گیا
 تھا۔



قصہ کی

رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔
ولید، ماورا کے سامنے والے صوفے پہ گم صم اور ساکت سا بیٹھا اور اسے سنی ہوئی داستان پر یقین کرنے اور نہ کرنے کے بیچ ڈول رہا تھا۔
کسی کہ جو کچھ وہ بتا چکی تھی وہ قابل فراموشی تو نہیں تھا۔
رضا حیدر۔ علی مرتضیٰ کے قاتل تھے۔ عافیہ بیگم اور ماورا مرتضیٰ کے مجرم تھے اور قاتل اور مقتول کی اولادیں محبت میں گرفتار تھیں۔
معاملہ کہاں سے شروع ہوا تھا اور کہاں پہنچا تھا اور آگے کیا ہونے والا تھا، سب عقل اور سمجھ سے باہر کی باتیں تھیں۔ ولید کی پُرسوج آنکھیں پینپنا رہی تھیں۔
”بتاؤ ولید! میرا ساتھ دو گے؟ مجھے تیمور حیدر واپس چاہیے۔ ہر حال میں۔“ ماورا النجا بھی کر رہی تھی تو، ایک ضد ایک ہٹ دھرمی کے ساتھ۔

چونتیسویں قسط

اس کا ذہن بڑی تیزی سے حرکت میں آچکا تھا۔
”اب کیا کیا جائے؟“ اس کی سوچ اور اس کے خیال منتشر ہونے لگے تھے۔
وہ کبھی کسی کے بارے میں سوچ رہا تھا اور کبھی کسی کے بارے میں۔ اور یونہی سوچتے سوچتے اس کی سوچ تیمور

Downloaded From
Paksociety.com



حیدر کی طرف جاکھلی تھی۔
 ”ہو نہ۔! لیلیٰ دشمنوں کے قبضے میں گھری ہے اور مجنوں میاں پتا نہیں کس کس جہان کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔؟“ وہ یوں سوچتے ہوئے خفگی سے بڑبڑایا تھا۔
 ”خیر۔! یہ تو ایک الگ مسئلہ ہے۔ ابھی تو ان لوگوں کے بارے میں کچھ سوچنا پڑے گا جو خود بھی بے خبر ہیں۔“

وہ خود کلامی کے سے انداز میں کتا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور میز سے اپنی چائیاں اٹھا کر ہر نکل آیا تھا۔ لیکن اپنی موٹر سائیکل تک آتے آتے اس کے ذہن میں ایک اور سوچ وارو ہو چکی تھی۔
 ”ارے۔! یہ تو پتا ہی نہیں کہ آخر وہ لوگ کرنا کیا چاہتے ہیں۔؟ ان لوگوں کی پلاننگ کیا ہے؟“ وہ بایک پہ سوار ہوتے ہوئے رک گیا تھا اور اپنا موبائل نکال کر عزت کے نئے اور خفیہ نمبر کو ملایا تھا۔
 ”جی فرمائیے۔؟“ کال ریسیو ہوتے ہی لٹھ مار قسم کا جواب موصول ہوا تھا۔
 ”میں نے ایک آئیڈیا سوچا ہے۔“ اس کے لہجے اور انداز پہ ولید کا موڈ ایک پل میں سنجیدگی سے شکستگی میں بدل گیا تھا۔

”بتائیے۔؟“ لہجہ اور انداز ہنوز تھے وہ اس کی باتوں پہ تپتی ہوئی تھی۔
 ”میں نے سوچا ہے کہ میں صحافت چھوڑ دیتا ہوں۔“ اس نے بڑے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔
 ”کیوں۔؟“ عزت کا کیوں بڑا بے ساختہ تھا۔
 ”کیوں کہ یہ کام اب میری بیوی کرے گی۔ آج کل ایسے کام وہی کر رہی ہے۔ لوگوں کی سن گن لینا۔ ان کی حرکتوں پہ نظر رکھنا اور پھر آگے انفارم کرنا۔ کرائم پہ دھیان دہا۔“ ولید نے باتوں باتوں میں اسے سب بتا دیا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی عزت کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔
 ”مجھے بس یہ بتائیے کہ فون کس لیے کیا؟“ وہ مسکراہٹ دیا چکی تھی۔ اور لہجے کو سابقہ انداز میں بدل لیا تھا۔
 ”تم سے فون پہ رومنس کرنے کے لیے۔“ ولید کا مزاج بھی مکمل شرارت میں بدل چکا تھا۔
 ”وہاٹ۔؟“ عزت اس کے جواب پہ ایک دم ہدک گئی تھی۔
 ”ظاہر ہے۔ صحافت نہیں کروں گا تو رومنس ہی کروں گا ناں۔؟ آخر فاسغ انسان اور کر بھی کیا سکتا ہے۔؟“ ولید نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا تھا اور عزت اپنے دھڑکتے اعصاب کے ساتھ دانت کچکچا کے رہ گئی تھی۔
 ”اوہ۔! تو سید حاسد ہا بولیں ناں۔ آپ مذاق اڑا رہے ہیں۔؟ وہ بھی میرا۔“ وہ لفظ چبا چبا کر بولی تھی۔
 ”اف توبہ۔! میں مذاق اڑاؤں۔؟ وہ بھی عزت کا؟ توبہ توبہ میری اتنی مجال کہاں۔؟“ ولید نے توجیے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔

”ولید۔! وہ زچ ہو کر بولی۔

”جی میری جان۔؟“ اب کی بار وہ بڑے پیار سے مخاطب ہوا تھا۔
 ”کیوں کر رہے ہیں ایسا۔؟“ وہ نروٹھے پن سے بولی۔
 ”ایسا۔ مطلب؟“ ولید نا سمجھی سے پوچھ رہا تھا۔
 ”مذاق۔! وہ اس کے رومانوی انداز کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

”ارے میری جان! میرا کب دل چاہتا ہے کہ میں مذاق کروں۔ بلکہ میرا تو دل چاہتا ہے جو بھی مذاق کروں اسے پورا کروں۔ سب کچھ حقیقت میں کروں۔ ایسے مذاق یہ تو میرا بھی دل جتا ہے۔ خون کے آنسو روتا ہوں۔“

ملنے کے لیے شارٹ کٹ لیا تھا۔ لیکن پھر بھی ابھی تک منزل نصیب نہیں ہوئی۔
وہ تو جیسے روہانسا ہوا تھا اور عزت اس کے ایسے جذباتی اور روہانے لہجے پہ نکل گئی تھی۔
”ان شاء اللہ سب اچھا ہی ہو گا۔“ اس نے اپنی طرف سے اسے دلا سا دیا۔
”کب ہو گا۔؟“ وہ چڑ کر بولا۔

”جب سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اسے تسلیاں دے رہی تھی۔
”اور سب ٹھیک تب ہی ہو گا جب ہم میں سے کوئی ایک گزر جائے گا۔“ وہ طنزیہ بولا۔
”پلیز!“ عزت نے بے ساختہ اسے ٹوکا۔

”خیر چھوٹو! جو بھی ہو گا دکھا جائے گا۔ آپ لوگوں کو فکر نہیں تو مجھے ٹینشن لینے کی کیا ضرورت ہے؟ ابھی
تم مجھے یہ کنفرم کرو کہ وہ لوگ کرنا کیا چاہتے ہیں؟ ان کی پلاننگ کیا ہے؟ تاکہ ان کو اسی طریقے سے ہینڈل کیا جائے؟

ولید ساری بات ذہن سے جھٹکتے ہوئے اصل مقصد کی طرف آگیا تھا جس کے لیے اس نے فون کیا تھا۔
”اب کیسے کنفرم کروں۔؟“ وہ ابھھی۔

”جیسے پہلے کیا تھا۔“ ولید نے اسے اشارہ دیا۔
”اچھا۔“ کوٹیشن کرتی ہوں۔“ اس نے سمجھتے ہی اثبات میں جواب دیا تھا۔
”اوکے۔ میں تب تک ان لوگوں کے پاس پہنچتا ہوں۔“ ولید نے کہہ کر فون رکھنا چاہا۔
”ولید!“ وہ اب کی بار بھی بہت بے ساختہ بولی تھی۔
”ہوں۔؟“ وہ فون بند کرتے کرتے رک گیا۔

”آئی مس یو۔“ لہجہ انتہائی مدہم تھا۔
ولید چند ثانیے اس کے اس اظہار کے زیر اثر چپ سا رہ گیا تھا۔
”سنو!“ وہ فون بند کرنے ہی والی تھی کہ ولید یکدم بول پڑا۔
”ہوں۔؟“ عزت کا لہجہ ہنوند مدہم تھا۔
”آئی لویو۔“ ولید کا اظہار عزت کی روح کو سرشار کرنے کے لیے بہت تھا۔
اور دونوں نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔



عزت دے بے پاؤں وہیں آکھڑی ہوئی تھی جہاں سے وہ گئی تھی۔ اندر خبیث لوگوں کی خبیث میٹنگ ہو رہی تھی۔
”لیکن حیدر انکل۔! ان بوڑھی عورتوں کو کٹھنپ کرنے سے ہمیں کیا حاصل؟ اگر کرنا ہی ہے تو پھر۔“
مونس مرزا نے اپنے آخری لفظ ’تو پھر‘ کو کافی لبا۔ کھینچا تھا اور وہ بھی کافی ذومعنی انداز میں جس کو باہر کھڑی
عزت بھی بخوبی سمجھ چکی تھی کہ اس کا اشارہ اور اکی طرف ہے۔
”نہیں۔! اس پہ ہاتھ ڈالنے سے معاملہ اور ٹیڑھا ہو جائے گا۔ تیور کے دل میں اس کا درد اٹھے گا اور وہ الٹا
ہمارا دشمن ہو جائے گا۔ اور وہ لڑکی خود بھی بہت چالاک ہے اس طرح ہاتھ نہیں آئے گی اور نہ ہی پیپر پہ سائن
کرے گی۔“ رضا حیدر کی پلاننگ کچھ اور تھی۔

”تو پھر کرنا کیا ہے۔؟“ مونس مرزا نے لہجہ کرپوچھا۔
WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

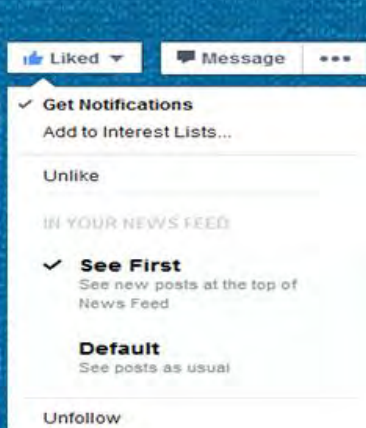
بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done



”ظاہر ہے جب وہ دونوں عورتیں ہمارے قصبے میں ہوں گی تو ماورا مرتضیٰ ان کو پہچانے کے لیے کچھ بھی کر
 کرے گی۔ ہر ناوان بھرنے کے لیے تیار ہوگی۔ اور اسے ہر حال میں پر اپنی کے تمام کاغذات پہ سائن کرنا
 ہوں گے۔ پھر وہ بھی خوش اور ہم بھی خوش۔“ رضا حیدر اپنی پلاننگ سوچ کر خود ہی مسکرائے تھے۔
 ”لیکن اگر معاملہ پولیس یا میڈیا تک پہنچ گیا تو۔۔۔؟“ موگس مرزا کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے احتیاطاً ”ساری
 معلومات لینا چاہ رہا تھا کہ آخر ان کے ذہن میں کیا چل رہا ہے۔؟“
 ”پولیس تک کبھی نہیں پہنچے گا۔ وہاں ایک خاص آدمی ہے میرا۔ اور وہی بات میڈیا کی تو میڈیا تک پہنچانے
 والا صرف ایک ہی آدمی ہے اور وہ ہے ولید رحمان۔ اور ولید رحمان نے اگر میرے کسی معاملے میں ٹانگ اڑانے
 کی کوشش کی تو اسے سیدھا سیدھا گولی کھانا پڑے گی۔ اس کے لیے تو ذرا بھی گنجائش نہیں ہے۔“
 رضا حیدر کے زہر خند لہجے پہ عزت کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا اور ماتھے پہ ایک دم سے پسینہ آگیا تھا اب اس سے
 وہاں ٹھہرنا مشکل ہو چکا تھا۔
 وہ بمشکل خود کو سنبھالتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی تھی اور اپنے کمرے میں آکر سانس بحال کی تھی۔ اور ساتھ
 ہی ولید کو مطلع کرنے کا سوچا تھا۔!



ڈاکٹر شاہ نواز کے گیسٹ روم میں مکمل خاموشی کا راج تھا۔
 تیمور بیڈ پہ بے سدھ بڑا تھا اور وہ تینوں اس کے لیے خاموش اور متفکر بیٹھے تھے۔ اور اس ”خاموشی“ کے
 سلسلے میں آفاق کے فون کی گھنٹی نے دورا ڈڑالی تھی۔ اور سب نے بے ساختہ چونک کر دیکھا تھا۔
 آفاق نے موبائل نکالا۔ فارہ کی کال تھی۔
 ”وہ پریشان ہو رہی ہوگی۔؟“ آفاق نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے فوراً ”کال ریسیو کی۔“
 ”ہیلو۔!“ اس نے کافی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔
 ”کہاں ہیں آپ؟ میں کب سے انتظار کر رہی ہوں۔؟“ فارہ کی پریشانی عروج پہ تھی۔
 ”تیمور کپاس ہوں۔“ اس کا لہجہ اور انداز ہنوز تھے۔
 ”واٹ؟ تیمور بھائی کپاس؟ لیکن وہ کہاں ہیں؟“ فارہ کو اب اگلا سوال سوچھا۔
 ”ڈاکٹر شاہ نواز کے گھر۔“ آفاق کی زبان سے بے ساختہ پھسلا تھا۔
 اور اس کی اس بے ساختگی پہ نوسہ اور ڈاکٹر شاہ نواز نے بھی ایک دم اس کی طرف دیکھا تھا۔ آفاق دل ہی دل
 میں پچھتایا تھا کیونکہ فارہ کا اگلا سوال حاضر ہو چکا تھا۔
 ”ڈاکٹر شاہ نواز کون۔؟“ اب وہ اس کون کا جواب کیا دیتا۔؟
 ”دیکھو فارہ۔ میں تمہیں گھر آکر سب بتاؤں گا۔ ابھی فون بند کرو۔“ وہ بے حد نرمی سے اسے سمجھاتے
 ہوئے بولا۔

”لیکن آفاق سب ٹھیک تو ہے ناں؟ خیریت ہے ناں؟ تیمور بھائی کسی ڈاکٹر کے گھر پہ کیوں ہیں؟ وہ ٹھیک تو ہیں؟
 فارہ کو ایک الگ پریشانی لاحق ہو چکی تھی۔
 ”ہاں۔ اللہ کا کرم ہے سب ٹھیک ہے ڈونٹ وری۔ اگر میں لیٹ ہو جاؤں تو انتظار مت کرنا۔ سوچانا۔“
 آفاق نے اسے نرمی سے سمجھا کر فون بند کر دیا تھا۔

”کس کا فون تھا۔؟“ قارہ فون بند کر کے پٹی ہی تھی کہ ٹیمینہ یزدانی قریب آ گئیں۔

”میں نے فون کیا تھا آفاق کو۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اچھا۔! کہاں ہے وہ؟ کیا کہتا ہے؟“ ٹیمینہ یزدانی بھی آفاق کے لیے فوراً ہی پریشان ہو جاتی تھیں۔

”کسی ڈاکٹر کے گھر پہ ہیں۔ تیمور بھائی بھی وہیں ہیں۔“ قارہ کے انداز میں ذرا سی لاپرواہی تھی۔ جبکہ ٹیمینہ یزدانی

ڈاکٹر کے نام پہ ہی متفکر ہو گئی تھیں۔

”کیا مطلب۔؟ کس ڈاکٹر کے گھر پہ ہے وہ۔“

”شاید ان کے کوئی جاننے والے ہوں گے“ ڈاکٹر شاہ نواز ان ہی کے گھر پہ ہیں وہ۔“ اس کی لاپرواہی ہنوز تھی

اور ٹیمینہ یزدانی کا جیسے پل میں جسم کا سارا خون نچر گیا تھا۔ ان کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔

”ڈاکٹر شاہ نواز۔؟“ ان کے ہونٹ پھر پھڑپھڑائے تھے۔ اور ان کا رد عمل دیکھ کر قارہ بھی چونک گئی تھی۔

”آئی۔ کیا بات ہے۔ کیا ہوا۔ ڈاکٹر شاہ نواز کون ہیں؟“ قارہ کافی الجھن لیے ان سے پوچھ رہی تھی۔

”ڈاکٹر شاہ نواز ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں۔ وہ۔ وہ۔ انیق کے ڈاکٹر تھے۔ انیق کا ٹریٹمنٹ انہوں نے ہی کیا

تھا۔ اور۔ اب ان کی بیٹی نوسیدہ شاہ نواز بھی ہارٹ اسپیشلسٹ ہی ہے۔ مگر آفاق وہاں کیوں؟“

ٹیمینہ یزدانی کے الفاظ بے ربط سے ہو رہے تھے اور آواز کپکپا رہی تھی ان کے دل میں خوف پوری طرح۔

ابھار چکا تھا۔

اور خطرے کی گھنٹی ان کے کانوں میں شور مچانے لگی تھی۔

قارہ اب بھی ان کی ذہنی حالت کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

”شاید تیمور بھائی کے ساتھ ہیں۔“

”اگر تیمور وہاں ہے تو کیوں ہے؟ اور اگر آفاق وہاں ہے تو کیوں ہے؟ کیا وجہ ہے؟ کیا ہوا ہے؟“ ٹیمینہ یزدانی کا

دماغ چند لمحوں میں ہی ماؤف ہو چکا تھا۔

”آپ اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟“ قارہ کی الجھن سلجھ ہی نہیں رہی تھی۔

”قارہ۔ کب کبھی تم نے آفاق کو دیکھا۔ اس کے سینے میں پین ہوا کبھی۔؟“

ٹیمینہ یزدانی آخر ماں تھیں اور پہلے بھی اس صدمے سے گزر چکی تھیں۔ اس لیے وہ بہت پریشان تھیں۔

”پین کا تو مجھے نہیں پتا۔ لیکن میں نے کئی بار ان کو اپنا سینہ سہلاتے ہوئے دیکھا ہے۔“

قارہ نے اثبات میں سر ہلایا اور ٹیمینہ یزدانی کی تو جیسے ریڑھ کی ہڈی میں اک سنسنی سی دوڑ گئی تھی اور وہ صوفے پہ

ڈھس گئی تھیں۔

”آئی۔ کیا ہوا۔ سب ٹھیک تو ہے نا؟“ قارہ یک دم ان کی طرف لپکی۔ اور انہوں نے اک نظر قارہ کو دیکھا

پھر اپنے اندر کے ابال کو بمشکل اندر ہی ضبط کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن آنسو بار بار اٹڈے آرہے تھے۔

”قارہ۔“ انہوں نے قارہ کو قریب بٹھا کر اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا اور بے اختیار رو پڑی تھیں اور قارہ پوچھتی ہی رہ

گئی کہ کیا ہوا ہے مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔



”آپ لوگوں کو یہاں سے چلنا ہی ہو گا۔ یہاں رہنا سراسر خطرہ ہے۔“ ولید نے کافی تحمل سے کہتے ہوئے ان

تینوں پہ نظر ڈالی تھی۔

عافیہ بیگم وہاں سے جانے کو تیار نہیں تھیں۔
 ”کہاں چلنا ہوگا؟ کہاں جائیں؟“ انہوں نے تلخی سے پوچھا۔
 ”اپنے گھر اور کہاں۔“ ولید نے کافی لاپرواہی کا مظاہرہ کیا تھا۔
 ”ہمارا کوئی گھر نہیں ہے۔ پچھلے چھبیس سالوں سے ہمارا کوئی گھر نہیں ہے۔ ہم گھر سے بے گھر پھر رہے ہیں۔
 لاوارش۔“ عافیہ بیگم کے لہجے کی تلخی عروج پہ تھی۔
 ”پلیز آئی! ایسا تو مت کہیں۔ آپ جانتی ہیں سب کا وارث تو صرف اللہ ہے۔ سب کا مالک اور سب کا
 محتار۔“ ولید نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
 ”جانتی ہوں۔ سب جانتی ہوں۔ لیکن میں اس گھر میں کیسے۔“
 ”آئی! وہ گھر آپ کا ہے۔ آپ کے شوہر کا ہے اور اب آپ کی بیٹی کا ہے وہاں جانا آپ کا حق بنتا ہے“ آپ
 مالک ہیں اس گھر کی۔ آپ کو بلا کسی جھجک۔“
 وہ انہیں۔“ حیدرولا“ جانے پہ اکسارہا تھا کیونکہ ماورا انہیں منانے میں ناکام ہو چکی تھی۔
 ”کیسے جاؤں۔ کس حوصلے سے جاؤں؟ وہاں کیا رکھا ہے اب۔“
 عافیہ بیگم نے کبھی بھی واپس اس گھر میں جانے کا نہیں سوچا تھا کیونکہ جب اس گھر میں اس گھر کو بنانے والا
 نہیں تھا۔ ان کا گھر والا نہیں تھا تو پھر وہاں جانے سے بھی کیا حاصل۔
 ”وہاں بے شک کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن وہ گھر تو آپ کا ہے نا؟ آپ کے شوہر کا۔ جو انہوں نے آپ کے
 لیے بنایا تھا۔ آپ کے رہنے کے لیے۔“ ولید ہر ممکن طریقے سے انہیں قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
 ”مجھے وہ گھر نہیں چاہیے۔ کیونکہ وہ گھر مجھ سے کب کا چھن چکا ہے۔ وہ میرے نصیب میں ہی نہیں تھا۔“
 عافیہ بیگم وہاں جانے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھیں۔
 ”دیکھیں آئی! آپ کو کچھ ہو گیا تو کس کو پریشانی ہوگی صرف آپ کی بیٹی کو۔ آپ اپنے لیے نہ سہی، لیکن اس
 کے لیے ہی مان جائیں۔ یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ پلیز کچھ خیال کریں۔“ ولید انہیں سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا
 اور بی گل اس سارے سلسلے میں خاموش تماشائی کی طرح بیٹھی تھیں۔
 لیکن ولید اور ماورا کی پریشانی دیکھ کر بالآخر انہیں بولنا ہی پڑا تھا۔
 اور ان کا بولنا کبھی کبھی بہت سخت بھی ہوتا تھا۔



”حیدرولا۔“ میں قدم رکھتے ہوئے عافیہ بیگم اور بی گل کا دل خون کے آنسو رویا تھا۔ انہوں نے گاڑی سے
 اترتے ہی سر اٹھا کر ”حیدرولا“ کی بلند اور وسیع عمارت کو دیکھا تھا اور دل پہ اک گھونسا سا پڑا تھا۔
 ماورا ان کی کیفیت سمجھ چکی تھی۔ اسی لیے ان کا ہاتھ کافی مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور عافیہ بیگم
 نے اس کے ہاتھ تھامنے پر بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔
 ماورا کی آنکھوں میں ایک تسلی تھی ہمت تھی حوصلہ تھا۔ جس کو دیکھ کر چند ثانیے کے لیے عافیہ بیگم کا دل بھی
 مضبوط ہو گیا تھا۔ اور پھر اس کے ساتھ قدم آگے بڑھا دیے تھے۔
 ”سیکیورٹی۔“ ماورا نے سیکیورٹی کو طلب کیا تھا اور پھر ولید کی موجودگی میں ہی تمام گارڈز کو سمجھایا تھا اور حفاظتی
 اقدامات سخت کر دیے تھے۔

ولید اور ماورا حفاظتی اقدام میں مصروف تھے اور عافیہ بیگم پورے گھر میں بولنا پھر رہی تھیں۔

”میڈم کی اجازت کے بغیر باہر کا گیٹ ہرگز نہیں کھلے گا۔ چاہے گیٹ پہ رضا حیدر یا تیمور حیدر ہی کیوں نہ ہوں؟“ ولید نے چوکیدار کو آخری ہدایت سے نوازا تھا اور وراج مین نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اور ابھی وہ ماورا سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کے نمبر پہ کال آگئی۔

”ہیلو۔“ اس نے کال اٹینڈ کی۔
 ”آفاق بات کر رہا ہوں۔“ دوسری طرف عجلت تھی۔
 ”اوہ اچھا۔ کیسے ہیں آفاق صاحب۔“ آفاق کے نام پہ ماورا نے بھی ٹھٹھک کر دیکھا تھا۔
 ”میں ٹھیک ہوں، لیکن تیمور کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ڈاکٹر شاہ نواز کے گھر پہ ہے۔ اگر ہو سکے تو تم ابھی پہنچو۔“
 آفاق کو واپس گھر جانے کی جلدی تھی، کیونکہ فارہ نے بتایا تھا کہ شینہ یزوانی کی حالت کافی خراب ہے، اچانک پتا نہیں کیا ہوا ہے؟
 ”ڈاکٹر شاہ نواز کے گھر۔“ اس نے زیر لب دہرایا۔

”ہاں۔“
 ”ٹھیک ہے۔ میں آتا ہوں۔“ اس نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔
 ”کیا ہوا۔ تیمور تو ٹھیک ہے نا؟“ ماورا کا پہلا سوال ہی تیمور کے لیے تھا۔
 ”نہیں۔ وہ ٹھیک نہیں ہے۔“ ولید نے صاف بتا دیا۔
 ”کیا ہوا ہے اسے؟“ ماورا کی پریشانی دیدنی تھی۔
 ”یہ تو وہاں جا کر ہی پتا چلے گا۔“ ولید اب جانے کے لیے پر تزلزل رہا تھا۔
 ”میں بھی ساتھ چلوں گی۔“ وہ بھی تیار تھی۔
 ”پھر وہی تماشا ہو گا؟“ ولید نے اسے روکنا چاہا۔
 ”تماشا تو اب ہر روز ہوتا ہے۔ پلیز مجھے روکو مت۔ ڈرائیور سے کہو گا ڈی ٹکالے۔ میں تب تک امی اوہلی گل کو بتا دوں۔“ ماورا کہہ کر اندر کی طرف لپکی تھی۔



ماورا کو گیٹ روم کی طرف بھیج کر ولید ڈاکٹر شاہ نواز کے پاس باہر ہی رک گیا تھا اور وہ اکیلی اندر آگئی تھی۔ تیمور سامنے ہی جہازی سائز بیڈ پہ بے سوجھ بڑا تھا اور اس کی حالت دیکھ کر ماورا سے رہا نہیں گیا تھا۔ وہ بے اختیار ہھاگ کر بیڈ کے قریب آئی تھی اور بے سدھ بڑے تیمور سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔ اس نے ایسی بے اختیاری کا بھی سوچا بھی نہیں تھا، لیکن تیمور کو اس حال میں دیکھ کر وہ خود کو روک نہیں پائی تھی۔

اس کے آنسو تیمور کے سینے میں جذب ہو رہے تھے اور اس کی قمیص بھیگتی جا رہی تھی۔
 ”مم۔ ما۔ ورا۔“ تیمور غنودگی میں کسکھایا تھا۔
 ”تیمور پلیز۔ اٹھو۔ آنکھیں کھولو۔ پلیز ٹھیک ہو جاؤ۔ میں۔ میں بہت پریشان ہوں مجھے ضرورت ہے آپ کی۔ میں بہت اکیلی ہوں۔ تیمور میں بہت اکیلی ہوں۔ مجھے تمامت چھوٹا۔ پلیز۔“
 وہ اس سے لپٹ کر روتی ہوئی اپنی تکلیف اور اپنی تمنائی کا اظہار کر رہی تھی۔ کیوں کر اس کی بے بسی کوئی سمجھ ہی نہیں پاتا تھا۔

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہوئی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

”ما۔۔۔ اور۔۔۔!“ تیمور کے ہوش ذرا سا پھر پھڑپھڑائے تھے اور اورانے اس کے سینے سے سراٹھا کر اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔

اس کے چہرے پہ اتنے دنوں کی بڑھی ہوئی شیوہتی اور آنکھوں کے گرد حلقے نظر آرہے تھے۔ ورنہ یہی چہرہ ہمیشہ اتنا تروتازہ نظر آتا تھا کہ ماورا نظر اٹھا کر دیکھتے ہوئے بھی گھبرا جاتی تھی۔ اور آج۔۔۔

”تیمور۔۔۔“ ماورا اس کی پیشانی پہ اپنی پیشانی ٹکا کر پھر سے رو پڑی تھی اور اس کی آنکھوں سے گرنے والے آنسو تیمور کی پلکیں بھگونے لگے تھے۔

”تیمور پلیز۔۔۔ ٹھیک ہو جاؤ۔۔۔ اٹھ جاؤ اس بستر سے۔۔۔ معاف کرو مجھے۔۔۔ میں تمہاری ہوں۔۔۔ میرا سب کچھ تمہارا ہے۔۔۔ تم نہیں ہو تو۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔ تمہارے سوا کچھ بھی نہیں چاہیے۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔“

ماورا کی مدھم آواز میں سرگوشیاں تیمور کی سماعتوں میں اتر رہی تھیں، مگر وہ مکمل ہوش میں نہیں تھا۔ البتہ اتنا احساس ضرور تھا کہ ماورا اس کے پاس ہے۔ اس کے قریب ہے۔ اس کے سینے سے لگی ہے۔ اس کو چھو رہی ہے۔ اس کے قرب کی خوشبو تیمور بے ہوشی میں بھی محسوس کر رہا تھا۔

”ماورا۔۔۔ مہ۔۔۔ میں۔۔۔ بہت۔۔۔ محبت۔۔۔ تم سے۔۔۔“

اس کے الفاظ بہت بے ربط سے ہو رہے تھے اور اس کے اوپر جھکی ماورا نے یکدم سراٹھا کر تیمور کے چہرے کو دیکھا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں۔

”ہاں۔۔۔ مجھے پتا ہے۔۔۔ آپ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اور مجھے اسی محبت کی ضرورت ہے۔۔۔ مجھے وہی محبت دوبارہ چاہیے۔۔۔ ہمیشہ چاہیے۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چاہیے۔۔۔“

وہ اس کے چہرے کو سہلا رہی تھی اور تیمور نے اس کے ہاتھوں پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا وہ مکمل غنودگی میں تھا۔ جبکہ ماورا کے دل پہ ایک تسلی، ایک دلا سے کا سا ہاتھ پڑا تھا۔ اس نے تیمور کے سینے پہ سر رکھ دیا تھا۔



آفاق کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی شینہ یزدانی نے اس کے کمرے کا چپہ چپہ کھنگال ڈالا تھا۔ اور اس کے اسٹڈی روم کی الماری سے انہیں وہ فائل مل ہی گئی تھی جسے آفاق یزدانی نے ہمیشہ چھپا کر رکھا تھا۔

فائل پہ ڈاکٹر شاہ نواز کا نام جگمگا رہا تھا۔ اور شینہ یزدانی کے ہاتھ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے فائل کا صفحہ پلٹا۔

”ہیشنٹ۔۔۔ آفاق یزدانی۔۔۔ وہ اس کا نام پڑھتے ہی کرسی پہ ڈھے گئی تھیں۔

”آئی۔۔۔“ فارہ نے یکدم لپک کے انہیں سنبھالنے کی کوشش کی تھی، لیکن سامنے ہی میز پہ رکھی فائل پر نظر پڑتے ہی اس کے قدم ٹھک گئے تھے۔ اس نے کسی انہونی کے خیال سے لرزتے ہوئے فائل اٹھا کر دیکھی اور اس کی آنکھوں کے سامنے زمین و آسمان گھوم گئے تھے۔ قدموں سے جان ختم ہو گئی تھی اور کھڑے رہنا بس سے باہر تھا۔

”آفاق۔۔۔“ اس کی چیخ بہت بلند تھی۔

وہ تیمور کے نیچے گری گئی اور تب تک آفاق بھی اندر داخل ہو چکا تھا۔

”فارہ۔۔۔!“ وہ یکدم اس کی طرف بھاگا اور شینہ یزدانی بھی چیخ کر اس کی طرف لپکی تھیں۔

(باقی آئندہ)

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ شعاع نومبر 2016 200

شہرِ حلیا

بیہ، عنایہ کے کمرے میں گئی تو اس نے دیکھا، عنایہ نزع کے الم میں تھی۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ اس نے بیہ سے کہا کہ تمہاری خاموش اور صبر جیت گیا اور میری فرماں برداری ناکام ہوئی۔ میرا دل اور ہاتھ دونوں خالی ہیں۔ مجھے اس سے محبت تھی۔ وہ میرے اندر رہتا تھا۔ میں جان ہی نہ سکی۔ تم اسے بتا دینا کہ مجھے اس سے کتنی محبت تھی۔ بیہ کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اسے ”فاح“ سے عشق تھا، بیہ ساکت رہ گئی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ دیا کو عنایہ کی موت کے بارے میں بتانے لگی۔

دیا کا کمرہ خاص تہ خانے میں تھا۔ جہاں وہ عبادت کرتی تھی۔ وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ بیہ پہلی بار وہاں گئی۔ کمرے میں داخل ہو کر وہ پتھر ہو گئی۔

دیا بھی مرنے کے قریب تھی۔ وہ بری طرح چلا رہی تھی۔ بیہ جو اس سے گزرے برسوں کا حساب لینے آئی تھی۔ کچھ نہ کہہ سکی۔ دیا نے دم توڑ دیا تھا۔ وہاں کچھ تصویریں تھیں ایک ہی بندے کی تصویریں اور دیا کی ڈائریاں۔ ان ڈائریوں کے ساتھ ایک رقعہ تھا جس پر لکھا تھا۔ ”انہیں پڑھ لینا۔ تمہارا تجتس دور ہو جائے گا۔“

بیہ نے کچھ قریبی لوگوں کو ان دونوں اموات کی اطلاع دی تھی اور فاح کو بھی فون کر کے عنایہ کی موت کے بارے میں بتایا تھا۔ فاح نے سرد لہجے میں کہا تھا کہ تم یہ اطلاع رافع کو دے دو۔ بیہ کے جتانے پر کہ رافع اس کا شوہر ہے اس نے سرد مہری سے کہا کہ وہ اب اس کا شوہر نہیں ہے۔

بیہ نے رافع کو اطلاع نہیں دی تھی۔ افسون مشدی ایک بزنس ٹائیکون کی اکلوتی بیٹی تھی رافع ابراہیم ایک مزدور تھا۔

ناولٹ

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM



افسون مشدی نے اس کو دیکھا اور اس کی اسیر ہو گئی۔ لیکن رافع ابراہیم نے اس پر توجہ نہ دی۔ افسون نے اسے اپنے باپ کی آکل کمپنی میں ملازمت دے دی۔ وہ اسے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ تب ہی ایئر پورٹ پر افسون پہنچ گئی تھی اور اس نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جب رافع ابراہیم نے مانا تو اس نے اسے روکنے کے لیے انتہائی قدم اٹھالیا تھا۔ مدید نے اپنے دوست حریر کو اپنی منگنی میں آنے کی دعوت دی تھی اور کہا اپنے ساتھ ایک اور ”دوست“ کو بھی لے آنا۔ مدید کا یہ دوست پاگلٹ ہے۔ وہ انتہائی وجہ ہے لیکن ساتھ ساتھ بدماغ اور غصیل بھی ہے۔ اناویہ بہت حسین دل کش تھی۔ اس کی کلاس فیلو رہا اس کے لیے اپنے بھائی کا رشتہ لے آئی۔ اناویہ نے اس کو ناراضی سے منع کر دیا اور کہا اس رشتہ سے انکار کی وجہ خود رہا ہے۔

روبا جب اناویہ کے گھر گئی تو اس نے اناویہ کے تایا زاد ابراہیم کو دیکھا۔ اس کی گہری محبت بھری نظریں روبا کو ڈنڈا بن کر گئی تھیں۔

فوزان مشدی کے آکل پلانٹ پر کام ہو رہا تھا۔ فوزان مشدی اپنے ایک ایک ورکر سے بخوبی واقف تھے۔ پچھلے چھ ماہ سے ان کے پلانٹ پر ایک ورکر کام کر رہا تھا۔ اسے افسوں کی سفارش پر رکھا گیا تھا۔ یہ ورکر بہت غیر ذمہ دار اور لاپرواہ تھا۔ یہ لڑکا رافع ابراہیم تھا۔ فوزان مشدی کو بتایا گیا کہ وہ معاہدہ توڑ کر نظر ان سے فرار ہو رہا ہے تو فوزان مشدی کو غصہ آ گیا اور اس نے خروج لگوا کر اسے جیل بھجوا دیا۔

افسون مشدی کی اپنی سوتیلی ماں آگینے سے بہت اچھی دوستی تھی۔ اس کے سوتیلے بھائی حمیر اور عمیر بھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ افسوں کا اپنا سگا بھائی ناراض ہو کر گھر چھوڑ گیا تھا۔ رافع ابراہیم کے جیل جانے سے افسوں بہت پریشان تھی۔ وہ اسے باہر نکالنا چاہتی تھی۔ وہ اسے چھڑانے کے لیے جیل چلی گئی جس کی وجہ سے اس کا باپ بہت پریشان ہو گیا۔

حریر اپنے پاگلٹ دوست کے ساتھ ڈین ہیک پہنچا تو مدید قاضی انہیں لینے نہیں آیا تھا۔ حریر نے اسے بتایا کہ مدید نے اپنی منگنی میں شرکت کے لیے بلایا ہے۔ یہ سن کر اس کا پاگلٹ دوست سچا ہو گیا تھا۔ وہ مدید کی منگنی میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا، لیکن مدید نے اسے زبردستی روک لیا۔

مدید نے زندگی میں بہت بڑے دن دیکھے تھے۔ امید اس کی خالہ زاد بھی جس سے اس کی منگنی ہونے والی تھی۔ اس کے خالو خوش حال تھے۔ رانیہ کی شکل میں مدید کی لائری نکلی تھی۔

افسون نے پہلی بار جب رافع ابراہیم کو دیکھا تھا تو وہ ایک معمولی مزدور تھا۔ اس کی تباہ حالی کے باوجود افسوں اسے دل

دے بیٹھی وہ اس کی منت سماجت کر کے اسے اپنی کمپنی میں لے آئی۔ رافع ابراہیم ماضی کے کسی واقعہ کی وجہ سے شدید پشیمانی اور اذیت کا شکار تھا۔ اس نے افسوں کی محبت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی ہر ممکن مزاحمت اور انکار کے باوجود افسوں نے ہار نہیں مانی تھی اور بالآخر رافع نے ہتھیار ڈال دیے، لیکن اس کا کمزور دل یہ برداشت نہ کر سکا اور اس کی سانس بند ہونے لگی۔ افسوں یہ منظر نہیں دیکھ سکی اور خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلی تھی، لیکن وہ پہنچ گیا تھا۔

فوزان مشدی کو پتا چلا کہ وہ جیل سے رافع کو نکال لائی ہے تو انہوں نے افسوں کو بتایا کہ وہ رافع کے متعلق ساری معلومات کراچے ہیں۔ وہ اپنے خاندان کا دھکارا ہوا ہے۔ اس نے اپنے بھائی کی بیوی پر بری نیت رکھنے کا گناہ کیا تھا۔

تیسری قسط

باہر نیم اندھیرا تھا۔ کالے سفوف میں — نقرہ کا پاؤڈر کھول دیا ہو۔ آسمان پو پھٹنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ آسمان پر سفید چودھویں کے چاند کی سفید طبع والی رنگت کے باعث رنگ کی دھاریاں کہیں کہیں دکھائی دیتی تھیں۔ جیسے روشن اور سفید تھا۔ البتہ زمین تاریک تھی۔ اور برقی

بابوں اور گلوں کی وجہ سے روٹھنیاں بنائی گئی تھیں پورے ماحول پر سکوت طاری تھا۔ بس ماربل کے چکنے فرش پر عنایہ کے دادا کی لاکھی ٹیکنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہ مضطرب سے جھکے کندھوں اور جھکے سر کے ساتھ عزم کے ڈاکٹر شوہر کو ہدایات دے رہے تھے۔ ارسل اور رمیز کے علاوہ مرگ والے گھر میں فونگی کے انتظامات سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا۔ ابھی فجر کی اذانیں نہیں ہوئی تھیں اور دکانیں بھی ساری بند تھیں۔

عنایہ کے دادا رمیز کو دھیمی آواز میں کچھ سمجھا رہے تھے۔

”ابھی فجر کی اذان نہیں ہوئی۔ لوگ گھروں میں ہیں۔ مسجدوں میں نہیں گئے۔ تھوڑی دیر بعد تک مسجد سے اعلان کروا دینا۔ اور شریف کو فون کر لویا اس کے گھر کسی کو بھیج کے اطلاع کرو۔ دن چڑھنے سے پہلے قنات اور شامیہ لگا جائے۔ دریاں بچھا جائے۔ نائی، قصائی اور دیگوں کا انتظام بھی کر لو۔ اور ہاں گورکن سے کہنا میرے بیٹے کے برابر جو جگہ ہے۔ وہ اس کی ماں اور میرے لیے مختص تھی۔ اس جگہ ہی میری پوتی اور بہو کے لیے لحد کا انتظام کرو۔ میرے بیٹے کے دامیں اور بائیں۔“ ان کی بوڑھی گدلی آنکھ سے آنسو بہتے تھے اور ان کی سفید ریش کو نم آلود کر جاتے۔ اس کم آمدورفت والے تاریک اور سنسان کونے میں دیوار سے لگی بیہ کائنیتی تھی اور گھنٹوں میں منہ چھپا کر روتی تھی۔ اور اس کے کان مکھیوں کی سی جھنجھٹا ہٹ کو سنتے تھے۔

”دیا اور عنایہ کی اجانک موت تو ایک ”معمہ“ ہے۔ انتہائی پراسرار ابھی گزری ہوئی شام کو میں نے

عنایہ کو ٹیرس پر بیٹھا دیکھا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک تھی۔ مجھے گمان بھی تھا کہ اگلے تین چار گھنٹوں میں وہ ختم بھی ہو جائے گی۔“ یہ ثوبیہ آنٹی کی ساس تھیں۔ واصف تایا کی والدہ ارسل کی وادی۔

”اور دونوں ایک ساتھ۔ کچھ تو ہے ناپراسرار“

واصف کہہ رہے تھے یہ تو پولیس کیس ہے۔“ ثوبیہ آنٹی کی آواز آئی تھی۔ وہ میتوں کے قریب بیٹھی تھیں۔ لیکن اتنا بھی قریب نہیں ہاں عزم وہیں تھی۔ عنایہ کے سرہانے اور ایک وہی تھی۔ ان چار کئی چنی خواتین میں بس رونے کا فریضہ ادا کرنے والی۔

وہ عنایہ کی نفرتی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھتی اس کے سر سے ماتھا ٹکراتی، رو رہی تھی۔ ہاں اس کا رونا تو بنتا تھا۔ عنایہ کے ساتھ ایک اسی کا خونی رشتہ تھا۔ وہ عنایہ کی پھوپھی زاد بہن تھی۔ اکلوتی پھوپھی زاد۔

اور اس تاریک گوشے میں عزم کے بین سنتی اور خوف زدہ نظروں سے عنایہ کی بند آنکھوں والے چہرے کو دیکھتی بیٹھ کانوں پر ہاتھ رکھ کر کرب کی ننگی ٹکوار پر چل رہی تھی۔

اس تاریک اور سنسان گوشے میں باتوں کی جھنجھٹا ہٹ کے ساتھ ساتھ عنایہ کا چہرہ بھی اس کے سامنے تھا۔ اور اس کی سفید رنگت میں زعفرانی سورج کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا تھا۔

یوں لگتا تھا وہ اپنے شہزادیوں والے تخت پر بڑی چین کی نیند میں گم ہے۔ ہر آواز، ہر ہلکا ہر آواز سے قطعی طور پر آزاد خوش، اور ہلکی پھلکی کسی تنگے کی مانند جو سبک خرام ندیوں کی ابلق سطح پر شان سے تیرتا ہو۔

اور اس کے برابر یعنی اس سوئی ہوئی شہزادی کے برابر اس مغرور ملکہ کا بھی تخت موجود تھا۔

وہ ملکہ جو ”سلطنت شخصی“ کی پوری سلطنت پر اپنا حکم چلاتی تھی۔ اس کا شفاف چہرہ عمر رواں کی کسی بھی شکن سے بے نیاز تھا۔ وہ آج بھی مغرور اور خوبصورت تھی، لیکن وہ ایسی بد قسمت ملکہ تھی جس کے حسن کو خراج تحسین پیش کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

وہ خود کو ”دیوی“ سمجھتی تھی۔ قابل ستائش ہستی جس کے حسن کے چرچے کیے جاتے آج یہ ملکہ اپنے اس ”دیوان خاص“ میں بالکل تنہا اور بے بس تھی۔

”کیا یہ نے یہ کیا؟“ اس کے سر سراتے لہجے میں
 ٹوکی ہوئی سی کٹ تھی۔



اور اتوار کے روز ابا کچے — آم لے آئے تھے۔
 پہلے پہلے تازہ لیموں اور ہری مرچیں، اماں اچار ڈالنے
 کے لیے برآمدے میں بیٹھ گئی تھیں۔ روٹی ان کے
 ساتھ تھی، اور مرجوں کے بیچ میں کٹ لگا رہی تھی،
 جس کے اندر اماں مسالا بھر رہی تھیں۔ اماں کے
 چہرے پہ گہری سنجیدگی تھی، ماتھے تک ململ کا دوپٹا
 کیے لیوں پہ کوئی تسبیح پڑھتی ہوئی ان کے چہرے پہ
 پریشانی تھی۔ روٹی گا ہے بگا ہے نگاہ ڈالتی اور جھکا لیتی۔
 ”رات تمہارے ابا پوچھ رہے تھے یہ روبا کا
 آخری سال ہے۔ میں نے کہا ہاں تو کہنے لگے، اب
 بڑھائی کا سلسلہ ختم کرواؤ۔“ اماں کی سنجیدہ سی آواز
 کانوں میں اتری تو وہ چونک گئی۔

”پھر آپ نے کیا کہا؟“

”میں نے کہا۔ آپ بسم اللہ کریں۔ کوئی ڈھنگ کا
 رشتہ ملتا ہے تو کاشف کے ساتھ ہی تمہارا بھی۔“ اماں
 بولتے بولتے چپ ہو گئی تھیں۔ روبا کے حواس گم
 ہوئے۔

”اماں! اتنی جلدی بھی کیا ہے۔“ وہ ٹھنک کر بولی
 تھی۔

”جلدی کا ہے کی۔ کاشف کے ساتھ ہی کروں گی۔
 برائی لڑکیاں کہاں برواشت کرتی ہیں۔ نندوں کا وجود تو
 ٹھکاتا ہے۔“

اماں دھیمی آواز میں کہہ رہی تھیں۔ روٹی نے گہرا
 سانس بھرا۔ اگر اماں نے طے کر رکھا تھا تو پھر انہیں
 کون روک سکتا تھا۔ وہ چپ چاپ مرتبان بھرتی
 رہی۔ لیموں، مرچیں اور آم گور اس کی آنکھوں میں
 بھی عجیب سی مرچیں گھس رہی تھیں۔ اور آنکھوں

کے پار ایک عکس تھا۔ دھندلا اور میلا سا۔ اس کا دل
 جیسے بند ہونے لگا۔ دو آنکھوں کی پیش اسے اس وقت

اس کا کوئی پرستار نہیں تھا۔ اور وہ اپنے تمام تر
 کروفر، غرور، مشغولیت اور تاب ناک حسن کے ساتھ
 ایک ”مسادھ“ میں دفن ہونے جا رہی تھی۔ بیہ نے
 کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ آج بھی اس عورت
 کے چہرے کی طرف نگاہ بھر کے دیکھنے کی تاب نہیں
 لاسکتی تھی۔ اس کے کان ابھی تک باتوں کی ہلکی
 جھنجھناہٹوں کو سنتے تھے۔

”عزتلیہ کے دادا چپ تو نہیں رہیں گے۔ کچھ نہ کچھ
 تو کریں گے۔ ڈاکٹری رپورٹ اور پوسٹ مارٹم تو ضرور
 ہونا چاہیے۔ آخر پتا تو چلے، یہ طبعی موت ہے
 یا۔“ تو بیہ کی آواز غراتی ہوئی تھی۔ پھر اس غراہٹ
 میں کئی اور آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ کورس میں
 گائی اور مگر مجھ کے آنسو بہائی، یہ بھی سوگ کا انداز
 تھا۔

”مجھے تو صاف صاف قتل کی واردات لگتی ہے۔ نہ
 چور نہ مور نہ کوئی ہو۔“ اس رسل کی دادی نے اپنے
 موٹے ہاتھوں میں چاندی کے منکوں والی تسبیح گھماتے
 ہوئے تاریک گوشے میں بیٹھی بیہ کے بھرے، ملگجے
 ویران سر آپسے نگاہ جمائی تھی۔

”قاتل گھر میں ہے، یہیں کہیں“ اس پاس۔“ وہ
 جیسے اپنی مکار آنکھوں کو گھمائی قاتل کی خوشبو سونگھ
 رہی تھیں۔ اور ان کی نیزے جیسے نگاہوں کا مرکز بیہ
 کا نحیف وجود تھا۔

”یہ دھن دولت، کروڑوں کی مالیت کا بنگلہ گاڑی
 اور دیا کے ہیرے موتی کا زیور، ان دونوں کے بعد اس
 ساری وراثت کا مالک کون ہے، یہی نا۔ یہ ساری عمر اس
 گھر میں رہتی آئی ہے، جس تھالی میں گھلایا اس میں
 چھید کیا۔ لکھوالو مجھ سے، اسی نے کام تمام کیا
 ہے۔“ انہوں نے فرد جرم عائد کر دی تھی۔ انہوں نے
 ٹھیک ہی کیا۔ بیہ اسی قاتل تھی۔ اور وہ واقعی اسی قاتل

تھی۔ ڈھیر ساری آوازوں میں ایک اور آواز کا اضافہ
 ہوا تھا۔ عزم تھی، جو اپنے آنسو پونچھتی دادا سے کہہ
 رہی تھی۔

”یہ ابا کو بتا ہے۔“ کاشف نے کہا تھا۔
”بلا ہی بلا سب کچھ طے کر لیا، حتیٰ کہ کھانے پہ
بلا لیا۔ اور مجھے بتایا تک نہیں، بس سرسری سا ذکر کیا
تھا۔“ اماں سنجیدہ تھیں۔ اور ابا سے کچھ خفا بھی، بھائی
انہیں سمجھا رہا تھا۔

”ابا نے ساری چھان بین کروائی ہے۔ تب ہی
انہیں گھر پہ بلایا ہے۔“

”لیکن وہ رسمی سی کارروائی، انہوں نے ہماری بچی تو
دیکھی ہی نہیں۔“ اماں وہی پرانے خیالوں والی
عورت۔ روپا کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ تو کوئی اسے
دیکھنے کے لیے آ رہا تھا۔

”انہوں نے روپا کو دیکھ رکھا ہے تب ہی تو آرہے
ہیں۔“ بھائی کی اطلاع نے اماں کے ساتھ ساتھ روپا
کو بھی حواس باختہ کر دیا تھا۔

”اور وہ رشتہ ڈالیں گے رسم کرنے آئیں
گے۔“ بھائی نے انہیں ششدر کیا اور اٹھ کر نہانے
چلے گئے تھے۔ اماں برآمدے میں اکیلی بیٹھی رہ گئی
تھیں۔ سوچوں میں گم اور حیران۔

”یہ کاشف کے ابا بھی نا بیٹیوں کے رشتے بھلا ایسے
طے کیے جاتے ہیں۔“

اماں کی بریڈا ہٹ روپی کو بچن میں سنائی دیتی تھی اور
اس کا دل جلتے ہوئے چولہے کی تپش جیسی آج دیتا
تھا۔ دو گہری بولتی آنکھیں اس کے گرد حصار کھینچتی
تھیں۔

راہ چلتے اس مسافر کی گہری آنکھوں کا قیام اس کے
دل میں بس گھڑی بھر کے لیے ہی تھا۔

وہ اس حقیقت کو چند ساعتوں میں ہی سمجھ گئی
تھی۔ اس نے تسلیم کر لیا کہ دل میں اکتھتی یہ ہلکی ہلکی
تپش ابا کے کیے گئے فیصلوں کے سامنے کوئی معنی نہیں
رکھتی۔

وہ ہنڈیا میں چھپے ہلاتی بے آواز بڑبڑاتی تھی۔ ”جو اب
جا ہیں، جو اب جا ہیں۔“

اماں کے ساتھ ساتھ روپا بھی چونکی۔ بھائی تو اس
وقت آتے نہیں تھے۔ تو پھر کون آیا تھا؟

کچھ ہی دیر بعد دروازے پہ دستک ہوئی۔ اماں اپنی
جگہ سے اٹھیں، پہنچی پہ ہاتھ دھونے اور ”اللہ خیر
کرے“ کہتی گیٹ پہ پہنچیں، دوسری طرف کاشف
بھائی تھے۔ کچھ لدے پھندے سے، اماں حیران تھیں
تو روپی سخت پریشان، بھائی تو اس وقت گھر آتے ہی
نہیں تھے۔

اماں بھائی کے ساتھ ساتھ چلتی برآمدے تک آئی
تھیں۔ ان کا چہرہ لال سا تھا۔ جیسے بھائی نے کچھ بتایا
ہو۔ جبکہ بھائی نے سارے تھیلے اس کے ہاتھ میں
تھمائے۔

”روپا! اچھا سا کھانا بنا لو۔ اور دیکھو، کسی اور چیز کی
ضرورت تو نہیں؟“ بھائی کا انداز مصروف سا تھا۔ اماں
پر سوچ تھیں جبکہ روپی گھبرائی گھبرائی۔

”کون آ رہا ہے بھائی؟“ اس نے ایسے ہی پوچھ لیا
تھا۔ اماں نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر خفگی سے
بولیں۔

”تمہیں اس سے کیا۔ جاؤ، جو بھائی نے کہا ہے
کرو۔“ اماں کے ڈانٹنے پہ وہ سامان سمیٹ کر اندر چلی
گئی تھی۔ اندر یعنی بچن میں، جس کی کھڑکی برآمدے
میں کھلتی تھی، جہاں پہ بھائی اور اماں بیٹھے تھے۔ اور ان
کی دھیمی آوازیں بچن میں بہ آسانی درتی تھیں۔

”ابا سے ان لوگوں کی چند دن پہلے بات تو ہو گئی تھی،
آج اچانک ہی آنے کا پروگرام بن گیا۔ ابا نے مجھے
کارخانے میں بلوایا۔“ بھائی اماں کو آنے والے
مہمانوں کے بارے میں تفصیلات فراہم کر رہے تھے۔
روپی کے کان خود بخود کھڑے ہوئے۔

”یہی بات تو سمجھ میں نہیں آرہی کہ اس کے توسط
سے آرہے ہیں؟“ اماں کی ابھی ابھی آواز نے روپی کو

چونکا دیا تھا۔ اس نے گوشت کے شاپر کو سلیب پہ

”مسکون سے کھانا رکاوٹی! اور دھیان رہے بھائی گھر پہ ہے تمہارے آسوا سے چونکادیں گے۔“ اماں کی نرم سی محتاط تنبیہ اس کی زمانہ ساز معاملہ فہم اور ذہین ماں۔

”جوان بھائیوں کی عقل کا پرہ پتلا ہوتا ہے بلاوجہ بھی پھٹنے میں دیر نہیں کرتا۔“

عام سے لہجے میں اتنا گہرا سبق، رونی کا سر جھک کر گھٹنے سے جا لگا تھا۔ اس نے ماں کا دیا گیا سبق سمجھ لیا تھا۔ اور پلو سے باندھ لیا۔ اور اماں تو اسے وقتاً فوقتاً ٹوکتی اور سمجھاتی رہتی تھیں۔ اوائل عمری سے لے کر اب تک ایک ہی سبق تھا۔ ان کا ٹوکنا اور ممانعت سر شام چھت پہ نہ جانے دیتیں۔

”بھوت بریت کا وقت ہوتا ہے۔ خلائی مخلوق سفر میں ہوتی ہے۔ چھت پہ نہیں جاتا۔“

وہ گرمی کی شدت اور جس سے گھبرا کر اکثر سہ پہر کے بعد چھت پہ جانے کے لیے پھلتی تو اماں کی نرم سی تنبیہ اس کے قدم روک لیتی تھی۔ کبھی وہ مان گئی اور کبھی اندر ہی اندر جھنجھلا جاتی تھی۔ تاہم ظاہر نہ کرتی۔

”جانے یہ کون سی خلائی مخلوق ہے جو مجھے نظر نہیں آتی؟ اماں کو دکھائی دیتی ہے۔ ہونہ سارے لوگ تو چھتوں پہ چڑھتے ہیں اس وقت اور لوگوں کی جوان بیٹیاں بھی یہ خورشید خالہ کی شہنائی رہتی ہے پورا دن چھت کے اوپر۔ گلی میں لٹک رہی ہوتی ہے۔ اس کو آج تک کوئی بھوت نہ لے آڑا۔“ وہ اندر ہی اندر بل کھاتی تھی اور کبھی منمناتے ہوئے کہہ بھی دیتی۔

”اماں! شہنا لوگ بھی تو چھت پہ چڑھتی ہیں۔ سارا وقت وہ ریٹنگ پہ لٹکی رہتی ہے۔“

اماں اس کی دلیل پہ عینک کے اوپر سے گھور کر دیکھتیں اور سلائی مشین کے پرنزوں کی صفائی میں مگن ہو جاتیں۔

”شہنا کے بھائی تو اسے نہیں ٹوکتے۔ وہ مشین کا تیل

سورج اور گرمی کا میل چل رہا تھا۔ دن کا دوسرا مگر سخت پہر گرمی جسم کا لہو نچوڑتی تھی۔

درخت تک ساکت، خاموش اور خشک دکھائی دیتے، پرندے ڈالیوں اور شاخوں میں منہ چھپائے اونگھتے، آب خورے خشک تھے۔ اور چڑیوں کی کنوڑیاں خالی۔

”جانے روبہ کیسے بھول گئی۔“ وہ برآمدے کے تخت سے اٹھیں، پیروں میں چپل اڑی اور ٹھنڈا پانی گھرے سے نکال کر دھلے ہوئے آب خوروں میں پانی ڈالا۔ پھر باجرے سے مٹی کی کنوڑیاں بھردیں۔

معا! انہیں باورچی خانے سے سسکی کی آواز آئی۔ ہلکی سی سسکی۔ جیسے روکنے کی کوشش میں ہونٹوں کو زبردستی ایک دوسرے میں پیوست کیا گیا ہو۔

روبا کی ماں کا دل کپکپا سا گیا تھا۔ وہ تیزی سے باورچی خانے کی طرف بڑھنے لگیں۔ دل میں وہم سا آیا تھا کہیں روبہ نے خود کو جلانہ لیا ہو، بے دھیان بھی تو بہت تھی۔

وہ کچن کی دہلیز پہ آکر کھڑی ہوئیں تو روبہ کی آواز نے انہیں ساکت کر دیا تھا۔

”جیسے ابا چاہیں۔“ وہ بار بار ایک ہی جملے کو دہراتی تھیں۔ اور اس کی سسکیاں؟ اماں کا دل پہلو میں تڑپ اٹھا۔ انہیں آن کی آن میں معاملہ سمجھ میں آ گیا تھا۔ روبہ نے ان کی باتیں سن لی تھیں، اور اب اسی تناظر میں رو رہی تھی۔ کتنا چھوٹا سا دل تھا ان کی بیٹی کا۔ ان کا دل ممتا کے احساس سے لہاں بھر گیا۔

”روبا! کیسی نادان ہو بیٹی! کوئی ایسے بھی روتا ہے ابا یہ تو نہیں چاہیں گے کہ ابھی کے ابھی تمہارا ہاتھ آنے والے مہمانوں کے ہاتھ میں دے کر چلتا کروں۔ ابھی تو صرف بات چلے گی بیٹی! تم نے دل ہی چھوڑ دیا؟“ اماں کی نرم آواز پہ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ اماں جانے کب وہاں آئی تھیں۔

سوراخوں کے اندر ڈالتی ہوئی مصروف نظر آتی تھیں۔
 ”اور تمہارا بھائی پسند نہیں کرتا۔ تمہارا چھتہ
 چڑھنا۔“ اماں کے انداز میں نرمی ہوتی تھی۔ وہ بہت کم
 روپا کو ڈانٹتی تھیں۔ بلکہ ڈانٹتی ہی نہیں تھیں،
 دراصل روپا نے کبھی ڈانٹ کھانے والا کام ہی نہیں کیا
 تھا۔

اگر بھائی پسند نہیں کرتے تو اسے بھائی کی پسند کا
 خیال رکھنا چاہیے۔

دل میں خوف سا بیٹھ گیا تھا۔ اور وہ دن کے وقت
 بھی چھتہ پہ نہیں جاتی تھی۔ پھر دو ہفتے بعد محلے
 سے اڑتی اڑتی ایک خبر روپا کے کانوں سے ٹکرائی
 تھی۔

”شہنا۔ بھوت آگئے تھے۔“

روپا نے سنا تو دھک سے رہ گئی۔ یعنی اماں کا کما
 جھوٹ نہیں تھا۔ اماں نے سچ بولا تھا۔ اور اماں کا تجربہ
 غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ اس دن اماں تکیوں سے روٹی
 نکال کر کھن میں رکھے چرنے پہ روٹی کات رہی
 تھیں۔ روٹی سسہی سسہی سی اماں کے قریب رکھی دری
 پہ بیٹھی سر ہلا ہلا کر سبق یاد کرتی تھی مگر اس کا سارا
 دھیان خالہ خورشید کی آہ و بکا کی طرف تھا۔ وہ اماں کے
 پاس بیٹھی رو رہی تھیں۔

ہائے میری جوان بچی! اتنے پیروں غفیریوں کو دکھایا
 پر کوئی افاقہ نہیں۔ بال نوچتی ہے اپنے بازوؤں میں
 دانت کھبوتی ہے۔ اپنی بوٹیاں نوچتی ہے۔ چلائی
 ہے دیواروں سے ٹکریں مارتی ہے۔ میں کدھر جاؤں
 آجی! اسے کس کو دکھاؤں۔

اماں نے چرنے سے نگاہ ہٹا کر اک نظر روپا کو دکھا
 اور آنکھ کی تکی سے اشارہ دیا۔

”خالہ کے لیے شربت بنالو۔“

یہ واضح اسے وہاں ہٹنے کا اشارہ تھا۔ اماں نہیں
 چاہتی تھیں کہ روپا خالہ خورشید کا داویلا بنے۔ وہ
 بھرے دل کے ساتھ کتاب دری پہ رکھ کر باورچی
 خانے میں آگئی تھی۔ لیکن اس نے شربت کے لیے
 پانی میں چینی گھولنے سے پہلے کھن میں کھانے والی کھڑکی

کا ایک پٹے غرور کھول دیا تھا۔
 اسے اماں کا جواب سننے کی بے چینی تھی اور اماں
 دھیمی آواز میں کاتی ہوئی روٹی کو گاتھ میں باندھتی
 ”آہستہ سے بولیں۔“

”ماں ہونا؟ تو ماں میں طبیب، حکیم، فقیر، پیر سب کچھ
 خود ہی ہوتی ہیں۔ اس کا ”مرض“ اکیلے میں پوچھو۔
 سارے ”بھوت“ آتر جائیں گے۔“

اماں کے جواب نے زمانہ ساز خالہ خورشید کے بند
 دماغ کی کھڑکی کھول دی تھی۔ اور اس دن خالہ خورشید
 شربت پیر بغیر ہی اٹھ کر چپل گھسیٹی اور دھنی کی بکل
 مارے نکل گئی تھیں۔

اور اسی رات خالہ خورشید نے سارا پیار دلار
 بھلا کر ڈنڈے کے زور پہ اس ”جن“ کا پتا لگایا تھا۔ پھر
 اس سے اگلے دن ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔ شہنا اس
 ”جن“ کے ساتھ رات کی تاریکی میں خالہ خورشید کا
 ”رائی ہار“ تجوری سے چڑا کر گھر سے بھاگ گئی تھی۔

اس شب روپا کی اماں کا چہرہ بڑا ہی تاریک رہا۔ وہ
 صبح کے منٹے گراتیں اور روپا کے چہرے پہ پھونک مار
 دیتیں۔ اسی رات روپا پہ بھی ایک عجیب انکشاف ہوا
 تھا۔

اور اسے بھوت پریت کی حقیقت کا پتا چل گیا۔ یہ
 خلائی مخلوق کیا تھی؟ اور کس طرح آنگن کی سیدھی
 ساوی پریوں کو دور غلا کر اپنے قبضے میں کرتی، پھر ان کے
 سنہرے پر کترتی اور انہیں زمین کے اندر دھنسا دیتی۔
 ٹھیک ایک مہینے بعد شہر کے گندے نالے سے شہنا کی
 مسخ شدہ لاش کو اس کے لاپرواہائی اٹھانے کے لیے
 نکل گئے تھے اور اماں نے اس دن زرب لب بڑبڑا کر کہا۔

”جوان ہوتی بہنوں کے بھائیوں کو ایسا لاپرواہ نہیں
 ہونا چاہیے۔“ اماں کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ گرا
 اور ان کے ململ دوپٹے کی نمی میں جذب ہو گیا۔ وہ
 تخت پوش پہ کھڑی تھیں۔ پاؤں کے نیچے جا نماز
 تھی۔

”کہ بہنوں کی ڈولی اٹھانے کے بجائے ان کے
 جنازوں کو کندھا دینا پڑے۔“ انہوں نے بات مکمل

ہنڈیا میں ڈیوٹی گھماتی رہا نہ جانے سوچوں کے کس سفر پہ نکل گئی تھی۔ چونکی تو تب تھی جب خوشبو کا ایک تیز جھونکا اس کے آس پاس چکرایا۔

روبا ہڑبڑا کر جیسے نیند سے جاگی تھی۔ پھر اس نے باورچی خانے کے چوکھٹے میں کھڑے ٹکڑے سٹھرے ترو تازہ سے بھائی کو دیکھا۔ اس کا ہانکا جھلا بھائی اپنی مسانت اور سنجیدگی کے ساتھ بڑا ہی خوبو لگتا تھا۔ روبہ کی آنکھوں میں ستائش کی بھر گئی تھی۔

”کس سوچ میں کم تھیں روبہ! دیکھو تو کڑا ہی پینڈے سے جلنے لگی۔ کچھ ”بو“ بھی محسوس ہوئی ہے۔“ بھائی کے احساس دلانے پر روبہ نے جلدی سے آنچ دھیمی کی تھی اور کڑا ہی میں پانی کا چھڑکاؤ بھی دیا۔ پھر کھانا بھی تیار ہو گیا تھا اور لبا بھی کارخانے سے واپس آگئے تھے۔ اب نہادھو کر نماز ظہر ادا کر رہے تھے۔ پھر مہمانوں کی آمد کا وقت ہو جاتا۔

اماں نے روبہ کو بھی ترو تازہ ہونے کا اشارہ دیا تھا۔ اور وہ شاور لے کر پٹکھے کے نیچے اپنے لاسنے بل سکھا رہی تھی۔ جب ایک نئی ٹکڑ گاڑی ان کے گیٹ پہ آ رکی۔

بھائی ”ابا کے اشارہ کرنے پہ مہمانوں کو ریو کر کے چلے گئے تھے۔ ان کے پیچھے لبا بھی۔ آنے والے مہمانوں کو بیٹھک میں بٹھایا گیا تھا۔ اور پھر مشروبات سے ان کی تواضع کی گئی۔ بھائی اماں کو بتا رہے تھے۔

”مہمان خاتون صرف ایک ہیں اور ساتھ ان کا بیٹا بھی ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگا کہ وہ گاڑی میں ماں کا انتظار کرتا۔ میں اسے بیٹھک میں لے آیا ہوں۔ اسی بہانے آپ کی ملاقات بھی ہو جائے گی۔ اور وہ روبہ کو بھی دیکھ لیں گے۔“ اس کا ٹکڑ مزاج بھائی اس لمحے بڑا حلیم اور بروہار نظر آ رہا تھا۔

اماں سنجیدگی سے سر ہلاتی بھائی کے ہمراہ بیٹھک میں چلی گئی تھیں۔ اور روبہ اوپر تخت پہ خاموشی سے

ڈھبے گئی۔ اس کی ساری ہمت دھیرے دھیرے جواب دے رہی تھی اور وہ آنے والے وقت کی تکلیف کو اپنی رگوں میں اترتا محسوس کر رہی تھی۔ ”معا“ اماں بیٹھک سے دھیمی چال چلتی باہر کو آئیں۔ اس حال میں کہ ان کا چہرہ جذبات کی سرخی سے نمتارہا تھا۔ پھر انہوں نے بے دم بیٹھک میں روبہ کا کندھانری سے ہلایا۔ وہ چونک کر ماں کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ اماں نے اس کی موہنی سی صورت دل میں اتارتے ہوئے پیشانی پہ والہانہ سا بوسہ دیا۔ وہ اماں کے پیار کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

”میری بیٹی نے بڑا اعلیٰ نصیب پایا ہے۔ آؤ میرے ساتھ بیٹھک میں۔ تمہاری ہونے والی ساس

”اماں!“ وہ رو دینے کو تھی اور اماں اس کی گھبراہٹ کو شرم پہ محمول کر رہی تھیں۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پھر پریشان کیوں ہوتی ہو۔ اطمینان رکھو روبہ! تمہارے والدین بہتر فیصلہ کریں گے۔“ اماں نے شاید اس کے تذبذب کی وجہ جان لی تھی۔ یا انہوں نے بے ارادہ ہی بات کی تھی۔ تاہم روبہ کا سر نہ جانے کیوں جھک گیا تھا۔ شاید اس خیال سے کہ اماں نہ جانے کیا سمجھتی ہوں۔

اور جب وہ بیٹھک میں آ رہی تھی تو اسے اماں کی کئی بات کا یقین ہو گیا تھا۔ اماں نے کبھی اس کے لیے غلط فیصلہ نہیں کیا تھا اور اماں جو کہتی تھیں ”ٹھیک ہی کہتی تھیں۔“ افرایم کی ماں جب اس کی طرح پیشانی چومتے ہوئے انگوٹھی پہنا رہی تھیں تو روبہ کو اپنی قسمت پہ رشک آیا تھا۔

جن نگاہوں کی تپش اسے تنہائی میں بھی گرمی کا تپ چڑھا دیتی تھی۔ وہ نگاہیں مسلسل اس کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ افرایم کی مدد بھری خوب صورت آنکھیں۔ شمد سے بھری۔ بلوریں کلچ سی اور اس کی شہابی رنگت اور ہونٹوں کا مل، پیشانی پہ —

بکھرے لہریے دار بال۔ اس کے پاس حسن کا خزانہ تھا، جو کسی عورت کے پاس ہوتا تو جانے کیا ہوتا؟ روبہ کو اپنا دل سنبھالنا مشکل تھا۔ و شوار تھا۔ ناممکن تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



میں اسے ایک منہ سے بچے کا بھائی بننا ڈرا بھی اچھا نہیں لگے گا۔“ انادیہ کے اگلے الفاظ نے جہاں آئی فرزانہ کو بت بنایا تھا۔ وہیں افرایم کی امی کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔

”ایسی بے حیائی کی بات۔۔۔ وہ بھی کنواری بچی کے منہ سے۔۔۔“

انہوں نے ناگواری کی شدید لہر دل میں اٹھتی محسوس کی تھی اور اس کی مزید بکواس سے مستفید ہوئے بغیر اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

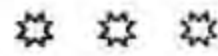
وہ پچھلے دو دن سے تذبذب کا شکار تھیں۔ ایک فیصلہ تھا جو عمل سے کوسوں دور لگتا تھا۔ لیکن لمحوں میں ہو گیا۔ افرایم کے لیے انہوں نے بارہا انادیہ کا سوچا تھا۔ اس کا تباہ کن حسن کسی اور لڑکی کی طرف دھیان جانے ہی نہیں دیتا تھا۔ پھر رشتہ داری بھی تھی۔ انہیں جیسٹھ کے بوجھ کا بھی خیال آتا۔ ”وہ کیا سوچیں گے۔ گھر کی بیٹی چھوڑ کر باہر سے بھاگ آئی۔“ وہ اپنے خدشات افرایم کے سامنے بیان کرتیں تو وہ آرام سے انہیں مشورہ دیتا تھا۔

”اپنوں کے بوجھ بانٹنے کے چکر میں اپنے بیٹے کا کچھ مرمت نکل دیجئے گا۔ سنیں امی! انادیہ کے پاس کچھ نہ ہوتا اور ایک اچھی زبان اور اخلاق ہوتا تو میں تایا کے اس بوجھ کو بخوشی اٹھا لیتا، لیکن اب ممکن نہیں ہے۔“

افرایم کا انادیہ کے لیے ہمیشہ سے انکار تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بیٹے نے خویہوں کے ترانوں میں کبھی حسن اور خوب صورتی کو نہیں بولا تھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو یوں وہ اس کی نگاہ کبھی نہ ٹھہرتی۔ رویا، انادیہ کی سہیلی تھی۔ جو اپنی ماں کے ساتھ انادیہ کا رشتہ لینے آئی تھی۔ جسے دروازے پہ افرایم نے دیکھا اور پسند کر لیا تھا۔

امی کو سانولی سلونی، سیاہ نقوش، نرم مزاج اور میٹھی طبیعت کی روپا بھاگنی تھی۔ سب سے بڑھ کر اس کی نیک ماں اور شریف باپ۔ چھوٹا سا خاندان۔ انہیں اور کیا چاہیے تھا۔ پھر افرایم کی خواہش بھی تھی۔

اور پھر انادیہ کے اس چچا زاد بھائی اس رسمی دعوت میں رویا صداقت کی منگنی ہو گئی تھی اور دو مہینے بعد شادی ہونا قرار پائی تھی۔



جون کی طویل دوسروں میں کالج سے ہونے والی موسم گرما کی چٹیاں ایک عذاب بن کر اس پہ نازل ہوئی تھیں۔ کالج نہ جانے کا مطلب تھا۔ پورا دن گھر میں رہنا اور آئی فرزانہ کی چاکری کرنا۔ گھر کے ان گنت کام، عذاب اور ایک وہیل۔ ابا کام پہ نکل جاتے تھے اور ناصر عشق لڑانے۔ آوارہ گلیوں میں گھومنے بے کار وقت ضائع کرنے۔ آئی فرزانہ ان دنوں۔ بے زار، بوجھل اور شدید بیمار دکھائی دیتیں۔

اس دن انادیہ تیسری سیڑھی کے قدمے پہ بیٹھی طعشری میں ڈالے چاول چنتی انتہائی بے زاری اور تلخی سے بولی تھی۔

”کیا ضرورت تھی۔ اس عمر میں عذاب ڈالنے کی۔ خود بھی مصیبت میں ہیں اور دوسرے بھی۔۔۔“

اس کا لہجہ بے زار، روکھا اور کسی قدر نفرت سے لبریز تھا۔ آنے والا وجود ابھی سے ہی انادیہ کی نفرت کے نشانے پہ تھا۔ فرزانہ نے آنکھوں میں اتری نمی کو پٹی لیا۔ لیکن ایک لفظ بھی جواب میں نہ کہا۔ تاہم برابر والے گھر کے صحن میں بیٹھی افرایم کی ماں نے انادیہ کی بات پہ ”استغفار“ کے کلمات ضرور کہے تھے۔ وہ افرایم کے سفید کرتوں کو کلف لگا رہی تھیں اور ساتھ انادیہ کی گل افشانی سے مستفید بھی ہو رہی تھیں۔ ساتھ والے گھر سے آوازیں ان کے صحن پر آمدے اور بچن میں بنا رکے چلی آتی تھیں۔ کیونکہ ساتھ والے گھر کے دونوں ”نافرمان“ بچوں کو آہستہ بولنے اور اپنے بزرگوں سے نرم لہجے میں بات کرنے کی کوئی تمیز نہیں تھی۔

”ویسے فرزانہ آئی! آپ کو خود سے خیال کرنا چاہیے تھا۔ مردوں کو ان باتوں کی کیا سمجھ۔ آپ کو خود احتیاط کرنی تھی۔ کل ناصر بھی کہہ رہا تھا۔ اس عمر

اس ”چاکری“ سے ریٹائر ہوں۔“ آم نہ ملنے کا سارا غصہ فریق کے دروازے پہ نکالا تھا۔

معا“ دھیرے دھیرے چلتی فرزانہ کچن میں آگئی تھی۔ اسے دیکھ کر انادیہ نے دانتوں تلے بے ساختہ زبان دبالی۔ پیٹھ پیچھے بھڑاس نکالنا اور بات تھی اور سامنے اور۔

”تم جاؤ۔ آرام کرو۔ صبح سے لگی ہو۔ کھانا میں بناتی ہوں۔“ فرزانہ نے اس کا ترش انداز دیکھتے ہوئے بھی نرمی کا مظاہرہ کیا تھا۔ انادیہ کی خوب صورت پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

”تاکہ ابا آپ کو کچن میں کام کرتا دیکھ لیں۔ اور سارا نزلہ مجھ پہ آکرے۔“ انادیہ کے تلخ الفاظ پہ فرزانہ پکا بکا رہ گئی تھی۔ وہ کہاں تک سوچوں میں نکل جاتی تھی؟ خدا کی پناہ فرزانہ نے یہ سوچا بھی نہیں تھا۔

”میں ان سے کہہ دوں گی۔ تم فکر نہ کرو۔“ فرزانہ کا وہی پر محل نرم لہجہ۔

”آپ کیا کہہ دیں گی؟ یہی نا“ آپ کی بیٹی سارا دن پتنگ توڑتی ہے۔“ انادیہ غصے سے چیخی۔

”یہ تم کیا فضول باتیں سوچتی ہو گڑیا۔ میرا ہرگز یہ مقصد نہیں۔“ فرزانہ کو اسے سمجھانا ہمیشہ مشکل لگتا تھا۔ وہ بچپن سے ایسی ہی تھی۔ ضدی، ہٹ دھرم، بد تمیز اور منہ پھٹ بھی۔ کچھ باپ کے بے جالاؤ نے اسے خود سربنایا تھا۔ بھائی بھی ایسا ہی تھا۔ جس کا کوئی رعب ہی نہیں اور انادیہ کسی سے ڈرتی بھی نہیں تھی۔ فرزانہ جب بھی سمجھانے کی کوشش کرتی۔ قاضی صاحب کی پدرانہ شفقت آڑے آجاتی تھی۔

”بچی ہی تو ہے۔ سمجھ جائے گی۔ ماں کا پیار نہیں دیکھانا۔ بس اسی کمی نے ضدی بنادیا۔“ وہ انادیہ کے معاملے میں حد سے زیادہ نرم تھے اور اس کی چھوٹی چھوٹی بد تمیزیوں کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ حالانکہ فرزانہ دیکھ رہی تھی۔ انادیہ دن بہ دن کتنی بد مزاج، موڈی اور خربلی ہوتی جا رہی تھی۔ فرزانہ سختی بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ورنہ سوتیلے بن کا میل لگ جاتا۔

فرزانہ کا چاول پکانے کا ارادہ دیکھ کر انادیہ گول

انہوں نے اللہ کا نام لے کر بسم اللہ کی۔ ان کے بیٹے کو انکار کسی طور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ اس وقت اپنے خاندان کا پہلا اپنے محلے کا پہلا پڑھا لکھا، لائق فائق قاتل ترسن کمشنر تھا۔ ڈپٹی کمشنر۔ سب سے بڑھ کر شریف اور اگلوں۔

روبا کے ابا نے اپنی تسلی کر کے ”باب“ کر دی تھی۔ وہ شکن کے طور پر اگلو بھی بھی پہنا آتی تھیں۔ اور ابھی کچھ دیر پہلے جم جم کا ڈبا دیوار پار فرزانہ کو پکڑا یا تھا۔ جس پہ ابھی تک شاید انادیہ کی نگاہ نہیں پڑی تھی۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ افرائیم سے دودھ پاتھ کرنے نہ آتی؟

انادیہ کی لمبی زبان کے جوہر دیکھتی وہ خدا کا شکر ادا کر رہی تھیں کہ ایک بروقت فیصلہ ان سے ہو سکا۔ دھوپ دیواروں پہ سمٹ رہی تھی۔ اس نے چادلوں سے بھری طشتری اٹھائی اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی۔ کنکر تھالی میں پڑے تھے۔ جو اس کا پیر لگنے سے فرش پر بکھر گئے تھے۔ انادیہ نے مڑ کر سمیٹنے کی کوشش گوارا نہ کی تھی اور جلتی جھنکی کچن میں آگئی۔ آج کل باورچی خانے کا سارا ”بار“ اس کے نالوں کندھوں پہ دھرا تھا۔

”ہونہ۔ جیسے اٹھارہ سال کی دو شیزہ ہو۔“ انادیہ نے غصے میں سر جھٹکا اور فریق سے دودھ نکالنے لگی۔

”پہلے شہک پیوں گی۔ پھر باندی کا سیاہا کروں گی۔“

ارے یہ آم کدھر گئے؟ روز ابالاتے ہیں اور روز ختم۔ ہونہ۔ لاڈورانی کچھ چھوڑے گی تو بچے گانا۔

دنپاسے نرالا بچہ پیدا کرے گی۔“ اس کی بوڑھا ہٹ اتنی اونچی تو تھی جو فرزانہ تک یہ آسانی پہنچ گئی۔ ان دنوں تو وہ اس قدر شرمندہ ہوتی تھی کہ کم ہی کمرے سے باہر آتی۔ اوپر سے انادیہ اسے شرمندہ کرنے کا کوئی موقع نہ چھوڑتی۔

انادیہ کی زبان دن بہ دن خنجر کی دھار جیسی ہوتی جا رہی تھی۔ یا شاید یہ کتنا مناسب تھا کہ زبان خنجر ہی تھی۔ اس کی دھار دن بہ دن تیز ہوتی جا رہی تھی۔

”مجھ سے یہ ”گھرواری“ کے سیاہے نہیں ہوتے۔ ابا سے کہتی ہوں۔ کسی نوکر کا بندوبست کریں۔ میں

کمرے میں آگئی، وہاں تپائی کے اوپر جم جم کا ڈبا رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھرنے کے ساتھ بھوک بھی چمک گئی۔ جم جم اس کی پسندیدہ مٹھائی تھی۔ ایک پیس اٹھا کر منہ میں رکھا۔

پھر وہ کچن کی طرف آئی تھی۔ جہاں پہ فرزانہ اپنی نازک حالت کے ساتھ سینے میں ترتر چاول بنا رہی تھی۔ انادیہ نے کچن سے باہر کھڑے کھڑے ہی دریافت کیا۔

”یہ مٹھائی کہاں سے آئی ہے۔ بڑے مزے کی ہے۔“

فرزانہ نے ماتھے پہ آیا پیمنہ پونچھ کر انادیہ کا چہرہ دیکھا۔ وہ گمن سی ڈبے میں سے جم جم نکال کر کھا رہی تھی۔

”تمہیں نہیں پتا؟“ فرزانہ ابھی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ اسے کیوں نہیں پتا تھا؟ افرایم کی مگتیر انادیہ کی سہیلی تو تھی۔

”کیا نہیں پتا؟“ انادیہ نے چونک کر پوچھا۔ فرزانہ کے انداز میں کچھ غیر معمولی پن تھا۔ جو اسے بری طرح سے کھٹکا تھا۔

”تمہاری چچی نے افرایم کی بات طے کر دی ہے۔ یہ اسی کی مٹھائی۔“ اس کا سانس سینے میں اٹک گیا تھا۔

”کس سے بات طے ہوئی؟“ کچھ دیر بعد وہ اپنا سرخ چہرہ دوپٹے سے تھپتھپاتی کچن میں گئی۔ فرزانہ کو بتانا پڑا۔

”تمہاری سہیلی روبا سے۔“ فرزانہ نے تو آرام سے بتایا تھا۔ لیکن انادیہ کے سر پہ دھماکا ہوا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ منہ حیرت سے کھل گیا۔ اتنی بڑی بات؟ اتنی اچانک۔

اتنا کچھ ہو گیا اور اسے پتا ہی نہ چلا۔ اس گھنی میسنی روبا نے پورا میدان مار لیا۔

وہ جم جم کا ڈبا اٹھائے عجیب و غریب تیور لیے چھت پہ چڑھنے لگی تھی۔ ادھر فرزانہ ہکا بکا۔ وہ کیا کرنے جا رہی تھی؟ کیا مٹھائی واپس؟

نیچے فرزانہ کچن میں کھڑی ہوا کرتی رہی۔ اور اوپر انادیہ مٹھائی کا ڈبا کھولے ساری مٹھائی کو ہاتھ میں چور چور کے لمبے کرتی عجیب بھجائی غصے کا شکار تھی۔ پھر اس نے برابر والی چھت پہ جھانکا۔ چھت سنسان تھی۔ نیچے افرایم کی سرکاری جیب بھی نہیں تھی۔

اس نے سوچ کر ڈبا ہوا میں اچھالا اور ساری مٹھائی کو ان کی چھت پہ پھینک کر ہاتھ جھاڑتی نیچے چلی آئی۔

ابھی وہ تیز قدموں سے نیچے آئی رہی تھی، جب اچانک عجیب سے شور نے اسے گھبرانے پہ مجبور کر دیا۔ اس نے تیزی سے پیچھے کے اوپر سے نیچے جھانکا۔ میٹھیوں کے پاس فرزانہ گری ہوئی تھی۔ اور اب پوری شدت کے ساتھ کراہ رہی تھی۔ انادیہ ہکا بکا رہ گئی۔ فرزانہ کیسے گری؟ اور اس کا گرتا کچھ ٹھیک بھی نہیں تھا اور اس حالت کے پیش نظر؟

اسے کچھ نہ سوچا اور وہ وہیں کھڑے کھڑے سوچنے لگی۔ پھر اس کی نظر فرش پہ پھری کنگروں پہ پڑی تھی۔ جنہیں انادیہ نے اپنی لاپرواہی کی وجہ سے اٹھانا ضروری نہیں سمجھا تھا اور ان ہی کنگروں سے فرزانہ کا پاؤں پھسلا تھا اور وہ منہ کے بل اونڈھی گر پڑی تھی۔

وہ سوچوں میں اس قدر گم تھی کہ اسے برابر والے گھر سے چچی کے آنے کا پتا ہی نہ چلا۔ چچی شاید فرزانہ کی تکلیف دہ کراہوں کو سن کر بھاگی بھاگی آئی تھیں۔ اور ان کے پیچھے افرایم بھی تھا۔ جس کی سرکاری جیب گلی میں کھڑی تھی۔ وہ ابھی ابھی اپنے دفتر سے آیا تھا۔ آتے ساتھ ماں کی بھاگ دوڑ پہ پریشان سا ہوا۔ امی کے بتانے پہ اس نے جیب اشارت کی اور پھر ان کے پیچھے ہی اندر چلا آیا۔

”ان کو تو اسپتال لے جانا ہو گا۔“ فرزانہ کی حالت کے پیش نظر افرایم نے ماں سے کہا۔ جو فرزانہ کو سہارا دے کر پانی پلا رہی تھیں۔ افرایم نے حیرت سے منجد کھڑی انادیہ کو دیکھا۔ وہ چھت کے اوپر سے پورا تماشا دیکھ رہی تھی۔ مگر اس نے نیچے آنے کی زحمت گوارا

نہیں کی تھی۔ افرایم کو وہ ہرگز روئے دن سے بڑھ کر ”بے حس“ لگی۔ کوئی اتنا سنگ دل نہیں ہو سکا کہ جو کسی کو تکلیف میں ترہتا دیکھ کر خاموشی سے تماشا دیکھے۔ مگر انادیہ اپنی طرز کاسب سے منفرد عجوبہ تھی۔ افرایم نے ماں کے ساتھ سہارا دے کر فرزانہ کو جیب میں بٹھایا اور سخت نظر چھت کے اوپر بندھ رہے۔ کہنیاں نکائے کھڑی انادیہ پہ ڈالی اور جیب کو تیزی سے بھگاتا نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اور جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا۔ انادیہ کو جیسے ہوش آگیا۔ وہ طرح طرح کے منہ بناتی میڑھیاں اتر کر نیچے آگئی تھی۔

پہلے جھاٹو پکڑ کر کنکریاں اٹھائیں، پھر کچن میں آکر اودھورے کھانے کو پکانے کے مرحلے سے گزارنے لگی۔

”اب کوئی نئی مصیبت نہ بن جائے۔“ انادیہ کو یہی فکر کھائے جا رہی تھی۔ فرزانہ کے خدا خواستہ مستقل بستر پہ پڑنے کی وجہ سے کہیں اس کا کلج جانا نہ بند ہو جانا؟ اسے بس یہی غم کھائے جا رہا تھا اور فرزانہ کی حالت؟ یا اس کی تکلیف؟ تو وہ جائے بھاڑ میں۔

رات بہت دیر بعد ان کی واپسی ہوئی تھی اور فرزانہ کو اپنے پیروں پہ چل کے آتے دیکھ کر انادیہ کی جان میں جان آئی۔ ابا بھی ہمراہ تھے۔ کچھ پریشان اور غم زدہ۔

اس رات ابا کے اصرار پہ افرایم اور چچی نے ان کے گھر ہی رات کا کھانا تناول کیا تھا اور افرایم چاولوں کے اس ”ملغوبے“ کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اسے سب کھا کیسے رہے ہیں؟

اس رات افرایم پہ انادیہ کے ”پھوہڑن“ کا بھی انکشاف ہوا تھا۔

اور وہ سوچ رہا تھا کہ اپنی آنے والی زندگی میں انادیہ کہاں تک ”اچھی صورت“ کا مار جن لے گی؟ بہر حال گھر گرہستی کے بغیر کوئی بھی عورت نامکمل اور اودھوری ہوتی ہے۔ گھر سنبالنا عورت کی اولین ذمہ داری ہوتی ہے جس سے انادیہ قطعاً تامل نہ کرے گی۔

جائے سے چچی نے بہت بلند آواز میں انادیہ کو سناتے ہوئے کہا تھا۔

”زندگی تھی تو بیچ گئی۔ ڈاکٹر نے کہا ہے۔ فرزانہ میں شدید خون کی کمی ہے۔ بچہ بھی کمزور ہے اور ماں بھی۔ اس کی خوراک اور آرام کا خیال رکھیں۔“

چچی کی چبھتی نگاہوں پہ وہ پاؤں پختی اندر چلی گئی تھی۔ افرایم تو کب کا جاچکا تھا۔ پھر چچی بھی فرزانہ کو ڈھیروں نصیحتیں کر کے چلی گئی تھیں اور انادیہ کو چچی کے خلاف بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا۔

وہ ابا کے پاس باہر چارپائی پہ بیٹھ گئی تھی اور ان کے کانوں میں ہولے ہولے پھونکتی رہی۔

”ویسے بڑی ہمدرد بنتی ہیں۔ اتنا نہیں ہو سکا کہ افرایم کی بات طے کرتے ہوئے آپ کو ساتھ لے جائیں۔ آپ افرایم کے اکلوتے تایا ہیں۔ ابا! ان لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ ویسے تو بڑا ”بھائی جی“ بھائی جی کرتی ہیں۔ اتنے اہم موقع پہ آپ سے مشورہ تک نہیں کیا۔“

ابا نے سر ہلاتے ہوئے اس کی ہر بات تحمل سے سنی تھی۔ پھر دھیمی نرم آواز میں بولے۔

”مشورہ تو کیا تھا۔ اور ساتھ چلنے کے لیے بھی کہا تھا۔ اس دن مجھے کسی ضروری کام سے جانا تھا۔ میں نے معذرت کر لی تھی۔“ ابا کے جواب پہ انادیہ کی چوتھوں میں تیکھا سن آگیا تھا۔

”اچھا! تو سب کو ہی پتا تھا سوائے میرے۔“ اسے بڑا ہی غصہ آیا۔

”اسی بھی کیا پردہ پوشی۔ میں نے کیا رشتے میں ٹانگ اڑالی تھی؟“ وہ جلتی بھنتی اٹھ کر کمرے میں بند ہو گئی تھی اور ابا بے چارے ہکا بکا رہ گئے۔ اس میں غصہ کرنے والی کیا بات تھی۔

اپنے قابل بیٹے کے لیے انہوں نے کسی قابل لڑکی کا انتخاب کر لیا تھا تو اس میں غصہ کرنے والی کیا بات تھی؟

جو بھی تھا۔ وہ اپنی بیٹی کے ”گمنوں“ سے ناواقف نہیں تھے۔

اور اب انادیہ کے مزاج کا ٹیکہ اپن انہیں بھی تشویش میں مبتلا کرنے لگا تھا۔ وہ دن بہ دن غصہ و بد زبان اور تلخ ہوتی جا رہی تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ انہوں نے تب نہیں سوچا تھا۔ جب وہ لاڈ پیار میں اپنی ہریات منوا کر فخر سے سب کو دیکھتی تھی۔ تب اس کے انداز میں ایک نخوت ہوتی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ ”دیکھا“ میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔



اور یہ اس سے اگلے دن کی بات تھی۔ اس دن سورج میں بھی اتنی تپش نہیں تھی۔ موسم خوش گوار تھا۔ فضا میں نمی کا احساس تھا۔ جیسے کہیں دور پہاڑوں پہ ٹوٹ کے مینہ برس رہا ہو۔ انادیہ نے سارے ”پھیلاوے“ سے نگاہ چرائی اور محلے کے آخری کونے میں رہنے والی ناجو سے ملاقات کے بہانے گھر سے نکل گئی۔ ناجو اس کی کوئی بہت گہری سہیلی نہیں تھی۔ بس ”ضرورتاً“ سہیلی بنی تھی۔ جو وقتاً فوقتاً کام بھی آجاتی۔ اکثر انادیہ اسے تب بلاتی تھی جب اس نے کپڑے دھونے کے لیے مشین لگوانی ہوتی یا پھر گندم کی صفائی کا ناپسندیدہ کام کرنا ہوتا۔ ناجو اسے کام کے وقت یاد آتی تھی اور مطلب حاصل کرنے میں انادیہ کو کمال حاصل تھا۔ ناصراور ایا کے نکل جانے کے بعد انادیہ بھی ناجو کی طرف نکل گئی۔

فرزانہ اس کے چلے جانے کے بعد خود ہی مشین لگا کر کپڑے دھونے لگی۔ انادیہ سے کچھ کہنا سننا بے کار تھا۔ وہ موڈ کے تابع تھی۔ موڈ ہوتا تو کام کرتی ورنہ جواب دے دیتی۔ جواب دینے کا بھی موڈ نہ ہوتا تو گھر سے نکل جاتی۔ جیسا کہ اس وقت نکل چکی تھی۔ فرزانہ گہری سانس بھرتی اپنے کام میں جت گئی تھی۔ جب پریشان پریشان سی افرایم کی امی نے دیوار کے پار سے جھانکا۔ بیچ والی دیوار کے دونوں اطراف پہ سیڑھیاں تھیں۔ ایک طرف ان کی سیڑھیاں اور دوسری طرف افرایم کے گھر کی سیڑھیاں یوں دونوں

خواتین آرام سے گفتگو بھی کر لیتی تھیں۔ اور چیزوں کے ”لین دین“ کا تبادلہ بھی ہو جاتا تھا۔ اچانک افرایم کی امی کا سر دیوار کے پیچھے سے نمودار ہوا تھا۔ فرزانہ کپڑے الگنی پہ ڈالتی ہوئی قریب آگئی۔ ”خیریت بھابھی!“ ان کے چہرے پہ اڑتی ہوئیاں دیکھ کر فرزانہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔ ”ایسی خیریت بھی نہیں۔ سمجھو، میرا تو دماغ گھوم گیا ہے۔“ وہ لال بھبھو کا چہرہ لیے صحن کے آگے تک جھانک رہی تھیں۔

”وہ نواب زادی کہاں ہے؟“ ان کا اشارہ انادیہ کی طرف تھا۔ ”گھر پہ نہیں ہے۔“ فرزانہ نے الجھن آمیز نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔ ”معا“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ڈیا فرزانہ کے سامنے کیا۔ ”یہ دیکھو۔“

”کیا ہے یہ؟“ فرزانہ کا دل وہم میں پڑ گیا۔ کہیں یہ وہی تو نہیں؟

”افرایم رات سونے کے لیے چھت پہ گیا تو یہ جم جم کا ڈبا چھت پہ گرا رہا تھا اور اندر موجود ساری مٹھائی۔ جگہ جگہ چپوٹے اور گیرے لائین بنائے مٹھائی کو چٹے تھے۔ کچھ ہوائی برندے لے گئے۔ پورے دو کلو کا ڈبا تھا۔ چپوٹوں سے کہاں ختم ہوتا؟“ بھابھی نے مارے غصے اور اہانت کے احساس تلے دب کر ڈبا دیوار کے اوپر پٹخ دیا۔

”یہ لینا نہیں تھا تو اسی وقت میرے منہ پہ دے مارتیں۔ میرے بچے کے تنگن کی مٹھائی کی ایسی ناقدری؟“ ان کا غصہ اور قلق بجا تھا۔ فرزانہ کا سر شرمندگی کے مارے جھک گیا تھا۔ یہ سب کیا دھرا انادیہ کا تھا؟ مگر وہ انادیہ کے خلاف کوئی بات نہیں کر سکتی تھی۔ بھابھی تو ویسے بھی آج کل انادیہ سے سخت کبیدہ خاطر تھیں۔

”بھابھی! شاید کوئی ملی اٹھا کر۔ کچن کا دروازہ کھلا رہ گیا ہو گا۔“ فرزانہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی صفائی کیسے پیش کرے؟ تاکہ بھابھی کو یقین بھی

ہوتی۔

”تو پھر یہ جلن کیوں؟“ تاجو کو اچھٹا ہوا تھا۔ وہ اس کے پھسریاں لیتے وجود کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔
”اس روبہ کی وجہ سے۔۔۔ کالی کلونی نے کیسی چمکتی قسمت پائی ہے۔ رشتہ میرا لے کر آئی تھی۔ نصیب اپنے چمکانی۔“ انادیہ نے اپنے۔۔۔ شعلے اگلنے۔ دل کی جلن کے اصل سبب کو ظاہر کیا۔

”اس گھٹی نے ہوا تک نہیں لگنے دی۔ اور بالا ہی بالا افرایم سے چکر چلا لیا۔“ انادیہ کا جلن کے مارے برا حال تھا۔

”تمہیں اس ”چکر“ پر جلن ہے؟ روبہ کے نہ بتانے پر؟ یا اس رشتے کی وجہ سے؟“

”تینوں۔۔۔“

”اس کا مطلب ہے۔ تم افرایم کے ساتھ کی خواہش رکھتی تھیں؟“ تاجو نے اپنی سٹچی سی سوچ کے مطابق نتیجہ اخذ کیا۔

”ہرگز نہیں۔ مجھے وہ ماں بیٹا کسی صورت پسند نہیں۔“ وہ ناگواری سے بولی۔

”مگر بات بن جاتی تو پسند آجاتا۔“ تاجو نے جیسے مزہ لیا تھا۔

”کبھی بھی نہیں۔“ انادیہ نے تنفر سے سر جھٹکا۔

”اس کی ماں کے ساتھ میری ایک دن نہ بنتی۔ اور وہ ماں کا بچہ ہے۔ مجھے ایسے ”پر پسند نہیں۔ جو ماؤں کی انگلی مگنی عمر میں بھی نہیں چھوڑتے۔“

”تو پھر یہ کھولن کیوں؟ روبہ کو تمہیں آگاہ کرنے کا کوئی ذریعہ میسر نہ آیا ہوگا۔ کالج کی بھی تو چھٹیاں ہیں۔“ تاجو نے پہلی مرتبہ کوئی ڈھنگ کی بات ”کھوپڑی“ سے نکالی تھی۔ ورنہ اس بیکار مغز میں سوائے شیطانی خیالات کے اور کچھ بھی نہ تھا۔

”ہونہ“ وہ دو ٹوکے کی لڑکی۔ میرے افسر کزن کے ساتھ عیش کرے گی، بیگم صاحبہ بن کر۔“ وہ تڑخی تھی۔

”اور اس بات سے بھی درگزر کروں کہ اس نے اپنی اچھی قسمت سے افرایم کو حاصل کر لیا تو یہ بات میں ہرگز نہیں بھول سکتی۔ چچی نے میرے منہ پر جوتی

آجائے۔

”رہنے دو فرزانہ!“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر تلخی سے کہا تھا۔ ”جیسے میں جانتی ہی نہیں۔“

”بھابھی! مجھ سے لاپرواہی ہو گئی۔ میں نے دھیان نہیں دیا۔“ فرزانہ کی منمناتی آواز نے انہیں اور بھی براہم کر دیا۔

”فرزانہ! اس کی غلطیوں پہ پردے ڈالنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں جانتی ہوں یہ انادیہ نے کیا ہے۔ اسے کس بات پہ غصہ تھا؟ مجھے ابھی تک یہ ہی بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ وہ کھولتے ہوئے مسلسل متفکر نظر آتی تھیں۔

”شاید آپ نے اسے آگاہ نہیں کیا۔ بلکہ افرایم نے۔۔۔ دونوں میں دوستی بھی تو بہت تھی۔ افرایم نے اپنی زندگی میں ہونے والی خوش گوار تبدیلی کے بارے میں اسے بتایا نہیں تو۔ شاید یہ اسی بات کا رد عمل تھا۔“ فرزانہ نے دھیمی آواز میں اپنے حساب سے وجہ بیان کی تھی۔ جس سے وہ کچھ دیر کے لیے سوچ میں گم ہوئیں۔ انہیں لگتا تھا افرایم کی خوشی میں یہ بدشگونی اچھی بات نہیں۔

”میرے اندر آگ سی لگی ہے۔ دل چاہتا ہے ہر چیز کو بھسم کر دوں۔“ وہ غصے میں بل کھاتی تاجو کی ڈیوڑھی میں ادھر سے ادھر چکر لگا رہی تھی۔ تاجو بڑی بھابھی کے فریج سے چوری شدہ آموں پہ ہاتھ صاف کرتی خواہ مخواہ کھانے لگی۔

”دھیان رہے۔ کہیں محبت کی آگ تو نہیں۔“ وہ آموں کو اس طرح چوس رہی تھی جیسے زندگی میں پہلی مرتبہ نصیب ہوئے ہوں۔ ایک چھوٹی، دو سرا پکڑی۔ البتہ انادیہ نے کٹے ہوئے آم کی ایک قاش بھی نہیں اٹھائی تھی۔

”محبت کرتی ہے میری جوتی۔ وہ بھی افرایم سے“ ہونہ۔۔۔ مجھے تو ایک آنکھ اچھا نہیں لگتا۔ اپنی نوکری کا بڑا مان ہے اسے۔ میں کالاٹ صاحبہ۔۔۔“ وہ زہر خنک

ماری ہے۔ ”انادیہ کا چہرہ نفرت و غصے کی زیادتی سے جگڑنے لگا تھا۔

”تم کیا کرنے والی ہو؟“ تاجو نے ابلتے تجتس کے ہاتھوں بے چینی سے مرتے ہوئے پوچھا تھا۔

”میں روپا کی بھابھی بننے والی ہوں۔“ اس نے ایک دھماکہ کیا اور تن فن کرتی چلی گئی۔ جبکہ تاجو چنی آنکھیں پھاڑے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ انادیہ نے ہم ہی ایسا پھوڑا تھا۔



وہ جامن کے پیڑ تلے چارپائی بچھا کر بیٹھی تھی۔ اماں نے سرسوں کا تیل اٹھایا اور چوکی ہاتھ میں پکڑے آگئیں۔ ان کا ارادہ روپا کے بالوں میں تیل لگانے کا تھا۔ روپا اماں کا ارادہ بھانپ گئی اور چوکی ان کے ہاتھ سے لے کر زمین پر رکھی اور خود اس پر بیٹھ گئی۔ اماں نے بھی چارپائی پر نشست سنبھال لی تھی۔

”اس جنگل کو بڑھانے کا شوق ہے۔ سنبھالنے کا نہیں۔“ اماں کی خفگی اور روپا کی سستی۔

”کبھی اندھا کیڑوں وہی کس کر کے لگالیا کرو۔“ اماں کے ٹوٹنے اور روپا کا بد کنا۔

”بہت ”بو“ ہے اماں۔“ اس نے ناک ایسے دبا لی جیسے ابھی ابھی بو کا بھکانا کھ میں کھس آیا ہو۔

”بال عورت کی ٹھنکتی ہوتے ہیں۔ ان کی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔“ وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔ ”معا“ وہ سری منزل کی کھڑکی سے کاشف نے روپا کو آواز دے کر اوپر بلایا تھا۔

”بھائی بلار ہے ہیں۔ میں ان کی بات سن کر آتی ہوں۔“ روپا نے تیزی سے دوپٹا گلے میں لٹکایا اور کھلے بالوں کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔ اوپر سے اماں کی تنبیہ۔

”بالوں کو باندھ کے چھت پہ جاؤ روپا!“

”ورنہ کوئی جن چٹ جائے گا۔ ہے ناں!“ وہ سیڑھیوں کے بیچ میں کھڑی مسکرائی۔ ”اور جن تو چٹ گیا اماں! اب میں کسی چیز سے ڈروں؟۔“ روپا کھلکھلاتی ہوئی چھت پہ پہنچی۔ کاشف جھکے برآمدے والی چھت تلے بیٹھا تھا۔ اس نے روپا کی بات

تاجو ایک دم اچھل پڑی۔ ”افراہیم کی ماں نے کیا واقعی؟ کب ماری؟“ تاجو کی حیرت سے چنی آنکھیں اور اندر کو دھتس گئی تھیں۔ انادیہ کا چمکیلا چاندی جیسا رنگ لال پڑ گیا۔

”لو کی دم۔“ چچی کی ایسی جرات بھی نہیں کہ حقیقت میں مجھ پہ ہاتھ اٹھائیں۔ میں نے محاورہ ”کما ہے“

”اچھا۔“ اچھا سمجھ گئی۔ روپا کو تم پر فوقیت دے کر۔“ تاجو نے انادو من کا سر ہلایا۔ جیسے ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی ہو۔

”اور مجھے چچی کو مزہ چکھانا ہے۔ یہ جتا کر کہ ان کا انتخاب بھی اچھا نہیں۔ اور مجھے رت بجیکٹ کر کے تو بالکل اچھا نہیں۔“ اس کی مغلٹی آنکھوں میں بھڑیلے کی سی چمک تھی۔ تاجو کو بھی پہلی مرتبہ جھرجھری سی آئی۔

”اس کا مطلب ہوا۔ تمہاری دشمنی چچی سے ہے۔ افراہیم اور روپا سے نہیں۔“

”ہاں۔“ اس نے سر ہلادیا۔ جیسے تیزی سے کچھ سوچ رہی ہو۔ کچھ پلان کر رہی ہو۔ حالانکہ پلاننگ تو وہ کر رہی چکی تھی۔ اب تو بس عمل کرنا باقی تھا۔

”لیکن جب آگ لگتی ہے تو شعلوں سے بچنا کوئی بھی نہیں۔“ اس کی آواز پھنکار سے مشابہ تھی۔ جیسے کوئی نیلی آنکھوں والی ناگن شوک رہی ہو۔

تاجو اسے دیکھ کر ٹھنک گئی تھی۔ پھر اس کے اندر تجتس نے انگڑائیاں لیں۔ انادیہ کیا کرنا چاہتی تھی؟ کوئی لڑائی؟ کوئی ڈرلما؟ کوئی دھماکہ؟ اسے بڑا ہی مزہ آیا۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو ”شر“ کو پھلتا پھولتا دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مزہ لیتے ہیں۔ اور دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر تماشا بنانے والوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ کیونکہ ”شر“ ان کے اندر بھی ایسے ہی انگڑائیاں بھرتا ہے۔ جیسے سانپ کے پیٹ میں زہر اگلنے کا درد۔ جب تک زہر نہ اگلے بے چین رہتا ہے۔

سن لی تھی۔ ”اب تم چیلوں سے ڈرو۔ جینوں سے ڈرو۔“
 کاشف اسے مسکراتے ہوئے چھیڑ رہا تھا۔ وہ گلابی سی
 ہوتی ہوئی آگے بڑھی۔
 ”اللہ بھائی نے سن لیا۔“ اسے بڑی ہی شرم آئی
 تھی۔

”اس بات کا کیا مطلب ہوا؟“ رویا ذرا بھی نہیں
 سمجھی تھی۔ کاشف نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھالیا۔
 ”عنفرت تمہاری زندگی میں ایک خوب صورت
 بلا آنے والی ہے۔“

”بلا؟“ وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

”نہیں سمجھیں؟ اچھا تو پھر بتاؤ۔ تمہاری اس
 سہیلی کا کیا بنا؟“ کاشف نے دلچسپی سے مسکراتے
 ہوئے پوچھا تھا۔

اپنی منتگنی کے چکر میں وہ اس کے ذہن سے نکل
 گئی تھی۔ وہ ہونٹوں کی طرح کاشف کو دیکھتے ہوئے
 چونکی۔

”انٹویہ؟“

”ہاں وہی۔“ کاشف کے لبوں پہ بڑا ہی خوب
 صورت مبسم نمودار ہوا۔ ”میری قسمت پھوڑنے کا
 ارادہ بدل دیا ہے کیا؟“ بھائی نے کندھے سے اسے
 ٹھوکا دے کر سوچوں کے بھورے یا ہر نکالا۔

”آہ یہ مذاق میں کسی جانے والی باتیں۔ بے ضرر
 سی جانے کب؟ کیسے اور کس طرح —
 قبولیت کے سفر پہ نکل گھڑی ہوئیں؟“

”تم اماں کے ساتھ دوبارہ وہاں جاؤ۔ میں نے سوچا
 ہے اگر قسمت پھوڑنی ہے تو اس خوب صورت بلا سے
 شادی کر لوں۔ شادی کر کے پچھتانا ہے تو کم از کم
 پچھتاؤ خوب صورت تو ہو۔“ وہ ابھی تک خوشگوار موڈ
 میں تھا۔ اور ہلکے پھلکے لہجے میں اپنی ”پسند“ بتا رہا تھا۔
 جبکہ رویا اس سوچ میں گم تھی کہ بھائی نے انٹویہ کو کہاں
 دیکھا؟ جو بات پسندیدگی سے خواہش اور پھر ”مطلب“
 تک پہنچ گئی تھی۔

بات اتنی بڑی نہیں تھی نہ خواہش ایسی انوکھی تھی
 پھر بھی دل میں ترانہ ہو گئی۔ رویا نے اسی دن اماں کو
 بھائی کی ”تمنا“ کے بارے میں واضح لفظوں میں بتا دیا۔
 اور اماں بھی رویا کی طرح حیران و پریشان رہ گئی تھیں۔
 کاشف کی خواہش اور مطلب؟

کاشف نے اسے کہاں دیکھا تھا؟ یا نہ دیکھا نہیں تھا۔
 بس بہن کے منہ سے تعریفیں سن سن کر اس نے اپنا
 ذہن دہالیا تھا؟

”ہم رشتہ لے کر تو گئے تھے۔ ادھر سے کوئی جواب
 نہیں ملا نہ ہاں نہ نال۔“ اماں کی گم صم سی آواز سنائی
 دی تھی۔

”لڑکی حسین ہے مگر ضرورت سے زیادہ تیز بھی
 ہے۔ میں تمہاری ساس سے بات نہ کروں؟“ انہوں
 نے چپ بیٹھی رویا سے مشورہ لینا چاہا۔

”رہنے دیں۔ اگر بھائی کی خواہش ہے تو انٹویہ بری
 نہیں۔ ٹھوڑی ماڈرن اور آوٹ اسپوکن (منہ
 پھٹ) ہے۔ بھائی کے ساتھ چل جائے گی۔“ رویا نے
 اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق مشورہ دیا تھا۔

”اس کی ماں تو بڑی بھلی مانس ہے۔ بے چاری
 دوسری عورت۔ پر لڑکی بہت۔“ اماں کا دم بس اسی
 بات پہ اٹکتا تھا۔ انہیں انٹویہ کچھ خاص پسند نہیں
 تھی۔

”اماں! انٹویہ ہی ٹھیک ہے۔ نئے نئے لوگ تو نہیں
 ڈھونڈنے پڑیں گے۔ میری اور بھائی کی سسرال ایک
 بن جائے گی۔ بیچ میں ایک دیوانہ سی تو ہے اسی بہانے
 بھائی میری بھی ”خبر گیری“ کر لیں گے۔“ رویا نے دل
 لگتی بات کی تھی۔ یہاں پہ اماں کی متنی ہوتی سوچوں کو
 سہارا ملا۔ وہ مکمل کا دیوانہ ٹھیک سے اوڑھتی اب ابا
 کے کمرے میں جا رہی تھیں۔ اور کسی کو بتائی نہ چلا۔
 کاشف کا دل انٹویہ پہ کیسے آیا؟

وہ ایک بو جھل سی سہ پہر تھی۔ سوکھی، ویران اور
 پھکی۔

”ڈیوڈھی میں شدید گرمی اور جس تھا۔ بجلی
 نڈار۔“ تاجو کے بیٹے، بھتیجیوں کے ریوڑ نے ایک ادھم

مچار کھاتا تھا۔ شور اور سر میں ورد کرتا ہنگامہ۔
 وہ چیل اڑتی موسیقی گالیوں سے ان کو نوازتی
 دوپٹے کے پلو میں کوئی چیز باندھ کر نکل پڑی۔ انادیہ کا
 گھر میں گلی چھوڑ کر تھا۔ اوپر سے چبھتا سورج۔
 آگ اگلتی گرمی۔ ناچو نے ہاتھوں کا چھجباتا کر سانولے
 رنگ کو دھوپ کی چبھتی کرنوں سے محفوظ کیا اور کچھ
 ہی دیر میں انادیہ کے گھر پہنچ گئی۔ انادیہ اسی کے انتظار
 میں تھی۔ چیل کی طرح لپک کر اس کے قریب آئی۔
 اور پھر بازو سے دو جوتی اسے گھسیٹ کر اپنے کمرے میں
 لے گئی۔

”کب سے انتظار میں تھی۔ اتنی دیر لگادی آنے
 میں۔“ اس نے کندھی چڑھا کر ایڑ کو لر لگایا۔

”ہاں تو اماں دیوانی کا ڈیرہ قریب تھوڑی ہے۔“ ناچو
 نے ناک کھینچ کر سڑکی تو انادیہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

”بتاؤ میرا کام ہوا کیا۔“ اس کی نیلی کانچ سی
 آنکھوں میں تجسس چھلکا پڑ رہا تھا۔ ناچو نے اتر کر کہا۔

”کوئی ایسا ویسا۔“ وہ کھلکھلائی تھی۔ ”پہلے کچھ
 کھلاؤ پلاؤ۔ پھر انعام و اکرام اور احد میں کام۔“ اس نے

فورا ”آنکھیں مٹکا کر“ سودے بازی کی۔
 ”میں نے تیرے لیے کڑائی بچا کر رکھی ہے۔ اور

فرنی بھی۔ ٹھنڈا شربت ابھی لاتی ہوں۔“ وہ تیزی سے
 باہر نکل گئی تھی۔ اور ناچو اپنی اتنی ”عزت افزائی“ پہ

پھولے نہ سائی۔ کہاں تو گھر میں سوکھی روٹی بھی نصیب
 نہ ہوتی تھی اور کہاں اتنی نعمتیں۔

انادیہ جب بڑے سجا کر واپس آئی تو ناچو کو کولر کے
 سامنے ٹھنڈی میٹھی نیند کے جھونکے آرہے تھے۔

ناچو کے ماتھے پہ شکر آئی جسے کمال مہارت سے اس
 نے چھپا لیا تھا۔

”اب بتا میرا کام ہوا؟“ انادیہ نے بے چینی سے
 انگلیاں مسلتے ہوئے پوچھا۔

”ہو گیا اور بڑا نکا کے ہوا ہے دیکھنا ایک ہی نگاہ میں
 چت نہ ہوا۔“ ناچو نے چٹکی بجائی تھی۔ ”تمہارا کام اور

میرے دام۔“ اس نے دوپٹے کا پلو کھول کر ایک تعویذ
 نما پڑیا انادیہ کے ہاتھ میں تھمائی۔ اور دوسرا خالی ہاتھ

بھی اس کے سامنے پھیلائے رکھا۔ انادیہ نے تیزی
 سے ٹکیہ اٹھایا اور ایک ہزار روپے اس کے ہاتھ میں
 رکھے۔ ناچو کا منہ اتر گیا تھا۔

”صرف پانچ سو؟“ وہ رو دینے کو تھی۔
 آنکھیں کھول کے دیکھ۔ ہزار ہے۔“ انادیہ نے

جتلایا تھا۔ ناچو کا منہ پھول گیا۔
 ”پانچ سو تو اماں دیوانی کو بھجواؤں گی۔ آخر اس نے

تعویذ کا خرچہ پانی بھی تو نکالنا ہے۔ سستے میں دے دیا
 اس نے۔ ورنہ مٹھی بھر بھر کے نوٹ لیتی ہے۔ یہ تو

میری ماں کا لحاظ کر گئی۔ آخر بیس سالہ پرانی گاڑی ہے
 میری ماں اس کی۔ اماں دیوانی کے تعویذوں سے اماں

کی اپنے پہلے شوہر سے جان چھوٹی پھر دوسرے شوہر
 اور ساس سے بھی۔ اب تیسرے کو بھی اوپر پہنچا کر دم

لے گی۔ جس بہو سے دل خراب ہو تار یا جس داماد کو
 ہری جھنڈی دکھانی ہوتی اماں اپنی پرانی ٹرک آنا تھی

یعنی تعویذوں والی۔ اور کام چٹکیوں میں ہو جاتا۔ اماں
 دیوانی کا تعویذ بڑا آزمایا ہوا تعویذ ہے۔“ ناچو کی فرائے

بھرتی زبان سے تنگ آکر انادیہ نے پانچ سو اور نکال کر
 اس کی مٹھی میں دبائے تھا۔

”آج کے لیے اتنا ہی۔ آگے اور بھی دوں گی۔
 اب چل نکلی۔ اب آئے تو غصہ کر س گے۔“ انادیہ نے



انسان کی سب سے بڑی بد نصیبی یہ ہے کہ وہ غلط
 راستہ اختیار کرے اور اسے اس راستے پر کامیابی مل

جائے۔ کاشف کا ساتھ لکھا جا چکا تھا۔ وہ اسے ملنا ہی تھا
 لیکن انادیہ کو یقین تھا کہ یہ اسی تعویذ کا کرشمہ ہے۔

اس میدان بلکہ اس دلدل میں اتری انادیہ کے لیے
 یہ ایک حیران کن معجزہ ہی تھا۔ اس بھگڑ رہے چلنے

والے ہر نئے گمراہ مسافر کے لیے یہ حیران کن اور
 اچھوتی دنیا تھی۔ تعجب میں ڈال دینے والی۔ ایک انچ کا

کاغذی ٹکڑا۔ کیسے دلوں کو پھیر سکتا ہے؟ اس کے پاس
 عقل ہوتی تو سوچتی لیکن اس کے پاس عقل ہی نہیں

تھی کہ وہ یہ سمجھ سکتی یہ رشتہ تو تعویذ سے پہلے ہی آپکا تھا۔ اس نے خود ہی تورویا کو منع کیا تھا۔

اسے جو دکھایا، سمجھایا اور بتایا جارہا تھا۔ وہ اسی پہ عمل پیرا تھی۔ اور اس کی رہنما ایک جلال عورت کی گنوار بیٹی تاجو۔ جب ”رہنما“ ایسے ہوں تو رہنماد پر چلنے والے راہیوں نے تو بھٹکانا ہی ہوتا ہے۔

اسی شب جب اس نے لوبان کی دھونی دے کر تعویذ گلے میں ڈالا تھا۔ ہاں یہ اسی شب کی بات تھی ایک عجیب و غریب واقعہ۔

ہاں یہ اس کے لیے واقعہ ہی تھا۔ تعجب انگیز حیران کن اماں دیوانی کے تعویذ۔ اس کا ایقان بچتہ کرنے والا۔ حالانکہ یہ محض اتفاق، لیکن انادیہ کی عقل کہاں کام کرتی تھی۔

اس شب وہ افرایم سے ملنے آیا تھا۔ اپنی سیاہ لمبی سی کار میں۔

وجہ خوش لباس، بلا کاخویر۔ وہ افرایم جیسا نہیں تھا مگر افرایم سے کم بھی نہیں تھا۔

اگر انادیہ کا نصیب بن جاتا تو چچی کے منہ پر طمانچہ جا لگتا۔ ان کی بہو کا بھائی، انادیہ کا شوہر۔ وہ انادیہ جیسے چچی نے مسترد کر دیا تھا۔ اور اس پہ روپا کو ترجیح دی۔ وہ بھول گئی تھی کہ روپا سے پہلے اس کے لیے کاشف کا رشتہ آیا تھا۔

وہ تذبذب کا شکار تھی۔ کیا خبر روپا اور اس کی ماں دوبارہ نہ آئیں۔ وہ ان کی خاموشی کو انکار سمجھ کے اپنی بے عزتی محسوس کر کے دوبارہ کبھی بھی نہ آئیں۔ اماں دیوانی کے تعویذ پہ ہاتھ لگتا تو اس کا دل پر سکون ہو جاتا تھا۔ اور اس سکون میں تب اضافہ ہوا تھا جب وہ افرایم سے ملنے اس کے گھر آیا۔

وہ دونوں صحن میں کھڑے تھے۔ ڈرائنگ روہم کے شیڈ تلے اور ایک دوسرے سے گفتگو میں مگن تھے۔ اور انادیہ ہنسنے کی کنگری پہ ہاتھ رکھے ساکت، منجمد اور حیران۔

”کیا تعویذ اتنی جلدی بھی اثر دکھاتے ہیں؟“

وہ ایک ٹپ چچی کے صحن میں کھڑے کاشف کو دیکھتی دم بخود تھی اور اسی بل کاشف نے کبھی نگاہوں کا زاویہ موڑ کر چھت کی طرف دیکھا تھا اور اس کے تاثرات بھی کم و بیش انادیہ جیسے تھے۔

وہ بھی اتنا ہی حیران اتنا ہی ساکت اور اسی قدر حیرت سے منجمد کھڑا تھا۔ اس ایک لمحے میں قید جس میں زعفرانی سورج کی ڈھلتی شعاعیں ایک حسین صورت کو مکمل کر رہی تھیں۔ کاشف کو لگا کہ کسی آرٹسٹ کے ایریل پہ لگی دلکش تصویر کا مبہوت کر دینے والا منظر ہے۔ کھلے ریشمی سے بل، جو ہوا سے اڑاڑ کر اس کے دودھیار خساروں سے شرارتیں کرتے تھے۔ نیلی دھکتی آنکھیں اور نیم وحیرت سے کھلے ہونٹ۔ جیسے کسی کو غیر متوقع دیکھ لیا ہو۔

کاشف کو پہلی مرتبہ اپنی اماں کے ان الفاظ یقین آیا تھا۔ جب روپا کو چھت پہ جانے سے وہ ٹوکتی تھیں۔ ”سر شام بل کھول کر چھت پہ گھومنا خاص ہے۔ اوپری مخلوق سفر پہ ہوتی ہے۔ کوئی جن مبہوت اثر نہ کر جائے۔“

کاشف کو اس لمحے جنوں اور پریوں کی اس کہانی پہ یقین آ گیا تھا۔ جب وہ خود چھت پہ لگتی ایک پری کی حسین کھلی زلفوں کا اسیر ہو گیا۔ اس لمحے کاشف کو خبر نہیں تھی کہ اسیری کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ زندگی کو گمنا کے رکھ دیتی ہے۔



چھوٹی چارپائی کے اوپر قلاقہ کا کھلا ڈبا رکھا تھا۔ جو اس وقت آدھے سے زیادہ خالی تھا۔ اور تاجو اپنی چھوٹی آنکھوں کو شمالا ”جنوبا“ کھینچ کھینچ کے کھولنے، پھیلانے کے چکر میں عجیب مضحکہ خیز صورت اختیار کر چکی تھی۔ پھر بھی بے یقینی تھی کہ کم ہی نہیں ہوتی تھی۔ صرف ایک ہی رات میں ایسی کالیا پلٹ؟ اتنا عظیم معرکہ؟ وہ قلاقہ کھاتی حواس باختہ سی انادیہ کا بازو دلوچے بھجانی خوشی کے اثر میں بولی۔

”تو مان گئی ہو اماں دیوانی کے تعویذ کو؟“

طرح ہمارے پیچھے ہیں۔ ناصر کی اطلاع نے ابا کے پیروں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ وہ جو نکاح کی خبر یہ ہی جوتا اتار چکے تھے۔ بھگالانے کان کر آپے سے باہر ہو گئے۔

اس کڑکتی دوپہر میں ابا کے گھونے، جوتے اور لاتیں ناصر کو لہو لہان کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ جو چیز بھی آرہی تھی۔ وہ بے دریغ ناصر پر سارے تھے۔ اور برقعے میں لٹی لٹکی اپنے استقبال پہ ششدر سی کھڑی تھی۔

”قاضی صاحب! بس کریں جوان بچہ ہے۔“
فرزانہ کی منیس دھری کی دھری رہ گئیں۔
”نہیں چھوڑوں گا اس کہنے کو۔ میری عزت کو چور ہے۔ نیلام کر آیا۔“ وہ غنیض کے عالم میں کانپ رہے تھے۔

”ذلیل انسان! کسی دوسرے کی عزت سے کھلواڑ کرتے اپنے آئین کی بہنوں، بیٹیوں کو سوچ لیتا چاہیے۔“ ابا آگ بکولہ تھے۔ اور فرزانہ تھر تھر کانپتی تھی۔ جبکہ انادیہ پتھر کا جیسے کوئی مجسمہ، سب اس تعویذ کی نحوست ہے جو اس نے گلے میں ڈال رکھا تھا۔

”میں تیرا خون کروں گا۔“ ابا ہتھیار لینے کے لیے کمرے کی طرف لپکے تو فرزانہ جانے کہاں سے ہمت کر کے ان کا بازو پکڑ کے کھڑی ہو گئی۔

”بس کریں قاضی صاحب! جو ہونا تھا ہو گیا۔ معاملہ مت بگاڑیں۔ جتنا ہنگامہ ہو گا۔ بات اتنی خراب ہو گی۔“ مگر ابا یہ ایک جنون سوار تھا۔ وہ برقعے میں لٹی لٹکی کو دیکھ کر آگ بکولہ ہوئے۔

”میں کہتا ہوں۔ اسے ابھی کے ابھی واپس چھوڑ کے آ۔“ ابا کا نیا حکم سن کر خون آلود ٹھوڑی پہ رومال رکھتا ناصر زخمی سیر کی طرح غرایا تھا۔
”چھوڑنے کے لیے نہیں لایا تھا۔ یہ بات زبان سے بھی مت نکالے گا۔“

”میں ایسی بے حیا لڑکی کو اپنے گھر میں نہیں رکھوں گا۔“ ابا اپنے فیصلے سے ہنسنے کو تیار نہیں تھے۔
”یہ بیوی ہے میری۔“ ناصر زبردست ہوا۔

کم صم بیٹھی انادیہ چونک کر سیدھی ہوئی تھی پھر بے ساختہ اپنا سر اثبات میں ہلا گئی۔ وہ اپنے اس ہاتھ کو بار بار پھیلا کر دیکھتی تھی جس کی تیسری انگلی میں ست رنگے تکیوں والی انگوٹھی کسی کے ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔

”بس پھر اس کی پکی مرید بن جاؤ۔“ ناچو نے دلار سے کہا تھا۔ کیونکہ اسے اپنے پیسے بھی ہاتھ سے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔

”اکثر لوگ کام پورا ہونے کے بعد رفوچکر ہو جاتے ہیں۔ دوبارہ مشکل سر پر پڑتی ہے تو پہلی کا آستانہ یاد آتا ہے۔ ایسے مطلبی لوگوں کو اماں دیوانی تعویذ نہیں دیتی۔“ ناچو نے اسے ڈرایا کہ اسے اماں دیوانی کی دوبارہ ضرورت پڑ سکتی ہے۔

”ایسا نہیں ہو گا۔“ انادیہ نے اسے تسلی دی تھی۔ ناچو خوش ہو گئی۔

”اچھا! اپنی چچی کی سناؤ۔ اس کے سینے پہ تو سانپ لوٹ گئے ہوں گے۔“ ناچو نے بڑی مزہ لیتی کیفیت میں محلے ہوئے پوچھا۔

”پتا نہیں۔ بہت چالاک عورت ہے۔ ظاہر تو کچھ نہیں کیا۔ رسم میں بھی شریک ہوئیں۔ اوپرے دل سے مجھے پیار بھی کیا تھا۔“

”ہاں! ایسی عورتوں کو بڑے حربے آتے ہیں۔“ ناچو نے تنفر سے خیال ظاہر کیا۔

انادیہ کچھ دیر وہاں بیٹھی اور پھر واپس آگئی۔ اسے ڈر بھی لگ رہا تھا اسے احساس تھا کہ اس نے گناہ کیا ہے۔

مقلنی سے چار دن بعد ایک کڑکتی دوپہر میں ناصر اپنے ساتھ برقعے میں لٹی شرمائی لجائی لڑکی کو لے آیا۔ ادھر فرزانہ کی طبیعت سخت خراب تھی اور ابا پریشان۔ اوپر سے ٹوٹنے والی یہ نئی افتاد۔ انادیہ کے ساتھ ساتھ فرزانہ بھی ہراساں تھی۔

”تمن مینے پہلے نکاح کیا تھا۔ اب میں اسے بھگالایا ہوں۔ اس کے گھر والوں کو بتا چل گیا ہے اور وہ کتوں کی

وردی والے کئی لوگ ان کے گھر میں گھسے اور ناصر کے ساتھ لبا کو بھی گرفتار کر کے لے گئے۔
لبا اس حال میں صحن سے ہٹکڑی لگوا کر نکل رہے تھے کہ ان کا سر جھکا ہوا اور کندھے ڈھلک رہے تھے۔



گھر میں ایک تھکا دینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ان دنوں برابر والے گھر میں بھی خاموشی تھی۔ کبھی کبھار چچی آتی تھیں۔ اور فرزانہ کے پاس بیٹھ کر چلی جاتیں۔ ان کی تسلیوں کا دائرہ بس فرزانہ کے گرد گھومتا تھا۔

”تم پریشان مت ہو۔ افرایم بھاگ دوڑ تو کر رہا ہے۔ اس لڑکے کی سرکشی نے تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ ایسی ذلت جس کا کوئی انت نہیں۔ ہم تو صداقت صاحب کے گھرانے کے سامنے بھی شرمندہ ہیں۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے؟ کیسے خاندان میں رشتہ جوڑ لیا۔ جو دسروں کی عزت سے کھیتے ہیں۔“
چچی کا لال ان کے لہجے سے مترشح تھا۔
”انادیہ بچن میں اسکو اٹس بنا رہی تھی۔ فوراً“ بھڑک کر باہر نکلی۔

”نکاح کیا ہے اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ آپ لوگوں کو تو موقع مل گیا ہے۔ میرے بھائی پہ کچھڑ اچھالنے کا۔“

چچی جو فرزانہ سے ہم کلام تھیں۔ ہکا بکا سی رہ گئیں۔ ”ہم کا ہے کو کچھڑ اچھالیں گے۔ ساری دنیا تھو تھو کر رہی ہے۔“ چچی نے انادیہ کی بد تمیزی پہ کوئی لحاظ نہ روا رکھتے ہوئے منہ توڑ جواب دیا تھا۔ جو انادیہ کے ٹھک سے جا لگا۔

”آپ نے سارے زیانے میں نشر کیا۔ ورنہ گھر کی بات گھر میں بھی رہ سکتی تھی۔“ انادیہ کے اس الزام پہ چچی آگ بگولہ ہو گئیں۔

”منہ سنبھال کر بات کرو بی بی! میں کوئی فرزانہ نہیں ہوں جو تمہاری ساری بد تمیزی سن کر بھی چپ رہوں۔“
چچی نے ہاتھ بلند کر کے جتلیا دیا۔ ”وہ جو لوگوں والے

”گھر سے بھاگی ہوئی۔ ماں باپ کی عزت کا جنازہ نکال کر آئی ہے۔ یہ میرے گھر میں نہیں رہے گی۔“ لبا نے نفرت سے منہ موڑ لیا تھا۔

”یہ اسی گھر میں رہے گی۔ میں دیکھتا ہوں۔ اسے کون نکالتا ہے۔“ وہ بھڑک کر بولا تھا۔

اور ان کی یہ لڑائی ابھی بیچ میں ہی تھی جب افرایم نئی اطلاع کے ساتھ ایک اور دھماکا کرنے نازل ہو گیا تھا۔ ناصر کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے افرایم نے لبا کو بتایا تھا۔

”نمایا جی! اس لڑکی کے گھر والوں نے ناصر کے خلاف اغوا کی ایف آئی آر کٹوا دی ہے۔ اور نامزد ملزم آپ بھی ہیں۔ ناصر کو پکڑوانے کے لیے ان لوگوں نے سازش کی ہے۔ آپ کا نام اس لیے بیچ میں رکھا ہے کہ ناصر کو جلد گرفتار کروا سکیں۔ میں نے اپنا سارا رسوخ استعمال کر کے پولیس کو چھاپہ مارنے سے روکا ہے۔ اگر عدالت سے وارنٹ لے کر وہ لوگ پولیس کو مجبور کریں تو میری کوئی کوشش آپ کو بچا نہیں سکے گی۔ ناصر سے کہیں ان کی لڑکی آرام سے واپس بھیج دے۔“

افرایم کی تجویز پر ناصر کھول اٹھا تھا اور پھر ان دنوں میں لڑائی شروع ہو گئی۔ جو بڑھتے بڑھتے ہاتھ پائی تک پہنچ گئی۔

اور ابھی لبا ان کے درمیان بیچ بچاؤ کروا رہی ہے تھے۔ جب ڈھیر ساری گاڑیوں کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی تھی۔

افرایم اپنا گریبان ناصر کے ہاتھ سے چھڑواتا نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

”آگئے ہیں سرکاری میزبان۔ تمہارا مدد درست کرنے۔ دیکھتا ہوں اب تم کیسے بچتے ہو۔“ وہ تیزی سے مڑا اور باہر نکل گیا تھا۔ لیکن جانے سے پہلے اس نے لبا کو تسلی ضرور دی تھی۔

”نمایا جی! آپ فکر نہ کریں، میں آپ کی ضمانت کرا لوں گا۔ آپ پریشان نہیں ہونا۔ میں آج ہی وکیل کر کے مچھلکے بنواؤں گا۔“ افرایم کے نکلتے ہی

وہ اس سے دور تھے اور اسے اندازہ نہیں تھا۔ وہ دن
سوں دور ہوتے جا رہے تھے۔

شام کو فرزانہ کا دل گھبرایا اور وہ اٹھ کے انادیہ کو
جھنجھوڑنے لگی تھیں۔

”اٹھو اور افرایم سے اپنے ابا کا چہرہ کر آؤ۔ جانے
ان کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ انادیہ کو فرزانہ کی آواز
بھکی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اس نے روشنی میں
فرزانہ کا چہرہ دیکھا۔ وہاں آنسوؤں کے ان گنت نشان
تھے۔

افرایم اور چچی سے تلخ کلامی کے بعد انادیہ کا دل تو
نہیں چاہ رہا تھا برابر والے گھر میں جانے کے لیے۔
لیکن پھر دل کی بڑھتی بے چینی سے گھبرا کر وہ ابا کی
خیریت پوچھنے چچی کے گھر آگئی تھی۔

گھر میں خاموشی پھیلی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے
قدم اٹھاتی کمرے کی طرف آگئی۔ چچی افرایم کے
کمرے میں تھیں اور نماز ادا کر رہی تھیں۔

وہ ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی اور وقت
گزاری کے لیے افرایم کے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

اس کا سادہ سا کمرہ اس کی سادہ طبیعت جیسا تھا۔ ہر
چیز ترتیب سے رکھی تھی۔ سامنے بلیک ٹوپس میں اس
کی شاندار تصویر لٹکی تھی۔ انادیہ بے ارادہ ہی دیکھتی
چلی گئی۔ اس تصویر اور اس کمرے کی ہر چیز کی اصل
مالکین نے چند مہینوں بعد یہاں آ جانا تھا۔ ہر چیز پر قبضہ
جمانے افرایم اور اس کے دل پہ اس گھر پہ اور ہر چیز
پر۔

جانے کیوں اس سوچ نے انادیہ کے دل کو پو جھل کر
دیا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں نمی ابھر آئی تھی۔ چچی
نے سلام پھیر کے دعا کی اور حیرانی سے انادیہ کی طرف
دیکھنے لگیں۔

دور کہیں کسی ایسبویٹس کا خوفناک ہارن سنائی دیتا
تھا۔ جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتا گیا۔ معاں گھر کے باہر بہت
سی گاڑیوں کے ٹائر ایک ساتھ چرچرائے تھے۔ انادیہ
دل میں اٹھتے غم کے غبار تلے بی بی بے ساختہ چچی کی
طرف بڑھی۔

گاڑیاں بھر بھر کے آئے تھے۔ سارے محلے والوں نے
دیکھا تھا۔ تب انہیں سلیمانی ٹوپی پہنا دیتیں۔“

”آپ کے بیٹے کو چین تو مل جائے۔ ناصری مخبری
بھی اسی نے کروائی۔“ انادیہ کا دماغ پھر گیا تھا۔ سارے
الزامات کی آج ہی بوچھاڑ کر دی تھی۔ اوپر سے بد قسمتی
ایسی کہ افرایم دفتر سے گھر آ گیا۔ ماں کو گھر میں نہ پا کر جو
اس نے دیوار سے جھانکا تو اس کا خون کھول اٹھا تھا۔
”سرے ہی پل وہ چھلانگ لگا کر نیچے تھا۔

انادیہ کے مد مقابل۔ تیوریاں چڑھی اور تیور بگڑے۔

”یہ کس لمبے میں تم میری ماں سے بات کر رہی ہو؟
اپنی زبان کو کنٹرول کرو۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔“
افرایم نے زہر خند لمبے میں کہا تھا۔

”تو اس سے برا پہلے بھی کوئی نہیں۔۔۔ خود کو کیا
سمجھتے ہو؟ ساری دنیا کے شریف ہو؟ باقی سب آوارہ
انادیہ کا میٹر کیا گھوما تھا۔ افرایم کا دماغ بھی چکر کھا
گیا۔

”تم دونوں تیا جی کی بد بخت اولاد ہو۔“ اچانک اس
نے ایسے الفاظ کہے جس نے ان سب کو پتھر اکر رکھ دیا
ایسا۔

”ایک امتحان اور ایک آزمائش۔ وہ تمہارے
”ہونہار“ بھائی کی وجہ سے اسپتال میں ہیں۔ میں
انہیں ہسپتال چھوڑ کے آیا ہوں۔ ان کی شوگر بہت لو
اور بلڈ پریشر خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔“ افرایم
کے انکشاف پر انادیہ کے ہاتھ سے گلاس پھسلا تھا۔ وہ
ہکا ہکا سی افرایم کو دیکھنے لگی۔ جبکہ فرزانہ رو رہی تھی۔
اور افرایم ہاں سے مخاطب تھا۔

”آپ اس کے منہ نہ لگا کریں۔ اس کی زبان کو لگام
نہیں ہے۔“ وہ ماں کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گیا تھا جبکہ
انادیہ وہیں صحن کے فرش پہ بیٹھ کر اونچی آواز میں
رونے لگی تھی۔

”ابا؟ میرے پیارے ابا۔“ اسے ابا بڑے شدت
سے یاد آئے تھے۔ ان دونوں بہن بھائی پہ جان چھڑکنے
والے ابا۔ ان کے تازا اٹھانے والے ابا۔

”چچی! میرے ابا۔۔۔“ وہ ان کے کندھے سے گئی
دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ باہر کا شور، ”آوازیں معا“
کوئی تھکے تھکے قدم اٹھاتا اندر کی طرف آیا تھا۔ پھر وہ
دروازے کے فریم میں لمحہ بھر کے لیے رکا اور آگے
برسنا۔ پھر اس نے تڑپ تڑپ کر روتی انادیا کے سر پہ
ملائت سے ہاتھ پھیرا۔ وہ خوف زدہ سی افرایم کو دیکھنے
لگی۔ جو دھیمی ”غم زدہ“ جھل آوازیں کہہ رہا تھا۔
”نہیں رہے۔“ اس کے الفاظ نے انادیا کا دل چیر
ڈالا۔

وہ افرایم کے کندھے سے گئی چیخ چیخ کر رونے لگی
تھی۔



ابا چلے گئے تھے اپنے پیچھے ڈھیر سا رانغم چھوڑ کر اور
ان کا کل اثاثہ ”عاقبت نا اندیش“ دو اولادیں۔ جن کے
پاس نہ کوئی رہنما تھا اور نہ انہیں کسی رہنما کی ضرورت
تھی۔ اپنے فیصلوں میں خود مختار، ضدی اور بے وقوف
تھے۔

کچھ رشتوں میں پختی بدگمانیوں کی وجہ سے وہ کچھ
زیادہ ہی تنہا تھے۔ اور ان بدگمانیوں کا موجب بنتی چھوٹی
چھوٹی سی غلط فہمیاں؟

ناجو، جو انادیا کی دلچسپی کے لیے روزانہ ان کے گھر آ
دھمکتی تھی۔ اور اسے چچی کے گھرانے سے بدگمان
کرنے میں پیش پیش رہتی۔ مگر انادیا کا ان دنوں ہر چیز
سے جی اچاٹ تھا۔ حتیٰ کہ کاشف کی دل لگی بھی اچھی
نہ لگتی تھی۔

ناصر ابھی جیل میں تھا اور اس کی بیوی میکے والوں
کے قبضے میں۔ ابا اپنی آخری آرام گاہ تک پہنچ چکے
تھے۔ پیچھے انادیا اور فرزانہ بچتی تھیں۔

فرزانہ کو ابا کے بعد چپ لگ گئی تھی۔ سارا دن
جائے نماز بچھا کر دعائیں کرتی۔ کبھی اپنے لیے کبھی
اپنے ہونے والے بچے کے لیے۔ اپنے لیے تو وہ کچھ
نہیں مانگتی تھی۔ اس کی ہر دعا کا محور اس کا آنے والا بچہ
تھا۔ جو پیدا ہونے سے پہلے ہی یم ہو چکا تھا۔

انادیا کو ان دنوں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی
فرزانہ کی آنکھوں میں بھی دھیرے دھیرے مر رہی
ہے۔ جانے کیوں فرزانہ کو کرب میں دیکھ کر اسے ایک
گونا گونا طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔ اگر اس کا دل دکھی تھا
تو اور بھی کوئی سکھی نہ ہوتا۔

پھر ایک دن ناچو ہوا کے گھوڑے پہ سوار بھاگی بھاگی
چلی آئی تھی۔ ”سنی ہو! تمہاری چچی نے تاریخ پکی کر
دی۔ افرایم کی شادی ہے۔ ارے کیسا بھتیجا نکلا۔ اپنی
شادی کی بڑگنی۔ تایا کا کفن بھی میلانہ ہونے دیا اور
تمہارا بھائی جو جیل میں سڑ رہا ہے۔ اسے نکلوانے کے
 بجائے اپنی خوشیوں کے کندھے پہ سوار ہے۔“ انادیا کا
دل غمو غم سے بھر گیا۔ حالانکہ چچی نے بتایا بھی تھا۔
”سادگی سے نکاح کریں گے۔ افرایم کو کورس کے
لیے جانا ہے۔ کہتا ہے روبا آجائے گی تو آپ کا دھیان
بٹ جائے گا۔ میرے اکیلے پن کی وجہ سے نکاح کا
فیصلہ کیا ہے۔“

”رشتے دار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ خود غرض اور
مطلبی۔“ انادیا رونے لگی۔ ان دنوں آنسو اس کی
پلکوں پہ دھرے رہتے تھے۔

”تم کہتیں تو سہی۔ چالیسواں تو ہونے دیتے۔“ ناچو
نے اسے تحریک دلائی۔

”بات کہہ کے گنواؤ کیا؟ جبکہ وہ فیصلہ کر چکے
ہیں۔“ اس نے تنفر سے کہا تھا۔

”اور تمہاری ساس تو شادی کے لیے نہیں کہیں گی؟“
ناجو کو ایک اور فکر نے ستایا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ نہیں۔“ انادیا نے کچھ سوچ کر
جواب دیا تھا۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا تھا۔

ناجو تو مطمئن سی گھر چلی گئی تھی۔ لیکن اسی شام روبا کی
اماں آگئیں۔

ان کا آنا غیر معمولی لگتا تھا۔ وہ بہت دیر تک فرزانہ
کے پاس بیٹھی رہیں۔ یہاں تک کہ انادیا کو بھی باہر
نکل کر سلام کرنا ہی پڑا۔ اور ابھی وہ دیر پہ پتھر رکھ کر ان
کی تواضع کے لیے کچن میں جا رہی تھی جب کاشف کی
اماں کے الفاظ نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار جہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

”تمہیں پتا چل چلے گا۔“ وہ بولی ہوئی اس نے
کمرے میں بند ہو گئی تھی اور انادیا صحن کے بیچ بیٹھ کر
اپنی بری قسمت کو سوچنے لگی۔
روبا کی اماں اگر دوبارہ آئیں؟ یا افرایم کے ساتھ
اس کا نکاح بھی فاسل ہو گیا تو؟
اور ہر مصیبت کی کٹری میں ناجواس کی مدد کے لیے
فورا تیار رہتی تھی۔ انادیا کا دکھڑا سن کر دل و جان سے
مدد کے لیے حاضر ہو گئی۔
”اماں دیوانی سے تعویذ لاتی ہوں۔ دیکھنا، کیسے
تمہارا نکاح ملتوی ہوتا ہے۔“ اس نے سینہ ٹھونک کر
کہا تھا۔ اور اس کا دل چاہا۔ وہ ناجو کا دانوں سے بھرا
چہرہ چوم لے۔ وہ ہمیشہ آڑے وقتوں میں انادیا کے کام
آتی تھی۔



ابا کی وفات کے بعد کچھ عرصہ افرایم اور چچی نے
اس کی دل جوئی کی تھی۔ مگر اس کا کردار ادیبہ دیکھ کر وہ
خود بخود پیچھے ہٹ گئے تھے اور اب تو چچی کو ان کا حال
پوچھنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ دونوں ماں بیٹا بڑے
ہی مصروف تھے۔ بازاروں کے چکر، شاپنگ اور
تیاریاں۔

انادیا غصے میں پورا دن بیٹھاتی تھی۔
”یہ ساوگی سے نکاح ہو گا۔ ساوگی اسی کو کہتے
ہیں۔“

افرایم کے دوستوں نے زبردستی گھر کی سجاوٹ کیا
کر دی۔ انادیا کے سینے پہ سانپ لوٹ گئے تھے۔ اسے
اگ بگولادیکھ کر فرزانہ سے رہانہ جاتا تھا۔
”کیا تھا اگر تمہاری خوشی میں بھی دیکھ لیتی۔ افرایم
کی شادی میں تمہارا بھی نکاح ہو جاتا۔ افرایم سارے
انتظام خود دیکھ لیتا۔“ فرزانہ کی حسرت آمیز آنکھوں
میں چھپا ایک انجانا خوف دیکھ کر انادیا چیخ پڑتی تھی۔
”آپ میرے باپ کا اچھا سوگ منارہی ہیں؟ ہر
وقت شادیوں کی بڑی رہتی ہے۔“ انادیا کچھو کے
لگاتے ہوئے یہ ہرگز نہیں دیکھتی تھی کہ اس کی بات کا

”ساوگی سے نکاح کریں گے۔ جینز کے نام یہ نکاح
بھی نہیں چاہیے، میرے گھر میں اللہ کا دیبا سب کچھ
ہے۔ بیٹی بیجیوں کی تو بیٹی لے بھی جاؤں گی۔ میری
تمنائی بھی دور ہوگی۔“ ان کا دھیما، بردبار لہجہ انادیا کو
سراسر ڈراما لگا تھا۔ ابا کو مرے ہوئے چار دن بھی نہیں
ہوئے تھے۔ فرزانہ عدت میں تھی۔ ناصر جیل میں اور
ان کو اپنے مطلب کی بڑی تھی۔ تمنائی دور کرنے کی۔
”ایک مذہبی اور سماجی فریضہ ہے۔ اس میں دیر کرنا
عقل مندی نہیں۔ پھر آج کل کے بچے بھی تو۔
کاشف نہیں رکھتا۔ اسی کا دیاؤ ہے سارا۔ ورنہ میں
چالیسویں سے پہلے کبھی نہ آتی۔“ ان کی نرم آواز انادیا
کی تیز آواز تلے اچانک دب گئی تھی۔ وہ کچن میں جاتے
جاتے پلٹ آتی۔

”میرے ابا مرے ہیں۔ کسی پڑوسی کا باپ نہیں۔
میرا دل صدے سے پھٹ رہا ہے۔ بھائی جیل میں اور
میں ڈولی پہ سوار ہو جاؤں۔ ایسی خود غرضی؟“ اس کے
رونے نے روبا کی اماں اور فرزانہ کو کھلا اٹھی تھیں۔
گو کہ بات غلط نہیں تھی۔ لیکن اس کا انداز اچھا
نہیں تھا۔ فرزانہ کو صاف لگ رہا تھا کہ روبا کی اماں کو
انادیا کا اپنی شادی کے معاملے میں بولنا پسند نہیں آیا۔
انہوں نے کہا کچھ نہیں تھا۔ تاہم ان کے چہرے پہ
بڑے ناگوار تاثرات رقم تھے۔

وہ چلی گئیں تو فرزانہ نے اسے ٹوکا تھا۔
”تمہیں بیچ میں بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ غلط تو
نہیں کہہ رہی تھیں۔ جانے میرا کیا بنتا ہے۔ تمہارے
ابا کے بعد تو مایوس ہو چلی ہوں۔ تم اکیلے کیسے رہو گی؟
شاید میں عدت اپنی خالہ کی طرف پوری کروں یا کہیں
اور۔۔۔ میرا یہاں تمہارے ابا کے بعد رہنا مناسب
نہیں۔ کل کو ناصر بھی آئے گا۔“ فرزانہ کی دھی
بو جھل آواز پہ انادیا سمجھے بغیر چلا آئی تھی۔

”اب آپ نے کہاں جانا ہے آنٹی! خدا کا خوف
کریں۔ کیا اور شادی رچائیں گی؟“ وہ غصے میں اتنی
ہی بد لحاظ ہو جاتی تھی۔ فرزانہ نے رخصتی نگاہ سے انادیا
کو دیکھا اور بس اتنا کہا۔

وزن کتنا ہے اور مقابل کا حوصلہ کتنا ہے؟

”تمہارے خاندان میں ایسا تیکھا مزاج کس کا تھا؟“

فرزانہ کا غم زدہ چہرہ موت کی سفیدی سے بچر جاتا تھا اور وہ سر جھکا کر نماز کے لیے اٹھ جاتی۔ یا نقلی عبادت کرتی یا پھر ہر وقت قرآن پڑھتی۔

ناچو کے لائے تعویذ کی بدولت اس کی شادی ملتوی ہو چکی تھی۔ اور انادیہ کے دلغ سے نا دیدہ بوجھ ہٹ گیا تھا۔ وہ اسے تعویذ کی کرامات ہی سمجھتی تھی۔ حالانکہ جس طرح اس نے کاشف کی ماں سے بد تمیزی کی تھی۔ اس کے بعد یہ کسی طور بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ افرایم کی شادی والے دن انادیہ کو رخصت کروا کے لے جاتیں۔

انہوں نے کاشف کو سمجھا دیا تھا۔ ”ابھی باپ کی وفات کے صدمے میں ہے۔ یہ وقت مناسب نہیں۔“ انہوں نے اپنی فراست سے بیٹے کا دل کھٹا ہونے سے بچا لیا تھا۔ انہیں اپنے بچوں کی خوشیاں بڑی عزیز تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی بد گمانیوں کی وجہ سے دلوں میں کدورتیں بھر جائیں۔ حالانکہ کاشف بڑا ہی پرہیزگار تھا۔ اندر ہی اندر تمللاتا رہا۔ اور انہی بوجھل دنوں میں روپا کی شادی کا دن بھی آگیا تھا۔

کاشف کے دل کو اس سی تھی کہ شاید وہ مختصر بارات کے ساتھ آتی دکھائی دے جائے۔ لیکن وہ مہندی اور بارات دونوں تقریبات میں نہیں تھی۔ البتہ ولیمہ کے دن دکھائی دے گئی تھی۔

سفید جوڑے میں چاندی سے تراشی کسی صورت کی طرح۔ کاشف کے من کی مراد پر آئی تھی۔ دل اسے دیکھ دیکھ کر بھرتا ہی نہیں تھا۔ ابھی افرایم نے اسے شہو کا دیا تھا۔

”کو تو ابھی قاضی کو بلوا لوں۔“ اس کی آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارت دیکھ کر کاشف کھیا ناسا ہو گیا۔ ”مرواؤ گے یا رب۔ جانتے نہیں وہ ضد کی کتنی پکی ہے۔“ کاشف مصنوعی انداز میں ڈر سا گیا تھا۔ افرایم نے ٹھنڈا سا ناس سا بھرا۔

”مجھ سے زیادہ ستر بھلا کون جانتا ہے؟“

کاشف نے بڑی لمبی آہ بھر کے پوچھا۔ ”داوی حضور کا۔ سیرت اور صورت دونوں میں ایسی ہی باکمال تھیں۔“ افرایم نے اس کے کندھے پہ اپنا بازو دراز کرتے ہوئے ہمدردی سے بتایا۔

”پھر داوا حضور کی کیسی گزری۔؟“ وہ شاید اپنے مستقبل کا نقشہ سوچ رہا تھا۔ افرایم کی بتائی گئی باتوں کے تناظر میں۔

”کچھ نہ پوچھو کیسی گزری۔“ افرایم نے ہنستے ہوئے اسے ڈرایا تھا۔ ”میں سمجھو، سانپ کے منہ میں کوڑھ کر لی آگئی تھی نہ اگلے بنتی نہ نکلتے۔“

”یعنی ان کا انجام۔؟“ کاشف بس بے ہوش ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا۔

”انجام نہیں۔۔۔ قیام۔۔۔ پوچھو، ان کا قیام؟“ افرایم نے ذرا اور خوب صورت نقشہ کھینچتے ہوئے مسکرا کر بتایا۔

”آں۔۔۔ ہاں وہی ان کا قیام؟“ کاشف کی پتلیاں تیزی سے گھومنے لگیں۔

”عالم بالا۔“ افرایم نے ڈرامائی انداز میں دھماکا کیا تھا۔ کاشف نے اس کے کندھے پہ گر کے بے ہوش ہونے کی اداکاری کی۔

”پھر یوں سمجھو کہ میں بھی جلد ہی تمہارے داوا حضور کا بیوی بننے والا ہوں۔“ کاشف نے ایک آنکھ کا کوننا کھڑا کر ڈر افاصلے پہ کھوئی کھوئی سی انادیہ پہ نگاہ ڈال کر افرایم سے کہا تھا۔ اسی بل انادیہ نے بھی اپنی نیلگوں آنکھوں سے کاشف کی طرف توجہ کی۔ نظروں سے نظریں ملیں اور کاشف آہ بھر کے بڑبڑایا۔

”ان کی نظروں کا“ ”سم قاتل“ ”انتا قاتل تو نہ تھا۔“

”بس تمہیں ہی“ ”مقتول“ بننے کا شوق چڑھا تھا۔“ افرایم نے شعر کہنے کے انداز میں مصرعہ مکمل کیا۔ کاشف نے خود سا اور بیٹھی انادیہ کے چاندی میں نہائے سراپے کو دکھایا۔

”قاتل انتا حسین ہو تو کون کافر ہے جو پھانسی نہ چڑھے۔“ کاشف کی بڑبڑاہٹ افرایم کو کھوکھائی تھی۔

وہ اسٹیج سے اتر کر نیچے گیا تو افرایم اپنی دلربا بیوی کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑے مدبرانہ لہجے میں بولا تھا۔

”جان جہاں! اپنے اس سونے جیسے بھائی کو بتایا نہیں تھا۔ کچھ دکتے ہیروں کی قسمیں بڑی مسلک بھی ہوتی ہیں۔ چھوٹیں تو نیل و نیل کر دیں۔ مے سمجھ کر نہیں تو زہر زہر کر دیں۔ ہاتھ لگائیں تو سر پلا آگ کر دیں۔ عشق سمجھ کر اوڑھیں تو برباد کر دیں۔“



اور یہ افرایم کی دعوتِ ولیمہ تھی۔

مختصر مگر بلاوقار مہمان۔ افرایم کے ماتحت افسران اور ان کی فیملیز۔ انادیہ آنکھوں میں دھندلیے، قریب ولیمہ ”میں غائب و غایب سے شامل رہی۔ دل ہیز سے اچاٹ تھا۔ اور آج روبا کو اتنے مان، فخر اور ہار کے ساتھ اسٹیج کی ملکہ بن کر بیٹھے دیکھ کر انادیہ کا پاس زیاں کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

اگر آج وہ افرایم کے پہلو میں ہوتی تو اس محفل کا سب کچھ اور ہوتا۔ اس کا بجلیاں بن کر کڑکتا حسن اپنے والوں کو چند حیا دیتا۔ آج افرایم نے کیا کھودیا تھا دلوں کی توجہ؟ رشک؟ اور خرم؟

اس نے اپنی تلخ سوچوں اور خود پسندی کے خمار میں سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی کہ افرایم اپنی بیوی کو مرکزِ نگاہ بنا کر بھی بھی خوش نہ ہوتا۔ اس کی بیوی کے لیے بس اس کی توجہ اور نظرِ کرم کافی تھی۔ وہ بے دلی سے کھانا کھانے سے پہلے ہی اٹھ گئی۔

اس کے جلدی اٹھنے کی ایک وجہ کاشف کی نگاہوں کا ارتکاز بھی تھا۔ اس کی برپیش نگاہوں کی حدت اور بندوبست کی گرمی۔ وہ افرایم کے کانوں میں گھسا یقینی طور پر انادیہ کے بارے ہی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس سے مزید برداشت نہ ہوا اور وہ اٹھ کر شامیانے سے نکل کر کمر کی طرف جانے لگی۔ معا ”اسے اپنے پیچھے قدموں کی ہلکی چاپ محسوس ہوئی۔ وہ دیکھے بغیر جانتی تھی کہ آئے والا کون ہے؟“

اس کی مسکراتی کن خوشبو انادیہ کے آس پاس چکرانے لگی۔ وہ ایسا تھا کہ لاکھوں میں ممتاز نظر آتا۔ اسے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے ہی سہی اس کا احساس زیاں کم ہونے لگا۔ وہ اس کے سامنے جم کر کھڑا تھا۔ کترا کر جانے کی راہیں مسدود تھیں۔ شامیانے کا دروازہ اتنا کشادہ نہیں تھا جو وہ برابر سے گزر جاتی۔ اس نے بے بسی کے عالم میں کاشف کی طرف دیکھا۔

”ہماری نظروں کے حصار سے بچ بچا کر آپ کہیں فرار نہیں ہو سکتیں؟“ اس کی خوبصورت آنکھوں میں ان گنت جذبوں کے چراغ روشن تھے۔

انادیہ کا ان آنکھوں کے سامنے ٹھہرنا محال تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ سب کچھ تھا۔ جو افرایم کی آنکھوں میں انادیہ کے لیے کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔

”راستہ چھوڑیے۔“ اس نے گھبرا کر چیخے دیکھا۔ سب لوگ دو لہا دلہن کے ساتھ تصور میں کھینچوانے میں اور سلامیاں دینے میں مصروف تھے۔ کچھ خواتین چچی کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھیں، کوئی بھی ان دونوں کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

”اول تو ہم راستے میں آیا نہیں کرتے اور اگر آجائیں تو پھر جلیا نہیں کرتے۔“ کاشف کا دل قریب لہجہ اور انداز انادیہ کی ہتھیلیاں بھینکنے لگیں۔

”جائیں نا کوئی دیکھ لے گا۔“ وہ محض اسے بھیجنے کے لیے ڈرانے کی کوشش کر رہی تھی اور کاشف ایسا بے نیاز جیسے اسے کسی کی برواہی نہیں تھی۔

”اہل حسن کو لوگ دیکھا ہی کرتے ہیں۔“ وہ اپنی تعریف کر رہا تھا یا اس کی؟ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

”کوئی قاعدہ قانون بھی ہوتا ہے دیکھنے کا۔ چچی ابھی افسانہ بنا دیں گی۔“ اس نے جان بوجھ کر چچی کا نام لیا۔ تاکہ اسے بھی بتا چلے افرایم کی ماں کیسی ہے؟

”محبت ہر قاعدے اور قانون سے بالاتر ہوتی ہے۔“ کاشف کے اپنے ہی فلسفے تھے۔ مخمور نگاہیں اور دل میں گھر کرتی صورت اور دلنشین انداز۔ مگر وہ بھی انادیہ تھی۔ کسی کے دل میں گھر کر تو سکتی تھی۔ مگر اپنے دل میں کسی کو جگہ نہیں دے سکتی تھی۔ یہ اس

کی ”خود پسندی“ کی انتہا تھی۔

”ہوئی۔“ انادوہ نے سخت بھری بے نیازی سے کہا۔ ”اب مجھے جانے دیجئے۔“

”کیا اپنے دل سے؟“ کاشف بے ساختہ بولا۔ انادوہ لہجہ بھر کے لیے ٹھہم سی گئی۔

”میں نے یہ کب کہا۔“ وہ جزبزی رہ گئی تھی۔ یہ کاشف تو بڑا گرا لگتا تھا۔ وہ کچھ گھبرائی اور پھر اس نے اپنی گردن میں لٹکے تعویذ پر غیر ارادی ہاتھ پھیرا۔ اسے یہ سب تعویذ کی کرامت لگ رہی تھی۔

”تو پھر سن لو۔ محبت کے قاعدوں میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے۔ جو بے دھڑک آجائے۔ وہ کبھی جا نہیں سکتا۔ اگر ایک دفعہ چلا جائے۔ تو پھر واپس آ نہیں سکتا۔“ وہ اسے فلسفہ نہیں سنا رہا تھا۔ اپنا مزاج بتا رہا تھا۔

اس کے لہجے سے وہ ٹھٹھک گئی، چونک گئی۔ پھر لہجہ بھر کے لیے رکی اور تیزی سے مڑکر مہمانوں کی بھیڑ میں شامل ہو گئی۔ اس نے گھر جانے کا ارادہ فی الوقت ترک کر دیا تھا۔ کاشف بھی شاید یہی چاہتا تھا۔ اسی لیے مسوڑ سیا واپس اسٹیج پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ الگ تھلگ سی بیٹھی تھی۔ مہمان کھانا کھا رہے تھے کچھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

بھیڑ چھٹی تو اس نے گھر جانے میں ہی عافیت جانی۔ اس کو جانا دیکھ کر چچی کے پاس کھڑی ایک عورت نے چچی کو مخاطب کیا۔ اس کے لہجے میں انادوہ کے لیے ستائش ہی ستائش تھی۔

”آپ نے اپنے جیٹھ کی بیٹی کیوں نہیں لی؟ کتنی پیاری ہے۔“ کیسا رشک بھرا انداز تھا۔ اسے ٹھنڈی پڑ گئی۔

انادوہ کے قدموں کی رفتار خود بخود سست ہو گئی تھی۔ وہ چچی کا جواب سننے کے لیے سست روی سے چلنے لگی۔ آخر چچی کیا جواب دیتیں؟ یہی ناکہ انادوہ جیسی حسین لڑکی ان کے نصیب میں نہیں تھی۔

”مگر یہ کیا؟“ اس کا دم اڑکا۔
”اسے وہی اپنے گھر لے کر جائے گا جسے اپنی زندگی

جنم ہٹانی ہوگی۔“ چچی کے استہزائیہ لہجے نے اسے سلگا دیا۔ اس کا دل چاہا ابھی پلٹ کر چچی کا مزاج ٹھٹھکانے لگا دے۔ مگر جانے کیسے ضبط سے کھڑی رہی تھی۔ ورنہ صبر اور ضبط اس کے مزاج کا حصہ نہ تھا۔ اس کے آس پاس جیسے شعلے لپکنے لگے تھے۔

”اب ایسی بات تو نہ کریں۔“ ان خاتون کے دل میں انادوہ کی موہنی صورت کھب کر رہ گئی تھی۔ وہ چچی کے تجربات سے ناواقف تھیں۔ اور انادوہ کے مزاج سے بھی اور چچی جانتی تھیں۔ زبان کی لغزش قدموں کی لغزش سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔

”آپ کو شاید انادوہ کے شاہانہ مزاج کی خبر نہیں۔“ چچی نے جان بوجھ کر بات ٹل دی تھی جبکہ انادوہ کے دل میں چچی کا استہزائیہ لہجہ ترانہ ہو گیا تھا۔ واپسی پر تو اس کے اندر شرارے پھوٹ رہی تھیں۔

”ہو نہ! دیکھوں گی، یہ رویا کیسے آپ کی زندگی جنت بناتی ہے؟ آپ کے گھر میں آگ نہ لگائی تو انادوہ نام نہیں میرا۔ اسی زبان سے کہیں گی۔ کیسی سبز قدم بہو گھر میں لائی۔ جس نے ہمیں برباد کر دیا۔ جس کی نحوست نے ہمیں تباہ کر دیا۔“ وہ غصے توہین اور نفرت کے احساس سے بھڑبھڑھلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

چچی کے اہانت آمیز الفاظ نے سر محفل اسے ذلیل کر دیا تھا۔ کچھ عورتوں نے اسے ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔ جب وہ شامیانے سے نکل رہی تھی تو اس کے شاطر ذہن نے ایک واضح منصوبہ سوچ لیا تھا۔ جس پر عمل کرنے کے لیے اسے باجو کا ساتھ اور اس کے قیمتی مشوروں کی ضرورت تھی۔



گرمی کا زور ٹوٹ گیا تھا۔

موسم خوش گوار ہو گیا تھا اور گزشتہ رات ہونے والی بارش کی وجہ سے فضا میں خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر انادوہ کے وجود میں ایسا شعلہ بھڑک رہا تھا۔ اسے دن رات آنچ دیتا اور سلگائے رکھتا۔ اسے اس کے اپنی بے عزتی یاد آتی تھی۔

اس دن ناچو چہل کھینٹی، موہنگ پہلیاں ٹوٹتی
انادیہ کے گھر آئی تو فرزانہ دروازے کراہ رہی تھی۔ ناچو
نے فرزانہ کی کراہوں کو ان سنی کرتے ہوئے انادیہ کو
تلاش کرنا چاہا۔ وہ نیچے کہیں بھی نہیں تھی۔ نہ کچن
میں نہ کمرے میں نہ اسٹور میں۔ ناچو نے احتیاطاً
غسل خانہ بھی دیکھ لیا تھا۔

کمرے سے فرزانہ کی درو میں ڈوبی آوازیں ابھی
تک آرہی تھیں۔

”کوئی ہے؟ کوئی ہے؟“ انادیہ کو بلاؤ۔ کوئی ہے؟“
ناچو ناگواری سے فرزانہ کو نظر انداز کرتے ہوئے
سر جھٹک کر سیڑھیاں چڑھتی اوپر آگئی۔ انادیہ ڈیوڑھی
میں جھٹکا جا رہی تھی۔ اور ریڈیو کی آواز چار سو
گوںج رہی تھی۔ ناچو نے آگے بڑھ کر آواز ہلکی کی تو
انادیہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔

”تم کب نازل ہوئیں؟“
”ابھی کے ابھی۔“ ناچو نے دانت نکالے۔ انادیہ
اپنے لائے سنہرے بال پونی میں جکڑنے لگی۔ جو ایک
ڈھیر کی صورت اس کی پشت اور کندھے پہ بکھر رہے
تھے۔ ناچو کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

”ہائے ظالم، بڑی قیامت ہو تم۔ سونے میں دھلی
یہ افرایم کی نظر کہیں کمزور تو نہیں تھی۔ اس ڈھلتی
شام کو اٹھا لایا۔ ایسے تیناک سوچ کو ٹھوکر مار کے۔“
ناچو کی عادت تھی۔ اس کے زخموں کو ادھیڑنے کی۔
انادیہ نے زخمی سے انداز میں اسے دیکھا تھا۔

”اس ڈھلتی شام نے افرایم کی زندگی کو روشن صبح
بنار کھا ہے۔“ انادیہ کے منہ سے انگارے جھڑے۔

”مطلب۔؟“ ناچو سمجھ تو گئی تھی۔ بس جان بوجھ
کے اس کی جلن کا مزہ لیتی تھی۔ دونوں ہی مزاجاً
دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر خوش ہونے والوں میں
سے تھیں۔

”وہ امید سے ہے۔“ انادیہ نے جل کرتا تھا۔
”واقعی؟“ ناچو اچھل پڑی تھی۔ جیسے یہ کوئی ان

ہونی بات ہو۔ ”کب۔ ہا۔ بڑی نصیب والی ہے۔“
اب وہ لہندی آہیں بھر کے انادیہ کو تاؤ دلا رہی

چچی بیٹھی ہی خاندان والوں کے سامنے اسے پول ہی
ذلیل کیا کرتی تھیں۔ جب کوئی چچی کے سامنے اس کی
تعریف کرتا تو فوراً ”اس کی چیدہ چیدہ برائیوں کو گنوانے
لگ جاتی تھیں۔ اپنی بیٹی تو تھی نہیں اسی لیے
دوسروں کی بیٹیوں پہ انگلی اٹھاتے انہیں ذرا خوف
نہیں آتا تھا انادیہ منہ بھر بھر کے انہیں بد دعائیں دیتی
تھی۔

”خدا کرے۔ آپ کی بہو کے ہاں درجن بھر لڑکیاں
ہوں تاکہ آپ کو احساس ہو۔ کسی کی بیٹی کے بارے
میں دو انچ کی زبان نہیں ہلاتے۔“ وہ اکثر ناچو کے
بھڑکنے پہ دیوار کے اوپر چڑھ کے چچی کو ڈھیروں سناتی
تھی۔

دراصل ناچو کو بھڑکنے میں کمال حاصل تھا۔ اور
انادیہ اس کا بڑا کارآمد ہتھیار تھی۔ مگر آج کل وہ چچی
کے گھرانے کو تکلیف دینے کے لیے اماں دیوانی سے
تعوذ نہیں منگوا رہی تھی۔ اور ناچو کا بزنس ٹھپ تھا۔
اسی لیے ناچو چاہتی تھی کہ کوئی ایسا مسئلہ اٹھے جس کے
بعد انادیہ کو اماں دیوانی کی لیے عرصے کے لیے ضرورت
پڑ جائے۔ اور اس کی ہوائی روزی کے راستے کھلے
ریں۔

اس دن ناچو صبح سویرے ہی انادیہ کے سر پہ سوار ہو
گئی تھی۔ اس کا جب دل چاہتا یوں ہی منہ اٹھا کر بے
دھڑک آجاتی تھی۔ ابا تو تھے نہیں۔ جو ناچو کو گھر
آنے جانے سے روکتے۔ ناچو کے گھرانے کو پورے
محلے میں کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ خود انادیہ بھی نہیں
کرتی تھی۔ مگر اسے ناچو کی اکثر ضرورت پڑ جاتی تھی۔
ایا کے بعد انادیہ خود مختار ہو چکی تھی۔ فرزانہ کو تو
کسی گنتی میں شمار نہیں کرتی تھی۔ مرضی سے باہر آتی
جاتی۔ شاپنگ کرتی، کھومتی پھرتی اور ناچو اس کے
ساتھ ساتھ رہتی۔

ناصر ابھی تک جیل میں تھا۔ اور افرایم نے اس
کی رہائی کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اسی لیے انادیہ کو
افرایم بہت غصہ آ رہا تھا۔ جسے اپنی خوشیوں میں کھو
کر تیا زاوی فکر تک نہیں تھی۔

تھی۔ ”اللہ کرے“ چچی کی ڈھیر ساری پوتیاں ہوں اور ان کی قینچی کی طرح چلتی گز بھر بھی زبانیں۔ ”انادیہ نے منہ بھر کے بددعا دی تھی۔ ناجو کی چھوٹی آنکھوں میں چمک بھر گئی۔ وہ کھسک کر اس کے قریب آگئی تھی۔ ”ہو سکتی ہیں۔ ایک چھوڑ کئی ہو سکتی ہیں۔“ ناجو نے چٹکی بجاتے ہوئے اسے اکسایا۔

”اماں دیوانی کے تعویذ سے۔ ارے، جب لڑکوں کے لیے تعویذ دے سکتی ہے تو لڑکیوں کے لیے کیوں نہیں وہ شاید بے نامچہ لڑکیوں کے بعد اس کا لڑکا ہو۔“ اماں دیوانی کے تعویذ سے۔ ”ناجو نے اسے پھر پی پڑھائی۔

اگر ایسا ہو جاتا تو مزہ ہی آ جاتا۔ چچی کو پوتے کی بڑی خواہش تھی۔ ہر ایک سے کہتی تھیں۔

”دعا کرنا میرا پہلا پوتا ہو۔ افرایم اکیلا نہ کوئی بھائی نہ بہن۔ بیٹا ہو گا تو پانڈو بنے گا۔“ وہی ماؤں کی پرانی سوچ۔ انادیہ سوچنے لگی۔ ”اگر پوتی ہوئی تو روپا کی حیثیت میں بھی کی آئے گی۔ اس کی پہلی سی قدر نہیں رہے گی۔ ابھی تو تانی نے اسے شہزادی بنا کر پلنگہ پہ بٹھا رکھا تھا۔ ذرا سا کام بھی نہیں کرنے دیتی تھیں۔

ناجو کو دو ہزار روپے منشی میں تھماتے ہوئے اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا تھا۔ یہ وکٹن سے آنے والا کرایہ تھا۔ جس سے مہینہ بھی گزارنا تھا اور ابھی فرزانہ کو ہسپتال بھی لے کر جانا تھا۔ مگر ان سب باتوں پر حسد غالب آگیا اور وہ ناجو کی طرف متوجہ ہوئی۔

”کام پکا ہونا چاہیے۔ حرام کے پیسے نہیں ہیں میرے۔“ اس کا انداز سخت بھرا تھا۔ ناجو نے اندر ہی اندر دانت پیسے مگر مسکرا کر چالپوسی سے کہا۔

”پہلے کبھی کچا کام کیا ہے؟“ ”نہیں۔“ انادیہ کو تسلیم کرتے ہی بنی تھی۔

جس وقت ناجو دو ہزار روپے میں دو بوائے سیڑھیاں اتر رہی تھی اسے انادیہ کی چچی والی ٹاپ عورت کے

ساتھ بھاکم بھاگ آتی دکھائی دیں۔ ناجو ناک۔ انگلی دھرے قدرے حیران ہوئی پھر سر جھٹک کر باہر نکل گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد فرزانہ کو چچی اپنے ساتھ ہسپتال لے گئی تھیں۔

انادیہ کو پتا ہی نہ چلا۔ وہ اپنے گلے میں لٹکے تعویذ سے ہاتھ پھیرتی ریڈیو پہ گلے سستی رہی اور اگلے چار گھنٹوں میں نیچے کمر امچ گیا۔

فرزانہ نے اپنا کما پورا کر دیا تھا۔ وہ اماں کے پیچھے ہی اس گھر سے چلی گئی تھی۔ اپنی عدت کے دن پورے کیے بغیر فرزانہ کو یہی دھڑکا تھا کہ انادیہ اس کے بعد اکیلی رہ جائے گی۔ لیکن جاتے جاتے بھی وہ انادیہ کی تنہائی دور کرنے کا سامان کر گئی تھی۔ ایک منشی سی پچی اس بے رحم شہزادی کے حوالے کر کے۔ فرزانہ دنیا سے منہ موڑ گئی تھی۔ انادیہ کو حواس باختہ چھوڑ کر۔ اور اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ فرزانہ اس گھر کے لیے کیا تھی؟ اور فرزانہ کے چلے جانے کے بعد اس کے اوپر کتنی بھاری ذمہ داری آگئی تھی۔ ایک ان چاہی ذمہ داری اور ناپسندیدہ بوجھ۔



گروش حالات نے انادیہ کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ پچی کا رونا چلانا، کھانا پلانا، نہ لانا دھلانا۔ اس جیسی نفس اور نازک اندام لڑکی کے لیے پہاڑ توڑ دینے کے مترادف تھا۔

پھر تمہیہ کہ کاشف تین مہینے کے شارٹ کورس پہ کراچی چلا گیا تھا۔ اور یوں اس پچی سے نجات کا واحد ذریعہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کی شادی تین مہینے کے لیے مزید ملتوی ہو گئی تھی۔

ان ہی حالات میں انادیہ کے لیے ایک اچھی خبر یہ تھی کہ افرایم کے ہاں لڑکی ہوئی تھی۔ انادیہ نے سنا تو ایک کھنسی سی خوشی میں مبتلا ہو گئی۔ اوپر سے اسے چچی کی اداسی مزہ دے گئی تھی۔ گو کہ انہوں نے بہت زیادہ غم نہیں کیا تھا لیکن ان کے چہرے پہ عجیب سی اداسی تھی۔ انادیہ کے لیے یہ تاثرات بڑے خوش کن

تھے۔ اگلے کئی دن تک وہ مسووری رہی اور فرزانہ کے اس عذاب پہ غصہ بھی نہیں نکلا۔

دکان سے کرایہ آجاتا تھا۔ سوگزر بسر میں مسئلہ نہیں تھا۔ مگر ضروریات بہت بڑھ گئی تھیں۔ اور انادوہ کی اچھا پہننے اوڑھنے کی خواہش مرچانے لگی تھی۔ لیکن یہ حالات بھی محدود وقت تک کے لیے تھے۔ شادی کے فوراً بعد وہ اپنے سارے ارمان پوری کرنے کی خواہش رکھتی تھی۔ زیورات، نئے نئے کپڑے اور خوب سیر سہانے کاشف کے گہرائی مسائل نہیں تھے۔ وہ معاشی لحاظ سے بہت مضبوط تھا۔ اور ابھی وہ مستقبل کے سہانے پہنے بن رہی تھی کہ وہ ہو گیا جس کی نہ اسے توقع تھی نہ خواہش۔

وہ دن اس کی زندگی کا بدترین دن تھا۔ انتہائی خوفناک اور بھانک۔ اس دن انادوہ نے افرایم کا ایک بیٹا نک روپہ چھوٹا تھا۔

اس دن وہ چھت پہ ہنہوے سے لٹکی تانکا جھانکی میں مصروف تھی۔ تبھی ادھر چکراتی بھی ادھر۔ ہنہوے کے اوپر نوکری رہی تھی۔ جس کے اندر کیلے رکھے تھے۔ وہ کیلے کھاتی مکن سی تھی۔ جب برابر والے مکن میں اس کی نگاہ روپا پہ پڑی تھی۔ قریباً تین مہینے بعد وہ روپا کو دیکھ رہی تھی۔ ٹھہری ہنہوے پہلے کے مقابلے میں جسم بھر گیا تھا۔ اور اس کے لہراتے خوب صورت بال۔ بال کیلے اور نرم تھے۔ گویا وہ ابھی نہا کر نکلی تھی۔ وہ مصروف انداز میں بچی کے کپڑے دھو رہی تھی۔ پھر اس نے بالٹی میں کپڑے نچوڑ کر رکھے اور انہیں الگنی پر پھیلانے کے لیے چھت کی طرف جانے لگی۔

انادوہ ذرا اوٹ میں کھڑی ہو گئی تھی۔ تاکہ روپا کی اس پہ نگاہ نہ پڑے۔ کہنے کو تو روپا اس کی سہیلی اور رشتے میں نہند تھی۔ لیکن انادوہ کو یکایقین تھا۔ چچی اور افرایم روپا کو انادوہ سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مہینوں ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھتی تھیں۔ گو کہ ایک دوسرے سے ملنے کا شوق بھی نہیں تھا۔ پھر بھی روپا انادوہ کو مکن میں بھی کم دکھائی دیتی

تھی اور انادوہ کو تو اس بات کی خبر ہی نہیں تھی کہ چچی روپا کو مکن میں بھی نکلنے نہیں دیتی تھیں۔ تاکہ انادوہ کی نظر بد سے محفوظ رہ سکے۔ ان کے جو خدشات تھے وہ بے بنیاد ہرگز نہیں تھے۔ انہیں کہیں کوئی خطرہ انادوہ سے لاحق ضرور تھا۔ شاید اس کی نیلی آنکھوں میں بجلی کی سی لپک انہیں خوفزدہ کیے رکھتی تھی۔

لیکن اس دن روپا کی بد قسمتی تھی جو وہ سیاسی غیر موجودگی میں کپڑے پھیلانے اور چلی آئی تھی۔ اپنے ہی دھیان میں مکن جب وہ بچی کے چھوٹے چھوٹے کپڑے الگنی پر پھیلا کر سیر دھیوں کی طرف آئی تو انادوہ نے اوٹ سے نکل کر ایک کیلے کا چھلکا سیر دھی کے اوپر پھینک دیا تھا۔ اپنے تئیں یہ اس کی بے ضرر سی شرارت تھی۔

اب وہ اوٹ میں کھڑی ہو کر تماشا دیکھنے لگی۔ جیسے ہی روپا نے اپنے۔ دھیان میں قدم بچے پاؤں رکھا۔ دوسرے ہی بل وہ پھسلتی ہوئی بھانک چٹخوں کے ساتھ زمین بوس ہو گئی تھی۔ یہ صرف لمحوں کا کھیل تھا اور بس۔ اور ابھی وہ پوری طرح سے اس کھیل کی کامیابی سے لطف اندوز بھی نہیں ہوئی تھی کہ کوئی قدموں کی خوفناک دھمک سے سیر دھیاں چڑھتا، دوڑتا اور دونوں چھتوں کو الگ کرتی چھوٹی دیوار کو پھاندتا اس کے سر پہ بم کی طرح چھٹا تھا۔

وہ افرایم تھا۔ جو ”آپے“ میں نہیں لگ رہا تھا۔ اور اس کے پیچھے آتی چچی خوشخوار تیور لیے اور افرایم اس کے منہ پر لگاتا ہر پھر رہا تھا ایک دو تین۔ اور کسی زخمی درندے کی طرح غرار ہا تھا۔

”کمہنی، ذلیل! مار ڈالا اسے۔ ڈائن کس کس کا خون چوسے گی؟“

وہ افرایم تو نہیں تھا۔ یہ تو کوئی درندہ تھا۔ افرایم تو بہت مہذب، نرم مزاج، حلیم الطبع تھا۔ وہ کسی عورت پہ ہاتھ کبھی اٹھانے والا نہ تھا۔ یہ افرایم اس افرایم سے کتنا مختلف اور الگ تھا۔ انادوہ کو پٹنے مار کھاتے ہوئے بالکل علم نہیں تھا کہ افرایم کے یوں پھرنے کی کیا وجہ ہے اور بچے سے آتی

انہوں نے کم پائی والی سطریں پڑھ لے اور پتھروں،
کنکروں پہ چلتی ندی عبور کر گئیں۔ آگے راستہ تنگ
اور ہموار تھا۔ پھر سامنے ہی برگد کا خوفناک سا درخت۔
دلوں میں ہیبت کا احساس ابھرا۔ ناچو کے ہاتھ پہ اس
کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔

”ڈرو نہیں۔“ ناچو نے تنبیہ کی ”یہاں آتے
ہوئے خوف آتا ہے۔ جاتے ہوئے نہیں۔“ اس کی
تسلیاں۔ انا دیہ خوف سے پیلی پڑتی چلتی رہی۔ جب
سردھڑ کی بازی لگا ہی دی تھی تو پھر ڈرنا کیسا؟
کچھ ہی دیر میں وہ اماں دیوانی کے آستانے تھیں۔
یہ ویسا ہی تھا جیسا کہ عموما ”عملیات کرتے والے
ساحروں کا ہوتا ہے۔

گھٹن سے بھرا کمرہ۔ نیچی چھت اکا دکالوگ۔
خاموشی، سناٹا اور ہیبت۔

”آج کے دن رش کم ہوتا ہے۔ اماں دیوانی کا یہ
چلہ تھوار“ ہے۔ آج کے دن وہ بہت کم کسی کا کام کرتی
ہے۔ یہ تو تیرے نصیب اچھے ہیں۔ میں نے تیری درو
ناک کہانی سنائی تو اماں کو ترس آگیا۔ اس لیے آج ہی
تمہیں بلا لیا۔“ ناچو نے اس کے کان میں سرگوشی کی
تھی۔

”آج کے بعد دوبارہ تو نہیں بلائیں گی؟“ انا دیہ نے
دھیمی آواز میں پوچھا۔

”ہرگز نہیں۔“ ناچو نے اسے تسلی دی تھی۔

”اماں دیوانی بس ایک ہی دفعہ کام کرتی ہے۔ پکا اور ٹھوس
جعلی پیروں کی طرح ڈرنا نہیں کرتی۔ بڑی جانی مانی
جلادو گرتی ہے۔“ ناچو اماں دیوانی کی تعریف کرتی چلی گئی
اور پھر اماں دیوانی کا انتظار کرتے کرتے وہ اس کی پوری
ہسٹری کو بھی جان گئی تھی۔

”بنگل کی ہندوانی تھی۔ یعنی ہندو عورت۔ ایک
مسلمان چھیرے کی محبت کا طوق گلے میں لٹکا لیا۔ اور
وہ تھا پکا مسلمان۔ یہ کٹر ہندو۔ چھیرے نے اس کی
محبت کو قبول نہ کیا اور بنگال چھوڑ کر یہاں آن بسا۔
اماں دیوانی اس کے پیچھے یہاں چلی آئی۔ وہ اپنی زندگی
اور بال بچوں میں کم تھا۔ اماں نے اس کے فراق میں۔

اسے افرایم سے بدلہ لینا تھا۔ ان تھپڑوں کا جو اس
کے منہ پہ مارے تھے اور چچی سے بھی انتقام لینا تھا۔ ان
جوتوں کا جو اس کے رخساروں پہ اپنے نشان چھوڑ گئے
تھے۔ ذلت کے نشان؟ اہانت کے نشان۔ روبا تو بلا وجہ
ہی ان دونوں کے بیچ میں ”پس“ گئی تھی۔ ورنہ انا دیہ
کے دل میں روبا کے لیے پر خاش نہیں تھی۔ پھر بھی
اس سارے ”انتقام“ کا بار بے چاری روبا کے سر پہ آ
گیا تھا۔

وہ قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی قصور وار ٹھہری
تھی۔ اور ایک نہ ختم ہونے والے عذاب میں مبتلا ہو
گئی تھی۔ ہاں، روبا کو تکلیف ہوتی تو افرایم بھی ترپتا
اور اسی ترپ کا مزہ لینے کے لیے وہ اندھا دھند چل
پڑی۔

نماز ظہر کا وقت تھا۔ سربا کے دن آچکے تھے۔ یوں
چڑھتے اور یوں ڈھل جاتے۔

اس نے ناچو کے کہنے پہ برقعہ پہن رکھا تھا۔ سر سے
لے کر پیروں تک۔ چہرہ نقاب میں چھپا تھا۔ اسی طرح
ناچو بھی برقعے میں تھی۔ تاہم اس نے نقاب نہیں لگا
رکھا تھا۔ وہ تانے میں بیٹھی ان جانے راستے کی جانب
گامزن تھی۔ اور بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

ناچو اس کی گھبراہٹ کو سمجھتی تھی۔ اسی لیے بار بار
اس کا ہاتھ دبائی، تسلی دیتی تھی۔ خشک فضا کے باوجود
اس کے ہاتھ پسینے میں بھیگے ہوئے تھے۔

کچھ ہی دیر میں تانکا ایک کچے راستے پہ رک گیا تھا۔
آگے ندی تھی۔ جسے پیدل پار کرنا تھا۔ بڑا خوفناک
راستہ تھا۔

”یہاں پہ میں آتی تھی تیرے لیے اور ایک نہیں
کئی دفعہ آئی ہوں۔“ ناچو نے بیچ بیچ میں اپنے
احسانات گنوانے بھی ضروری سمجھے تھے اور انا دیہ کو
آگے بڑھتے ہوئے کئی مرتبہ ناچو کی دوستی پہ فخر سا ہوا
تھا۔ اس نے اس کی خاطر اپنی جان جو کھم میں ڈالی تھی۔
ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ۔

اور اب کام ذرا دسری نوعیت کا تھا اس لیے انا دیہ
کو خود ہی آنا پڑا۔

جنگلوں میں بیٹھ کر ہزار چلے کیے مگر مجھ پر پھر بھی نہ ملا اور ایک روز وہ اس دنیا سے ہی چلا گیا۔ اماں غم میں دیوانی۔ تب سے آج تک یہ اماں دیوانی ہے۔ اسی پچھیرے کی قبرہ اماں نے اپنا آستانہ بنالیا۔ اور ساری زندگی لوگوں کے لیے وقف کر دی۔ دکھی انسانیت کی خدمت۔ اٹنے کام سیدھے اور سیدھے اٹنے کرنا اماں دیوانی کے بامیں ہاتھ کا کام ہے۔

لیکن ایک بات ہے۔ اماں سب سے زیادہ چوٹی کا تعویذ محبت کرنے والوں کے لیے دیتی ہے۔ مجال ہے جو لڑکا، کسی لڑکی کا دل توڑ کر سکھی رہ جائے۔ اماں کو جلال آجاتا ہے اپنی ناکام حسرتوں کا اور پھر اتنا محبوب گیا یا محب گیا۔

انا دیہ خاموشی سے بنا جو کی باتیں سن رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ان کا بلاوا آگیا۔ وہ دونوں اندر پہنچیں۔ یہ ایک ٹھٹھن زوہ نیم تاریک کمرہ تھا۔ فرش درری پہ بیٹھی گھونسلایا ہوں والی عورت۔ جس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اپنے دھیان میں گول گول سر کو گھماتی تھی۔

وہ ایک کمرہ چرے والی عورت تھی۔ اگر وہ مجھ پر اسے چھوڑ کر بھاگا تھا تو ٹھیک ہی بھاگا تھا۔ اس خوفناک عورت سے شادی کے بعد بھلا اس کا کیا حشر ہوتا؟

”یہ آتش عشق ہے“ جلا کر رکھ کر کہتی ہے۔ اس چرے پہ نہ جاؤ۔ اس عشق کو دیکھو۔ جس نے چروں پہ کالک مل دی۔ ”اماں دیوانی آنکھیں کھول کر غرائی۔

لگتا تھا اس نے اس کی سوچ کو پڑھ لیا ہے۔ کہنے کے ساتھ ہی اماں دیوانی ایک مرتبہ پھر دھیان گلیان میں گم ہو چکی تھی اور انا دیہ کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

پھر اس نے اچانک ہاتھ کا اشارہ دیا۔ بنا جو اس اشارے کو پہچانتی تھی غورا ”انا دیہ کا بازو دبوچ کر کھڑی ہو گئی۔

”چل“ ہمیں جانے کا حکم ہے۔ ”بنا جو نے اس کی انگلی میں دبی سونے کی انگوٹھی اپنے ہاتھ میں دبوچی اور تیزی سے آستانے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ ”بیچھے مت دیکھنا“ وہ اسے گھسیٹی باہر لارہی

تھی۔

انا دیہ کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس نے گھومتے سر کے ساتھ آخری مرتبہ گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔ بنا جو کی تنبیہ کے باوجود اور اس کی جیسے جان سے نکل گئی۔ وہاں کونے میں اماں دیوانی سے دور جلتی لوبان کے اٹھتے دھوئیں کے پیچھے کوئی کھڑا تھا۔ سانس لیتا ہوا مجبور بے بس بے حد خوب صورت چہرہ اور اس چہرے پہ بے انت کرب کی اذیتیں رقم تھیں۔ وہ ایک کم عمر نورانی صورت والا لڑکا تھا۔

اس نے شادی کے بعد افرایم کے گھر میں نہیں، اس کے دل میں قدم رکھا تھا۔ وہ اپنے شوہر کے گھر کی ہی نہیں، اس کے دل کی بھی ملکہ تھی۔ افرایم اس سے محبت کرتا تھا اور اس کی ماں اپنے بیٹے کی محبت سے محبت کرتی تھی۔

افرایم کی شاندار جاب کی وجہ سے زندگی میں سہولیات، امن، سکون سب کچھ تھا۔ معاشی لحاظ سے افرایم اس کے بھائی سے کم نہ تھا۔ شادی کے دسویں مہینے میں بیماری سی بی نے ان کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا تھا۔ پھر کچھ ہی عرصے میں وہ دوبارہ امید سے ہو گئی تھی۔ اماں کو پوتے کھلانے کا بڑا ارمان تھا۔ اور روبا کی خواہش تھی۔ اب کی دفعہ بیٹا ہو اور کبھی کبھی خواہشیں ایسے بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ خدا نے اسے ایک نہیں، دو دو بیٹوں سے نوازا۔ دونوں کی شکلیں جڑواں ہونے کے باوجود مختلف تھیں۔ بس آنکھیں بال اور ہونٹ کاٹل ایک جیسا تھا۔ افرایم جیسا باقی دونوں میں کوئی بھی چیز مماثلت نہیں رکھتی تھی۔ بڑے ہوئے تو عادتیں، مزاج، انداز بھی مختلف اور روبا بھی اپنے بیٹوں کی پیدائش سے پہلے والے وقت کو یاد کر رہی تھی۔

جب وہ ایک تکلیف دہ حادثے سے گزری تھی۔ چھت سے اترتے ہوئے سیڑھیاں طے کرتے پھسلنا اور زمین پر گر کر بے ہوش ہو جانا۔ بڑا خوفناک وقت تھا۔ سانس سینے میں اٹکا تا ہوا۔ ڈاکٹر پریشان اور افرایم بھرا ہوا۔

نہ بچے محفوظ تھے اور نہ ماں۔ روبہ کو ہوش نہیں آ رہا تھا۔ ایک پری میچور ڈیوری۔ ڈیزھ مینہ ہسپتال میں رہنے کے بعد اس کا آپریشن ہوا اور افرایم کی جان میں جان آئی تھی۔

وہ خیر و عافیت سے گھر آگئی تھی۔ بچے تندرست تھے۔ اماں صدقے اتارتی نہ کھکتی تھیں اور افرایم کا انادیہ پہ آیا غصہ ختم ہی نہ ہوتا تھا اور اب تو روبہ بھی انادیہ سے کھینچنے لگی تھی۔ وہ اس کی سہیلی تھی اور ہونے والی بھانجھی بھی۔ بلاوجہ ہی اس کی جان لینے کے درپے تھی۔

انادیہ کو پہلے ہی کوئی پسند نہیں کرتا تھا اور افرایم اور اماں کی خاص تاکید، تنبیہ اور سمجھانے پہ روبہ نے بھی انادیہ سے دور رہنا شروع کر دیا تھا۔

افرایم اکثر کہتا ”اس سنہری بلا میں تمہارے بھائی کو آخر کیا نظر آیا ہے؟“ وہ اس سوال پہ خاموش رہ جاتی تھی۔

اس معاملے میں وہ انتہائی بے بس تھی۔ اسے لگتا تھا۔ بھائی اپنے فیصلے پہ نظر جانی نہیں کرے گا۔

”کبھی خیال آتا ہو سکتا ہے۔ انادیہ نے جان بوجھ کر نہ کیا ہو۔ بے دھیانی میں چھلکا پھینک دیا ہو۔ مگر افرایم کہتے تھے۔ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے انادیہ کو چھلکا پھینکتے دیکھا تھا اور جب افرایم نے دیکھا تو پھر شک کی کوئی گنجائش نہیں رہتی تھی۔

اس کا دل انادیہ کھٹا ہو گیا تھا۔ اسی دوران افرایم کا دباؤ بھی بڑھ گیا تھا۔

”کاشف کو سمجھاؤ۔ وہ انادیہ سے بچ جائے۔ یہ بڑی خوب صورت بلا ہے۔ خون چوس ڈالے گی۔ اس کا ذہن تخریب کاری کی طرف مائل رہتا ہے۔“

روبا خود بھی انادیہ سے بیزار ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے اماں سے ذکر کیا تو وہ بے بس نظر آئیں۔ ”کاشف نہیں مانے گا۔“

”پہلے اس میں ہیرے لگے تھے۔ اب کیرے نظر آ رہے ہیں۔“ وہ واقعی نہیں مان رہا تھا۔

روبا پریشان تھی۔ پھر اس کی پریشانی کا دائرہ وسیع

ہونے لگا۔ بیڑھوں سے گرنا، بچوں کی سیدائش اور اس کے بعد نہ ختم ہونے والا تظنیفوں کا سلسلہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ پہلی مرتبہ اسے کچن میں برتن دھوتے ہوئے کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا۔ لگتا تھا جیسے کسی بچے نے اس کی قمیص کا دامن پیچھے سے کھینچا ہے۔ پہلے اس نے نظر انداز کیا پھر خیال گزرا پاؤں پاؤں چلتی بیٹی کچن میں نہ آگئی ہو۔ اسی خیال کے تحت اس نے برآمدے تک بھی جا کر دیکھا۔ کچی اپنے کٹ میں سوئی ہوئی تھی۔ وہ سر جھٹک کر اپنا وہم خیال کرتی واپس آگئی۔ لیکن پھر دوبارہ ایسا ہوا تو مارے خوف کے اس پہ کچلی طاری ہو گئی تھی۔

اس نے کچن میں کلام ادھورا چھوڑا اور اٹھ کر بچوں کے کمرے میں آگئی۔ پھر اسے جتنی بھی قرآنی سورتیں یاد تھیں باری باری سب پڑھیں اور جیسے دل سے سارا خوف نکل گیا۔

رات کو افرایم گھر آیا تو وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ بلکہ اپنی سالگرہ بھی۔ مگر افرایم نے بہت خوب صورت سر براہز دیا تھا۔ انہوں نے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا بھی کھلایا اور کچھ تفریح بھی کی۔ پھر جب وہ گھر آئی تو بچوں کو سلاتے، فیڈر بناتے، افرایم کے لیے کافی تیار کرتے بہت سا وقت گزر گیا تھا۔ روبہ نے کچن کی لائٹ بند کرنے سے پہلے چیزیں ٹرے میں رکھیں اور ابھی ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سوچ بورڈ کے ٹن پہ کلک کی آواز کے ساتھ کچھ سرسراہٹ ہوئی اور ایک دم کچن میں اندھیرا چھا گیا تھا۔

روبا کی جیسے جان نکل گئی تھی۔ اس کے ہاتھ سے ٹرے چھوٹ گئی۔ ایک چھناکے کی آواز سن کر افرایم افق خیزاں باہر آیا تو روبہ پھر پھر کانپتی حواس باختہ تھی۔ ”روبا! کیا ہوا؟ یہ شور کیسا تھا؟“ وہ گھبرا کر پوچھنے لگا۔ اماں بھی بھاگی بھاگی پہنچ گئی تھیں۔

روبا رونے لگی تھی۔ لیکن کچھ بتانے سے قاصر تھی۔ وہ انہیں کیا بتاتی؟ بھلا کون یقین کرتا؟

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

پس برگ

نہ کرتا۔

مسام جو ڈائری لکھا کرتا تھا، آج اس ڈائری کو اپنے سامنے کھول کر بیٹھے میں سوچ رہا ہوں کہ اس ڈائری میں اتنے صفحے خالی کیوں ہیں۔ ایسے اتنے سارے خالی صفحے چھوڑ کر وہ کیوں مر گیا۔ کیا اسے ڈائری میں اور کچھ نہیں لکھنا تھا۔ اس نے قلم کی سیاہی کو بھی کھوکھلا پایا تھا۔ یا وہ لفظوں سے بھی بدلہ لے رہا تھا۔ وہ ان سے

لوگ زندہ انسانوں کو مار دیتے ہیں اور پھر ان پر ماتم کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ موت اچانک آتی ہے، مجھے لگتا ہے کہ کچھ لوگوں کی موت رنگ رنگ کر آتی ہے۔ وہ ایک

تن آور درخت کا بیج بن کر پہلے اندر جگہ بناتی ہے۔ جڑ نکلتی ہے، تن پھوٹتا ہے، درخت بنتا ہے، پھر درخت کی ناسور چھاؤں روح کے چپے چپے پر سایہ فگن ہو کر اسے موت کی طرف کھینچنے لگتی ہے۔

”ہم لوگوں کو ختم کر دیتے ہیں اپنے رویوں سے،“

”میں لفظوں سے اور پھر ان کا سوگ مناتے ہیں۔“

لوگ یہی کہتے ہیں کہ جو زندہ تھا، دیکھو اب وہ مر گیا۔ جبکہ انہیں یہ کہنا چاہیے کہ ”وہ جو ایک عرصے سے اندر سے مر رہا تھا آج اس کی موت کا دائمی خاتمہ ہو گیا۔“ جب وہ اندر سے مر رہا تھا دراصل تب ہی انہیں اپنا سوگ شروع کر دینا چاہیے تھا۔ لوگ اس انتظار میں کیوں تھے کہ وہ کفن میں لپیٹ دیا جائے اور

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

پھر ہی وہ ماتم شروع کریں۔ اس انتظار میں کہ وہ مر جائے اور وہ شور کریں کہ وہ بھو وہ تو مر گیا۔ وہ کیسے مر گیا۔ کیوں کر مر گیا۔

کیا وہ نہیں جانتے وہ کب مرنا شروع ہوا۔ کیسے مرنا شروع ہوا کیوں مرنا شروع ہوا۔

کیا وہ بیچ جو سب نے مل کر اس کے اندر بودیا تھا اس کی روح میں دبا دیا تھا وہ پھوٹ کر موت نہ بنتا؟ وہ بیچ جسے حسد، انتقام، جلن، کم ظرفی، بے حسی، تکبر، خود غرضی، احساس برتری، کاپانی دیتے رہے تھے وہ اپنی جڑیں نہ پھیلاتا۔ یہ زہریلا تن اور درخت اس کی روح میں شاخیں نہ پھیلاتا، دماغ کو مفلوج، دل کو ناکارہ

رہنچیدہ تھا۔ اگر اس سے اپنی زندگی کے دن پورے نہیں ہو سکے تھے تو وہ اپنی ڈائری کے صفحات تو پورے لکھ دیتا۔ اس کی ذات پر جو حق ہمیشہ پڑی رہی، وہ حق وہ اس ڈائری میں ہی اٹھارتا۔

اس کی زندگی جو بھاپے تک نہیں جاسکی، کم سے کم یہ ڈائری ہی اپنے آخری صفحے تک چلی جائے۔ اسی لیے اس کے قلم سے اسی کی ڈائری کے ایک خالی صفحے پر میں نے لکھنا شروع کر دیا ہے۔ ”عصام مرچکا ہے اور اب لوگوں کا سوگ بھی شروع ہو چکا ہے۔“

میں اس ڈائری میں وہ کون کون سی بات لکھوں کہ اس کے سب خالی صفحے پر ہو جائیں۔ کیا وہ بات لکھ دوں جو بازار میں میرے ساتھ ساتھ چلتے اس نے ایک دن کہی تھی۔

”کل یہاں میں نے ایک کمزور سے بوڑھے کو دیکھا تھا۔ وہ ٹھنڈ سے کانپ رہا تھا۔ پھٹے پرانے سے کپڑے پہنے ہوئے تھے اس نے جب میں اس کے قریب سے گزرا اور اس کی طرف غور سے دیکھا تو اس نے بھی میری طرف غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میں ڈر گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ اس نے مجھ سے کہا۔ ”میں ٹھنڈ سے کانپ رہا ہوں اور تو دنیا کی بے حسی سے اپنی بے قدری سے کانپنے لگا۔“

بے اختیار میری ہنسی نکل گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ

بھی بننے لگا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کچھ عجیب سی بات کہہ گیا ہے۔ لیکن اب جب یہ ڈائری اور اس کی زندگی میرے سامنے ہے تو مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ اس بوڑھے کی آنکھوں کی تنہیہ حقیقت تھی۔ عصام نے اس بوڑھے کی آنکھوں کو تھیک سے پڑھ لیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ آنکھوں کی تحریریں پڑھنے میں وہ کتنا ماہر تھا۔ اس کا بچپن لوگوں کی آنکھوں میں جھانکتے جھانکتے بوڑھا ہو گیا تھا۔ جو باتیں اسے معلوم نہیں ہونی چاہیے تھیں وہ بھی معلوم ہو گئی تھیں۔

اتنی سی عمر میں اس نے دو سروں کی نظروں میں ہتک اور احساس برتری کی تحریریں پڑھنی شروع کر دی تھیں، تحریریں گوشہ نشیں، انہیں اور وہ ان، تو ان کا کھوجی تھا۔ مجھے اس وقت معلوم نہیں تھا کہ جو چیزیں اس نے پڑھنی شروع کر دی ہیں وہ اس کے علم میں نہیں اس کی موت کے امکانات میں اضافہ کریں گی۔ جو چیزیں وہ جاننے، کھوجنے، سوچنے لگا ہے وہ اس کی زندگی کے دن کم کر دیں گی۔ ان دیکھی تحریریں پڑھنے والے بہت جلد مر جاتے ہیں۔

ہر چیز تو وزن چاہتی ہے تو ہی وہ قائم رہتی ہے۔ عصام متوازن نہیں تھا۔ متوازن ہوتا تو مصنف نہ ہوتا۔ اونچی پہاڑی پر روشن الاؤ کی طرح اس کی شخصیت کا پھیلاؤ اتنا وسیع اور بلند تھا کہ مجھے جیسے شخص کے لیے کوئی ایک پہلو جان لینا بھی بہت ہوتا۔ اس کی ذات کے اتنے رخ تھے کہ اگر میں اسے ان گنت آئینوں کے سامنے کھڑا کر دیتا تو ہر آئینہ ایک الگ صورت دکھاتا۔ اتنی جہتیں رکھنے والے انسان ہوتے ہی کتنے ہیں۔ بہت کم ہنسی میں سما جانے والے موتوں جیتنے، کچھ قائد، کچھ شاعر، کچھ استاد، کچھ عالم، کچھ خطی سائنس دان اور کچھ اس جیسے مصنف۔



اس کی پہلی کہانی چھپ گئی تھی۔ ایڈیٹر نے تعریفی خط لکھ کر بھیجا تھا۔ خط کافی لمبا تھا لیکن اس کا لب لباب یہ تھا کہ۔

”اتنی حساس تحریر کم سے کم میری نظموں کے سامنے سے آج تک نہیں گزری۔ موضوع تو وہی پرانا ہے ایک۔ یہ وہ عورت اور اس کی دکھی مشقت بھری زندگی۔ ہزاروں ایسی بیوائیں دیکھی ہیں لیکن وہ یہ وہ نہیں دیکھی جو آپ نے اپنی کہانی میں دکھائی ہے یا تو آپ کا تخیل قابل تعریف ہے ورنہ شاید آپ کا فکری مناظرہ آپ نے لفظوں کے جس ویسے میں اس یہ وہ کے کردار کی جوت جلاوی ہے وہ حیران کن ہے۔“

میں جانتا تھا کہ اس نے کس یہ وہ کی کہانی لکھی ہے۔ وہ یہ وہ ہمارے اسکول کے چڑا سی کی بڑی بیٹی تھی۔ جو اسکول کی طرف سے ہی الاٹ اپنے باپ کے دو کمروں کے کواٹر میں اپنے چار یتیم بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ آدمی چھٹی کے وقت کالے پنہ اور کبھی کبھی نان مکی لگایا کرتی تھی۔ اس یہ وہ کو سارا اسکول جانتا تھا پھر سب نے وہ محسوس کیوں نہیں کیا تھا جو عصام نے کر لیا تھا۔ عصام نے کبھی اس سے نان مکی لے کر نہیں کھائی تھی۔ وہ آدمی چھٹی کے وقت باجی جی سے کچھ دور جا کر کھڑا ہو جاتا اور ات دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کے روتے ہوئے چھوٹے بچوں کو بہلانے لگتا تھا۔

گھر والے سب خوش تھے لیکن وہ خوش نہیں ہو سکا۔ دو دن چپ رہنے کے بعد اس نے بس اتنا کہا۔ ”کسی کے دکھ پر میں نے اپنی خوشی لکھ دی۔ ٹھیک نہیں کیا شاید۔“

ٹھیک تو اس نے واقعی نہیں کیا تھا۔ کیا ضرورت تھی اتنا غیر معمولی حساس ہونے کی۔ اسے بھی ہم سب گھر والوں کی طرح نارمل ہونا چاہیے۔ باقی دنیا کی طرح بے حس۔ اس نے اپنے دل میں اتنے سوراخ کیوں کر لیے تھے جو شگاف بن کر اسے نکل گئے۔ جب دنیا بے حس کے چراغ بے نیازی کے طاقتوں پر رکھ کر جلا رہی تھی تو وہ بھی یہی کرتا۔ دنیا بے پیندے کی تھی تو وہ بھی کیوں نا بے پیندے کا ہو گیا۔

اس کی کہانیاں چننے لگی تھیں۔ لفظوں کو اس نے جوئے معنی ویسے تھے وہ اس کی کہانیوں کو غیر معمولی بنا

رہے تھے۔ اہرام بنے، زمین پر پہاڑ کی طرح ڈھونٹے معاشرے میں وزن لاشوں کو وہ اکھیرا کھینچ کر لانے لگا۔ اس کی سوچ، بخارا بھی، جو دنیا کا کونا کونا سو گھنٹی۔ اس کا تخیل زمین پر رہتا تھا، ہوا میں اڑتا۔ اس کی ذہانت سوال کھڑے کرتی، جواب ڈھونڈ کر لاتی۔ وہ جس بات کی کھوج میں نکلتا اس بات کا راز یا کر ہی لوٹتا۔

”کیسی عجیب کتاب ہے۔“ اکثر میں کسی کتاب کے چند صفحے پڑھ کر اسے ایک طرف اچھال دیتا۔ وہ کتاب اور مجھے بیگ وقت دیکھتا۔ کتاب اٹھاتا اور بس پہلی چند لائنیں پڑھ دیتا۔

”اندھیروں کی چاپ اس وقت بڑھ جاتی ہے، جب روشنیوں کی چال معذور ہونے لگے۔“

اس نے بلند آواز سے پڑھا اور میری طرف دیکھا۔ ”جس کتاب کا آغاز اتنی بڑی سچائی سے ہو رہا ہے۔ اس کتاب کو تم عجیب کہہ رہے ہو۔“

جب وہ آہستہ آہستہ موت کی طرف بڑھ رہا تھا، اس وقت میں اندھیروں کی وہ چاپ سن رہا تھا، جو اس کی روشنیوں کو معدوم کر رہی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ جس کتاب کی پہلی سطر ایسی ہو سکتی ہے اس کتاب کا ختم شد کیا ہوگا۔ جس سمجھ داری سے اس نے ایسی باتیں سمجھنی شروع کر دی ہیں اس کا۔ ”ختم شد“ بھی کیا ہوگا۔



اس کی کتاب نے ادب کے حلقے میں شور برپا کر دیا تھا۔ نقادوں نے اس کی کتاب کا کوئی ایسا جملہ نہیں چھوڑا تھا جسے وہ زیر بحث نہیں لائے تھے۔ تجزیوں اور تعریفوں کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ ایک دن اس نے مجھے ایک خط دکھایا۔ وہ خط اسے ایک مصنف نے لکھا تھا۔ خط کا لب لباب تو تعریف تھا لیکن اس میں کچھ ایسے گہرے طنز چھپے تھے جنہیں صرف وہ ہی سمجھ سکتا تھا۔ اسے تنقید بری نہیں لگی تھی۔ وہ تو مصنف کے منافقانہ انداز پر ہنس دیا تھا۔ بھلا جو بچپن سے آنکھوں کی تحریریں پڑھ رہا تھا، وہ خط میں چھپے لفظوں کے مطلب نہیں پڑھ سکتا تھا، خط کی ایک لائن میں کیسے

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناؤ لزا اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

✓ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

✓ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

بھول سکتا ہوں۔ جس میں یہ اشارہ دیا گیا تھا کہ اس نے اپنی کتاب کو دوسری کتابوں سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ ”جن کتابوں کے زیر اثر رہ کر یہ کتاب لکھی گئی ہے یقیناً وہ کتابیں بھی اعلیٰ پایے کی ہوں گی۔“

زیر اثر تو وہ اس خیال کے رہا تھا جو اس نے آنکھ کھولتے ہی جھپٹا تھا۔ اس کتاب کے لیے اس نے کتنے سال تکلیف میں کائے تھے عین جانتا تھا۔ رات رات بھر چپ خاموش بیٹھ کر اس نے صرف چند جملے لکھے تھے۔ دوستوں کی گپ شب کے دوران عموں میں بیٹھے، موٹر سائیکل چلاتے، ٹرین کی چھک چھک کے ساتھ اس نے اپنے خیال کے ساتھ کمنٹس سفر کائے تھے۔ جس طرف لوگ سفر کر رہے تھے۔ وہ تو اس کی الٹی سمت کا مسافر تھا۔ ہم سالوں اور مہینوں کی باتیں کرتے اور وہ صدیوں اور قرون کی باتیں کرتا۔ اس کی دی ہوئی دلیلیں دم بخود کر دیتیں۔ وہ کسی کو متحرک کرنے کے لیے نہیں لکھتا تھا۔ نہ ہی اس نے عوام الناس کا کلیہ نکال کر قلم اٹھایا تھا کہ آج کل اس موضوع کی بہت مانگ ہے، چلو اس پر لکھتے ہیں۔ آج کل اس موضوع کی کتاب دھڑا دھڑکتی ہے میں بھی اسی موضوع پر لکھوں۔

اس کی کتاب ایک بینک ثابت ہوئی۔ اس وقت میں جانتا تھا کہ یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ وہ اچھی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں دراصل وہ یہ کہتے ہیں کہ ”بس بھی! ہماری کتاب کے ساتھ کسی اور کی کتاب اچھی نہ کہلائے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اچھے رائٹرز کے انتظار میں رہتے ہیں ان کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ ”ہمارے بعد کوئی رائٹر اچھا نہ آئے۔“

اس لیے کہ چل چلاؤ کتابوں میں اس نے ”چشم بارہ“ دے دیا تھا۔ خیال جو کبھی انہیں چھو کر نہیں گزرا وہ خیال اسے چھو گیا، نایماؤں میں ایک بیٹا ہو کر اس نے دکھا دیا۔ انہیں لگتا تھا کہ جو کام وہ نہیں کر سکے، جو وہ نہیں سوچ سکے وہ کسی اور نے کیے کر اور سوچ لیا؟

اس کا غیر معمولی پن اس کے لیے عذاب بن گیا۔

اس کتاب کو ایک ایسی کھونٹی بنا دینا چاہتے تھے۔ جس پر وہ اپنی کامیابی کا تہنہ نہ ٹکا سکے۔ ایسی کتاب دوبارہ ہرگز نہ لکھ سکے۔ چل چلاؤ کتابوں میں یہ فاش غلطی دوبارہ کر ہی نہ سکے۔ اس کی کتاب کی مقبولیت کو کم کرنے کے لیے انہوں نے دھول پٹنے شروع کر دیے۔



ایک دن اسے ایک پروڈکشن ہاؤس میں بلایا گیا۔ اس کی لمبی لمبی میٹنگ ہونے لگیں۔ وہ اسکرپٹ لکھنے لگا۔ کچھ عرصے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس نے اسکرپٹ پر کام روک دیا ہے۔

”ڈرامے کے نام پر جو عورت نامہ اسکرین پر چلتا ہے وہ میں نہیں لکھ سکتا۔ وہ میری پوری کہانی بدل دیتا چاہتے ہیں۔ میں نے ایڈیٹنگ کے لیے ہاں کہی تھی۔ کہانی کا حلیہ خراب کرنے کے لیے نہیں۔ وہ چاہتے ہیں میں بار بار لڑکی کو باپ یا بھائی کے ہاتھوں سے پھاؤں۔ روز روز گھر میں لڑائیاں کراؤں۔ ہر قسط میں کسی نہ کسی عورت کا کردار روئے، چلائے۔ بس کہانی نہ لکھوں، سیدھی سیدھی ٹی آر پی لکھ دوں۔ وہ کہتے ہیں اسکرین پر کیا ہٹ ہوگا۔ ہم جانتے ہیں، تم ادبی لوگ کتابیں لکھنے والے تم کیا جانو کہ اسکرین پر کیا چلتا ہے۔ کس سین پر دیکھنے والے روتے ہیں، کس قسط کی ٹی آر پی زیادہ آتی ہے۔ ڈراما بنانا آرٹ نہیں کیمسٹری ہے۔ اگر ڈراما بنانا ایسی ہی کیمسٹری ہے تو پھر یہ اس کیمسٹری کے لیے رائٹرز کو زحمت کیوں دیتے ہیں۔ یہ اپنے چینل اور پروڈکشن ہاؤسز میں کیوں نہیں ایسا خام مال پیدا کر لیتے جو انہیں مشین کی طرح ان کی مرضی کی رٹی رٹائی چیزیں نکال نکال کر دیتے رہیں۔ جو چینل ہیڈ میری کتاب پر فدا تھی، وہ اسی کتاب پر لکھا میرا اسکرپٹ بار بار میرے سامنے پینچ پینچ کر پھینک رہی تھی۔ یہ ایسی تھیل کے لیے رائٹر کو کیوں بلاتے ہیں۔“

”تھیل کے لیے رائٹر کو کیوں بلاتے ہیں۔“ یہ بات تو میں بھی آج تک نہیں سمجھ سکا۔ جس کہانی کو

ایڈیٹر جانے اور ڈائریکٹر۔ آپ کو اپنے پیسوں سے مطلب ہونا چاہیے۔

مجھے ہنسی آئی ہے ان لوگوں پر جنہوں نے کبھی اسکرین آرٹ کی تعریف نہیں پڑھی وہ مجھے اسکرین کی کیمسٹری سمجھاتے ہیں۔ جو لوگ اسکرین پلے کی آلف بے سے واقف نہیں ہیں وہ مجھے بتاتے ہیں کہ مجھے سین میں اسکرین پلے کتنا لکھنا ہے۔ کچھ تو کہتے ہیں کہ کیا ضرورت ہے اسکرین پلے لکھنے کی بس کام چلاؤ اپنا وقت بچاؤ پیسہ کماؤ۔

ایک کوئینٹ ہیڈ میری کہانی کی تعریف میں رب

اللسان ہوتی رہی۔ پھر اس نے ہفتوں مجھے یہ سمجھانے میں لگا دیے کہ دیکھو تم اچھے مصنف تو ہو گے لیکن اچھے اسکرپٹ رائٹر نہیں ہو۔ تم اچھی کہانی لکھ سکتے ہو لیکن اچھا ڈراما نہیں اس لیے جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ وہ کوئینٹ ہیڈ ہے جس کے کریڈٹ پر ایک بھی ڈراما نہیں۔ جو مجھے جیسے رائٹرز کے ساتھ رابطہ تو بہت شوق سے کرتی ہے اور اسی شوق سے انہیں "اسکرین کیمسٹری" سمجھاتے سمجھاتے بریاد کر دیتی ہے۔ یہ سب چینل یا ایسی ٹی آر پی عوامی رائے عورتوں کی پسند ناپسند کی آڑ میں اسکرپٹ کا حلیہ بریاد کر دیتی ہیں کیونکہ یہ خود کسی قاتل نہیں ہوتیں۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ اسکرپٹ لکھنا کسے کہتے ہیں۔ اپنے اندر وہ قابلیت کے نام پر "کام" رکھتی ہیں اور ہماری قابلیت کو بھی "صرف کام" بنا دیتا چاہتی ہیں۔ وہ خود کچھ نہیں سمجھ سکیں تو ہمیں بھی سمجھنے نہیں دیتا چاہتیں۔

ایک نے میرا لکھا اسکرپٹ میزبر اچھا کر کہا "اس کی ٹوپوائنٹ ٹو سے زیادہ ریننگ آگئی تو میں ریزائن کروں گی۔" جس نخوت اور ہٹک سے اس نے فقرہ کہا اس نے مجھے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا کہ مجھے ڈراما نہیں لکھنا چاہیے۔ اتنی جلدی ان لوگوں نے مجھے اپنے حساب کتاب سے ناکارہ ثابت کر دیا۔ جبکہ یہ سب مل کر سٹیم ناکارہ کر رہے ہیں۔

میں سمجھ گیا کہ عصام ایسے لوگوں کے روبرو ہو گیا

اس نے اتنے سالوں کی محنت سے لکھا تھا اسے وہ چند لاکھ کے عوض بریاد نہیں کر سکتا تھا۔ سب لوگ اس کی کتاب پر ڈراما بنانے کے لیے بے چین تھے۔ لیکن کوئی بھی اس کی بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کوئینٹ ہیڈ اسے فون پر فون کرتے، جب بات آگے بڑھتی تو وہی ٹی آر پی وہی کہانی کا بریاد حلیہ وہی اسکرین کی کیمسٹری جیسے معاملات سامنے آتے۔ وہ دلیلیں دیتا، سمجھاتا پھر خاموش ہو جاتا۔

"میں اس سسٹم میں سروائیو نہیں کر سکتا۔"

اس کی ڈائری کے اس صفحے پر بس یہی ایک جملہ لکھا ہے۔ اگلے صفحے پر مہینوں کے وقفے کے بعد لکھا ہے۔ "ادب عالیہ کے ساتھ توفیق عالیہ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ کتابیں اور کہانیاں جتنی بلند پایہ کی ہوں اس سے کہیں زیادہ بلند پایہ عوام الناس کو ہونا ہوگا۔ ورنہ یہ کتابیں زندہ رہیں گی نہ انہیں لکھنے والے میرا ذہن تخلیقات کی بھرمار سے بھرا ہوا ہے میں انہیں باہر لانے کے لیے بے تاب ہوں لیکن لوگ انہیں اپنی ناقص عقل سے رد کر دیں گے۔ یہ خوف مجھے ست کر دیتا ہے۔ میں اپنی کہانیوں کو اپنے سامنے دم توڑتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ کوئی بھی غیرت مند مصنف اپنی کتاب پر جاہلوں کی نکتہ چینی نہیں سہ سکتا۔ یہ جاہل تخلیق کو "طوائف" سمجھتے ہیں کہ گالی دے لی دھتکار دیا ورنہ نیکی کے پلڑے میں تول کر بدی کے پلڑے کی طرف اچھال دیا کہ لو یہ اسی قابل ہے بد کردار غیر شرعی ہونہ۔"

جن لوگوں نے سارے زندگی دو ڈھنگ کی کتابیں نہیں پڑھیں وہ مجھے کہتے ہیں کہ "یہ میں نے کیا لکھا ہے یہ تو ٹھیک نہیں۔"

جو لوگ ایک جملہ لکھنا نہیں جانتے وہ میرے جملوں پر ریڈ پین سے لائن لگاتے ہیں کہ "یہ بے معنی کا جملہ اسکرین پر نہیں آئے گا۔"

جو لوگ فون پر فون کر کے مجھے چینل بلاتے ہیں وہ مجھے پاس بٹھا کر سمجھاتے ہیں کہ "آپ بھی پیسے کمائیں جو جی میں آتا ہے ہمیں لکھ کر دے دیں پھر

تھا جو رتی ماشہ تولہ ہر کم وزن پر بھی اس جیسے مصنفوں سے وزنی تھے۔ جس کھوٹ کے وہ مالک تھے، عصام اس کھوٹ سے ناواقف تھا۔ وہ سمجھتے تھے وہ تو ہیتل کو رگڑا مار مار کر سونا بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ وہ تو الٹا سمجھ داری کر رہے ہیں۔

”عصام کہانی تو لکھ سکتا ہے لیکن ڈراما نہیں۔“

ان سب نے مل کر مشہور کر دیا۔ یہ بھی کہا جانے لگا کہ وہ ان پروفیشنل ہے۔ وہ واقعی میں ان پروفیشنل تھا۔ پروفیشنل ہوتا تو خود غرض ہوتا، مطلبی دھوکے باز، حاسد، مکار، بے حس، مغرور، منافق ہوتا۔ اس وقت زندہ ہوتا۔



ڈراما لکھنے کا فیصلہ چینیوں کی قطار کی طرح کچھ وقت تک تو سیدھ میں نبھتا رہا۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے فیصلے اور حالات کے فیصلوں میں فرق ہوتا ہے۔ گھر کے معاشی حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ ضد کی سیدھ میں چلتا ہی جاتا یا تو اسے کوئی جاب کرنی تھی یا اسے اپنے لکھنے کے کام سے پیسے کمانے تھے۔ تنگ دستی وہ سانپ تھی جو اس کے قلم کی بین پر ناپنے والی نہیں تھی۔

اس نے پھر ڈراما لکھنے کا فیصلہ کیا۔ جس رائٹر کا وہ بہت بڑا فین تھا اس بار اس کے ساتھ۔ اسے یقین تھا کہ جو چیز دوسرے نہیں سمجھ سکے وہ ایک رائٹر سمجھے گا۔ ذہنی مطابقت جو دوسروں کے ساتھ نہیں ہو سکی تھی وہ ایک رائٹر کی دوسرے رائٹر کے ساتھ ہو جائے گی۔ ایک ہی طرح کے دو لوگ مل کر ایک پروجیکٹ پر کام کریں گے تو نتیجہ بہترین آئے گا۔ یہ اس کی زندگی کا وہ فیر تھا جس میں اس نے بہت سی چیزوں کے ساتھ کمپرومائز کرنا شروع کر دیا تھا۔

”فی الحال میں نے خود کو ذہنی طور پر کمپرومائز کے لیے تیار کر لیا ہے۔ ضروری نہیں کہ جس آزادی سے میں کہانیاں لکھتا ہوں اسی آزادی سے اسکرپٹ بھی لکھوں۔ سسٹم کے ساتھ ٹھوڑا بہت کمپرومائز کرنا ہی پڑتا ہے لیکن تم دیکھنا ایک دن میں اپنی مرضی کا کام

بھی کرنے لگوں گا۔ اسکرین پر ایک دن مجھے پوری آزادی حاصل ہوگی۔ پھر لوگ دیکھیں گے اسکرین آرٹ کے کہتے ہیں۔“

اس کا جوش دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ کہانیوں میں اس کی مہارت، کردار نگاری کا عروج، لفظوں کا سحر طاری کرنا جال یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ اس کا اسکرپٹ کس پائے کا ہو گا۔ وہ بیک وقت پچاس کردار لکھ سکتا تھا۔ ایک کہانی کو ہزار رنگ دے سکتا تھا۔ اس کے قلم کی نوک سنگ تراش کا اوزار تھی، ضرب و نقش بیک وقت بھی اور بروقت بھی۔

اب لوگ کہہ رہے ہیں کہ وہ باقاعدہ مصنف تھا، قدرت نے اسے بنیاد سے مصنف بنایا تھا۔ میں کہتا ہوں وہ باقاعدہ ادیب اس بے قاعدہ دنیا میں بے بنیاد آگیا تھا۔ اس کی مہارت، اس کا فن، اس کے شعور کی گہرائی، اس کی لفاظی، اس کی شخصی لغت بھی اسے اس بے قدری جیسے ناسور سے بچانے میں ناکام رہی تھی جو کچھ کامیاب لوگوں کا تکبر اور احساس برتری مہارت سے اس کے اندر کھود کر رہا تھا۔ میں آج تک سمجھ نہیں سکا کہ لوگ اسے تسخیر کرنا چاہتے تھے یا شکست فاش سے دوچار۔ اس کے شعبے کے لوگ اس سے متاثر زیادہ تھے یا حاسد؟ اس کی مرہ ڈائری کا فوری لفظ میری انگلیوں کی پوروں کے نیچے آخری سانس لینے لگے ہیں۔

اس نے کام شروع کر دیا۔ کاش اس نے وہ کام شروع نہ کیا ہوتا۔ کاش میں نے بھی اس سے نہ کہا ہوتا کہ اپنے روپے میں لچک لاؤ۔ کاش میں نے اسے پچاس دوسرے رائٹرز کی مثال نہ دی ہوتی کہ دیکھو وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ یہ نہ کہا ہوتا کہ خود کو ہر پاد نہ کرو جو مل رہا ہے وہ کرو، گرو، کمپرومائز۔ آرٹ کی خدمت کا تم نے ٹھیکہ نہیں لیا ہوا۔ جہاں سب ”کام“ لکھ رہے ہیں تمہیں ”آرٹ“ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کتابوں سے اتنے پیسے نہیں کما سکتے ڈراما لکھ کر ہی تم کچھ اتنے پیسے حاصل کر سکتے ہو۔ ہمارے ملک میں ادیب کبھی امیر نہیں ہوتا، تم ڈراما

لکھو اور ان سب معاشی مسائل سے نکل آؤ۔ پہلی قسط لکھنے سے پہلے تک وہ ہر روز اپنی ڈائری لکھتا رہا تھا۔ ان دنوں اس کے لفظ موتی تھے۔ ان کی خوشبو پھول تھی۔ کافور نہیں۔ اسکرپٹ کی پہلی دو سری قسط لکھنے کے بعد اس کی ڈائری خاموش رہنے لگی۔ صفحے خالی نظر آنے لگے۔ ہفتوں گزر گئے، ان پر سیاہی کا ایک دھبہ بھی نہ پڑا۔ پھر ایک صفحے پر کچھ مبہم سا لکھا تھا۔

”میں نے سنا تھا“ مصنف حساس ہوتا ہے۔ کیا حساسیت یک طرفہ ہوتی ہے؟ یا وقت پڑنے پر استعمال میں لائی جاتی ہے؟“

پھر بہت سے صفحات کی خاموشی اور چند لائنیں۔ ”میرا بہترین سین کٹ دیا جاتا ہے۔ معمولی سی باتوں پر لمبی لمبی بحث صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں کوڑھ مغز ہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔“ میں کوڑھ مغز ہی ہوں، مجھے کچھ معلوم نہیں لیکن کیا اسے ثابت کرنے کے لیے ایک مناسب انداز نہیں اپنایا جاسکتا۔ ایک تخلیق کار کے الفاظ اور لمبے میں اتنی رحمت میں سوچتا ہوں کہ انکساری کیا صرف ایک لفظی حقیقت ہے جسے زبان سے ادا کیا جاتا ہے۔ بس؟ کیا اس انکساری کو عمل میں نہیں لایا جاسکتا؟ میں یہ بھی سوچنے لگتا ہوں کہ برا انسان دراصل ہوتا کون ہے، وہ جس کا ظرف برا ہوتا ہے؟ یا وہ جس میں انسانیت کا مزاج برا ہوتا ہے؟ میں بلند ہو جاتا ہے تو اسے زیادہ جھکنے والا ہو جانا چاہیے تاکہ زیادہ اکڑنے والا، تکبر کا وکیل تو ہر دلیل پر ذلیل ہے۔“

ڈائری کے اس صفحے نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں یہیں رک جاؤں، آگے پڑھنے کی کوشش نہ کروں۔ نکلے کی ہوا سے ڈائری کے صفحات پھر پھڑپھڑ رہے ہیں۔ یہ میری انگلیاں، یہ کیوں کپکپا رہی ہیں۔

”میں نے اسکرپٹ کی مین قسطیں بھجوا دی ہیں۔ تعریف کے بدلے میں مجھے لمبی تقریر سننے کے لیے ملتی ہے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا کہ وہ کس بات پر خفا ہیں۔ اس سے کہہ دو انہوں نے کہا۔“

میں بالکل ویسا ہی لکھ کر دے رہا ہوں یا اس چیز سے کہ آخر میں وہ کیسے لکھ کر دے رہا ہوں، جو انہوں نے کہا۔ میں غلطی کیوں نہیں کر رہا، میں کہیں کوئی کمی کیوں نہیں رہنے دے رہا۔ انہوں نے انڈسٹری کو ہٹ ڈرامے دیے ہیں۔ اس بنا پر صرف انہیں ہی علم ہے کہ ڈراما کیسے لکھا جاتا ہے۔ مجھے بار بار احساس دلایا جاتا ہے میں نے ابھی تک کوئی کام نہیں کیا میں کیسے صحیح اور غلط کو جان سکتا ہوں۔ کیا میری قابلیت اسی وقت ثابت ہوگی جب میں ڈراموں کی ایک لمبی لائن لگا دوں۔ اگر ایسا ہی تھا تو میری پہلی کہانی کو شائع نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ میری پہلی کہانی سے پہلے میری کہانیوں کی کوئی لمبی لائن نہیں لگی تھی۔ مصنف کے قلم پر اعتماد نہیں کیا جائے گا تو ادب کے نام پر دہرائی ہوگی۔“

اس کی ڈائری نے ایک لمبی خاموشی اختیار کر لی۔ مجھے وہ دن یاد ہیں، ان دنوں اس کا گھر میں کوئی پارسل نہیں آتا تھا۔ وہ دنیا اور اس دنیا کے کارخانے سے لا تعلق ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”تم اسکرپٹ نہیں لکھ رہے؟“ ایک دن میں نے پوچھا۔

”جانتے ہو تو پوائنٹ ٹو کتنے ہوتے ہیں؟“ مجھے یاد تھا کہ ایک چینل کی ایڈیٹر نے اس کے اسکرپٹ کے بارے میں کیا کہا تھا۔ اسی لیے میں یہ چاہتا تھا کہ اس کی یادداشت اتنی اچھی نہ ہو۔ اسے سنیو فرینڈ کا مرض لاحق ہو جائے۔ وہ باتیں بھولنے لگے۔

”تم نے میری کتاب پڑھی اور مذاقاً کہا کہ تم میری کتاب کو از خود مین بکر پرائز کے لیے سلیکٹ کرتے ہو۔ تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ میں دوسرے درجے کا ناکارہ رائٹر ہوں۔“

میں خاموش اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ وہ غصے میں تھا یا غمگین، میں جان نہیں سکا۔ اس کی آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں۔ ہاتھ بدھا کر اس نے میرے سامنے کچھ پیپر رکھے۔ یہ اس کے اسکرپٹ کا پلندہ

تھا۔ جسے وہ رات دن ایک کر کے لکھتا رہا تھا۔ اس نے کھڑکھار کرنے کے لیے خود کو تیار کر لیا تھا اسی لیے اس اسکرپٹ کو نہ جانے کتنی بار تبدیل کر چکا تھا۔ جو سین اور مکالمے ٹھیک تھے، انہیں بھی وہ ہدایات پر بدلتا رہا تھا۔ اس اسکرپٹ پر جگہ جگہ ریڈ پین سے کراس کے نشانات تھے۔

”یہ تمہارا اسکرپٹ ہے عصام؟“

”یہ اسکرپٹ نہیں ہے۔ یہ تو ایک ناکام رائٹر کا وہ پرچا ہے جس پر اسے دو نمبر ملے ہیں۔ میری ساری

محنت پر مجھے یہ سننے کو ملا۔

”مسٹر عصام! اگر آپ کو اس اسکرپٹ پر بہت زیادہ نمبر بھی دیے جائیں تو یہ دو سے زیادہ نہیں ہوں گے۔“ میں دنگ اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ ایک رائٹر

دوسرے رائٹر کو نمبر دے رہا ہے۔

”تم دوبارہ مجھے کبھی اسکرپٹ لکھنے کے لیے نہیں کہو گے۔ میں بچوں کو ٹیوشن پڑھا لوں گا۔ کوئی جاب ڈھونڈ لوں گا۔“

اس کے بعد اس کی ڈائری پھر سے خاموش ہو جاتی ہے۔ اس لمبی خاموشی میں ایک اور فقرہ گونجتا ہے۔

”آپ اپنے بچوں کے لیے کیا مثال سیٹ کر رہے ہیں۔ سستی اور کٹلی آگ کا دریا ہے آپ کے لیے، آپ اسے پار نہیں کر سکتے۔ آپ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے مسٹر عصام۔“

اس ڈائری نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ دکھ سے یا شاید پھر خوف سے کپکپا رہا ہوں۔ عصام جو اپنی پہلی تحریر کی خوشی اس لیے نہیں مناسکا کہ اسے لگا اس نے کسی کے دکھ پر کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ عصام ان فقروں کو اپنے اندر ناسور بننے سے کیسے روک سکا ہو گا۔ میں تو ابھی بھی اندازہ نہیں لگا سکا کہ اس ناسور کا بیج کہاں سے پھوٹا جو اسے زندگی سے اتنا دور لے گیا۔ اس نے جاب کے لیے کوشش شروع کر دی۔ جو اس کی مداح ہونے کا دعوا کرتی تھی ان میں سے اس نے ایک سے کہا۔

”تمیں نے سنا ہے آپ کے پروڈکشن ہاؤس کو

کوٹینٹ ہیڈ کی ضرورت ہے۔ آپ پروڈکشن کی ہیڈ سے میرے لیے بات کریں۔ میں کہانیوں اور اسکرپٹ کو بہت اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔ بہت سے فریئر آئیڈیاز پر اچھے اسکرپٹ لکھوا سکتا ہوں۔ ڈراما انڈسٹری میں نئے تھم لاسکتا ہوں۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں تمہارے لیے بات کرتی ہوں۔ میں تو ویسے ہی تمہاری بہت بڑی فین ہوں۔“

بات اس نے واقعی یہی کی، لیکن کسی اور کے لیے۔ اس کے لیے جو اس سے قابلیت میں کم تھا، جو ان کے

اندر رہ سکتا تھا۔

اس کی ڈائری کے خالی سوا گوار صفحے پر ایک فقرہ لکھا تھا۔

”مجھے یقین ہونے لگا ہے دنیا ناک تک لالچ اور خود غرضی کی علت سے بھر چکی ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ میں لوگوں کو جانتا ہوں۔ یہ لوگوں کی خرابی ہے کہ ان کے اصلی چہرے دکھائی نہیں دیتے۔ یا میری اپنی خالی کہ اصلیت جان نہیں سکتا۔“

اگر دنیا لالچ اور خود غرضی کی علت میں گرفتار تھی تو وہ بھی ہو جاتا لیکن زندہ تو رہتا۔ لوگ مرجاتے ہیں پھر دنیا اپنے سوگ کا ڈراما شروع کرتی ہے۔ اب اس کے لیے لمبے لمبے کالم لکھے جا رہے ہیں۔ اس کی قابلیت پر بھرے کیے جا رہے ہیں۔ پوسٹ پر پوسٹ آرہی ہے۔ وہ کتنا عظیم اور بچل رائٹر تھا سب کو یاد آ رہا ہے۔ اس کی کتابوں کے اقتباسات شیئر کیے جا رہے ہیں۔

کیا میں بھی اس کی ڈائری شیئر کروں۔ وہ خالی صفحات جن پر اس نے کچھ نہیں لکھا، ان پر ان کا کما لکھ کر سب کے سامنے رکھ دوں۔

اب جب میں نے اس کی بند آنکھوں کی ساری تحریر پڑھ لی ہے تو کیا میں سرخ روشنائی سے لکھ دوں کہ ”وہ تو مر گیا لیکن ہم سب منافق مسکیر حاسد بے حس خود غرض کم ظرف زندہ ہیں۔“



WWW.PAKSOCIETY.COM



گلابی دنیا

”اسپورٹس چینل لگاؤ۔“ حمزہ نے ٹی وی لائونج
میں رکھے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
تو میں نے بھی اسی ٹون میں جواب دیا۔ ”نہیں“
مجھے یہ شور کھٹنا ہے۔“



WWW.PAKSOCIETY.COM

”نہیں“ مجھے بچھو لگتا ہے۔ لگاؤ دوری میں ٹی وی توڑ دوں گا۔“ حمزہ کی ہٹ دھرمی جاری تھی۔ مجھے پریشان کرنے کا کہاں کوئی موقع چھوڑتا تھا۔

”حمزہ! یہ کیا بروتی ہے۔“ میں نے زنج آکر کہا تو وہ مسکرایا۔ مجھے کمزور پڑا دیکھ کر اور اپنی فتح کے جھنڈے لہرا کر اسے دلی سکون جو ملتا تھا تو پھر کبھی کبھی وہ میری بات مان بھی لیا کرتا تھا۔

عجیب سی طبیعت کا مالک تھا۔ میں نے بھی چینل نہیں بدلا تھا۔ شو دیکھ رہی تھی کہ بڑی امی کی آواز پر چونک گئی۔

”حرا! جاؤ میرے لیے چائے لے کر آؤ۔“ بڑی امی کی بات پر کیسے انکار کرتی، میرا ڈانٹ کھانے کا بالکل بھی موڈ نہیں تھا۔ اس لیے خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔ اگر کچھ دیر رک کر شو مکمل ہونے کا انتظار کرتی تو نہ جانے کیا کیا سننے کو ملتا۔ میں وہاں سے غصے میں اٹھی اور اپنا غصہ جاتے جاتے ریموٹ پر نکالا۔ جب غصے سے میں نے وہ ریموٹ حمزہ کی طرف پھینکا تو حمزہ نے فوراً ریموٹ سے چینل بدل کر اسپورٹس چینل لگا دیا۔

بڑی امی کے سامنے حمزہ میرے لیے اکثر نرم پڑ جاتا۔ پتا نہیں وہ بڑی امی سے ڈرتا تھا یا پھر اسے مجھ پر ترس آجاتا تھا۔ بڑی امی میری دل آزاری کا کبھی کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں اب تو میں بڑی امی کے اس لمبے کی عادی ہو چکی تھی۔ بڑے ابو تو حمزہ سے بھی زیادہ پیار مجھ سے کرتے، ہمیشہ رانی بیٹی کی طرح رکھا۔ ان کی وجہ سے ہی تو آج میں یونیورسٹی میں بزنس ڈپارٹمنٹ میں زیر تعلیم تھی۔

بڑی امی غصے میں کچھ بھی بول دیتیں۔ وقتی طور پر بہت دکھ ہوتا، خاص طور پر جب وہ مجھے امی ابا کے نہ ہونے کا زہمہ دار ٹھہراتیں۔ تو میں گھنٹوں خاموش رہتی اور دادی کی گود میں سر رکھ کر رو لیتی۔ تو دل کا بوجھ تھوڑا

کم ہو جاتا۔ دادی کی گود میں سکون ہی اتنا ہوتا کہ سارے دکھ کہیں دور چلے جاتے۔ بڑے سے ہال میں ایک طرف لاؤنج تھا تو دوسری

طرف کھانے کی میز، کارنر میں امریکن کچن میں آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔ دادی کے کمرے کا دروازہ بھی ہال میں کھلتا تھا۔ اوپر والے پورشن کی سیڑھیاں ہال میں اترتی تھیں۔ سیڑھیوں کے ایک طرف دادی جی کا کمرہ تھا کیونکہ ان کو سیڑھیاں اترنے چڑھنے سے گھنٹوں میں درد ہو جاتا تھا اس لیے بڑے ابو نے ان کو نیچے ہال میں کمرہ دیا ہے باقی اوپر والے پورشن میں کمرے تھے۔

میں اپنے روم میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ کل فنانس کا ٹیسٹ تھا۔ جس کی تیاری میں مصروف و دنیا و جہاں کو بھول کر صرف اور صرف کتاب اور ذہن کے درمیان جنگ جاری رکھے ہوئے تھی۔ بڑی امی میرے کمرے میں آئیں، کچھ پل مجھے دیکھتی رہیں پھر بولیں۔ ”میں مارکیٹ جا رہی ہوں۔ رات کا کھانا بنا دیتا۔ بڑھائی کے ساتھ کام کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ اتنے سکھ تو ماں کے ہوتے ہوئے بھی نہ ملتے جتنے۔“ وہ کہتے کہتے رک گئیں۔

میں نے خالی نظروں سے انہیں دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے میری آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ انہوں نے دوبارہ وار کیا۔ ”مہارانی کی طرح رہتی ہو۔“ بڑی امی کی آنکھوں میں میرے لیے حقارت تھی۔

میں آج تک یہ بات سمجھ نہ پائی تھی کہ انہیں مجھ پر اتنا غصہ کیوں آتا ہے۔ ”جی ابھی بنا دوں گی۔“ بنا دوں گی مطلب۔ ابھی اٹھو اور رکھو کتاب۔ میں نے ان کی بات پر کتاب بند کی تو وہ چلی گئیں۔ میں نے ایک بار پھر ہند کتاب کو دیکھا پھر میں نے سوچا کہ رات میں بیٹھ کر پڑھ لوں گی۔

رات کے کھانے کی میز بر دادی نہیں تھیں۔ حمزہ نے کھانا شروع کرتے ہی دادی کا پوچھا تو بڑے ابا نے بتایا کہ ان کے کھنے میں درد ہے بڑے ابا نے میری

طرف دیکھتے ہی کہا کہ دادی کا کھانا ان کے کمرے میں پیشیاؤں میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جب میں کھانا

لے کر داوی کے کمرے میں گئی تو وہ دروازے پر کراہ رہی تھیں۔ ان کے گھٹنے میں شدید درد ہو رہا تھا میں نے آؤڈیکس لگائی اور پھر سکائی کرنے لگی۔ دو سے تین گھنٹے کی مشقت کا نتیجہ یہ ہوا کہ داوی کو نیند آنے لگی۔ وہ مجھے دعائیں دیتی نہ جانے کب سو گئیں۔ میں آرام سے آہستہ سے دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آگئی۔

کتاب کھول کر دیکھا تو آنکھیں نیند سے بھری تھیں پھر بھی زبردستی پڑھنے کی کوشش کرنے لگی تو کتاب کے لفظ جھومنے لگے دل نے یہی کہا کہ حراسو جاؤ صبح دیکھا جائے گا میں نے بھی بیڈ کی چادر درست کی اور لیٹتے ہی آنکھیں موند لیں۔

ناشتے کی ٹیبل کے پاس کھڑی میں بڑے ابا کے لیے چائے نکال رہی تھی جب بڑی امی زینے سے اترتے ہی مجھ سے مخاطب ہوئیں وہ کہیں جانے کے لیے تیار تھیں۔ ہاں یاد آیا آج ان کے فلاحی ادارے کی خاص میٹنگ تھی۔ ”حمزہ! حمزہ کی بلو شرٹ نہیں مل رہی ہے کل تو رانی نے دھوئی تھی۔“ بڑی امی نے میرے علم میں اضافہ کرتے ہوئے کہا رانی ہمارے گھر میں جھاٹو برتن اور کپڑے دھونے کا کام کرتی تھی جبکہ باقی تمام کام میری ذمہ داری شمار ہو جاتے۔

میں نے سعادت مند اور فرمانبردار بیٹی کی طرح کہا ”جی بڑی امی وہ میں نے یہ کر کے حمزہ کے کمرے میں رکھی تھی۔“

”جاؤ اب اسے ڈھونڈ کر دو۔“ بڑی امی کے حکم کی تعمیل کرنے میں حمزہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

حمزہ نے الماری کے سارے کپڑے زمین پر ڈھیر کیے ہوئے تھے۔ میں نے زمین پر ڈھیر ہوئے کپڑوں کو دیکھا اور پھر حمزہ پر نظر ڈالی اور حمزہ سے کہا۔

”یہ کیا کیا تم نے؟ ایک شرٹ نہیں ڈھونڈ سکتے؟ دھیان سے کام کرو تو پتا چلے تمہیں۔“ میں بلو شرٹ مسلسل ڈھونڈ رہی تھی اور ساتھ ساتھ بول رہی تھی۔

”جلدی ڈھونڈو۔“ لیکچر بعد میں بھی دے سکتی ہو۔

مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ شیشے کے سامنے بال بناتے ہوئے حمزہ نے شیشے میں سے ہی مجھ پر نظر ڈالی۔

وہ میری باتوں سے بے زار ہو رہا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ اسے میرا بولنا برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ اسے برداشت کرنا آتا ہی کہاں تھا۔ اتنے میں میں نے شرٹ کپڑوں کے ڈھیر سے کھینچ کر نکالی۔

”یہ لو۔“ میں نے شرٹ حمزہ کے سامنے لہرائی۔ اس نے غور سے دیکھا اور میرے ہاتھ سے لیے بغیر استری کرنے کو کہا کیوں کہ وہ خوب صورت شرٹ سلوٹوں سے مزین ہو چکی تھی۔ ایک پل کے لیے مجھے غصہ تو آیا غصے میں ہی استری اسٹینڈ پر شرٹ کو پھینکنے کے انداز میں رکھا اور استری کرنے لگی۔ پھر میں نے دیوار پر لگی گھڑی کو دیکھا۔ جو ساڑھے آٹھ بج رہی تھی۔

”جلدی کرو۔“ حمزہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرانی تو دل چاہا ادھر ہی چھوڑ دوں۔

”تو کر نہیں ہوں میں اور بھی کام ہیں مجھے۔“ پھر زبان کھولنے کے بعد یاد آیا کہ یہ تو بڑی امی کا حکم تھا۔ ان کی گستاخی تو دیال جان ہو سکتی ہے۔ میں نے استری کی ہوئی شرٹ حمزہ کی طرف پھینکی جو سارے کام کاج چھوڑے اسی کے انتظار میں میری طرف چہرہ کیے ہوئے تھا اور شرٹ کو پہننے کے انتظار میں کھڑا تھا۔ شرٹ پہن کر بٹن بند کرنے لگا تو پہلے سے دو سرا بٹن غائب تھا میں کمرے سے باہر آنے کو ہی تھی کہ حمزہ کی آواز پر مڑی۔

”حمزہ! میں نے دل میں سوچا۔“ خدا یا! اب کیا مصیبت ہے۔“ پہلے سے دو سرا بٹن غائب تھا۔ حمزہ نے اس بٹن پر ہاتھ رکھے میری طرف دیکھا تو میں حمزہ کی سوالیہ نظروں کو سمجھ نہ پائی۔

”اب کیا ہوا؟“ میں نے بے زاری سے پوچھا۔ ”تم نے استری کرتے وقت دیکھا نہیں تھا۔“ حمزہ بولتے ہوئے۔۔۔ بٹن بند کر رہا تھا اس بات کی وجہ اب تک نہ جان پائی تھی۔ اس لیے غصے میں بول

انھی۔
”اسٹری ہو گئی نا“ یہی بہت بڑی بات ہے۔“

”اچھا جی۔ اس بڑی بات کے ساتھ بٹن لگانے جیسی چھوٹی بات بھی کرو۔“ حمزہ نے اسی ٹون میں جواب دیا۔

میں واپس کمرے میں آئی۔ سپر پختے ہوئے نیبل کے پاس پہنچی دراز سے سوئی دھاگا نکال کر اس کی طرف بڑھی میری بے زاری میرے چہرے سے ظاہر تھی جب کہ حمزہ مسکرا رہا تھا۔ جیسے وہ لطف اٹھا رہا ہو۔ اس کی مسکراہٹ میرے چہرے پر غصے کے بل نمایاں کر گئی۔ میں نے بٹن شرٹ پر رکھا اور لگانا شروع کیا۔ میرے ماتھے کے بل حمزہ کو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اس لیے اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی، میں نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ بات بتانے لگا۔

”غصے میں کہیں میری اسکن بھی اس کے ساتھ سلائی نہ کر دیتا۔“ حمزہ کی اس بات پر بھی میرا وہی انداز تھا جیسے سنا ہی نہ ہو۔

دل تو چاہا یہ سوئی اس کے سینے میں اتار دوں۔ میں نے سوئی کو عور سے دیکھا پھر اسے پتا چلے گا کہ تنگ کرنا کیا ہوتا ہے۔ حمزہ مسلسل میرے چہرے کو دیکھ رہا تھا اور میں پورے دھیان سے بٹن ٹانک رہی تھی۔ دھاگا کاٹنے کے لیے میں نے قینچی کے لیے دیکھا تو حمزہ کی طرف دیکھ کر میں تھوڑا جھینپ گئی تو اس نے نظریں مجھ پر سے ہٹائیں۔

”قینچی کہاں ہے؟“

”مجھے کیا پتا۔“ حمزہ نے اس جملے کو اتنا چبا کر کہا جیسے واقعی نہیں جانتا تھا۔

میں نے دانت سے کاٹنے کی کوشش کی تو میرا چہرہ حمزہ کے سینے پر تھا، جہاں میں اس کے دھڑکتے دل کی آواز سن سکتی تھی۔ اتنے قریب سے کچھ عجیب سا احساس ہوا جیسے بجلی کے نیچے تاروں کا کرنٹ لگا ہو۔

میرے دل کی دھڑکنوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ میرے اندر کی ہلچل میرے ہاتھ سے ظاہر ہو رہی تھی، میں نے جلدی سے دھاگا شرٹ سے چھڑایا اور دراز میں

رکھ کر حمزہ کو دیکھے بنا کمرے سے باہر آ گئی۔

”مجھے کیا ہو رہا ہے۔“ میں نیچے پجن میں گئی۔ کھانے کی نیبل پر پانی کا جگ۔ بھرا ہوا تھا، میں نے پانی گلاس میں بھرا اور پھر ایک سانس میں پی لیا۔ پھر اپنا بیگ اٹھایا اور گیٹ کی طرف بڑھی اس سے پہلے کہ حمزہ سامنے آئے اور اس کی آنکھوں میں میرے لیے مذاق ہو مجھے چلنا چاہیے۔ میری حالت اس پر واضح تو ہوئی ہو گئی وہ پتھر تو نہ تھا۔ زیادہ نہ سہی ہلکا سا جھٹکا اسے بھی محسوس ہوا ہو گا۔

گیٹ کے باہر حمزہ بائیک پر سوار تھا۔ وہ اپنی بائیک کو ریس دے رہا تھا، میں نے نظر چرا کر اسے دیکھا تو وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔ میں اسے نظر انداز کر کے چلنے لگی تو اپنی بائیک لے کر میرے سامنے آ گیا۔ میری طرف دیکھے بغیر ہی بولا جس سے صاف ظاہر تھا کچھ تو احساس حمزہ کو بھی ہوا تھا کہنے لگا۔ ”میری وجہ سے لیٹ ہوئی ہونا۔ چلو میں چھوڑ دوں۔“

”اتنی سہیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تمہاری مدد نہیں چاہیے۔ میں چلی جاؤں گی۔“ میرا لہجہ برف میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں اس کے قریب نہیں آنا چاہ رہی تھی۔ حمزہ کا لہجہ بھی کچھ مختلف نہ تھا۔

”ٹھیک ہے جاؤ۔ مو۔“ حمزہ اپنی بائیک تیزی سے لے کر چلا گیا۔ یونیورسٹی سے گھر پھر گھر کے کام، ان کے ساتھ حمزہ کی نوک جھونک میں وقت ایسے گزر گیا جیسے اسے پر لگ گئے ہوں۔



میرے امتحانات اگلے مہینے تھے۔ میں چاہ رہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ وقت پڑھائی میں گزرے۔ میں کتاب کے صفحے کو الٹ پلٹ کر کے دیکھ رہی تھی یہ اکاؤنٹنگ اتنی مشکل کیوں ہے کیا کروں؟ کس سے مدد لوں؟ میں نے کتاب اور نوٹ بک اٹھائی اور سیدھی حمزہ کے کمرے میں پہنچ گئی۔ وہ تو دنیا سے بے خبر سو رہا تھا۔

”حمزہ اٹھو۔“ حمزہ میری آواز پر کہاں اٹھنے والا تھا،

میں نے دوبارہ حمزہ کے کان کے پاس جا کر زور سے آواز لگائی۔ ”حمزہ اٹھو۔“

”کیوں اتنا چلا رہی ہو۔؟ سونے دو۔“ مجھے حمزہ پر شدید غصہ آیا پھر سائیڈ ٹیبل پر رکھا گلاس میں نے اٹھایا جس میں پانی تھا۔ چند بوندیں میں نے حمزہ کے منہ پر چھڑک دیں۔ وہ اک دم سے اٹھا، غصہ اس کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا، میں نے بھاگنے میں عافیت سمجھی۔

حمزہ نے اوڑھی ہوئی چادر کو ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ ”حرا کی بچی۔“

حمزہ میرے پیچھے بھاگا۔ میں سیڑھیوں پر تیزی سے بھاگی اور سامنے سے آتی بڑی امی سے ٹکرائی۔ اب ایک اور قیامت میں وہیں ٹھک کر کھڑی ہو گئی۔

”لو کی! تمہیں عقل نہیں۔ لڑکیوں کو اس طرح کی حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔“ بڑی امی ابھی غصہ کر ہی رہی تھیں کہ پیچھے سے حمزہ کو آتے دیکھا تو ان کا غصہ اور بڑھ گیا۔ ”بچی نہیں رہیں اب تم۔ ہوش کے ناخن لو۔ تمہارے ماں باپ بھی مصیبت کی گھنٹی ہمارے گلے باندھ گئے۔“ بڑی امی کی ان جلی کٹی باتوں سے آنسو میری آنکھوں میں تیرنے لگے۔ وہ وہاں سے چلی تو گئیں پر میرے سارے ہوئے زخموں کو اوھیر گئیں۔ جاتے ہوئے حمزہ کو ساتھ لے گئیں کہ فلا جی اوارے کی کچھ فالٹز چیک کروانی تھیں۔ حمزہ خاموشی سے بڑی امی کے ساتھ چلا گیا۔ جب بڑی امی مجھ پر برستیں تو کچھ بوندیں حمزہ اپنے دل پر بھی محسوس کرنا کیوں کہ اسے لگتا تھا کہ اس میں اس کی بھی غلطی ہے۔ میں کچن میں کھڑی تھی اور رو رو کر میری آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔ آج امی ابو کی بہت یاد آئی۔ چھوٹی سی بات پر اتنی باتیں اگر میں آج اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنے گھر میں ہوتی تو یہ بے جا روک ٹوک، ڈانٹ شاید میرا مقدر نہ ہوتی۔ دادو میری ہمدرد تھیں۔ وہ میری وجہ سے پریشان ہوں، میں ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی اس لیے ان کے سامنے آنسو بہا کر اپنے دل کا بوجھ بھی ہلکانہ کر سکتی تھی۔ بس زیادہ پریشانی

میں ان کی گود میں سر رکھ کر کچھ پل کو آنکھیں موند لیتی جس سے حمزہ کو بخشاشی ہوتی۔ اس وقت بھی میں دادو کے کمرے میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ دروازے پر ہی حمزہ کی آوازیں آنے لگی۔ وہ دادو کے کمرے میں ان سے باتیں کر رہا تھا۔ دادو نے کبھی ہم دونوں میں فرق نہ کیا تھا، اگر ایک ان کی آنکھیں تھا تو دوسرا ان آنکھوں کی روشنی۔

دادو حمزہ سے کہہ رہی تھیں کہ ”کیوں تنگ کرتے ہو اسے۔ بہت اکیلی پڑ جاتی ہے وہ۔“

”دادو۔ حرا نے آپ سے شکایت کی۔“ گود میں سے اٹھ کر دادو کو دیکھتے ہوئے حمزہ نے کہا۔

”نہیں حمزہ وہ تو کچھ نہیں بولتی۔ دیکھنا جب اس کی شادی ہو جائے گی اور وہ چلی جائے گی تو پھر تمہیں اس کی بہت یاد آئے گی۔“

”دادو اس سڑی سے شادی کرے گا کون؟“ حمزہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

”چل ہٹ بد معاش۔“ دادو نے حمزہ کو چپت لگاتے ہوئے کہا تو میں نے بھی پھر حمزہ اور دادو کو ڈسٹرب نہ کیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں اپنے کمرے میں اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ آج دل پر ایک بوجھ سا تھا پتا نہیں کیوں آج دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں کسی سے بات کروں اس لیے شام سے ہی اپنی کمرے میں تھی جب کہ اب تو رات کے نو بج رہے تھے۔ خاموش کمرے میں نظریں تو کتاب پر تھیں پر سوچ کیں اور ہی سفر کر رہی تھی۔

میں شام سے کہاں ہوں، کسی کو کوئی فرق ہی نہیں پڑا۔ کوئی دیکھنے پوچھنے بھی نہیں آیا۔ آج تو بڑی امی کی آواز بھی نہیں گونج رہی، بڑی امی اور بڑے ابا شاید پارلی میں گئے ہوں گے۔ ورنہ بڑے ابا مجھے نہ پا کر ضرور پوچھتے۔

حمزہ تو بڑی امی کی طرح ہے، ضرورت ہوئی تو پوچھ لیا ورنہ کیا فرق پڑتا ہے۔ میں جیوں یا مریں۔ ابھی ان سوچوں میں ہی تھی کہ ایک دم دروازہ کھلا اور حمزہ اندر آیا۔

”پاگل لڑکی! کیا کر رہی ہو۔؟“

مسکراہٹ کھل اٹھی۔ کیک کا ٹکڑا میں نے دادو کی طرف بڑھایا تو حمزہ نے بھی اپنا بڑا سامنہ کھول دیا۔ حمزہ کی طرف بنا دیکھے میں کیک اس کے منہ میں رکھ کر جلدی سے دادو کی طرف مڑی۔

”دادو آپ کو — یاد تھا۔“

بالکل۔۔۔ اور یہ شیطان بھولنے کب دیتا ہے۔“ دادو نے حمزہ کی طرف اشارہ کیا تو میں نے بھی حمزہ کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا جس کی آنکھوں سے خوشی ظاہر ہو رہی تھی۔

عجیب تھا یہ حمزہ بھی، کبھی جھگڑا کرتا تو کبھی بڑی امی سے ڈانٹ پڑوا کر خوش ہوتا تو کبھی میرے درد کو کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ کتنے خوب صورت تھے یہ بل۔۔۔ یہ بل جو آج حمزہ کی وجہ سے میری زندگی کے چند ایک خوب صورت پلوں میں شمار ہونے لگے۔ میری زندگی کے یادگار ہیں یہ بل۔

پھر کیک کاٹنے کے بعد ہم کالی دیر تک دادو کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے رہے وقت کا احساس تب ہوا جب بڑی امی کمرے میں داخل ہوئیں وہ لوگ پارٹی سے آچکے تھے۔ میں ایک دم سے ڈر گئی کیوں کہ ان کا سارا غصہ ہمیشہ کی طرح مجھ پر نکلنے والا تھا۔

”حمزہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟ تمہیں اس وقت اپنے کمرے میں ہونا چاہیے۔“ حمزہ بڑی امی کی بات پر اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور حمزہ کے پیچھے میں بھی دادو کے کمرے سے باہر چلی گئی میں نے جاتے ہوئے ایک نظر بڑی امی پر ڈالی۔ غصے سے ان کی دماغ کی رگیں بھی پھول گئی تھیں جو ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھیں میرے جاتے ہی بڑی امی نے دروازے سے باہر کی طرف دیکھا پھر ان کی آواز نے میرے قدم روک لیے جب تک حمزہ اپنے روم میں جا چکا تھا۔

”ماں جی! آپ حمزہ کے دماغ میں ایسا کچھ نہیں ڈالیں گی جو مجھے منظور نہ ہو۔“

”رخسانہ میں تو بس۔“

”مجھے امید ہے آپ آئندہ اس بات کا خیال رکھیں گی۔“ بڑی امی نے دادو کو اپنی بات بھی پوری نہ

”حمزہ! یہ کیا طریقہ ہے تم دروازہ ٹاک کر کے بھی آسکتے ہو۔“

”کیوں؟ تمہارا دروازہ ٹاک کر کے آؤں تو کمرہ سمجھ رکھا ہے۔“

”حمزہ! اب ہم بچے نہیں ہیں سنا نہیں تھا بڑی امی نے کیا کہا تھا۔“ میرے دکھ اور غصے کے ملے جلے احساس کو حمزہ سمجھ گیا تھا اس لیے اس کا لہجہ بھی دھیمّا ہو گیا جس میں قدرے اپنا پن پھیلنے لگا۔ حمزہ اسٹڈی ٹیبل سے ٹیک لگائے میری طرف دیکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

”مرا میری طرف دیکھو۔“ میں نے بہ مشکل حمزہ کے چہرے کو دیکھا۔

”اگر یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں میرا بچپنا ہے تو مجھے بڑا نہیں ہونا۔ تم بات نہیں کرتیں دن میں ایک دو بار جھگڑا نہیں کرتیں تو میرا دن مکمل نہیں ہوتا اور ویسے بھی آج جو تم نے کیا ہے اس کی سزا دادو تمہیں دیں گی۔“

”میں نے کیا کیا ہے؟“ میرے چہرے سے پریشانی نمایاں ہوئی تو حمزہ کے چہرے پر شریر سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”یہ تو دادو ہی بتائیں گی چلو اٹھو۔“ میرے کان پکڑ کر کھینچے اور مجھے دادو کے کمرے کی طرف لے گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے کیک پر لگی موم بتیوں کی روشنی سے کمرہ روشن ہوتے ہوئے دیکھا۔ دادو کے چہرے پر مسکراہٹ سجی ہوئی تھی انہوں نے بائیں میری طرف پھیلائی تو میں دادو سے لپٹ گئی۔ ساتھ میں میری آنکھوں کے کنارے بھی نم ہو گئے۔ حمزہ نے چھری میری طرف بڑھائی۔

”ابھی برتھ ڈے حرا۔“ تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس دن کو تو میں نے خود بھلا دیا تھا اور یہ ہی سوچا تھا کہ سب بھول چکے ہیں میرا اس دنیا میں آنا کچھ خاص نہیں ہے جیسا دوسرے لوگوں کا ہوتا ہے۔ میری سوچ غلط تھی کسی کے لیے نہ ہو حمزہ اور دادو کے لیے تو خاص ہی تھا۔ میرے چہرے پر بھی

کرنے دی اور اپنی بات کہہ کر چلی آئیں۔

نہایت سچی محبت کے ساتھ استقبال کا یہ روپ دیکھ کر خوب خوش ہوئی۔ زویا خود بھی بہت خوش مزاج لڑکی تھی وہ اپنی بڑھالی کے کسی اسائنمنٹ کو مکمل کرنے پاکستان آئی تھی۔ آج میں دیر سے اٹھی۔ تقریباً دس بجے قریب کا وقت تھا۔ اسی لیے صبح کافی تازہ دم تھی۔ جھکن جیسے ختم ہو گئی تھی۔ دماغ ہر سوچ سے پاک تھا۔ میں فریش ہو کر ہال میں گئی تو سب کو دیکھ کر یاد آیا کہ آج اتوار ہے اس لیے آج سب گھر پر ہیں۔

بڑے ابانے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ ”میرے بچے کے پیپرز کیسے ہوئے ہیں؟“

”بہت اچھے ہوئے ہیں بڑے ابو۔“ بڑے ابو کے لہجے میں اتنی مٹھاس تھی کہ بڑی امی کا منہ کڑوا ہوتے ہوئے محسوس ہوا۔ زویا نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے میری طرف دیکھا تو میں اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”کیسی ہیں زویا آپ؟“

”بہت خوش“ ان فیکٹ میرا بھی کام تقریباً ختم ہونے والا ہے۔“ بڑی امی زویا کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

میں اٹھ کر کچن کارنر کی طرف گئی اور اپنے لیے چائے بنانے کے ارادے سے چولہے پر چائے کا پانی رکھا دیکھا تو بڑے ابانی بوی لاؤنج سے اٹھ کر دواوی کے کمرے کی طرف جا رہے تھے اور جاتے ہوئے مجھے تاکید کر رہے تھے کہ حمزہ کے لیے بھی چائے بنا دو۔ اس نے ابھی ناشتا نہیں کیا تو میں نے بڑے ابو کی بات سن کر چائے کا پانی مزید بڑھا دیا۔ جب کہ بڑی امی زویا کے ساتھ مصروف تھیں۔ میں نے چائے نکالی۔ بریڈ ٹوسٹر سے نکالے ”آلیٹ بنا کر ناشتے کی ٹرے تیار کر کے حمزہ کے لیے لے جانے لگی تو بڑی امی نے روک لیا۔

”بیٹا حرا! تم آرام سے ناشتا کرو حمزہ کا ناشتا زویا دے آتی ہے۔“ میں نے ایک نظر ٹرے پر ڈالی اور پھر ٹرے زویا کی طرف بڑھا دی۔ بڑی امی کی محبت بھری آواز پر میں شدید رو گئی تھی۔ ایک زمانہ بیت گیا تھا کہ کبھی انہوں نے مجھ سے اتنی اپنائیت سے بات کی ہو۔ زویا

میں بھاگ کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور اپنا دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ کیوں بڑی امی داد سے اس طرح سختی سے بات کر رہی تھیں۔ بڑے ابانے سامنے تو وہ خود کو بڑا خدمت گزار بنا کر پیش کرتی ہیں اور ان کا اشارہ کس طرف تھا، ان کو کیا نام منظور تھا میں اپنے دماغ پر زور ڈال کر بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی اس لیے اپنی آنکھیں موند لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ جو بھی تھا آج اچھا دن تھا صرف حمزہ کی وجہ سے کچھ پل خوب صورت بنے جو میری خود کی دنیا میں شمار کرنے لائق تھے۔ اس لیے میں مزید بڑی امی کے بارے میں سوچ کر اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

آج آخری پرچہ دے کر آئی تو دیکھا کہ رانی اب تک گھر کی صفائی میں مصروف تھی اور اس سے کام بڑی امی اپنی نگرانی میں کروا رہی تھیں۔ میں کمرے میں بیگ رکھ کر چھینچ کر کے آئی تو بڑی امی نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

”حرا! کھانے کو دیکھ لو اور ہر چیز رانی سے صاف کروا کے رکھ دو۔ میں ذرا اپنے روم میں جا رہی ہوں۔“ میں نے ایک فوجی کے سلوٹ کرنے کے انداز میں ”جی بڑی امی جی“ کہا اور کچن کارنر کی طرف بڑھ گئی۔ اتنی تیاری کرنے کی تفصیل رانی نے بتائی۔ ”بڑی ابانی جی کی دوست کی بیٹی دینی سے آرہی ہیں۔ اس کے لیے یہ سب تیاری ہے اور حمزہ صاحب انہیں ایرپورٹ لینے گئے ہیں بس اب تو وہ آنے والی ہوں گی۔ بڑی تعریفیں کر رہی تھیں جی۔“

”اچھا چلو بس اب جلدی سے کام ختم کرو، تمہیں کہیں ڈانٹ نہ پڑ جائے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

رانی پھر جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں زویا ہمارے گھر پہنچ چکی تھیں بڑی امی نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا تو زویا بھی

کے جاتے ہی انہوں نے مجھے اپنے پاس بیٹھ کر ناشتا کرنے کو کہا تو میں ناشتے لے کر وہیں بیٹھ گئی۔

چائے پیتے ہوئے میں نے رسمی انداز میں پوچھا۔ ”بڑی امی! آپ کو بھی چائے دوں۔“ تو انہوں نے منع کر دیا۔

”حرا! میں چاہتی ہوں کہ زویا اس گھر کی ہو بنے۔“ بڑی امی کے یہ الفاظ میرے اندر جیسے شیشے کے گھر میں پتھر کا کام کر گئے۔ یہ دل تو جیسے دھڑکنے لگا۔ بھول گیا۔ مجھے کوئی فرق تو نہیں پڑتا چاہیے تھا پھر کیوں چائے کا گھونٹ میرے حلق سے نیچے اترنا مشکل ہو گیا تھا۔

میں نے بڑی امی کو دیکھا تو وہ اپنی بات مکمل کرنے لگیں۔ ”میں چاہتی ہوں کہ تم زویا کو حمزہ سے بات چیت کرنے کا موقع دیا کرو۔“ بڑی امی کے اس جملے پر میں نے ان کو دیکھا۔ یہ جملہ تھا یا تیز دھار سے وار ہوا تھا۔ میرے اختیار میں کہاں تھا جو میں انہیں موقع دیتی پھر بھی اثبات میں سر ہلانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

میں نے بڑی امی کی بات پر ابھی سے عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب صرف دادی تھیں جن کے سامنے میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتی تھی۔ اس لیے میں دادی کے کمرے میں گئی اور دادی کی باتیں کرنے لگی۔

میں بات کرتے کرتے مسکراتی رہی تھی پر میری آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ دادی کہیں نہ کہیں بھانپ گئی تھیں کہ مجھے بڑی امی نے کچھ کہا ہے۔ اس لیے پھر مجھے سمجھانے لگیں کہ میں کسی کی بھی باتوں کو دل سے

نہ لگاؤں، خاص طور پر بڑی امی کی۔ کوئی لاکھ آپ کا برا چاہے پر جو خوشیاں آپ کی قسمت میں ہیں وہ اپنا راستہ بنا کر آپ تک پہنچ جاتی ہیں۔ بات اتنی مشکل تو نہ تھی پھر کیوں مجھے یہ بات مشکل اور پیچیدہ معلوم ہو رہی تھی؟

میں سامنے رہتے ہوئے بھی حمزہ سے جدائی سننے کے لیے اپنے دل کو آمادہ کر رہی تھی اور پاگل دل ان سب باتوں کے لیے آمادہ نہ تھا۔ دل کہاں دنیا داری کو جانتا ہے، یہ دل تو اپنی ہی من مانی کرتا ہے۔ یہ کون سا راستہ تھا جس پر دل نے سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ

بات میں کسی سے شیز بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟ میرے لیے یہ سب پریشان کن تھا۔ میرے اندر جنگ چل رہی تھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے کیا نہیں۔ کیا درست ہے اور کیا غلط غصیلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

میں آج سارا دن اپنے کمرے میں ہی رہی، نیچے جانے کو دل ہی نہ چاہا۔ نہ ہی کھانا کھایا۔ وقت بھی گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ کیوں آج کا دن ہواڑ کے جیسا لگ رہا تھا، میں چادر اوڑھے بیڈ پر لیٹی تھی، جب حمزہ آیا۔

دروازہ کھولتے ہی مجھے آواز دینے لگا۔ ”حرا۔“

میں نے ایسے ظاہر کیا کہ جیسے میں سو رہی ہوں۔ تب اس نے چادر میرے چہرے سے ہٹائی تو مجھے غصہ آ گیا کیوں کہ مجھے بڑی امی کی بات یاد آ گئی تھی۔

”حمزہ! یہ کیا بد تمیزی ہے تم ہٹانا کہیے کمرے میں کھس آتے ہو۔ کتنی بار منع کیا ہے۔ تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا کیا اس گھر سے مجھی اب چلی جاؤں میں۔“ غصے اور غم سے۔ میری آواز بھرتی تھی۔ حمزہ ایک دم ساکت سا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ جیسے میری باتوں سے اس کی روح فنا ہو گئی ہو۔

”تم ایسے کیوں ری ایکٹ کر رہی ہو۔“ اسی پل مجھے احساس ہوا کہ میں کچھ زیادہ ہی بول گئی ہوں۔ اس لیے موڈ کو بدلا۔

”حمزہ جاؤ، پلیز جاؤ۔“

”میں تم سے پوچھنے آیا تھا کہ تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟“

”مجھے بھوک نہیں ہے حمزہ۔ اب اور سوال نہیں۔ مجھے اب سونے دو۔“ حمزہ میرے سر دلجے کو محسوس کرتے ہوئے اٹھے قدموں باہر جانے لگا۔ اسے ابھی بھی کچھ امید باقی تھی کہ میں کچھ کہوں گی۔ ”ہاں! جاتے ہوئے دروازہ بند کر دینا۔“

حمزہ کو مجھ سے ایسے رویے کی توقع نہ تھی۔ اس لیے دروازہ بند کرتے وقت اس نے کچھ پل مجھے دیکھا

پس رہوں گی۔“ میری اس بات پر حمزہ کو یقین نہ آیا۔ وہ تو میرے جواب کا انتظار تھا۔

”کیوں جاؤ گی تم؟“ حمزہ نے پھر ایک اور سوال کیا اور اب جیسے میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں میں کمزور نہ پڑ جاؤں۔ کہیں میرے دل کا حال میری آنکھیں نہ عیاں کر دیں۔ میں نے حمزہ کو بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف کیا اور باہر دھکیلتے ہوئے دروازہ بھی بند کر دیا۔ دروازہ بند کرتے ہی میری آنکھوں کا سمندر بند توڑ کر بہہ نکلا۔

امی ابو کے بعد ماموں جان مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے، مگر بڑے ایانہ مانے کیوں کہ میں ان کے بھائی کی آخری نشانی تھی۔ اسی طرح دادو بھی مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے بڑا ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھیں تو میں اس گھر میں ہی آئی۔ پھر کبھی نانوں کے گھر جاتی تو ایک دن بعد ہی حمزہ ضد کر کے بڑے ابو کو لے آتا اور مجھے واپس لے جاتے جب کہ آج میں نے عیشہ کے لیے جانے کا فیصلہ صرف اپنے دل میں ہی کر لیا تھا۔

اس بات کا علم بڑے ایانہ اور دادو کو ہوتا تو وہ کبھی نہ مانتے۔ آج بھی حمزہ اس بات کو قبول نہ کیا رہا تھا کہ میں کچھ دنوں کے لیے ہی نانوں کے ہاں جاؤں۔ اب تو میں بھی اس گھر سے مانوس ہو گئی تھی، جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ جانے کی وجہ بھی تو صرف اتنی تھی کہ بڑی امی کے حکم کے مطابق مجھے حمزہ اور زویا کو اکیلے چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ دوسرے یہ کہ حمزہ کو کسی اور کے ساتھ دیکھ کر میرے دل کو تکلیف ہوتی۔ عجیب خود غرضی پر اتر آیا تھا یہ پاگل دل لاکھ سمجھانے کے باوجود سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ اس ضدی بچے کی طرح تھا جو اپنا من پسند کھلونا کسی کے ساتھ شیئر کرنے کو تیار نہ تھا۔

میں نے اپنے رخساروں پر اپنے ہاتھ کی انگلیاں رگڑتے ہوئے اپنے چہرے پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا اور اٹھ کر الماری سے بیگ نکالا اس میں کپڑے اور کچھ ضروری سامان رکھا۔ اس کے بعد دادو سے ملنے ان کے کمرے میں گئی جہاں حمزہ پہلے سے

جب کہ میں کٹری کی طرف دیکھ رہی تھی۔ صمت نہ ہوئی کہ اس کے چہرے کو دیکھ سکوں اور پھر حمزہ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ اس وقت واقعی مجھے اتنا دکھ ہوا کہ آنسو آنکھوں سے گر کر میرے چہرے پر پھیل گئے۔

دل کا دکھ درد بانٹنے والا کوئی ہمہ رد ہو تو زندگی کتنی آسان ہو جاتی ہے۔ دکھ بانٹنے سے کم ہو جاتا ہے۔ اس دکھ میں کوئی آپ کے ساتھ دکھی ہو تو آپ کو کسی اپنے کے ہونے کا احساس دنیا کے دیے ہوئے دکھوں سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ حمزہ کے بعد میری ایک ہی خاص دوست تھی فاریہ، جو میری ہر مشکل کا حل ڈھونڈتی۔ میں نے جب اسے اپنے دل کا حال بتایا تو اس نے بنا سوچے سمجھے ایک نئی بات کا انکشاف کر ڈالا۔

”حرا! تمہیں محبت ہو گئی ہے۔ اس لیے تم حمزہ اور زویا کو ایک ساتھ برواشت نہیں کر پارہی ہو۔“ میں نے فاریہ کی بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ میرے موڈ کو بدلنے کے لیے یہ سب مذاق کر رہی ہے۔ کالج سے واپسی پر میرا موڈ کافی بہتر ہو گیا تھا جس سے تھکن اور بوسہ ختم ہو گئی۔ ذہن پر سکون ہو تو ہر چیز خوش گوار محسوس ہوتی ہے۔ اسی خوش گوار موڈ کے ساتھ میں گھر میں داخل ہوئی تو سامنے حمزہ اور زویا کو خوش گوار موڈ میں محو گفتگو پا کر دماغی سکون کہیں کھونے لگا۔ اور میں خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پتا نہیں کیوں میری آنکھیں اتنا جل رہی تھیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی بیگ کو بیڈ پر پھینکا اور فون نکال کر کان سے لگاتے ہوئے دروازہ بند کرنے لگی تو سامنے حمزہ کو کھڑا پایا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیوں اس طرح کا برتاؤ کر رہی ہو حرا؟“ میرے فون کی بیل مسلسل جا رہی تھی۔ دوسری طرف ہیلو کی آواز سنتے ہی میں نے فون پر کہا کہ ”ماموں جان مجھے لے جائیں، کچھ دن نانوں کے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کئی سوال تھے۔ وہ دادو کو بھی میرے جانے کا بتا چکا تھا۔ وہ شاید دادو سے مجھے روکنے کی سفارش کرنے گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں دادو کا کہنا کبھی نہیں ٹالوں گی۔ دادو کے گلے لگ کر میرے آنسو نکل آئے۔ ”کیا ہوا میرے بچے۔“

میں نے آنسو صاف کرتے ہوئے دادو سے کہا۔ ”کچھ نہیں دادو! بس کچھ دنوں کے لیے نانو کے پاس جا رہی ہوں۔ آجاؤں گی۔“ میں دادو سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

میں نے دل میں سوچا کہ اب میں کبھی اس گھر میں واپس آؤں گی تو تمہاری اجازت درکار ہوگی۔ اب میں کبھی بھی اس گھر میں لوٹ کر نہیں آؤں گی حمزہ۔ میں سوچ میں گم تھی اور گاڑی سوسائٹی سے کر اس کر کے کشادہ سڑک پر رواں دواں تھی۔ کچھ دیر بعد ہم دوبارہ ایک شاندار سوسائٹی میں داخل ہو گئے۔ ان ہی کشادہ گھروں میں ایک کشادہ گھر نانو کا تھا جس کے گیٹ پر ہارن دستے ہی چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ بڑے سے لان کے ایک طرف پارکنگ ایریا تھا گاڑی وہیں کھڑی کر کے ماموں میرا بیگ لے کر گھر کی طرف بڑھے۔ میں بھی پیچھے ہی تھی۔

اسی لیے وہ جان چکی تھیں کہ کچھ تو بات ہے جو میرے اندر اتنی توڑ پھوڑ ہو رہی تھی کیوں کہ دادو بڑی امی کی طبیعت سے بہ خوبی واقف تھیں۔ اب حمزہ سے برداشت نہ ہوا تھا وہ دادو سے التجا کرنے لگا۔

”دادو پلیز! روکیں اسے۔“ اور میں نظریں جھکائے کھڑی تھی جیسے میں نے حمزہ کی بات سنی ہی نہ ہو۔

ممائی شازیہ اور ان کی بیٹی عالیہ داخلی دروازے پر ہمارے ہی استقبال کے لیے کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھ کر عالیہ بے حد خوش ہوئی وہ مجھ سے ایک سال ہی چھوٹی تھی۔ اس لیے ہم دونوں میں کافی گہری دوستی تھی۔ ممائی مجھے پیار سے اندر لے گئیں میں نے گھر میں نظر دوڑاتے ہی نانو کا پوچھا۔

”جانے دو حمزہ اسے کچھ دن نانو ماموں اور ممائی کے ساتھ رہے گی تو اسے اچھا لگے گا اور اب تو اس کے امتحان بھی ختم ہو چکے ہیں۔“ دادو کی ان باتوں پر میں نے دادو کو غور سے دیکھا۔ تو ان کی آنکھیں بھی نم ہی نظر آئیں۔

ممائی کہنے لگیں۔ ”مان کی کمر میں درد ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹر نے بنڈر سٹ کی تاکید کی ہے۔ تم جا کر مل لو۔“ میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میرے ساتھ عالیہ بھی چل دی۔

تب ہی رانی دادو کے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ ”حرا۔ آپ کے ماموں ہال میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ تو میں دادو کے ساتھ باہر آگئی حمزہ بھی ہمارے پیچھے تھا۔ میرا بیگ اسی نے گاڑی میں رکھا۔ بڑے ابا تو آفس میں تھے جب کہ بڑی امی زویا کے ساتھ مارکیٹ گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں میں دادو اور حمزہ ہی تھے۔ دادو لاؤنج تک میرے ساتھ آئیں۔ میں گاڑی میں بیٹھ چکی تھی جب کہ ماموں دادو سے بات کر رہے تھے جو گاڑی سے کچھ فاصلے پر تھے۔ حمزہ نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

نانو ہمیشہ مجھے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں۔ آج بھی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور ہمیشہ کی طرح آج بھی ان کے وہی کلمات تھے۔

”حرا! یہ آخری بار ہے۔ اس کے بعد تم میری اجازت کے بنا کبھی بھی نہیں جاؤ گی۔“ میں

”حرا میری بچی! تم آتی ہو تو ایسا لگتا ہے کہ میری حاجہ آگئی ہے۔ خوش رہو میری بچی۔“ میرے ماتھے پر پوسے دیے۔ کتنی ہی دعا میں ان کی زبان پر رواں تھیں جن میں پوری پوری سچائی تھی۔ ممائی نے بھی

جانے دوں گا۔" میں من ہی من مسکرا دی کیوں کہ وہ وقت کبھی آنے والا نہیں تھا۔ پھر نہ جانے کب نیند کی پری مجھ پر حاوی ہو گئی۔ صبح کی کرنیں میرے کمرے کو روشن کر رہی تھیں جن کی نرم گداز گدگدی سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ عالیہ اٹھ چکی ہے اور وقت بھی خاصا گزر چکا ہے تو میں بھی اٹھ کر فریش ہوئی۔ ہال میں گئی تو ممانی مجھے دیکھ کر مسکرا دیں۔ وہ یقیناً "میرا ہی انتظار کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے نوری کو ناشتا تیار کرنے کا حکم دیا۔ میں نیوی لاونج میں بیٹھ گئی تو نوری ناشتالے کروہیں آگئی ساتھ ہی ممانی بھی آکر بیٹھ گئیں۔ میں چائے پینے لگی۔

"حرا۔ تم خوش تو ہو نا۔ کوئی پریشانی تو نہیں ہے نا۔" ممانی کی کھوجتی نظروں کو دیکھ میں چائے کا گھونٹ لینا بھول گئی ایک پل کے بعد چائے کا گھونٹ میں نے حلق سے نیچے اتار دیا اور مصنوعی مسکراہٹ بجا کر ممانی کو بتانے لگی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ممانی جان۔ میں خوش ہوں۔"

"خدا ہمیشہ تمہیں خوش رکھے۔ میں بھی ایک بیٹی کی ماں ہوں۔ اصل مسکراہٹ اور مصنوعی مسکراہٹ کا فرق جانتی ہوں۔" ممانی کی اس بات پر میں شرمندہ سی ہو گئی اور نظریں جھکا لیں۔

ممانی کی نظریں اب بھی مجھ پر گڑی تھیں۔ "وقت آنے پر میں آپ کو ضرور بتاؤں گی۔" میرے اس جملے سے جیسے ان کو تسلی ہوئی تو انہوں نے مسکرا کر بات بدل دی اور ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول ہو گئیں۔

میں ان سے باتیں اور ناشتا ساتھ ساتھ کرتی جا رہی تھی۔



بوند اباندی نے ہوا میں خنکی کا تناسب بڑھا دیا تھا۔ سردی کی آمد تھی۔ موسم کی طرح احساس بھی سرد ہو رہے تھے جب کہ اندر اراٹوں کو آگ لگی ہوئی

رات کے کھانے کا خاص اہتمام کیا تھا۔ میرے پسندیدہ کھانے تیار کروائے تھے۔ عالیہ اور نانو کے ساتھ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ اب ممانی نے کھانے کے لیے آواز لگادی۔ میں اور عالیہ کھانے کی میز پر پہنچے تو وہاں ماموں موجود تھے۔ وہ مجھے گھر پر چھوڑ کر نہیں کام سے چلے گئے تھے اس لیے دوبارہ نظر نہ آئے اور اب وہ یہاں تھے۔ ماموں نے میری پلیٹ میں خود کھانا ڈالا۔

اور میرے سر پر ہاتھ پیار سے پھیرتے ہوئے کہنے لگے "حرا کے آنے سے ہمارے گھر کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے۔"

"وہ تو ہے جناب۔" ممانی نے بھی ماموں کا پورا پورا ساتھ دیا اور میں مسکرا دی اور پلیٹ میں کچھ گھمانے لگی۔

میرے ذہن میں اب بھی وہی گھر تھا اور یہاں میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔

تب ممانی نے کہا۔ "کھاؤ بیٹا۔" تو میں نے چمچے سے نوالہ منہ میں رکھا۔



یہ یادوں کا قافلہ رک کیوں نہیں جاتا۔ یہ لمحہ بہ لمحہ بدلتے احساس کا طوفان تھم کیوں نہیں جاتا۔ نادان سوچ اس پر بضد ہے۔ جو میرا نہیں جس کا خیال میرا نہیں۔ یہ بالکل دل اتنی سی بات نہ سمجھ سکا اور اندھے گھوڑے کی طرح سراب کا پیچھا صرف خالی پن کے سوا کیا دے سکتا تھا۔ ان سوچوں میں غرق نیند نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ میں نے اپنے برابر میں دیکھا تو عالیہ دنیا سے بے خبر سو رہی تھی۔

کچھ دن پہلے میں بھی ایسے ہی بے خبر بے فکری کے ساتھ سویا کرتی تھی۔ جب کہ آج کا دن بالکل مختلف تھا۔ اس میں غلطی کس کی تھی میری حمزہ کی یا پھر میرے دل کی۔ یہی سوچتے سوچتے میں نے اپنی آنکھیں موندیں پھر میری بند آنکھوں میں حمزہ کا چہرہ نمودار ہونے لگا۔ اس کی وہ بات کہ "حرا آئندہ نہ

تھی۔ جو جل جل کر راکھ ہو رہے تھے۔ میں کھڑکی میں
اداس بیٹھی باہر بارش کی برستی بوندوں کو دیکھ رہی تھی
کہ میری نظر لان میں لگے اس پودے پر پڑی جو بڑے
بڑے پودوں میں چھوٹا سا، مگر نمایاں نظر آ رہا تھا۔ اس پر
ایک عدد سُرخ رنگ کا پھول کھلا ہوا تھا جس کے ساتھ
بارش کی بوندیں چھٹ چھاڑ کر رہی تھیں۔ بارش کی بوند
بڑتے ہی وہ پھول بھی جھوم جاتا اور کئی بل کھا کر رکنا کہ
ایک اور شرر بوند اس کی مستی میں اضافہ کر دیتی تھی
اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی کہ اچانک میرے فون کی
گھنٹی بجی تو میں نے فون پر دیکھا۔ حمزہ کا نمبر تھا میں نے
واپس رکھ دیا۔

پھر میں بارش کو کھدی ہوئی زمین میں گرتے دیکھنے
لگی۔ جہاں شاید نئے پودے لگانے کے لیے زمین تیار
کی گئی تھی۔ اس کے ارد گرد ہری بھری گھاس کی چادر
پھیلی ہوئی تھی۔ جبکہ بارش کی بوندیں اس کھدی ہوئی
مٹی میں جذب ہو رہی تھیں۔ کچھ ہی وقت میں وہ
زمین تر ہو گئی۔ میرے موبائل پر میسج کی رنگ ہوئی
تو میں نے موبائل پر دیکھا "حمزہ کامیاب ہو گیا۔" "مرا! آئی
کس یو۔" وہ میسج پڑھتے ہی میرے چہرے پر
مسکراہٹ کھل اٹھی کسٹاخ دل نے ہلچل مچادی۔ اس
ہلچل میں سرگوشیاں ہونے لگیں کہ میں بھی جواب
میں لکھ دوں "آئی مس یو ٹو ویری میچ" اور وہ سارے
جذبات جو اس کے لیے ہیں۔

پھر سوچ کا رخ بدلا کہ ایک لڑکی کا اپنی محبت کا اظہار
کرنا کچھ معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مشرقی لڑکی اپنی لالچ
اور شرم کی حد کس طرح پھلانگ سکتی ہے۔ بالکل
نہیں۔ اور وہ بھی مجھ جیسی لڑکی جس کے سر پر ماں
باپ کا سایہ موجود نہ ہو۔ جو لوگوں کی باتوں کا منہ توڑ
واب دے سکتے ہوں مجھ بے سہارا کے لیے اپنے
بات کا گلا گھونٹنے میں ہی سمجھ داری ہے۔ ان
بچوں نے جیسے مجھے تھکا دیا تھا میں کھڑکی سے ہٹ کر
اپنے بیڈ پر لیٹ گئی اور کئی خوش فہمیوں اور سوچوں میں
گرنے دینا سے بے نیاز ہو گئی کہ میرے فون کی پھر سے
گھنٹی بجی تو میں پھر سے واپس اسی دنا میں آئی۔

میں نے فون پر دیکھا تو گھر کا نمبر تھا۔ جس کو زیادہ
استعمال دادو کرتی تھیں۔ میں نے فون اٹھایا تو اس
وقت بھی دادو ہی تھیں۔

"کیسی ہو میری بچی؟" حال احوال پوچھ کر کتنی ہی
دعائیں دے ڈالیں۔ "خوش رہو! اللہ خوش رکھے،
جگ جگ جیو۔"

اور ان دعاؤں میں اتنا اثر تھا کہ میری ساری تھکن
دور ہونے لگی۔

"بیٹا۔ میں نے کہا تھا نا کوئی کسی کو لاکھ باندھ کر
رکھے قسمت کو کوئی نہیں باندھ سکتا۔ اگر کوئی کسی کی
خوشیوں کے راستے میں کھڑا بھی ہو جائے تو خوشیاں اپنا
راستہ خود بنا کر اپنے حقدار کی جھولی میں سما جاتی ہیں۔"
میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی جبکہ دادو کی بوڑھی آواز
میں خوشی کی کھنک تھی۔ تو میں بھی ہنس دی۔ "شام
تک انتظار کرو سب واضح ہو جائے گا۔"

"کیا دادو؟"
"میری دعاؤں کا اثر۔" دادو نے مسکراتے ہوئے
کہا۔

ان کی آواز کا ترنم میرے کانوں میں رس گھول رہا
تھا۔ جبکہ میں بات کی وجہ بھی نہ جانتی تھی۔ دادو کے
فون بند کرنے کے بعد دل و سوسوں کے شر کے انجان
راستوں پر سفر کرنے لگا۔

کیا بات ہو سکتی ہے؟ دادو کس کا غور چکنا چور
ہونے کی بات کر رہی تھیں اور شام تک ایسا کیا ہونے
والا تھا۔ جس سے ہر چیز واضح اور شفاف نظر آنے والی
تھی۔ میرا دماغ ان سوچوں سے تھک چکا تھا۔ تو
آنکھیں بند کر کے میں سکون محسوس کرنے لگی اور
میری آنکھ لگ گئی۔

شام میں جب اٹھی تو گھڑی پر نظر دوڑائی پانچ بج
رہے تھے۔ کمرے سے باہر آئی تو دیکھا کہ ہال میں بڑی
امی اور بڑے ابا بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ حیران کن
بات تو یہ تھی کہ ساتھ میں دادو بھی تھیں۔ ویسے دادو
ان کے ساتھ کم ہی جاتیں۔ بڑے ابا پھر بھی دادو کو
میں لے جاتے مگر خزانہ حکیم کے ساتھ کبھی بھی

نہیں۔ ان کا رویہ ہی کچھ عجیب ہوتا اس لیے ان سب کو ساتھ دیکھ کر یہی سوچا کہ زویا اور حمزہ کی شادی کا دعوت نامہ دینے آئے ہوں گے جبکہ بڑی امی کے چہرے پر خوشی کی جگہ ناخوش گواری جھلک رہی تھی جبکہ بڑے ابا بہت مطمئن تھے اور دادو تو بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔

میں نے آگے جا کر سب کو سلام کیا۔ بڑے ابا نے سر پر ہار سے ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں جبکہ دادو ایلے ملیں جیسے وہ بھی میری طرح اداس تھیں جبکہ مجھے دیکھ کر بڑی امی کے چہرے پر جو پر مسکراہٹ تھی وہ غائب ہو گئی۔

پھر نانوں کی آواز ابھری ”یہ آپ کی بچی ہے ہمارے گھر تو ویسے ہی مہمانوں کی طرح آتی ہے۔ پھر بھی آپ نے ہم سے پوچھ کر جو عزت ہمیں بخشی ہے ہم اس کے لیے تمہارے دل سے شکر گزار ہیں۔“ نانوں کی بات میرے پیٹے نہ بڑی تو بھی میں مسکرا کر بڑے ابا کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے ایک بار پھر ہاتھ بڑھا کر میرے سر پر پھیرا اور کہا ”تو آج سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرا بٹی میری ہوئی۔“ تو ماموں اور ممانی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

ماموں جی خوشی سے کہنے لگے ”بہت بہت مبارک ہو ماں جی آپ کو تو جیسے میرا دل بند مٹھی سے آزاد ہوا۔ ساری دھڑکنیں بیک وقت دھڑکنے لگیں۔ پھر میں سب سمجھ گئی کہ یہاں میرے اور حمزہ کے رشتے کی بات ہو رہی ہے تو میں شرما تے ہوئے وہاں سے اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔ میں خود پر ہنسی۔ شرمانے کی کیا بات ہے سب میرے اپنے ہی تو ہیں۔ میں مسکرانے لگی اور دل میں کئی ارمان سجانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ممانی دادو کا ہاتھ پکڑے میرے کمرے کے اندر داخل ہوئیں۔ ممانی دادو کو چھوڑنے ہی آئی تھیں۔ دادو بیڈ پر بیٹھی ہی تھیں کہ میں اپنا سران کی گود میں رکھ کر لیٹ گئی تو ہار سے وہ میرے سر کو سہلانے لگیں۔ کتنا سکون میرے آ رہا تھا جسے میں بیس دن سے مس کر رہی تھی۔

دادو۔ یہ سب کیسے ہوا؟

”بیٹا! اللہ کی مصلحتیں اللہ ہی جانتا ہے۔“

”دادو کیا حمزہ نے مجبور کیا ہے۔“ میں نے دوبارہ سوال کر کے کریداکہ وہ ان بیس دنوں میں جو ہوا ہے کچھ تو بتائیں۔

”ہاں۔!“ دادو کی ایک ہاں نے جیسے میری زندگی خوشیوں سے بھردی۔ میں نے مزید پوچھا۔

”پھر دادو۔“ میں مسکراتے ہوئے مزید پوچھنے لگی۔

”جب اس آدمی انگریز زویا کے ہتھکنڈے نہ چل سکے تو رخسانہ نے صاف کہہ دیا کہ میں زویا کی شادی حمزہ سے کرنا چاہتی ہوں جس کے لیے زویا کے گھر والوں کو بھی آگاہ کرنے والی تھیں کہ حمزہ نے کہا کہ میں زویا کا دوست ضرور ہوں مگر اس سے شادی نہیں کروں گا۔ حمزہ نے رخسانہ بیگم سے کوئی سخت رویہ اختیار نہ کیا بس خاموش ہو گیا۔ زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتا، گھر پر بھی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ تو پھر تیرے بڑے ابا نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ شادی صرف حرا سے کرے گا۔“ اس بات پر دادو بھی مسکرائی تھیں اور ہار سے میرا ہاتھ بھی چوم لیا۔ ”میں تو ہمیشہ سے یہی چاہتی تھی۔ بس رخسانہ کی بد زبانی سے ڈرتی تھی۔ اس کا ذکر تمہارے بڑے ابا نے مجھ سے کیا تو میں نے شکرانے کے نوافل پڑھے اور کہا کہ نیک کام میں دیر کیوں رخسانہ کو مینا تو بہت مشکل کام تھا۔ ویسے تو وہ مان ہی نہیں رہی تھی مگر پھر جب شوہر نے اپنی اہمیت جتائی تو وہ مان گئی۔“

”دادو! حمزہ کیسا ہے؟“ میں نے ان کی گود سے اٹھ کر سامنے بیٹھتے ہی پوچھا تو وہ مسکرا دیں۔

”بہت بہت خوش ہے وہ جس دن سے اسے پتا چلا ہے کہ تم اس کی زندگی میں آنے والی ہو۔ خوشی سے پھولے نہیں ساتا، بے حد خوش ہے۔“ تب ہی مسکراتی ہوئی عالیہ کمرے میں داخل ہوئی اور دادو کو دیکھتے ہی کہا۔ ”آئی لوگ جارہے ہیں آپ بھی آجائیں۔“ تو دادو میرے سر پر ہاتھ پھیرتے اور میرے

اس گھر کی بیٹی ہوں۔ آج مجھے اپنی قسمت پر ناز محسوس ہو رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ گھنٹوں بیٹھ کر اس رب العزت کا شکریہ ادا کروں جس نے میری زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا۔

گال پر چار سے چھتہ پاتے ہوئے اٹھ گئیں۔ میں ایک بار بھر داد کے نکلے سے لگ گئی۔ کتنے خوب صورت پل تھے یہ جنہیں میں دل سے محسوس کر رہی تھی۔



”بارات آگئی۔“

ایک لڑکی بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ”حمزہ بھائی تو بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ ایسے جیسے کسی ریاست کے راج کمار۔“ وہ دوبارہ بولی۔ یہ لڑکی عالیہ کی دوست تھی جبکہ میرے چہرے پر آتے جاتے رنگ نمایاں تھے۔ میں آئینے کے سامنے بیٹھی تھی اور میک اپ ایکسپرٹ مجھے تیار کر رہی تھی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔ اور عالیہ کی بات کا جواب دے ڈالا۔

”تو ہم بھی اپنی حرا کو راج کمار کی طرح بنا دیں گے بلکہ تیار ہونے کے بعد ہماری حرا ملکہ لگے گی۔“ ابھی یہ باتیں چل ہی رہی تھیں کہ ممانی کمرے میں داخل ہو گئیں۔ وہ بھی بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ ”جلدی کرو لڑکیوں! نکاح کی رسم ہونے والی ہے۔“

ممانی دوسری لڑکیوں کو ساتھ لے کر چلی گئیں مگر باقی کی رسمیں ادا ہو جائیں۔ آخر کار وہ وقت بھی آئی گیا جب نکاح کے لیے قاضی، ماموں اور ان کے ساتھ دو گواہ اور بھی تھے اندر آ گئے۔ نکاح کی رسم ادا ہو گئی۔ سب نے مبارک باد دی اور پھر آج میں حرا سے حرا حمزہ ہو گئی۔ کچھ عجیب سا احساس ہوا جیسے میں اندر سے بھی بدل چکی ہوں۔



عروسی جوڑے میں جمہازی سائز بیڈ پر بیٹھی میں حمزہ کا انتظار کر رہی تھی۔ کمرہ بھی دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ تازہ گلابوں کی خوشبو سے سارا کمرہ منک رہا تھا۔ بھینی بھینی سی خوشبو عجیب سا احساس طاری کر رہی تھی۔ خواہشیں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ میں اپنی ہی

”اٹھ جاؤ۔ گھر میں بہت کام ہیں اور وقت بھی بہت کم ہے۔“ ممانی نے کمرے میں آتے ہی پردے ایک طرف کیے تو روشنی کی کرنوں سے کمرہ روشن ہو گیا۔ میں نے آنکھیں کھولتے ہی سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھا کر دیکھا کہ حمزہ کا کوئی مسیج یا کوئی مس کال تو نہیں موبائل پر کچھ بھی نہ تھا یہ کیا بات ہوئی! یہی سوچ رہی تھی کہ ممانی کی آواز پھر کانوں سے نکل آئی۔

”جلدی اٹھو حرا مارکیٹ جانا ہے۔ لسٹ تیار کرنی ہے شادی والا گھر ہے۔“

”اوہو۔“ می اٹھ جاتے ہیں۔ ”عالیہ یہ کہتے ہوئے چادر ڈھانپنے لگی تو ممانی اور دیکھتے ہوئے بولیں۔

”او خدا یا اس لڑکی کو کبھی کسی چیز کا ہوش نہیں۔ حرا تیار ہو کر نیچے آ جاؤ اور اس لڑکی کو بھی لے آؤ ساتھ۔“ ممانی نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا اور جاتے جاتے ساتھ لانے والا جملہ جو بولا وہ عالیہ کے لیے تھا جو پھر سونے جا رہی تھی۔ فوراً ”اٹھ گئی آج کی صبح میرے لیے نہایت ہی خوب صورت اور خوشگوار تھی۔ سردی کے باوجود دل میں جو خوشی کی حرارت تھی۔ وہ سردی کے احساس کو زائل کر رہی تھی۔ میں نے الماری سے کپڑے نکالے اور واش روم میں جانے سے پہلے عالیہ کو جگا دیا۔ ہم تیار ہو ک رہال میں آئے تو ممانی ڈیکوریشن، کیکٹرنگ والوں کو لائن میں کھڑا کر کے کچھ سمجھا رہی تھیں۔ ڈیکوریشن والا تو کچھ پھول بھی ساتھ میں لایا تھا۔

— ممانی ان پھولوں کو دیکھ کر اپنا حتمی فیصلہ سنارہی تھیں۔ جبکہ ایک طرف نانو اور ماموں بیٹھے شادی میں بلائے جانے والے مہمانوں کی لسٹ تیار کر رہے تھے۔ میں نے اس گھر میں اتنا وقت نہیں گزارا تھا پھر بھی اس گھر کے لوگ ایسے تیار یوں میں مصروف تھے جیسے میں

دکن

نومبر 2016 کا شمارہ شائع ہو گیا

✽ اداکار ”علی رحمن“ سے شاہین رشید کی ملاقات،

✽ ”آوازی دنیا سے“ اس ماہ مہمان ہیں ”عدیل اظہر“

✽ اداکارہ ”نازیہ ملک“ کہتی ہیں ”میری بھی سنیے“

✽ اس ماہ ”صائمہ مشتاق“ کے ”مقابل ہے آئینہ“

✽ ”من مورکھ کی بات نہ مانو“ آسیہ مرزا کا سلسلے وار ناول،

✽ ”راہنزل“ تنزیلہ ریاض کا سلسلے وار ناول،

✽ ”گل گہسار“ فرح بخاری کا مکمل ناول،

✽ ”چاشین“ نایاب جیلانی کا مکمل ناول،

✽ ”تجھ پہ دل ہمارا“ نازیہ جمال کا مکمل ناول،

✽ ”شکر پارے“ ام طیور کا دلچسپ ناول،

✽ ”امید صبح بہار رکھنا“ شانہ شوکت کا ناول،

✽ نفیسہ سعید، بشری گوندل اور ماریہ یاسر کے افسانے اور مستقل سلسلے

اس شمارے کے ساتھ دکن کتاب

”خود کو جانے دوسروں کو پہچانیے“

آہٹ سے چونک رہی تھی۔ پھر روانہ کھانے کی آہٹ ہوئی تو میں نے گھونگھٹ کی اوٹ سے ہی دیکھا تو حمزہ تھا وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ اس کی خوشی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ جیسے لمبی ریاضتوں کے بعد اس کے دل کی مراد پوری ہوئی ہو۔ سچی مسکراہٹ اس کے چہرے پر رقصال تھی۔

وہ میرے مقابل آکر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے میرے کام والے دوپٹے کو میرے چہرے سے ہٹایا تو شرم سے میں نے نظریں جھکا لیں۔ اس کی مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔ اب تو شرارت بھی اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے میری ٹھوڑی سے میرے چہرے کو اوپر کیا۔ اور غور سے دیکھنے لگا پھر اپنی جیب سے ایک چمکی ڈسبہ نکالی۔ جگمگاتی انگلیوں سے نکال کر میرے ہاتھ کی انگلی میں پستانے لگا تو مجھے اچانک زویا کا خیال آگیا۔

”زویا کیوں چلی گئی؟“

”میں کہاں چاہتا تھا کہ وہ جائے مگر کیا کرتا اسے کوئی آدھا انگریز پسند آگیا تھا۔ مجھے چھوڑ کر وہ ہمیشہ کے لیے چلی گئی۔ بے چارہ میں یہاں پھنس گیا۔“ آخری الفاظ پر حمزہ کی ہنسی چھوٹ گئی تو میں سر سے پاؤں تک جل گئی اور اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر گھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ حمزہ گرتے ہوئے انداز میں بید پر پیچھے کو ہٹ گیا۔ پھر کچھ لمحوں بعد اٹھ کر میرے قریب آگیا۔ میرے چہرے کے بدلتے تاثرات کو دیکھنے لگا۔ پھر ایک ہاتھ سے میرے چہرے کو اپنے مقابل کرتے ہوئے مجھ سے گویا ہوا۔

”میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میری شرٹ کے بٹن ٹانگنے کا حق میں تمہارے علاوہ کسی اور کو دوں“ کسی اور کے قریب آنے سے مجھے وحشت سی ہوتی ہے۔ شاید میں کسی اور کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کی مدھم ہوتی آواز سے مدھوشی جیسے سر بکھیر رہے تھے۔ اور میرے ارد گرد کی دنیا گلابی ہوتی جا رہی تھی۔

دل آباد کا برباد ہونا بھی ضروری ہے
جسے پانا ضروری ہے، اسے کھونا ضروری ہے

خوش ہوں کہ میرا حق طلب کام تو آیا
خالی ہی سہی میری طرف جام تو آیا

مکمل کس طرح ہوگا تماشا برق و باراں کا
ترا ہنا ضروری ہے، مرار و نا ضروری ہے

کافی ہے میرے دل کی تسلی کو یہی بات
آپ آنے کے آپ کا پیغام تو آیا

بہت سی سُرُخ آنکھیں شہر میں اچھی نہیں لگتیں
ترے جاگے ہوؤں کا دیر تک سونا ضروری ہے

اپنوں نے نظر پھیری تو دل نے دیاساتہ
دنیا میں کوئی دوست میرے کام تو آیا

کسی کی یاد سے اس عمر میں دل کی ملاقاتیں
ٹھٹھرتی شام میں ایک دھوپ کا کونا ضروری ہے

وہ صبح کا احساس ہو یا میری کشش ہو
ڈوبا ہوا خود شدید سربام تو آیا

یہ خود سروقے لے جائے کہانی کو کہاں جانے
مصنف کا کسی کردار میں ہونا ضروری ہے

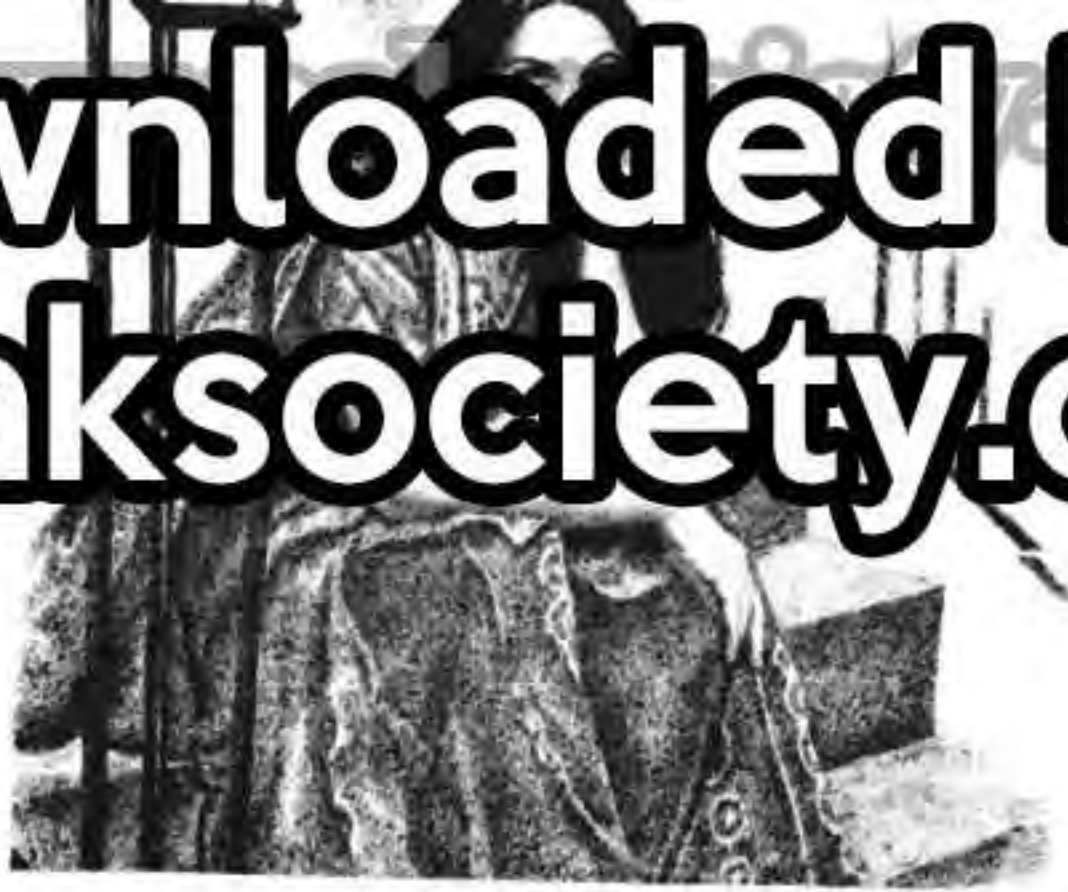
لوگ ان سے کہتے ہیں کہ کتنے ہیں شکیل آپ
اس صحن کے صدقے میں میرا نام تو آیا

جنابِ دل بہت تازاں نہ ہوں داغِ غمیت پر
یہ دنیا ہے یہاں یہ داغ بھی دھونا ضروری ہے

شکیل بدایونی

شعیب بن عزیز

Downloaded From Paksociety.com



دل پہ جو بوجھ ہے اس بار کہاں تھا پہلے
تیرے جیسا کوئی غم خوار کہاں تھا پہلے

ایسے لاچار مسیحا تو نہیں ہوتے تھے
اتنا مایوس یہ بیمار کہاں تھا پہلے

عمر گزری تو تعارف کی شروعات ہوئی
یہ بتا اے میرے دلدار کہاں تھا پہلے

اس سے پہلے بھی سنایا ہے تجھے حال اپنا
تو سماعت کا روادار کہاں تھا پہلے

یہ تو کچھ تازہ جدائی کا اثر لگتا ہے
ورنہ تو اتنا ملنسار کہاں تھا پہلے

دُعا ئے نور پہ محفل کا اختتام ہوا
اُس ایک شخص پہ سارا سخن تمام ہوا

حصار کی پختہ رہنے سے اسم پڑھنے سے
چراغِ فجر میرے ساتھ ہمکلام ہوا

ہماری چھت پہ پرندوں نے رات گریہ کیا
وہ رات جس میں چراغوں کا قتل عام ہوا

ہمارا قتل شہادت کے باب میں لکھنا
ہمارے بعد محبت کا احترام ہوا

بنامِ عشق سرودشتِ رائیگاں میثم
ہماری خاک اُٹلنے کا اہتمام ہوا

میثم علی آغا

اعتبار ساجد

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ شعاع نومبر 2016 261

سرجیکل اسٹرائیک

لیش انت رو پاکستان

لیش انت رو پاکستان
(تم کیوں پاکستان گئے)
کویت میں بسلسلہ روزگار انڈر کنسٹرکشن بلڈنگ
میں تین انڈین اور ایک پاکستانی خان صاحب کام کر
رہے تھے۔ اب انہوں نے یہ سوچ کر کہ ہمیں اس
اکیلے پاکستانی آدمی پر برتری حاصل ہے کیوں کہ ہم
تعداد میں تین ہیں اور یہ ایک ہے۔ تو بس! انہوں نے
خان صاحب سے مذاق کرنا شروع کر دیا کہ ہم پاکستان کو
یہ کروں گے، ہم پاکستان کو وہ کروں گے، ہم پاکستان کو
سبق سکھا دیں گے، ہم پاکستان کے اندر ٹھس کر
پاکستانیوں کو ماریں گے۔

خان صاحب پہلے تو چپ چاپ سنتے رہے یہاں
تک کہ ان کا ضبط جواب دے گیا۔ تو انہوں نے ہاتھ
میں پکڑے نیپے سے زمین پر ایک لکیر کھینچی اور حب
الوطنی سے بھرپور لہجے میں فرمایا۔

”خوجہ پاکستان اور انڈیا کی سرحد تو دور ہے مگر یہ
سمجھ لو اس لکیر کے میری طرف پاکستان ہے اور تمہاری
طرف انڈیا ہے اب اگر تم تینوں مرد کا بچہ ہے تو پاکستان
کے طرف کی لکیر پار کر کے دکھاؤ۔“ بس اتنا کہنا ان کی
مردانگی کو للکارنا تھا اور یہ ان ہندوستانیوں کی عزت
نفس کا مسئلہ بن گیا۔ ان تینوں نے پاکستان کے بارڈر پر
بھرپور حملہ کر کے بارڈر کراس کرنے کی کوشش کی۔
لیکن پاکستانی سرحد کی حفاظت پر مامور محافظ نے نیپے
سے مار مار کر ان کا برا حال کر دیا۔

کافی دیر مرمت کروانے کے بعد بھی جب وہ بارڈر
کراس نہ کر سکے۔ تو خان صاحب نے فرمایا۔

جج : قتل کس نے کیا؟
ملزم : میں نے قتل کیا۔
جج : لاش کہاں ہے؟
ملزم : لاش میں نے جلادی۔
جج : وہ جگہ دکھاؤ جہاں لاش جلائی تھی؟
ملزم : میں نے وہ ساری زمین کھود دی۔
جج : تو کھودی ہوئی مٹی کدھر ہے؟
ملزم : اس کی میں نے اینٹ بنادی۔
جج : تو وہ اینٹ دکھاؤ؟
ملزم : میں نے ان سے مکان بنالیا۔
جج : وہ مکان کدھر ہے؟
ملزم : زلزلے میں گر گیا۔
جج : تو لمبہ کدھر ہے؟
ملزم : وہ میں نے بیچ دیا۔
جج : کس کو بیچا؟
ملزم : پڑوسی کو۔
جج : پڑوسی کو بلاؤ؟
ملزم : وہ مارا گیا۔
جج : کس نے مارا؟
ملزم : میں نے مارا۔
جج : تو لاش کدھر ہے؟
ملزم : لاش میں نے جلادی۔
جج : اے الو کے نیچے! تو نے قتل کیا ہے یا
سرجیکل اسٹرائیک؟ قتل کو قبول بھی کیے جا رہا ہے اور
کوئی ثبوت بھی نہیں دے رہا۔

حراکشیف ڈی آئی خان

لڑکا ”کیوں؟“
لڑکی ”اگر اب تک زندگی میں سگریٹ پر خرچ کیے
ہوئے پیسے بچا لیتے تو سامنے کھڑی BMW گاڑی
تمہاری ہوتی۔“

لڑکا ”آپ سگریٹ جیتی ہیں؟“

لڑکی ”نہیں۔“

لڑکا ”تو کیا وہ گاڑی آپ کی ہے؟“

لڑکی ”نہیں۔“

لڑکا ”مشورہ دینے کا شکریہ۔ میں سگریٹ بھی پیتا
ہوں اور وہ گاڑی بھی میری ہے۔“

نتیجہ! زیادہ لیکچر دینے سے بے عزتی ہو جاتی ہے
حالاں کہ لڑکا بعد میں چنگ چپی پر گیا تھا۔

نائب خان۔ کراچی

منیو

ایک آدمی کی شادی مہمانوں کی کمپنی میں کام کرنے
والی لڑکی سے ہو گئی۔ شوہر گھونگھٹ اٹھانے لگا تو بیوی
بولی۔

”برائے مہمانی اس منیو سے انتخاب کریں۔“
”گھونگھٹ اٹھانے کے لیے ایک دیائیں۔ باتیں
کرنے کے لیے دو دیائیں۔ منہ دکھائی کے لیے تین
دیائیں۔ انگوٹھی پہنانے کے لیے چار دیائیں۔“
شوہر غصے سے ”اب یہ بھی بتا دو طلاق دینے کے
لیے کیا دیائیں؟“

بیوی بولی۔ ”آپ کامرہ جود بیلنس اس کام کے لیے
ناکافی ہے۔ برائے مہمانی پہلے حق مہر کے پیسے جمع
کرائیں اور مزید معلومات کے لیے میری امی سے
رابطہ کریں۔“

”مجھ سے شادی کرنے کا شکریہ۔“

مریہ عمران۔ لاہور

نہن

ٹیچر۔ ”میاؤ سندھ کی زمین اچھی ہے یا پنجاب کی؟“

بچہ۔ ”مس! کراچی کی۔“

ٹیچر۔ ”بیوقوف! پنجاب کی! جہاں سے ہم سبزی

”مڑا! تم ایک لکیر تو پار نہ کر سکتے پاکستان کی حدود
کیسے پار کرو گے۔ جہاں ہمارے جیسے لاکھوں جوان
بیٹھے ہیں۔ اب دوبارہ کبھی بھول کر بھی کسی کے سامنے
یہ بات نہ کہنا کہ ہم پاکستان کے اندر کھس کر مارے
گئے۔“

یہ الفاظ کہہ کر خان صاحب اپنے سامان سمیٹ کر گھر
کو روانہ ہو گئے۔ اور وہ ہندوستانی ہسپتال سے علاج
کے بعد زخموں کی رپورٹ لے کر انہوں نے سوچا کہ
اب کیا کیا جائے تو ان میں سے ایک نے مشورہ دیا کہ
اقوام متحدہ میں یہ معاملہ پیش کیا جائے یعنی کہ پولیس
اسٹیشن میں تو جناب تین عدد زخمی پولیس اسٹیشن میں
شکایت لے کر حاضر ہوئے کہ ان کو ایک پاکستانی نے
تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔ اس کا نوٹس لیا جائے اور ہمیں

انصاف دلایا جائے۔

پولیس اسٹیشن سے بلڈنگ کے مالک کو فون کیا گیا
اور پوچھا گیا کہ آپ کے پاس کوئی خان صاحب کام
کرتے ہیں ان کا فون نمبر چاہیے۔ پھر کل کر کے خان
صاحب کو پولیس اسٹیشن بلایا گیا اور دوران تفتیش
خان صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ نے ان کو کیوں مارا تو
خان صاحب نے پورا قصہ تھانیدار کے گوش گزار کیا۔
قصہ سنتے ہی پولیس اسٹیشن میں سب کے سب
پیٹ پکڑ کر بننے میں مصروف تھے۔ کوئی زمین پر گرا
ہنس رہا ہے تو کوئی ہنسی کنٹرول کرنے کے چکر میں
کھاسی سے دوچار ہے اور جتے جتے ان کے منہ سے
کچھ الفاظ نکلتے تو وہ یہی ہوتے کہ۔

”لہش انت رو پاکستان“ (تم پاکستان کیوں گئے؟)

اس سارے واقعے کا مطلب صرف اعڑیا میں
پاکستان مخالف عناصر کو اتنا بتانا ہے کہ یہ نہ ہو کہ کل کو
پوری دنیا یہ کہے کہ ”لہش انت رو پاکستان۔“

عروبہ خان۔ کراچی

نتیجہ

ایک دن ایک لڑکا ایئر پورٹ پر سگریٹ پی رہا تھا۔
لڑکی ”ایک دن میں کتنے سگریٹ پیتے ہو؟“

پھل حاصل کرتے ہیں۔“
پو۔ ”مس! اگر انڈیا سے جنگ ہوئی تو ہم کیا سبزی
پھل سے حملہ کریں گے۔ یہاں کراچی میں جہاں
کھدائی کریں اسلحہ لکھتا ہے۔“

ماہ نور۔ عثمان کراچی

خطرناک سفر

بس خطرناک پہاڑی سڑک پر مشکل سے آگے بڑھ
رہی تھی اور ڈرائیور پوری حاضری سے اسٹیرنگ پر
کنٹرول رکھنے کی کوشش کر رہا تھا ایسے میں اس کے
پاس بیٹھا ہوا مسافریاتوں سے مسلسل اس کے کان کھا
رہا تھا۔

”ایسے جان جو کھوں کے سفر میں“ میں بہت ٹھہراتا
ہوں مجھے پچھلی دفعہ ایسے ہی ایک سفر کے دوران دل کا
شدید دورہ پڑا تھا“ مسافر نے پریشان ہو کر کہا۔
”کاش آپ اس دورے میں چل بے ہوتے۔“
ڈرائیور نے تنک آ کر کہا۔

صائمہ الطاف احمد۔ کراچی

قابل دید

تھانے دار گشت پر روانہ ہونے کے لیے تھانے
سے نکلا تو اس کے سامنے سے ایک ٹیکسی ست
رفتاری سے گزر رہی تھی وہ تیزی سے آگے بڑھا اور
اچھل کر اس کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے ڈرائیور سے
بولا۔

”یہ تمہارے آگے آگے گاڑی جا رہی ہے اس کا
پیچھا کرو۔ یہ مجھے مشکوک لگتی ہے مجھے ہر حال میں
اس کا تعاقب کرنا ہے۔“

”صاحب جی!“ ڈرائیور نے عاجزی سے کہا۔
”وہی گاڑی تو میری خراب ٹیکسی کو باندھ کر لے جا رہی
ہے۔“

مرت الطاف احمد۔ کراچی

پیارہ رائٹر
خاوند (اخبار پڑھتے ہوئے بیوی سے) ایک رائٹر
نے لکھا ہے کہ شوہروں کو گھر میں بولنے کا حق ملنا
چاہیے۔ بیوی (تاسف سے) ”جی جی! پیارہ رائٹر! گھر
میں کہہ نہ سکا اسی لیے اسے اخبار میں کالم لکھنا پڑا۔“
شازیہ گلزار بھٹی۔ بھکر

قطیس

ایک عورت نے اپنے مایوس اور دل گرفتہ شوہر
سے کہا۔
”آخر یہ کہنے سے تمہارا کیا مطلب ہے کہ کوئی چیز
ایسی نہیں ہے جس کے لیے تم زندہ رہنے کی آرزو
کرو۔ جب کہ ایسی ایک نہیں کئی چیزیں موجود ہیں۔
ابھی فلیٹ کی قطیس ادا نہیں ہوئی ہیں۔ کار کی قطیس
ادا نہیں ہوئیں۔ ٹی وی کی قطیس ادا نہیں ہوئی
ہیں۔“

لیلا انعم شیخ۔ گدو بیراج

شہد کی مکھی

ایک نہایت نازک اندام خاتون ایک باغ کی سیر
کر رہی تھیں۔ اتفاق سے کسی درخت پر شہد کی مکھی کا
چھتا بھی تھا۔ خاتون گھبرا کر باغ کے مالی کے پاس گئیں
اور نہایت ناراض ہو کر بولیں۔

”کتنے احمق آدمی ہو تم۔ شہد کی مکھیاں پال رکھی
ہیں۔ ایک مکھی نے مجھے ڈنک بھی مارا ہے۔“

”میں معافی چاہتا ہوں خاتون!“ مالی نے نہایت
معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”آپ مجھے بتائیے کس
مکھی نے یہ گستاخی ہے۔ میں اسے سزا دوں گا۔“

رخسار ظفر۔ لاہور



فہم کتاب

اقصی ناصر کراچی
عزود تجھ مگر زخم خوردہ
شکست محنت امگر فاتحانہ

آمنہ اجالا ڈہری
تم نے میرے ساتھ اٹھائے ہیں دکھ بہت
خوش ہوں کہ راہ شوق میں تنہا نہیں ہوں میں
کبریٰ عباسی ہری پور

یہ بات بتائی ہے مجھے یاد دہانے
کیوں سے ملاقات کا جرجر چاہیں کرتے
رافیہ بٹول گھوٹکی

یہ دل ہے مرا یا کسی کنیا کا دیا ہے
بجھتا ہے دم صبح تو جلتا ہے سرفشام
مسرت اسلم سیو والا

تم ساری طرح مینے کا ہنر آتا، تو بھر شاید
مکان اپنا وہی رکھتے پتا تبدیل کر لیتے
ناظم زیدی اعظم چوک

یہ دصال ہے کہ فراق ہے دل مبتلا کو پیار ہے
جو یہ پھول ہے تو کیلا رہے جو یہ زخم ہے تو ہزار ہے
زوبارہ خالد لاہور

پیاں کہتی ہے کہ چل دریا اٹھا لائیں ہمیں
درد کہتا ہے کہ رک پایاب ہونے دے مجھے
نجم، نادیر گلستان جوہر

اپنی آنکھوں کے سمندر میں اتر جانے دے
تیرا مجرم ہوں مجھے دُوب کے مرجانے دے
زخم کتنے تیری جاہت سے ملے ہیں مجھ کو

سوچتا ہوں کہ کہوں تجھ سے، مگر جانے دے
سیدہ لبیب زہرا کھرڈ پٹنا

یہ زواں نے مسکرا کر بڑی دیر میں لکھا
اک لفظ آرزو میرے دل کی کتاب میں

عائشہ طاہر لودھراں
تجھے سوچوں تو محسوس ہوتا ہے
زندگی کتنی خوبصورت ہے

صدف عمران کے ڈی اے سوسائٹی
اپنے خلاف فیصلہ خود ہی لکھا ہے آپ نے
ہاتھ بھی مل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں

دائرہ وارہ ہی تو ہیں عشق کے سلسلے تمام
راہ بدل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں
لاریب، مہار ذیب چونیال

مجھے لگتا ہے باقی اک اک شے ہے بے گانی
بس اک تنہائی ذاتی ہے میرے دیران کمرے میں
بیلے کتنی ہی خاموشی ہو لیکن غم کی سرگوشی

ہمیشہ گونج جاتی ہے میرے دیران کمرے میں
نمرہ، اقرار کراچی

جو حرف حق تھا وہی جا بجا کہا سو کہا
بلا سے شہر میں میرا لہو بہا سو بہا
شکست و فتح میرا مسئلہ نہیں ہے فراز

میں زندگی سے خبر آ کر رہا سو رہا
ارم ذوالفقار کراچی

ایک تو دل کے رختے دُشوار بہت تھے
بھر میں پیسا اچھے سائیں دُھوپ بہت ہے
کون تھا جس سے دل کی حالت کہتا میں

کس سے کہتا، اچھے سائیں دُھوپ بہت ہے
نہا، فخر فیصل آباد

اپنے سچا سے اب کوئی امید نہ رکھ ساعز
وہ تنگ دل ہے اور تیرے زخم کی گہرائی بہت



اولیٰ حضرت محمد

بہرہ رقی ہے جہاں آپ آ کرنا نہیں چاہتے۔
 ہمارے ہاں ایک عام آدمی کا بچپن پیار لینے، بڑھاپا
 پیار دینے اور جوانی پیار کرنے کی کوششوں میں گزر
 جاتی ہے۔

دوستوں کو معاف کرنا انتہائی مشکل ہے بہ نسبت
 دشمنوں کے۔
 فوزیہ ثمریث۔ بکرات

ایک حکایت ایک سبق،

عرب کے معروف شاعر فردوق کہتے ہیں کہ میں
 ساحل بحری میں اپنی والدہ کے ہمراہ مکہ مکرمہ آیا۔ جب
 میں حرم کی حدود میں داخل ہوا اور مقام مناکہ پہنچا
 تو دیکھا کہ وہاں بہت سے اونٹ ہٹکائے جا رہے
 تھے۔ میں نے لوگوں سے پوچھا۔
 ”یہ اونٹ کس کے ہیں؟“

لوگوں نے بتایا۔ ”یہ اونٹ امام حسینؑ کے ہیں۔“
 فردوق کہتے ہیں کہ اسی اشنا میں میری نگاہ امام حسینؑ
 پر پڑی۔ میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام
 پیش کیا اور عرض کیا۔

”اے نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ آپ کی
 مرادیں پوری فرمائے اور میرے ماں باپ آپ پر
 قربان ہوں۔ آپ حج کی ادائیگی کے بغیر مکہ سے نہ نکلے
 روانہ ہو رہے ہیں؟“

امام حسینؑ نے میرے سوال کا جواب دینے کے
 بجائے مجھ سے پوچھا۔
 ”تم کون ہو؟“

میں نے بتایا۔ ”میں آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا
 غلام ہوں۔“

میری بات سن کر امام حسینؑ نے پوچھا۔
 ”تم عراقیوں کی بابت کیا جانتے ہو؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
 حضرت انسؓ جہنی رضی اللہ عنہ کے والد فرماتے ہیں
 کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ
 میں گیا۔ وہاں لوگ اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کہہ رہے تھے کہ
 لیے لاتے بند ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں
 میں اعلان کرنے کے لیے ایک آدمی بھیجا کہ
 ”جو اس طرح ٹکڑے کہہ کر آنے جانے کا راستہ بند کر
 دیا، اسے جہاد کا ثواب نہیں!“

(ابوداؤد)

کچھ موتی چمکنے ہیں،

۱۔ علم کے بغیر جو چیز گھسی جائے وہ بے علمی کا اشتہار
 ہوتا ہے۔ (مولانا وحید الدین)

۲۔ اٹنا پڑھو، اتنا پڑھو کہ اُبلنے لگو۔ اس کے بعد لکھو۔
 (مولانا سید سلیمان ندوی)

۳۔ عمر رسیدہ بیوی، بوڑھا کتا اور نقد رقم وقار
 دوست ہوتے ہیں۔ (فرینکلن)

۴۔ جو کسی سے حسد کرتا ہے، وہ اپنی کمتری کا اعتراف
 کرتا ہے۔ (لاطینی کہاوت)

عاشق ہاں گیر مرالی۔ کبیر والا

پھول جیسے لفظ،

۱۔ کچھ تعلق انا سے ٹوٹ جاتے ہیں لیکن کچھ رشتوں
 کو قائم رکھنے کے لیے انا ضروری ہو جاتی ہے۔

۲۔ جب لوگوں کی نیت میں ایک دفعہ کھوٹ آجائے
 تو وہ ساری زندگی سفر میں رہتے ہیں۔ زندگی ان
 کے لیے دکھ درد والی مسافرت بن جاتی ہے۔

۳۔ ہمیشہ یاد رکھیں ان لوگوں کو جو آپ کی حیات کے
 راستے میں اپنا سب کچھ ادا دیتے ہیں۔

۴۔ زندگی ایک ایسی ٹرین ہے جو ہمیشہ ایسے ایسے
 تھکنے والے مقاموں پر رکتی ہے۔

قرآن کا ٹھکانہ
، پیٹ کا غالی رکھنا
، نماز تہجد کی ادائیگی
، نالہ سحرگاہی
حنا سلیم اعوان - آخون بانڈی

میں نے عرض کیا میں عراقیوں کو خوب جانتا ہوں
ان کے دل آپ کے ساتھ ہیں اور ان کی تلواریں
ابن زیاد کے ساتھ ہیں
میری یہ بات سن کر امام عالی مقام نے فرمایا۔
”تم سچ کہتے ہو، اب معاملہ اللہ ہی کے ہاتھ میں
ہے۔ وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے“
یہ کہہ کر آپ نے اپنی سواری آگے بڑھادی۔
(تاریخ طبری)

سیر اور کوئلہ

ایک دفعہ کوئلے نے، سیرے کو مخاطب کر کے کہا۔
”ہم دونوں ایک جیسی کان میں سے نکلے ہیں
لیکن میں نہ صرف سیاہ رنگ کا ہوں اور تو سفید
بلکہ لوگ مجھے دیکھتے ہی سیدھا بیٹھنٹی میں ڈال کر جلا
دیتے ہیں اور تیری رسائی یاد شاہوں کے تاج تک
ہو جاتی ہے کیا تو تینا سکتا ہے کہ لوگ مجھے میری
بہ صوفی کی وجہ سے ناپسند قرار دیتے ہیں اور کیا
تو اپنی خوشنمائی کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں جگہ
پاتا ہے“

سیرے نے بڑے غور سے کوئلہ کی بات سنی
اور بڑے وثوق کے ساتھ کہا۔
”اے نادان! میری عزت و احترام کا انداز میری
قوت بخئی اور ہمت ہے میں ہے جبکہ تو کیا ہے۔ ذرا سی
چوٹ سے ٹوٹ جاتا ہے اس لیے وہ تجھے کم تر
اور کمزور سمجھ کر ذلیل کرتے ہیں اور تجھے جلا دیتے
ہیں میں چونکہ مضبوط ہوں اور لوگوں سے آسانی
ٹوٹ نہیں سکتا اس لیے لوگ میری عزت کرتے
ہیں لہذا مضبوطی زندگی کی آبرو ہے لہذا اگر تو عزت
چاہتا ہے تو خود میں جھٹکی پیدا کر“
مسرت الطاف احمد - کراچی

حضرات حسنینؑ کی مثالی سخاوت

حضرت امام عزالیؑ نے ”احیاء العلوم“ میں
حضرات حسنینؑ کی سخاوت کا عجیب واقعہ ذکر کیا ہے۔
ابوالحسن مدانیؑ کہتے ہیں کہ حضرت امام حسنؑ اور
حضرت امام حسینؑ اور حضرت عبداللہ بن جعفرؑ حج
کے لیے تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں ان کے

جھوٹا انسان

وہ انسان جھوٹا ہے جو حق گوئی کے موقع پر خاموش
رہے یا ایسی بات کہے جس سے ابہام پیدا ہو۔
(دعوت علی داف)
نادیہ، نجر - گلستان جومہر

اقوال زریں

- حقیقت یہ ہے کہ بد نظری ہی بدکاری کے راستے
کی پہلی سیڑھی ہے۔
- اس زمین پر بہت زیادہ لوگ اور بہت کم
انسان جیتے ہیں۔
- علم یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ کیا کہنا ہے
اور حکمت یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ ”کب“
کہنا ہے۔
- تیری داڑھی تیرے بعد پیدا ہوئی مگر سفید
ہو گئی لیکن تو ابھی تک ویسے سا دیرسا کالا ہے۔
- دنیا کی ساری دلیلیں، جواز اور وکالتیں تو ہم
اپنی ذات کے لیے رکھتے ہیں مگر ساری سزائیں
دوسروں کے لیے منتخب کرتے ہیں۔
- شبنم شمشاد - یزمان

بیمار دلوں کا علاج

عبداللہ انطاکیؒ نے فرمایا۔
”پانچ چیزیں ایسی ہیں جو دل کی تمام بیماریوں
کے لیے معجزہ دوا کے ہیں۔
، نیک لوگوں کی ہم نشینی۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

تھے۔ جب یہ وہاں سے گزری تو اس کو دیکھ کر حضرت
حسنؑ نے اسے پہچان لیا۔ آپؑ نے فرمایا۔
”میں تیرا وہی مہمان ہوں دودھ اور بکری والا“
بڑھانے پھر بھی نہ پہچانا اور کہا۔
”کیا خدا کی قسم تم وہی ہو؟“

حضرت حسنؑ نے فرمایا۔ ”ہاں میں وہی ہوں“
اور یہ فرما کر آپؑ نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ
اس کے لیے ایک ہزار بکریاں خریدی جائیں۔ چنانچہ
بکریاں خریدی گئیں اور ان بکریوں کے علاوہ ایک
ہزار دینار (اشرفیاں) نقد بھی عطا فرمائے اور اپنے
غلام کے ساتھ اس بڑھیا کو اپنے چھوٹے بھائی حضرت
حسینؑ کے پاس بھیج دیا۔

حضرت حسینؑ نے دریافت فرمایا ”بھائی نے
کیا بدلہ عطا فرمایا؟“
بڑھیا نے کہا۔ ”ایک ہزار بکریاں اور ایک ہزار
دینار“
یہ سن کر اتنی ہی مقدار دونوں چیزوں کی حضرت
حسینؑ نے عطا فرمائی۔

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن جعفر کے پاس
بھیج دیا گیا۔ انہوں نے تحقیق فرمائی
”ان دونوں نے کیا کیا مرمت فرمایا؟“
اور جب معلوم ہوا کہ یہ مقدار ہے تو انہوں نے
دو ہزار بکریاں اور دو ہزار دینار عطا فرمائے اور یہ
فرمایا۔

”اگر تو پہلے مجھ سے مل لیتی تو میں اس سے
بہت زیادہ دیتا“
یہ بڑھا عار ہزار بکریاں اور عار ہزار دینار۔
(اشرفیاں) آگے کر خاوند کے پاس پہنچی اور کہا۔
”یہ اس ضعیف اور کمزور بکری کا بدلہ ہے“
(فضائل صدقات)

سامان کے اونٹ ان سے جدا ہو گئے رہے بھوکے پیاسے
چل رہے تھے۔ ایک چیمے پر ان کا گزرا ہوا جس میں
ایک بوڑھی عورت تھی۔ ان حضرات نے ان سے
پوچھا۔

”ہمارے پیسے کو کوئی چیز (پانی یا دودھ لٹی وغیرہ)
تمہارے پاس موجود ہے؟“
اس نے کہا۔ ”ہے“

یہ لوگ اپنی اذیتوں پر سے اترے۔ اس بڑھیا
کے پاس ایک معمولی سی بکری تھی، اس کی طرف اشارہ
کر کے کہا۔ ”اس کا دودھ نکال لو اور اس کو مقور اٹھو“
پنی لو۔

ان حضرات نے اس کا دودھ نکالا اور پی لیا۔
پھر انہوں نے پوچھا۔

”کوئی کھانے کی چیز ہے؟“
اس بڑھیا نے کہا۔ ”بھی بکری ہے، اس کو تم
میں سے کوئی ذبح کرے تو میں پکا دوں گی“
انہوں نے اس کو ذبح کیا اور بڑھیا نے پکایا۔
یہ حضرات جب کھاپی کر شام کو چلنے لگے تو انہوں
نے اس بڑھیا سے کہا۔

”ہم ہاشمی لوگ ہیں، اس وقت حج کے ارادے
سے جا رہے ہیں۔ اگر ہم زندہ سلامت
مدینہ واپس آئے تو ہمارے پاس آنا، تیرے احسان
کا بدلہ دیں گے“

یہ حضرات تو فرما کر چلے گئے، شام کو جب اس کا
خاوند (کس جنگل وغیرہ سے) آیا تو اس بڑھیا نے
ہاشمی لوگوں کا قصہ سنایا۔ وہ بہت غما ہوا کہ تو نے
اجنبی لوگوں کے واسطے بکری ذبح کر ڈالی۔ معلوم نہیں
وہ کون تھے، کون نہیں تھے۔ عرض وہ غما ہو کر چپ

ہو گیا۔ کچھ زمانے کے بعد جب ان دونوں میاں بیوی
کو عزت نے بہت ستایا تو یہ محنت مزدوری کی
نیت سے مدینہ منورہ گئے۔ دن بھر میتگیاں اکٹھی
کرتے اور ان کو بیچ کر گزرا کرتے۔
ایک دن وہ بڑھا میتگیاں اکٹھی کر رہی تھی۔
حضرت حسنؑ اپنے خاوند کے آگے تشریف لے گئے





خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

اپنے گاؤں کا نام دیکھ کر ہوئی۔ جوش میں آکر فوراً ہی خط لکھ دیا۔ مگر ستمبر کے شمارے میں خط شامل نہ تھا۔ ایک دفعہ پھر سے تیاری شروع کر لی۔ آپ کی محفل میں قدم رکھنے کی جگہ ملے نہ ملے کوئی شکوہ نہیں۔ ماڈل واقعی ماڈل لگ رہی ہے۔ روایتی دلہن نہیں۔ پہلی شعاع میں چیف ایڈیٹر اور بانی محمود ریاض صاحب کی اہلیہ کے انتقال کی خبر پڑھ کر دل دکھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ حمد و نعت کا ٹوکیا لکھوں۔ ہمارے نبی کی پیاری باتیں ایک ایسا سلسلہ ہے جو قلب و نظر کی تطہیر کا سامان بنتا ہے۔ بھٹی کوثر خالد جڑانوالہ بہت خوب۔ یک نہ شد و شد۔ میری بیٹی مہ نور تو ویسے ہی آپ کی فین ہو چکی ہے۔ اب نسرین عظیم جڑانوالہ کے ”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے“ پہ تصویر دیکھ کر اس نے فوراً ”پہچان لیا کہ چشمے والی محترمہ آپ ہیں۔“ خط آپ کے ”سلسلہ ڈائجسٹ کی جان ہے۔“

بھٹی یہ طیبہ نذر ساہیوال کہاں غائب ہیں۔ دراصل

آپ کے خطوط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں
آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں
اللہ تعالیٰ آپ کو ہم کو اور ہمارے پیارے وطن کو اپنے
حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

پہلا خط شہد اوپور سے آمنہ حسین کا ہے، لکھتی ہیں
شعاع اکتوبر کا شمار مجھے لاہور اسٹیشن سے ملا۔ شادی پر
گئی ہوئی تھی۔ سوچا واپسی میں پتا نہیں کب ملے۔ ٹائٹل
بست پار تھا۔ ”پہال ساز“ کا شدت سے انتظار تھا جسے
میں نے ٹرین میں بیٹھتے ہی پڑھنا شروع کر دیا۔ سائرہ رضا
کوئی ناول لکھیں اور ہمیں پسند نہ آئے، نا ممکن ہے۔
افسانے سب ہی زبردست تھے رشتے ناتے، قاتلہ رابعہ کا
اس دفعہ بازی لے گیا۔ پنجاب سے واپسی پر پتا چلا کہ
میرے کزن جو میرے منگیتر بھی ہیں۔ ابو ظہبی میں جاب
کی وجہ سے جا رہے ہیں۔ مجھے خوشی بھی ہے اور تھوڑی
پریشان بھی۔ خوشی اس بات کی کہ فیوچر اچھا ہو گا اور
پریشانی یہ ہے کہ اتنی دور پہلی دفعہ گئے ہیں۔ میں 6 اکتوبر کی
رات 11 بجے ایئر پورٹ کے لیے نکلے اور صبح 7 بجے
فلائٹ تھی۔ بس میں بہت روئی اللہ تعالیٰ حمید خان (منگیتر)
کو کامیابی عطا فرمائے اور 16 اکتوبر کی رات عمر سعد کی
وفات کی خبر ملی۔ مجھے یقین ہی نہیں آیا۔ آپ میرے کزن
کے لیے دعا کریں کہ وہ بھی وہاں سیٹ ہو جائیں۔

ج۔ پیاری آمنہ! اتنا چھوٹا سا دل ہے آپ کا۔ مانا کہ
محبوبوں میں دلوں کو دھڑکا سا لگا رہتا ہے لیکن اب وہی اتنا
بھی دور نہیں ہے کہ آپ جانہ سکیں اور وہ آنہ سکیں اور
اب تو رابطوں کے ذرائع اتنی ترقی کر گئے ہیں کہ جب
چاہیں رو برو بیٹھ کر بات کر لیں۔ فی الحال اپنی توجہ ڈاکٹر بننے
پر لگا لیں۔ ان شاء اللہ وہ جاب پر سیٹ ہو جائیں گے اور پھر
آپ کو بھی اپنی دلہن بنا کر دینی گے جائیں گے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ایمل رضا قاتلہ
رابعہ اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے
ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

رحمانہ چوہدری نے مدد کے رند میر سے شرکت کی ہے
لکھتی ہیں

میں اگست کے شمارے میں اپنا اپریل کا بھیجا ہوا شعر
موجود پا کر جہاں حیران ہوئی وہاں بہت خوش بھی۔ خوشی

میں اپنے بچے کی مگر کی گام ویکہ کر بہت خوش ہوتی ہوں
بات ہو جائے۔ عفت سحر طاہر کے ”خواب شیشے کا“ کی
جناب۔

خواب تو کلچ سے بھی نازک ہیں
ٹوٹنے سے انہیں بچانا ہے
صباحت یا سمین کا ایک چپ سو سکھ میں عاکفہ ایک
استعارے کی مانند لگی اس کا گردار بہت کچھ یاد دلا گیا۔
بہت سی ایسی باتیں جو بھولے سے بھی یاد کرنے کو دل نہیں
کرتا مگر یہ معاشرے کا مثبت رخ دکھانا گردار ہمیں ہمیشہ
اپنے ارد گرد موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔

ایمل رضا کا پیال سا جب بھی پڑھا ایک ماہر نفسیات
کی طرح اس نے پٹانا نز کر لیا۔ اسے پڑھتے ہوئے تو
سائیس بھی رکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ آنسو کب بہتا
شروع ہوتے ہیں۔ پتا ہی نہیں چلتا میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ
زبان پہ تھوڑا سا کنٹرول رکھ لیا جاتا تو اتنے ایسے ظہور پذیر
نہ ہوتے بہر صورت ایمل رضا اتنا اچھا ناول لکھنے پر
مبارک باد کی مستحق ضرور ہیں۔ یہ ناول انہیں ہمیشہ
لکھاری بہنوں کی فہرست میں ممتاز رکھے گا۔

ام سعدی نے ابامیاں اور زومینے گل میں صباحت جی
کی طرح بہت سے آئینے دکھا کر ہمیں ان کے رویہ کر دیا
ہے۔ اتنی ٹھوس حقیقت کو اتنے سہل انداز میں صفحہ

قرطاس پر بکھیرنے کی بہت بہت مبارک ہو۔
فرزانہ کھل کے کھل ناول ”چھپا کے چھپی“ کی بات
کریں تو کیا بات کریں یوں لگتا ہے دھنک کے سارے
رنگ اس ایک ناول میں فرزانہ کھل نے جمع کر لیے
ہوں۔ فرزانہ ناول لکھیں یا افسانہ دونوں لا جواب ہیں۔

میرا بہت دل چاہتا ہے کہ میں کسی رسالے کا کوئی دفتر
دیکھوں جہاں ہزاروں کہانیاں بکھری ہوں۔ خطوط کا ایک
ڈھیر توجہ کا طالب ہو۔ ردی کی ٹوکری بلکہ ٹوکرا منہ کھولے
پڑا ہو۔ اور آپ لوگ سر پکڑے بیٹھے ہوں کہ الفاظ کے
خزانوں میں سے کس کس کو نکالیں کس کو چھوڑیں۔

سمیرا حمید کیوں غائب ہیں۔ ہم ان کے انتظار میں چشم
براہ ہیں۔

ج : پیاری رحمانہ! ہمیں احساس ہے کہ دور افتادہ گاؤں
میں رہنے والی قارئین کو رچا بہت تاخیر سے ملتا ہے۔ رچا
پڑھ کر اپنی رائے کا اظہار کرنا اور پھر خط پوسٹ کرنا کالی

وقت طلب کام ہے۔
آپ کے خط شامل نہ ہو سکے۔ اس کا ہمیں دلی افسوس
ہے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ آپ واقعی بہت اچھا خط
لکھتی ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔

خواب زاوی + زمین زاوی لکھتی ہیں
شعاع پہلی بار کب ہاتھ میں آیا اچھی طرح یاد نہیں
شاید تب جب لفظوں سے آشنا ہوئے عرصے بعد روانی
سے اردو پڑھنا سیکھا تو شعاع کو اپنی سہیلی بنالیا۔ ایک دفعہ
مس ساجدہ نے کہا۔ عائشہ کی فطرت لڑاکا ہے مگر اس کے
شعاع نے اس کو تبدیل کر دیا ہے۔

پہلے ”قراقرم کا تاج محل“ پھر ”دل کے رستے دشوار
بہت تھے“ اور اب تین سال پہلے والی جنت کے پتے بہت
زبردست کہانیاں تھیں اب اس کے علاوہ ”پیال سا“
کے لیے ایمل رضا کا بہت بہت شکریہ۔

پلیز پرانی رائٹر کو واپس لے آئیں وہ شعاع کے ایسے
چمکتے ستارے ہیں جس سے شعاع کی روشنی تھوڑی کم سی
ہو گئی ہے اور ان رائٹرز سے گزارش ہے کہ اپنے محسن کو
بھولنا اچھی بات نہیں مطلب شعاع۔

زمین زاوی! خط شائع کرانے کے لیے ضروری ہے کہ
خط میں شمارے پر جامع اور مختصر تبصرہ ہو۔ کوئی جواب
طلب بات ہو۔ بہت سی قارئین اس بات کا خیال نہیں
رکھتیں اس لیے ان کے خط شائع نہیں ہوتے۔

دوسرے خطوط کا یہ سلسلہ ادارے اور قارئین کے
درمیان رابطے کا ہے۔ برائے مہربانی اسے دوستوں کو سلام
نیک تمناؤں یا رشتہ داروں سے محبت جتانے کا سلسلہ ہرگز
نہ سمجھا جائے۔ امید ہے آئندہ اپنے اس نام کے ساتھ
”جو آپ کے والدین نے بڑے پیار سے آپ کا رکھا ہو
گا۔“ شامل بزم ہوں گی۔ پرانی مصنفین تک آپ کا پیغام
پہنچا رہے ہیں۔

سحرش مصطفیٰ نے میانوالی سے لکھا ہے

شعاع اور خواتین میرے پسندیدہ ڈائجسٹ ہیں اس خط
سے پہلے تقریباً ”میں چار خطوط بھیج چکی ہوں اور دو افسانے
بھی مگر شائع نہیں ہوئے بہت دکھ ہوا اور سوچا اب نہیں
لکھوں گی مگر پھر شعاع نے لکھنے پہ مجبور کر دیا۔ ڈائجسٹ
میری فرصت کے اوقات میں میرے ساتھی ہوتے ہیں اور

بہت اچھا ساتھ رہتا ہے۔
مجھے شکوہ نہیں ہے بس کچھ خواتین اور شعاع سے پیار
ہی کچھ ایسا ہے کہ غصے میں بھی پیار جھلکتا ہے۔
ج : پیاری سحرش! ایک بات آپ کو سچ بتائیں۔ صبح
سے شکایتی خط پڑھ کر چکر آرہے ہیں۔ یقین کریں
جب ہم آپ کی تحریریں شامل نہیں کرپاتے تو خود بھی بہت
دکھی ہوتے ہیں۔ سحرش آپ نے بہت اداس کر دینے والی
کہانیاں لکھی ہیں کسی ہلکے پھلکے موضوع پر فلم اٹھائیں۔
ہمارا اندازہ ہے کہ آپ ضرور اچھا لکھیں گی۔

آگے چل کر بتا چلے گا۔
اس ماہ کہانی ماضی میں چل رہی ہے جہاں انڈیا اور روبا
کے کردار ہیں۔

حننی! اقبال منڈی فیض سے شرکت کر رہی ہیں لکھا
ہے
میں ایک اسکول ٹیچر ہوں۔ منڈی میں ہمارا ایک خوب
صورت سا گھر ہے۔ مجھے اپنے گھر سے اور گھروالوں سے
بہت پیار ہے۔ ہمارا گھر انہ ایک مذہبی گھر ہے۔ منڈی
فیض آباد کے لوگ بہت پیارے اور مخلص ہیں۔ اللہ
کرے کہ میرا ملک اور منڈی فیض آباد ہمیشہ سلامت
رہے۔

ج : جب سے شعاع میں 'جب تم سے ناتا جوڑا' شروع ہوا
ہے۔ میرا دل کرتا تھا کہ میں بھی کچھ تو لکھوں ان کے لیے۔
میں گھر میں چھوٹی ہوں اس لیے میرا دل بہت چھوٹا ہے اور
میں بہت حساس بھی ہوں۔ میں سب سے پہلے یہ سلسلہ
پڑھتی ہوں۔ لڑکی کا گھر کون سا ہوتا ہے۔ بچے والے کہتے
ہیں کہ لڑکی پرانی ہے۔ اور سسرال والے کہتے ہیں پرانے
گھر سے آئی ہے۔ تو اللہ نے لڑکی کس گھر کے لیے بنائی ہے؟

ج : اوہ پیاری سی چھوٹی سی حننی! اتنی بات سمجھ لیں
کہ لڑکی ہو یا لڑکا۔ انسان کو اللہ نے اپنے لیے بنایا ہے اور
یہ پوری دنیا اللہ نے آپ کے لیے بنائی ہے پھر اس کے چکر
میں نہ پڑیں۔ کہ گھر کس کا ہے کس کا نہیں ہے یہ دنیا کسی
کا گھر نہیں ہے۔ بس تھوڑی دیر کے لیے یہاں آتے ہیں۔
اس اصلی گھر کی فکر کریں جہاں ہمیشہ رہیں گے۔

شازیہ الطاف ہاشمی نے شجاع آباد سے لکھا ہے

ایک چپ سو سکھ۔ سیاحت یا سمین جی ویل ڈن! بہت
بڑھیا بھی! ہاجرہ رحمان کی تحریریں مجھ سے زیادہ اشتیاق
سے اور کون پڑھتا ہو گا (بتائیں ذرا) چھپا کے چھپی کچھ
عجیب نہیں بھلا؟ پیال ساڑھاؤ ناکس۔ ایمل جی تم جیو
ہزاروں سال۔ غزلوں میں ناصر زیدی بھر لے گئے موسم
کے پکوان خالدہ جی! کبھی شامی ٹکیوں کی مختصر سی ترکیب
ضرور دیں کیونکہ مجھے ٹکیاں بھی بنانی نہیں آتیں۔
پچھلی تحریروں کا جواب خاموشی میں ہے تو خاموشی کا وہی

آپ کے خطوط کی ہماری نظر میں بہت اہمیت ہے بس
صفحات کی مجبوری آڑے آئی ہے۔

شمرین حبیب لکھتی ہیں

شرخطا۔ ایک بہت بہت عمدہ تحریر نایاب کی۔ مگر میں
ان تین دوستوں میں کنفیوز ہو گئی ہوں بہت مشکل سی
ہو رہی ہے کہ کون کہاں سے آیا۔ کس کی منگنی کون دکھی
کون غصے میں؟

افسوس مشہدی نام بھی پیارا اور کام بھی۔ آجکے واقعی
ایک اچھی ماں ہے۔ اور وہ جو ہجروالم کا مارا لڑکا ہے۔ جانے
دنیا کے جیل خانے سے افسوس مشہدی کے دل کے قید
خانے کو چٹنا۔ کیا وہ مرجائے گا؟ اگر ایسا ہوا تو شرخطا پر ان
ہو جائے گا۔ اس بندے کے بنا اور ابھی تو کہانی بھی
ادھوری ہے۔ اسے کون کھل کرے گا۔

نایاب کے کردار بہت شدت پسند ہوتے ہیں اور یہی
ان کے ناول کا حسن ہوتا ہے۔ نایاب نے پہلی قسط میں
ظہران کے ایئر پورٹ پر گرمی کا جو نقشہ کھینچا تھا۔ بہت عمدہ
تھا۔ گرمی کی حدت کو اتنے رنگوں میں بیان کرنا ایک اچھے
رائٹر کی پہچان ہے۔ شرخطا ایک اچھا ناول ہے۔ آگے دیکھتے
ہیں کیا نسخہ اختیار کرتی ہے کہانی۔

ج : پیاری شمرین! کہانی ابھی شروع ہوئی ہے۔ اگرچہ
کہانی کے بارے میں پہلے سے بتانے سے لطف کرکرا ہو
جاتا ہے لیکن آپ کا کہنا صحیح ہے کہ تینوں دوستوں کے
کردار بہت اچھے ہوئے ہیں اس لیے وضاحت کر دیتے
ہیں۔ ان تینوں دوستوں کے نام حریر، مدید اور فلاح ہیں۔
مدید اور فلاح دوست ہونے کے ساتھ ساتھ رشتہ دار بھی
ہیں۔ فلاح کا نکٹ ہے۔

مطلب ہے ناں جو آپ نے اس شمارے میں ماہوش طالب کو دیا ہے اگر آپ نے جواب نہ دیا تو میں نے یہی سمجھا ہے۔

ج : پیاری شازیہ ! آپ کے بہت سارے افسانے موصول ہوئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ابھی پڑھے نہیں گئے۔ کچھ قابل غور ہیں یعنی ان کے شائع کرنے کا فیصلہ نہیں ہوا۔ اس لیے ہماری خاموشی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کی تحریریں ناقابل اشاعت ہیں۔ چھپا کے چھٹی پانی میں پیر مارنے کی آواز کو کہا ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فرخ ناز آبرو نے ضلع مکیانہ گجرات سے لکھا ہے

آپ سب نے مجھے بھولی بیری یاد کی طرح فراموش کر دیا۔

اس دفعہ ٹائٹل پر صحت مندی بھرے بھرے رخساروں والی ثناء امجد سیدھی پسند کی سند پانگنی۔ یار بیک گراؤنڈ کلر فل دیا کریں نا "سیاہ حاشیہ" جلدی جلدی سمیٹا گیا۔ "خواب شیشے کا" موضوع اولڈ اولڈ (ذاتی رائے) "شہر خطا" اکٹھا کر کے پڑھوں گی۔ یہ خط خصوصاً "خصوصاً" نوال میرز کے لیے لکھ رہی ہوں اس دفعہ کی بھی بہت اچھی تھی۔ فرزانہ کھل زبردست۔ بصرہ جلدی جلدی میں لکھا ہے دل میں نشانی برقرار ہے۔

ج : پیاری فرح ! اتنی جلدی کا ہے کی تھی۔ اطمینان سے بصرہ کرتیں خط کا شائع ہونا اتنا اہم نہیں جتنا ہمارے لیے آپ کی رائے جاننا ہے۔ اور بھولے کہاں ہیں بس مصروفیات ہمیں بھی سر اٹھانے کا موقع نہیں دیتیں ورنہ اس وقت بھی کتنے ہی نام ذہن میں گردش کر رہے ہیں جنہوں نے خط لکھنا بند کر دیے ہیں۔ کسی ایک کا نام بھی لکھنے سے چوک گئے تو پھر انہیں شکایت ہوگی ویسے اتنے قلیل وقت میں یہ جو خط کے آخر میں آپ نے گل بوٹے بنائے ہیں اچھے لگے۔

عظمیٰ شفیق نے جزائوالہ سے لکھا ہے

دلکش سا سرورق بہت اچھا لگا۔ خاص طور پر ماڈل کا ڈریس۔ تصویر "نا تاجوڑا" کے اوپر یقیناً "کوثر خالدہ جی اور ان کی نندی ہیں شناسا لگیں گیلانی محلہ پانچ منٹ کا راست ہے یہاں سے شاید اس لیے دیکھا ہو۔ نرسن علیم جی کے

جوابات بالکل بچے لگے۔ کوثر خالدہ جی ایک طرف آپ کا کہنا کہ کاش میں غصہ پینا سکھ لوں اور آپ کا المیہ یہ کہ آپ کسی پر غصہ ہو ہی نہیں سکتیں یہ تو کھلا تضاد ہے۔ کچھ قاری بہنوں کا یہ لکھنا۔ میری پہلی اور آخری خواہش یا پھر میرا پہلا اور آخری خط۔ یہ کیسی بلیک میلنگ ہے بھئی؟ مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی یہ بات۔

اس ماہ راشدہ رفعت کا افسانہ بہترین تھا۔ شمن کی مائی جان کا گھر انہ مجھے بھی اچھا لگا۔ ماورا خان کا افسانہ گھسا پٹا تھا۔ قانتہ راجہ اور حاجرہ رحمان کے افسانے نارمل لگے۔ ایک چپ سو سکھ افسانہ بظاہر تو اچھا تھا پر عاصفہ کی چپ جیسی چپ تو سراسر ظلم ہے خود پر۔ سائرہ رضا اس پار متاثر نہ کر پائیں۔ انتہائی پھیکا پن تھا ناول میں۔ فرزانہ کھل بزم سجانے میں کامیاب رہیں۔ ثایاب جیلانی کا ناول بس گزارنے لائق ہے۔

سیدہ لوبا سجاد کی شاعری زبردست ہوتی ہے۔ ج : پیاری عظمیٰ ! کہاں تھیں؟ اب ایسی بھی کیا مصروفیت کہ اشعار بھیجتا بھی چھوڑ دیے۔ شمارے بہت اچھا بصرہ کیا آپ نے اور ایک بات ہم پر پہلی اور آخری خواہش یا آخری خط جیسے الفاظ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہمیں تو اپنی ہر قاری بہن بہت عزیز اور پیاری ہے۔

کوثر خالدہ کے تضاد کا جواب وہ خود دیں گی۔ ویسے ہماری نظر میں یہ تضاد نہیں ہے کیونکہ نارمل انسان کو غصہ بھی آتا ہے اور پیار بھی۔ ہاں کسی بھی چیز کو حد سے نہیں بڑھنا چاہیے۔

سمیرا حنا اور انعم سیالکوٹ سے شریک محفل ہیں اس ماہ کا ٹائٹل بہت پیارا تھا۔ "جب تجھ سے نا تاجوڑا ہے" بہت اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ سیالکوٹ اتنا پیارا شہر ہے کبھی اس کا ذکر شعاع میں نہیں کیا آپ نے۔ کراچی کا تو بہت ذکر کرتی ہیں۔ ہماری باجی نے اپنے شوہر سے بڑی جھڑکیاں کھائی ہیں لیکن شعاع بڑھتا نہیں چھوڑا۔ "خواب شیشے کا" "پیاں ساز" "شہر خطا" بہت اچھا جا رہے ہیں۔ اس ماہ کا چھپا کے چھٹی بہت اچھا ناول تھا۔ مکمل ناول زیادہ اور اچھے دیا کریں۔

ج : پیاری سمیرا حنا ! انعم ! اب بھی سیالکوٹی کڑیوں! آپ ضرور ہمیں اپنے پیارے شہر کے بارے میں لکھ بھیجیں ہم شائع کریں گے ویسے۔ علامہ اقبال اور فیض صاحب کی

وجہ سے سالوٹ کا نام ہم دیکھ جاتے ہیں۔ آپ کو پر جا پسند آیا شکریہ۔ مگر آئندہ ذرا جامع بصرے کے ساتھ تشریف لائیے گا۔ باجی کے لیے کیا کہیں ”محبت میں ایسے سخت مقام تو آتے ہی ہیں۔“ اور بھئی کراچی کے بارے میں تو ہم نے کبھی نہیں لکھا، آپ نے کہاں سے پڑھ لیا۔

سیرت امین نے میاں چنوں سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ایک خط شادی سے پہلے لکھا تھا۔ پانچ سال ہو گئے۔ ویسے شعاع سے ناتا تب سے ہے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ اس ماہ سرورق اچھا تھا (فریش سی ماڈل) حمد اور نعت کے کیا ہی کہنے (سبحان اللہ) ”پیارے نبی کی پیاری باتیں“ بہت پیارا سلسلہ ہے ”جب تجھ سے ناتا جوڑا“ اچھا سلسلہ ہے۔ سرین عظیم نے اچھا لکھا (گڈ) زاہد احمد سے ملاقات زبردست رہی ”شعاع“ کے ساتھ ”بھی پیارا سلسلہ ہے ”پیال ساز“ کیا بات ہے بھئی ایمل رضا! الفاظ کا چناؤ زبردست۔ الفاظ کی گہرائی اور شدت بے مثال ”شہر خطا“ اور ”خواب شیشے کا“ زبردست جا رہے ہیں۔ منجھی ہوئی رائٹرز، کمال ناول! ”وہ جب ملے“ زبردست رہا۔ کیا جاوولی قلم ہے! فرزانه کھل نے بھی بہت اچھا لکھا۔ قلم پہ عبور رہا مکمل (خدا داد صلاحیت ہے بھئی یہ) افسانوں میں زرمبنے گل ٹاپ رہا۔ بے وفائی، بے جاہا، رشتے ناتے سب ہی پرفیکٹ تھے اور ایک چپ سو سکھ افسانے کی حد تک ٹھیک تھا۔

ج : پیاری سیرت! افسانے بھیج دیں اس کے لیے اجازت کی کیا ضرورت اور ہاں تیرا خط کب لکھیں گی؟ جب داوی بن جائیں گی؟ جامع بصرے کے لیے شکریہ۔

امید بخاری نے چوک اعظم سے لکھا ہے

شعاع کی اپنائیت اور سب بہنوں کی محبت کا بہت شکریہ کہتے ہیں کہ رانا تو بہت آسان ہے مزہ تو جب ہے کسی کو روتے سے ہنساؤ، جن بہنوں کو میرا احوال اچھا لگا، ان کی محبتیں میرا سیول خون بڑھا گئیں۔ خاص طور پر نادیہ صدیقہ، رضوانہ، فکیل، صبا طارق اور کوثر خالد جی خاص طور پر آپ کے الفاظ تو میرے لیے سند ہیں، ایک ڈگری جو

خود اتنا اچھا لکھتی ہیں۔

ج : پیاری امید! دوستوں کو خط لکھنے کے لیے بھی حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے کیا؟ اور زندگی پہلے ہی اتنی مسالے دار ہے کہ مزید ٹیکھے پن کی ضرورت نہیں۔ ہم تو ویسے بھی میٹھی چیزوں کے رسیا ہیں۔ دو ٹیکھے بول زندگی کو کتنا آسان اور دل کو کتنا ہلکا کر دیتے ہیں، خواتین سے زیادہ کون جانتا ہو گا۔

ناظمہ زیدی چوک اعظم سے لکھتی ہیں

ٹائٹل خوب صورت مگر ناخن ایسے لگے جیسے کوئی جنگلی ہتھیار ہوں، پیاری باتیں دل اور روح خوش کر گئیں۔ ”ناتا“ اچھا تھا بس اپورنج ”خط آپ کے“ زبردست مگر محفل سونی سونی بھی میرے نام کے بغیر ”شعاع“ کے ساتھ ”میں بھی جوابات لکھ کر بھیجنا چاہتی ہوں، بھجوں کیا؟“ ”خواب شیشے کا“ اچھا جا رہا ہے ”پیال ساز“ زبردست میرے اندازے کے مطابق نانو گلاب عالم ہی ہیں۔ آگے دیکھو۔ سانس روک کے پڑھ رہے ہیں بس۔ ام سحری کا چھوٹا سا افسانہ بھی اچھا تھا، کیا ضروری ہے کہ اپنے اولاد سے ہی ٹھوکر لگے بندہ ویسے ہی سنبھل جائے تو ”جب وہ ملے“ ہمیشہ کی طرح شگفتہ سی تحریر، نایاب جی آپ کا ناول کچھ پیچیدہ سا لگا، فرزانه کھل کا ناول بھی دل کی ماروں کو چھو گیا۔ ”رشتے ناتے“ صلہ رحمی کا ننھا سادرس۔ باقی تمام افسانے اچھے تھے جو پڑھے ہیں بقیہ ابھی زیر مطالعہ۔ سارہ علی آپ کا لطیفہ بیسٹ تھا گڈ۔ تاریخ ہمیشہ کی طرح بیسٹ۔ اسامہ اعجاز کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ ویل ڈن جوان، پورا شعاع ہی ہمیشہ کی طرح مزیدار جیسے دال روٹی کے ساتھ آم کا چار۔

ج : پیاری ناظمہ! افسانہ لگ جائے گا۔ باری آتے آتے تھوڑی دیر لگ جاتی ہے۔ شعاع کے ساتھ ساتھ میں ضرور شرکت کریں۔ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

سالانہ خریدار بننے کا یہ فائدہ کیا کم ہے کہ بک اسٹال کے چکر نہیں لگانا پڑتے۔ گھر بیٹھے پر چال جاتا ہے۔

فوزیہ ثمرٹ، ہانیہ عمران اور آمنہ رئیس گجرات سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

سرورق پہلی نگاہ میں دل کو بھگا گیا۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح توجہ کے قابل لگے۔ پیاری باتیں لا جواب ہوتی

ہمیشہ کی طرح جامع اور مکمل ہے۔
جزائوالہ سے کوثر خالد نے محفل کو رونق بخشی ہے،
لکھتی ہیں

کوثر خالد آج بہت خوش ہے کہ حمد و نعت کی کتاب
”حوض کوثر“ مجھ تک رسائی پا چکی ہے اور بیٹا کپور ہے۔
سب سے پہلے یا سمین حقی سے کہتا ہے: ہمیں تو خود
اپنا ”نانا“ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ کچھ پیرا گراف حذف اور
کچھ بے ترتیب ہو گئے تھے۔ کمال ہے ہم تم کے علاوہ کسی
نے اپنی الجھن نہ بتائی۔ واہ بھئی واہ۔ سرورق۔ مجھے تو
اپنی بی بی ہی لگی۔ ”حمد“ فرسٹ کلاس سادہ مگر بہترین۔
نعت پرانی دونوں کو ترنم سے پڑھا۔ نئی جی کی باتیں۔
کھانے کے آداب۔ ایک بات پر ہم نادم ہوئے کہ
موٹاپے کی وجہ سے کبھی ٹیک لگا کر کھاتے ہیں۔ یا اللہ

معافی۔ ”نانا“ سچ تصویر دیکھ کر مزہ آگیا اور سروے پر تبصرہ
کا بے چینی سے انتظار ہے۔ امید ہے یا سمین کو یہ مختصر سا
”نانا“ بھائے گا۔ ”وسنگ“ زبردست۔ اسامہ حیرت انگیز
پاک بچے، زندہ باد، ”چھپا کے چھپتی“ ہائیں یہ کیا نام ہوا؟
بیٹی بولی۔ کوئی گانا ہے۔ بہر حال فرزاند کا قلم رواں اور
دکچپ لگا۔ ”شہر خطا“ ایک بار پھر نایاب کا قلم جولانیوں پر
آیا تھا۔ عرب داستان افسوں نام لکنا پیرا ہے۔ ”خطا آپ
کے“ بے حد دلچسپ ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک کاررواں سا
بننا جا رہا ہے۔ رضوانہ تمہیں بھی ہم فوزیہ کے ساتھ ہی بیٹی
لکھ چکے ہیں۔ ماں بننا مبارک ہو۔ شیمہ جی میں ہی کیا جو
بھی اس محفل میں بار بار شائع ہو خط۔ وہ نام دل و نظر میں
محفوظ ہو جاتے ہیں جیسے سناں۔ ناظمہ ارم سمین عائشہ
انبیہ، حرا وغیرہ ”موسم کے پکوان“ چانپڑائی کی۔ پہلی
بار واہ واہ ہوئی دوسری بار چانپ کا حلوہ بن گیا گل گل کر۔
کل گیس جونہ تھی۔ بھی گھبراہٹ کر رہی ہوں۔ گوشت کچا
پکا کھا جو نہیں سکتی۔

ج۔ کوثر جی! نعت کے مجموعے پر دلی مبارک باد۔ رضای
خوش بختی کہ اس نے ماں کی خوشنودی حاصل کی۔ تبصرہ تو
آپ کا ہمیشہ ہی بے ساختہ اور بے لاگ ہوتا ہے۔ بہت
شکریہ شعاع کی پسندیدگی کا۔ جھٹائی کا سروے اور تصویر مل
گئی۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ شامل اشاعت ہوگی۔ چھپا کے
بھئی جب پانی میں تیز تیز چلا جائے تو اس سے جو آواز نکلتی

ہیں۔ شاہین صاحب نے دل خوش کر دیا۔ زاہد احمد کا انٹرویو کر
گئے۔ قسمت کا دھنی ہے مجھ سے نانا جوڑا ہے۔ واہ جی واہ
کیا بات ہے دونوں مندوں بھانج کی۔ اللہ پاک نظر بد سے
بچائے۔ کوثر جی سے یہ کون کی سادگی میں اک حسن کا
جہاں آباؤ ہے کیا صورت کیا سیرت ہر چیز منفرد اور دلکش
ہے۔ چلو جی کسی دن چنہہ اسپتال گیلانی محلہ ہو ہی
آئیں۔ شعاع کے ساتھ ساتھ میں دونوں بہنوں کے شعر
اچھے لگے۔ پال ساز لا زوال داستان۔ نگار ایک چھوٹی سی
غلطی کا زندگی بھر نادان بھرتی رہی۔ ناقابل فراموش تحریر۔
ٹاولٹ ”شہر خطا“ کرداروں کے اتنے اوکھے اوکھے نام
ہیں اور پھر شاید ماضی حال دونوں ساتھ ساتھ چل رہے
کنفیوز ہو جاتی ہوں ویسے کمائی ہے دل چسپ نایاب
جیلانی اس بار بھی آئیں اور دلوں پر راج کرنے لگیں۔
چھپا کے چھپتی بہت اچھی تحریر تھی۔ افسانے ایک سے

بڑھ کر ایک تھے۔ ام سعدی کا زمینے گل آج کی سچائی کا
بولتا ثبوت ایسی ہی کمائی مجھے بھی آتی ہے۔

مستقل سلسلوں میں شعاع کے ساتھ ساتھ شامل
ہونے کا ارادہ ہے۔ جب نئے گھر شفٹ ہو جائیں گے تب۔

پچھلے ماہ کی شاعری زیادہ اچھی لگی تھی۔ تاریخ کے
جھوکوں سے۔ غدار بیوی ہائے ہائے یہ دنیا تو ازل سے
چالاک لوگوں سے بھری پڑی تھی۔ آئینہ خانے میں واصلہ
جی کے کمینس کچھ پچھلے پچھلے لگے۔

خط آپ کے بہنوں کی خوب صورت محفل جہاں ہر
کسی کو انعام آزادی دی گئی ہے۔ بنت حوا اللہ تمہارے
بھائی کو سدا سلامت رکھے۔ زہبایہ خالد شیمہ اکرم کوثر
خالد بہت بہت شکریہ اتنی محبتوں سے نوازنے کا نوال
افضل گجرات سے کراچی تک کے سفر کی داستان اگلے خط
میں لکھوں ناں۔

ج: پاری فوزیہ! خط تو آپ ہمیشہ ہی بہت اچھا لکھتی ہیں
مگر آپ کی مختصر کمائی پڑھ کر دل کو بہت غمیں لگی۔ بہت
دکھ ہوا دل چھوٹا نہ کریں۔ یہ تو ہر گھر کی کمائی ہے بس اللہ
سے ہی امید رکھیں وہی محنت اور صبر کا صلہ دیتا ہے۔ ان
شاء اللہ آپ کو بھی صبر کا میٹھا پھل ضرور ملے گا۔ اپنی کمائی
افسانے کی شکل میں لکھ کر بھجوائیں تاکہ ہماری طرح اور
لوگ بھی پڑھ سکیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کہ آپ کو اتنی
خوشیاں دے کہ سب دکھ بھول جائیں۔ شعاع پر تبصرہ

اس ناول کو بے حد پسند کیا اور ہمیں تعریفی خطوں لکھے۔ اس ماہ محفل میں یہ تمام خطوط شامل ہیں۔ آپ یقین رکھیں، ہم اس سلسلے میں مکمل غیر جانبدار ہیں۔

کراچی سے تسنیم کوثر نے لکھا ہے

اس دفعہ سائرہ رضا کا ناول جب وہ طے بہت ہی زبردست رہا۔ کیا نایاب ناول لکھا ہے۔ نازک اندام اور انخس کا نام پڑھتے ہی پچھلی کہانی فوراً یاد آگئی۔ ”چھپا کے چھپی“ فرزانہ کھل کا ناول بھی ماشاء اللہ اپنے نام کی طرح اچھوتا، پیارا سا شاہکار ناول لگا اور ”پیال ساز“ تو دھماکا ناول ہے۔ اس جیسا خوب صورت ترین ناول ہم نے کبھی نہیں پڑھا۔ ایمل رضا کو بہت دعائیں اور مبارکباد۔ صاحت یاسمین کا افسانہ ”ایک چپ سو بسکھ“ نصیحت آمیز کہانی تھی۔ راشدہ رفعت نے اپنی چھوٹی سی کہانی میں عمدہ پیغام دیا ہے۔ ”خواب شیشے کا“ معذرت کے ساتھ اس میں دل نہیں لگ رہا۔ اس کے علاوہ شہر خطا میں بھی مزا نہیں

آ رہا۔ ”زرمینے گل“ اچھا ہے مگر اس کا اینڈ سمجھ میں نہیں آیا۔ ماورا خان کا ”مجھے چاہا“ بے حد اچھا افسانہ تھا۔ ”رشتے ناتے“ بس گزارا تھا۔ ”تاریخ کے جھروکوں“ میں بہت پسند آیا۔ ”پیارے نبی کی پیاری باتیں“ تو شعل کی شان اور جان ہیں۔

ج۔ پیاری تسنیم! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا پچھلا خط شامل نہ ہو سکا۔ شعل کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔

عائشہ ریاب کراچی سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

سرورق ماڈل بہت ہی پیاری لگی۔ بہت ہی خوب صورت انداز تھا۔ کافی عرصے بعد کوئی نیا چہرہ آیا ہے۔ ناول ”خواب شیشے کا“ دلچسپیوں سے بھرپور، کبیر مپاں! کون ہیں بھئی؟ جلدی سے اس راز سے بھی پردہ اٹھائیں۔ برائے مہربانی ترمین کو بھی ایک ہیرو دلا دیں، تاکہ اس کی منفی سوچوں میں کمی واقع ہو۔ ”پیال ساز“ کہانی بہت خوش اسلوبی سے اختتام کی جانب رواں دواں ہے۔ اس قسط میں جتنے بھی انکشافات ہوئے ہیں، سب ہی یونیک تھے۔ زل اور باسل کو جدا نہیں کیجئے گا۔ ”وہ جب طے“ سائرہ رضا کا نام پڑھتے ہی دل خوش ہو گیا، لیکن اس بار انہوں نے پورا حق ادا نہیں کیا۔ ”شہر خطا“ کہانی بہت اچھی ہوئی ہے، کوئی

ہے اسے چھپا کے چھپی کہتے ہیں۔ ایک انڈین گائے میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے لیکن فرزانہ نے اس ناول کو گائے پر نہیں لکھا تھا۔

عائشہ جمالیگیر مرالی نے کبیر والا سے لکھا ہے

ایمل رضا کا ”پیال ساز“ بہت ہی اچھا جا رہا ہے۔ بہت ہی منفرد لکھا ہے ایمل رضا نے۔ عفت سحر طاہر کا ”خواب شیشے کا“ بھی بہت ہی اچھا ناول ہے۔ آپ سے پوچھنا تھا کہ اگر ہم کوئی شعر بھیجیں تو وہ اس ماہ کے رسالے میں شائع نہ ہو۔ تو کیا اگلے ماہ کے رسالے میں شائع ہو جائے گا یا دوبارہ بھیجنا ہوگا؟

ج۔ شعر دوبارہ بھجوانے کی ضرورت نہیں۔ ہم شعر محفوظ رکھتے ہیں، لفافے پر سلسلے کا نام لکھنا بھی ضروری نہیں۔

صبا خان مہلول پور سے لکھتی ہیں

ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ مجھے جانے کیوں ایسا لگنے لگا ہے کہ اس ادارے نے بھی لکھاریوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ حالانکہ میں نے ہمیشہ آپ لوگوں کو غیر جانب دار جانا مگر اب کیا ہو گیا ہے۔ بعض لکھنے والوں کے عام سے افسانوں اور ناولز کی بھی بے جا تعریف چھاپی جاتی ہے، صرف اس وجہ سے کہ یا تو وہ مذہب پر لکھتے ہیں۔ یا بے جا قسم کی مشکل زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ کچھ صرف منظر نگاری کرتے ہیں۔ ان کے ہاں کہانی کا پلاٹ بہت کمزور ہوتا ہے، پھر بھی انہیں بلاوجہ کی پبلیٹی ملتی ہے مگر کچھ بہت اچھا، سادہ اور بہترین لکھنے والوں پر کی گئی ایسی ایسی تنقید کو چھاپا جاتا ہے جو میرے حساب سے تنقید کے زمرے میں نہیں آتی۔ کیا آپ لوگوں نے بھی اپنے رائٹرز کو دو قطاروں میں تقسیم کر دیا ہے۔

ج۔ پیاری صبا! ہماری قارئین ہمیں جو خط لکھتی ہیں۔ ہم اس میں کوئی ردوبدل نہیں کرتے، ہم نے خطوط کا سلسلہ آپ کی بے لاگ رائے شائع کرنے کے لیے شروع کیا ہے۔ قارئین جن کہانیوں کی تعریف کرتی ہیں۔ ان کا موضوع ہمیشہ مذہب نہیں ہوتا، نہ ہی ہمیشہ مشکل الفاظ پر مبنی کہانیوں کی تعریف ہوتی ہے۔ اس بار فرزانہ کھل کا ناول بہت سادہ اور عام سے موضوع پر تھا۔ اس میں مشکل الفاظ بھی نہیں تھے۔ ہماری تقریباً ”سب ہی قارئین نے

ج - پیاری عاقلہ! خوش ہو جائیں۔ ایمل نے زل اور باسل کو جدا نہیں کیا۔ شعاع کی پسندیدگی اور جامع تبصرے کے لیے شکریہ۔

مسرت الطاف کراچی بے لکھتی ہیں

اس بار بھی شعاع کے ہاتھ میں آتے ہی پھکی مسکراہٹ نے میرے لبوں کا احاطہ کیا کبھی کبھی مجھے ایسے فیل ہوتا ہے جیسے میری تحریروں کو انتہائی مجبوری کے تحت شائع کیا جا رہا ہے۔ اکتوبر کا ٹائٹل بہت زیروست تھا ڈریسنگ اور میک اپ تو دل کو چھوٹا ہوا محسوس ہوا "رقص بسک" ایک بار پھر غائب دیکھ کر دل پر صبر کر لیا۔ "خواب شیشے کا" مائی موسٹ فیورٹ ناول "جب ہم ملے" سارہ

سرا ہاتھ نہیں آ رہا ہے۔ لیکن بہت اسٹرائک سی کہانی ہے۔ "چھپا کے چھپی" بہت ہی زیروست کہانی تھی۔ "جیش تو ایسے" شمن کی تائی نے بہت ہی زیروست بدل لیا۔ "رشتے ناتے" مجھے چاہا بہت اچھی لگی۔ "بے وفائی" بالکل پسند نہیں آئی۔ کبھی پٹی آدمی ادھوری کہانی لگی۔ شوہر صاحب نے نہ کبھی نفرت کا اظہار کیا نہ کبھی تعلق توڑنے کی دھمکی دی۔ خالہ جان نے بس آنا "فانا" طلاق کے کاغذات پکڑا دیے کوئی ساس اتنی اچھی نہیں ہوتی۔ اولاد کے لیے محبت ہر ماں کی دل میں بہو سے زیادہ ہوتی ہے۔

قارئین متوجہ ہوں!

- 1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔
- 2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔
- 3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
- 4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
- 5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپس ممکن نہیں ہوگی۔
- 6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
- 7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع

37- اردو بازار کراچی

ج - پیاری مسرت! ذرا مجبوری کی وضاحت بھی کر دیتیں۔ ہمیں بھی تو پتا چلے کہ خط شائع کرنے کے لیے ہمیں کون سی مجبوری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہاں خط نہ شائع کرنے میں یہ ہماری مجبوری ہے کہ صفحات بہت محدود ہوتے ہیں۔ لکھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

ماہنامہ خواتین، ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نیوی جیسٹس، ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پیش سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔

قلعہ کجھوگولہ

عدل کا کرشمہ

پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ معبد کا چوکیدار ہے۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ کئی غلام گردشوں سے گزرنے کے بعد کاہنوں کے سردار کے سامنے جا پہنچا۔ ان کو کسی نے نہیں دیکھا ہوا تھا۔ وہ معبد سے نہیں نکلتے تھے۔ بہت کم لوگ ہی ان سے ملاقات کیا کرتے۔ اس ملک کے حقیقی حکمران یہی کاہن تھے۔ کوئی بھی ان کی مخالفت کی جرات نہ کر سکتا تھا۔ لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ ان کی حکم عدولی دراصل خداؤں کی نافرمانی کے مترادف ہے اور ایسے لوگ لعنت کے مستحق ہوں گے۔

سمرقند کی ایک گہری سردرات میں ایک شخص اپنے گھر سے نکلتا ہے، چاروں طرف گھپ اندھیرا ہے۔ اس کا رخ شاہی محل کی طرف ہے۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اندھیرے میں راستہ تلاش کرتا بالآخر محل کے قریب جا پہنچتا ہے۔ اس کے ایک جانب معبد ہے۔ اس کے دروازے پر ایک بہت بھاری پتھر رکھا ہوا ہے جس میں مورتیاں کھدی ہوئی ہیں۔ اس پر رعب طاری ہے۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ معبد میں داخل ہونے والا ہے۔ اس سے پہلے اس کو کبھی یہ موقع میسر نہیں آیا۔

نوجوان نے دائیں بائیں دیکھا۔ کاہن ایک صف میں کھڑے تھے۔ اس نے بڑے کاہن کی طرف اپنے کان لگا دیے وہ سمرقند کی تاریخ اور اس کا ماضی بیان کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ کس طرح مسلمانوں نے اس ملک پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس نے نوجوان سے کہا۔ ”ہم نے اس قبضے کے خلاف کتنی ہی ناکام کوششیں کیں مگر ان کا اقتدار تدریجاً پکا ہوتا جا رہا ہے۔ اب ہم ترب کا پتا پھینکنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم نے سنا ہے کہ اس قوم کا بادشاہ نہایت عادل شخص ہے وہ دمشق میں رہتا ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کے پاس اپنا ایجنسی بھیجا جائے اور ہم اپنی شکایت ارسال کریں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اس بارے میں کیا کرتا ہے۔ چونکہ تم عربی زبان سے واقف ہو، لہذا ہم نے تمہیں منتخب کیا ہے۔ تم نہایت ذہین اور دلیر بھی ہو۔ گفتگو کا فن جانتے ہو۔ کیا تم اس کام کے لیے آمادہ ہو؟“

یہ بھاری بھر کم نوجوان بزدل نہیں بلکہ نہایت بہادر شخص ہے۔ اس کا قد خاصا لمبا ہے۔ نہایت ذہین و فطین ہے۔ سوچ اور فکر بلند ہے وہ نہایت مدبر ہے۔ مقامی زبان تو اس کی مادری ہے مگر اس میں ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ اس کو عربی زبان پر عبور حاصل ہے اور وہ فر فر عربی زبان بولتا ہے۔ اسے معبد کے سب سے بڑے عمدے دار نے ملاقات کے لیے بلوا رکھا ہے۔ اس ملاقات کے شوق اور خوف نے اسے ایک عجیب کیفیت میں مبتلا کر رکھا ہے اس کا جسم کانپ رہا ہے۔ اس معبد میں بہت کم لوگ داخل ہو سکتے ہیں اور جو اس کے ذمہ داران ہیں وہ بس ایک مرتبہ اندر داخل ہوتے ہیں اور پھر ساری زندگی ان کو سورج کی روشنی نصیب نہیں ہوتی۔

وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتا گیا۔ اس کے لیے دروازہ کھول دیا گیا۔ اگلے کمرے کے وسط میں اس نے ایک عظیم الجثہ شخص کو دیکھا۔ اس کی سفید لمبی داڑھی تھی۔ اس نے اس کو اس کے نام سے پکارا اور اپنے

نوجوان نے اثبات میں سر ہلادیا۔

بڑا کاہن کہنے لگا۔

”پھر فوری طور پر اپنے سفر روانہ ہو جاؤ۔ تمہیں

زادراہ وافر مہیا کر دیا جائے گا۔“
نوجوان وہاں سے نکلا تو خوشی اور مسرت اس کے
چہرے پر عیاں تھی۔ آج سب سے بڑے کاہن نے
مجھے شرف باریابی بخشا ہے۔ مجھے ایک عظیم مشن کے
لیے منتخب کیا ہے۔ اب وقت ہے کہ میں اپنی
صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکوں۔

اس شخص نے مسکراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔
”نہیں“ اجنبی دوست! یہ تو اللہ کا گھر ہے، یہ مسجد ہے۔
”کیا تم نے نماز پڑھ لی ہے؟“
”نماز۔ میں کیسے نماز ادا کر سکتا ہوں؟ میں تو سمرقند
کے کاہنوں کے دین پر ہوں۔ اس دین کو کاہنوں کے
علاوہ کوئی نہیں جانتا اور وہ اسرار سے بھرا ہوا ہے۔“

اس نے پوچھا، تمہارا دین کیا ہے؟
کہنے لگا۔ ”میں سمرقند کے کاہنوں کے دین پر
ہوں۔“

”سوال ہوا۔“ ان کا دین کیا ہے؟“
”جواب ملا۔“ مجھے معلوم نہیں۔“

سوال ہوا۔ ”پھر تمہارا رب کون ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”معبود کا خدا۔“

اب اس نے اگلا سوال کیا۔ ”اگر تم اس سے مانگو تو
کیا تمہیں عطا کرتا ہے اور اگر تم بیمار ہو تو تمہیں شفا
دیتا ہے؟“

”کہنے لگا۔ مجھے معلوم نہیں۔“

اس شخص نے موقع غنیمت جانا کہ ایک شخص
شکل و صورت سے ذہین و فطین ہے، اجنبی ہے۔ اس کا
کوئی دین اور مذہب نہیں، اس کو دین کے اصول بتائے
جائیں۔ چنانچہ اس نے اسلام کی خوبیاں بیان کیں اور
پھر چند لمحوں کی بات تھی، اس سمرقندی کے دل کا غبار
چھٹ گیا اور اس نے کلمہ توحید پڑھ لیا اور دین اسلام
میں داخل ہو گیا۔

اب اس شخص نے اپنے اس نو مسلم بھائی سے
کہا۔

”چلو ہم امیر المومنین سے ملنے کے لیے چلتے
ہیں۔ ہر چند کہ یہ وقت انہوں نے گھر والوں کے لیے
مقرر کیا ہوا ہے، پھر بھی وہ بڑے متواضع ہیں۔“

مسجد سے نکل کر وہ گلی میں آئے نہایت ہی سادہ
سے دروازے کی طرف اشارہ کر کے اس نے بتایا کہ یہ
امیر المومنین کا گھر ہے۔ اس کو تعجب ہوا۔ اس کا خیال
تھا کہ بڑا عالی شان محل ہو گا۔ مگر یہ تو معمولی گھر ہے۔

وہ گھر واپس آیا اور سفر کی تیاری کرنے لگا۔ معبود کی
طرف سے اس کو زادراہ وافر مقدار میں مہیا کر دیا گیا۔
اس کا تیز رفتار گھوڑا اس کے ہمراہ تھا۔ وہ اس پر سوار
ہوا اس کا رخ بخارا کی طرف تھا۔ وہ مہینوں کا سفر ہفتوں
میں طے کرنا طلب پہنچ گیا۔ دمشق اس کی آخری منزل
تھی جواب بالکل قریب تھی اور وہ دن بھی آیا جب وہ
دمشق میں داخل ہو رہا تھا۔

دمشق جو مسلمانوں کا دار الخلافہ تھا، ان کی عظمت کا
نشان، بہت بڑا شہر، نہایت صاف ستھرا، تہذیب یافتہ
تھا۔ اسے یہ سمرقند سے کہیں بڑا نظر آیا۔

وہ ایک سرائے میں اترا اور اس کے مالک سے پوچھا
”امیر المومنین سے ملنے کا کیا طریقہ ہے؟“

سرائے کے مالک نے کہا ہمارے امیر المومنین سے
ملنا نہایت آسان ہے۔ تم مسجد کی طرف چلے جاؤ۔
وہاں کسی بھی شخص سے ان کے گھر کا راستہ پوچھ لیتا۔
وہاں کوئی پہرے دار نہیں ہے، نہ ملاقات پر کوئی پابندی
ہے۔“

وہ مسجد میں داخل ہوا۔ ایسی خوب صورت عمارت
اس نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ اس نے خیال کیا
کہ یہی شاہی محل ہو سکتا ہے، چنانچہ اس نے ایک
شخص سے پوچھ ہی لیا۔ اس کے لہجے اور شکل سے
معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اس شہر میں اجنبی ہے۔ اس شخص
نے کہا۔

”کیا تم قصر خلافت کے بارے میں جانا چاہتے
ہو؟“

”مگر کیا یہ قصر خلافت نہیں ہے؟ اس نے تعجب
سے پوچھا۔“

اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ خلیفہ عادل عمر بن عبد العزیز نے اس کا حال پوچھا اور آنے کا مقصد معلوم کیا۔

”بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“

اس نے کہا ”عظیم سپہ سالار قتیبہ بن مسلم نے ہمارے ملک پر قبضہ کیا ہے۔ یہ دھوکے سے قبضہ ہوا ہے نہ تو اعلان جنگ ہوا اور نہ ہمیں اسلام کی دعوت دی گئی ہمارے ساتھ ظلم ہوا ہے۔“

عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ فرماتے لگے ”اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ظلم کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ ہمیں عدل و انصاف کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔“

پھر آواز دی۔ ”اے غلام! کاغذ اور قلم لایا جائے۔“ غلام کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لے کر حاضر ہو گیا۔ اس پر دو سطریں لکھیں ”اس پر مہر لگائی“ پھر اس کو سر بمہر کر کے سمرقند سے کہا کہ

”اسے اپنے شہر کے حاکم کے پاس لے جاؤ۔“

سمرقندی واپس ہوا۔ اب اس کا سینہ توحید کے نور سے بھرا ہوا تھا۔ جہاں جاتا وہاں سیدھا مسجد میں داخل ہوتا۔ نماز پڑھتا اور اپنے مسلمان بھائیوں سے ملاقات کر کے اپنی منزل کو روانہ ہو جاتا۔ سفر کی ایک عجیب لذت تھی۔ اب اس کے لیے کوئی شخص اجنبی تھا نہ وہ دوسروں کے لیے اجنبی۔ وہ جس مسجد میں نماز ادا کرتا، لوگ اس کی طرف دیکھتے۔ اس کی شکل و شباہت سے پتا چل جاتا کہ وہ مسافر ہے۔ اس علاقے کا رہنے والا نہیں ہے۔ اور پھر نمازیوں میں اس کی مہمان نوازی کے لیے سبقت لے جانے کی کوشش ہوتی۔ ہر کوئی اسے اپنے گھر میں لے جانے اور اس کی ضیافت کرنے کے لیے اصرار کرتا۔ اب اس کو مسجد کی اہمیت اور اس دین حنیف کی بے شمار خوبیوں کا ادراک ہو چلا تھا۔ پھر ایک دن آیا جب وہ سمرقند میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ سیدھا مسجد کی طرف گیا۔

اس نے کاہنوں کو رپورٹ دی تھی۔ ان کو

مسلمانوں کے خلیفہ کے جواب سے مطلع کرنا تھا۔ وہ معبد میں داخل ہوا۔ اب وہ اس کی تاریک گلیوں اور غلام گردشوں سے خائف نہیں تھا۔

پتھروں سے بنے ہوئے بت جو کبھی اس کے لیے معبود سے کم نہ تھے، اب ان کی حقیقت سے واقف ہو گیا تھا۔ یہ بت تو باتھوں سے بنائے ہوئے تھے۔ کسی کاریگر کے ہاتھوں کا کمال نہ نفع و نقصان کے مالک اور نہ اپنے آپ کو کھٹاڑے کی ضرب سے بچا سکنے والے۔ وہ ان پر ایک حقارت کی نظر ڈالتا ہوا بڑے دروازے پر جا پہنچا۔ دربان اس کو خوب پہچانتا تھا اور پھر اس کے لیے دروازے کھلتے چلتے گئے اور وہ چند منٹوں کے بعد بڑے کاہن کے سامنے کھڑا تھا۔ کاہن کو اسے دیکھ کر

اعتبار نہ آیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کو قتل کر دیا گیا ہو گا۔ مگر ان کا اپنی ان کے سامنے کھڑا تھا۔

اس نے ان کے سامنے تفصیل سے سفر کے حالات بیان کیے۔ کیسے گیا، کہاں کہاں سے گزرا۔ اپنا اسلام لانے کا واقعہ وہ جان بوجھ کر گول کر گیا۔ خلیفہ سے ملاقات اور حکم نامہ حاصل کرنے تک ایک ایک بات ان کے گوش گزار کی گئی۔ کاہنوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھا گئی۔ بشارت ان کے چہروں سے عیاں تھی۔ ہماری آزادی کا وقت آگیا ہے۔ خلیفہ کی طرف سے واضح حکم ہے کہ قاضی کے سامنے اس مقدمے کو پیش کیا جائے۔ کاہنوں کو مکمل آزادی ہوگی کہ وہ اپنے دلائل دیں۔ سپہ سالار قتیبہ بھی عدالت کے کمرے میں کھڑا ہو گا اور پھر قاضی جو فیصلہ دے اس کو نافذ کیا جائے۔“

پھر وہ دن آگیا جس کا اہل سمرقند کو انتظار تھا۔ بے شمار لوگ اس تاریخی مقدمے کی کارروائی سننے کے لیے چلے آئے۔ عدالت مسجد میں لگی ہوئی ہے۔ وہ کاہن جن کو کبھی کسی شخص نے نہ دیکھا تھا، مقدمے کی پیروی کے لیے حاضر ہیں۔ مسلمانوں کا سپہ سالار امیر قتیبہ بھی حاضر ہے۔ سب کے سب قاضی کے منتظر ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

قاضی نے پوچھا ”کیا تم نے حملے سے پہلے اہل سمرقند کو اسلام کی دعوت دی تھی یا جزیہ دینے پر آمادہ کیا تھا یا دونوں صورتوں میں انکار پر لڑائی کی دعوت دی تھی؟“
”نہیں ایسا تو نہیں ہوا۔“ سپہ سالار نے جواب دیا۔

”تو گویا آپ نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا۔“
اب آگے قاضی کے الفاظ پر غور کریں۔

”اللہ رب العزت نے اس امت کی مدد اس لیے کی ہے کہ اس نے دین کی اتباع کی اور دھوکا دہی سے اجتناب کیا۔ اللہ کی قسم! ہم اپنے گھروں سے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلے ہیں ہمارا مقصد زمین پر قبضہ جمانا نہیں ہے۔ اور نہ حق کے بغیر وہاں حکومت کرنا ہمارا مقصد ہے۔ میں فیصلہ دیتا ہوں کہ مسلمان اس شہر سے نکل جائیں۔ اور شہر اس کے اصل باشندوں کو واپس کریں۔ پھر ان کو دعوت دین دیں، جنگ کا چیلنج دیں اور ان سے لڑائی کا اعلان کریں۔“

اہل سمرقند اور کاہنوں نے اس فیصلے کو سنا، ان کے کانوں اور آنکھوں نے جو سنا اور دیکھا اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے سوچا ہم کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہے۔ قاضی نے حکومت کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ بہت سوں کو تو پتا ہی نہ چلا کہ عدالت بر خاست ہو چکی ہے اور قاضی اور امیر روانہ ہو چکے ہیں۔

سمرقندی (مسلم) سفیر بڑی حیرت سے بڑے کاہن کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا ہے۔ وہ گہری سوچ میں مبتلا ہے۔ اس نے اپنی سابقہ زندگی پر غور کرنا شروع کیا ہے۔ اپنے عقیدے کے بارے میں سوچتا ہے، کتنا عجیب و غریب عقیدہ ہے۔ اس کا دائرہ کتنا مختصر اور چھوٹا ہے جو صرف کاہنوں کے درمیان گھومتا ہے؟ اور اب اس کا ذہن دین اسلام کے حوالے سے سوچ رہا ہے۔ اس کا دائرہ کتنا وسیع اور بڑا ہے۔ خیر سے بھرپور عدل و انصاف کرنے والا دین، جس کی بلندیوں کو سورج کی شعاعیں اور چاند کی روشنی بھی چھونے سے قاصر ہیں۔

کاہن کس بات کی امید اور مقدمے لے کر آئے ہیں؟ ذرا غور کیجئے یہ کہ ایک فاتح قوم مفتوح علاقوں سے نکل جائے مقدمہ جس شخصیت پر دائر کیا گیا وہ عظیم قائد اور سپہ سالار ہے۔

نگاہیں مسجد کے دروازے کی طرف لگی ہوئی ہیں کہ کب قاضی داخل ہوتا ہے۔ حاضرین کو بہت زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ ایک چھوٹے قد اور نحیف جسم والا شخص، معمولی لباس پہنے، سر پر عمامہ رکھے ہوئے دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے اس کا غلام ہے۔ لوگوں میں سناٹا چھا گیا ہے۔ بعض نے اپنی انگلیاں منہ میں دبالی ہیں۔

”اچھا یہ ہے مسلمانوں کا قاضی۔ یہ خلیفہ اور سپہ سالار قتیبہ بن مسلم کے خلاف فیصلہ دے گا۔“

قاضی مسجد کے ایک کونے میں اپنی نشست سنبھالتا ہے۔ اس کا غلام اس کے سر پر کھڑا ہے۔ بغیر کسی لقب کے امیر کا نام لے کر اسے بلایا جا رہا ہے کہ وہ عدالت کے سامنے حاضر ہو۔

امیر شہر حاضر ہوا۔ عدالت نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اب غلام کاہنوں کے سردار کو بلوا رہا ہے جو امیر کے ایک طرف بیٹھ گیا ہے۔ اور اب عدالت کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔

قاضی اپنی نہایت پست آواز میں کاہن سے مخاطب ہے۔ ”بتاؤ تم کیا کہتے ہو؟“ کاہن نے کہا۔

”قائد امیر قتیبہ بن مسلم ہمارے ملک میں دھوکے سے داخل ہوئے۔ اعلان جنگ نہیں کیا اور ہمیں اسلام کی دعوت بھی نہیں دی گئی۔“
قاضی نے اب امیر کی طرف دیکھا ”تم کیا کہتے ہو؟“

اس نے قاضی کو دیکھا اور گویا ہوا۔
”لڑائی تو دھوکا ہوتی ہے۔ یہ ملک بہت بڑا ملک ہے، اس کے باشندوں کو اللہ تعالیٰ نے ہماری وجہ سے کفر و شرک سے محفوظ فرمایا ہے۔ اور اسے مسلمانوں کی ملکیت اور وراثت میں دے دیا ہے۔“

گئے۔ اس نے کہا۔
 ہمیں گواہی دے چکا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود
 حق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور
 اس کے رسول ہیں۔“
 اب بڑے کاہن کی یہ کہنے کی باری تھی۔ ”اور میں
 بھی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں
 اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول
 ہیں۔“

اور پھر چشم فلک نے دیکھا کہ سمرقند کی گلیاں اور
 چوک اللہ اکبر کے نعروں سے گونج رہے ہیں۔ لوگ
 جوق در جوق اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ انہوں
 نے گھوڑوں کی باگیں پکڑ لی ہیں۔ اس ملک سے واپس
 مت جائیں۔ ہمیں اسلامی عدل و انصاف کی ضرورت
 ہے۔ ہم نے اپنی کاراج دیکھا ان کے ظلم و ستم سے
 ہم خوب واقف ہیں۔ آپ سب لوٹ آئیں۔ ہم نے
 بھی آپ کے دین کو قبول کر لیا ہے۔“

اور پھر تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ مسلمان
 فوج واپس ایک مفتوح شہر میں داخل ہو رہی ہے۔
 اس طرح سمرقند کی سرزمین میں اسلام کی دولت
 داخل ہو گئی اور پھر کبھی نہیں نکل سکی۔
 (عبدالملک مجاہد)



خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گیسٹ وائر انسٹیکٹو میٹریا

کانیا ایڈیشن قیمت - 750/ روپے

کے ساتھ کھانا پکانے کی کتاب

گھانا خواتین

قیمت 225 روپے بالکل مفت مائل کریں۔

آج ہی 800/ روپے کا مٹی آؤر ارسال فرمائیں۔

وہ آنکھیں بند کر کے کتنی ہی دیر بیٹھا سوچتا رہتا
 ہے۔ اس کا ذہن مسلسل بدل رہا ہے۔ میں کب تک
 اندھیروں میں رہوں گا؟ روشنی تو بڑی واضح ہے۔
 یقیناً ”اسلام عدل و انصاف کا دین ہے۔ اس میں چھوٹا
 بڑا سب برابر ہیں۔ آج عدالت میں سب لوگوں نے
 دیکھا قاضی کے سامنے حاکم کس طرح سرنگوں ہو کر
 بیٹھا تھا۔ کیا ہمارا بادشاہ اس طرح عدالت کے سامنے
 پیش ہو سکتا ہے؟

وہ ابھی اسی غور و فکر میں تھا کہ اسے گھوڑوں کے
 چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ لوگ بازاروں سے
 گزر رہے تھے۔ شور مچا تھا۔ اس نے آنکھیں
 کھولیں۔ آوازوں کی طرف کان لگائے اور پھر اس نے
 اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔
 ”کہ یہ شور کیسا ہے؟“

اسے بتایا گیا کہ قاضی کے فیصلے پر عمل درآمد شروع
 ہو چکا ہے اور فوجیں واپس جا رہی ہیں۔

ہاں وہ عظیم افواج جن کے سامنے مدینہ سے لے کر
 سمرقند تک کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکی جنہوں نے قیصر و
 کسریٰ اور خاقان کی قوتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔
 جو طاقت بھی مسلمانوں کے راستے میں آئی اسے وہ
 خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گئے۔ مگر آج اسلامی
 افواج ایک کمزور سے نحیف جسم کے مالک قاضی کے
 فیصلے کے سامنے دست بردار ہو گئی ہیں۔

کاہن اپنے ساتھیوں کی باتیں سنتا جا رہا تھا اور پھر
 اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

”کیا ہمارا دین باطل اس حق کے سامنے ٹھہر سکے
 گا؟ کیا وہ نور اسلام کا مقابلہ کر پائے گا؟

نہیں ہرگز نہیں۔ رب کا فیصلہ آچکا ہے۔ اس نور
 کے مقابلے میں کوئی بھی نہیں ٹھہر سکتا۔

اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور پوچھا
 ”تمہاری کیا رائے ہے؟ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیا ان کا
 مقابلہ کر سکیں گے؟ وہ سب خاموش رہے۔

”سمرقندی مسلم ایچی نور سے کہنے لگا۔ ”ساتھیوں!
 میرا فیصلہ اور مشورہ سنو۔“ کان اس کی طرف لگ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

✓ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

✓ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

طیبہ سعدیہ عطاریہ مغل۔۔۔ کھٹیا لہ
سیالکوٹ

منٹ بعد اٹھتی ہوں تو نماز فجر اور قرآن پاک کی تلاوت کے بعد بسترہ کرتی ہوں اتنے میں آہستہ آہستہ بھی جاگ جاتے ہیں۔ بھائی مسجد میں امی نماز قرآن کے بعد آتا گوندھتی ہیں ملکی سے مکھن نکالنے کے لیے

ساتھ ہی چائی میں مدھانی چلا دیتی ہیں میں ساتھ سب چیزیں سمیٹتی ہوں برتن دھوئی ہوں آگ جلاتی ہوں چولہے میں (ہم لکڑیاں اور گوبر کے ایلے جو امی ہاتھ سے خود تھاپنے جاتی ہیں حویلی ان پہ آگ جلاتے ہیں) رات کا بچا سالن گرم کیا پھر امی چولہے کے آگے بڑھ کے روٹیاں بناتی ہیں سب ہی پاس بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ پکاتی جاتی ہیں ساتھ جو لڑائی کر رہے ہوں انہیں چمٹا دکھا کے وارن کرتی ہیں۔ کہ نہ لڑو تم لوگ کھانے پہ بیٹھ کے لڑنا تم لوگوں کی عادت ہے۔ یعنی آٹھ بجے تک تبھی ناشتہ کر لیتے ہیں۔

میں ساتھ تھوڑی بہت صفائی بھی کر لیتی ہوں بچے اسکول ابو کام پہ امی حویلی اور باقی کے سارے کام میرے سپرد آ گئے ہی صفائی گھر کی دھلائی برتنوں کی سے فارغ ہو کے آرام لی وی نہیں ہے جو دیکھوں پھر دوپہر کا کھانا جب اسکول سے بچے آتے ہیں۔ تب دے کر ساتھ ہی شام کی تیاری جو کہ مجھے ہی تیار کرنا ہوتا ہے۔ البتہ ساتھ بہن پلپ کروادیتی ہے۔ مرضی سے کھانا تیار ہے۔ سب کھاتے ہیں کچھ دیر بچے پڑھتے ہیں۔ ہم چھت کے صحن پہ چار پائیاں بچھا کے بستر کر دیتے ہیں۔ جس کو جب جب نیند آئے سو جاؤ۔ اور شعلے پڑھنے کا ٹائم جب شعلے آجاتا ہے۔ تو امی کی صلو اتوں کے ساتھ ساتھ ہر کام کے دوران پڑھا جاتا ہے کہ مجھ سے صبر ہوتا ہی نہیں یعنی 2 دن میں پڑھنا جیسے مرضی ہو!

(1) شعلے سے وابستگی تو شاید بچپن سے تھی مگر باقاعدہ نہیں۔ کیونکہ میرے ننھیال میں میری آنٹی پڑھتی تھیں اور جب کبھی امی وہاں جاتیں تو شعلے یا خواتین لے آتیں۔ تو میں میرا رشتہ بس اشعار پڑھنا اچھی اچھی باتیں پڑھنا تصاویر دیکھنا بس پھر جب چارم میں بھی امی حویلی گئی تھیں شعلے پڑھتے پڑھتے رکھ کے گئی تھیں میں نے اٹھا کے دیکھا اور یونہی ایک کہانی پڑھنا شروع کی جو کہ افسانہ تھا۔ جو آج بھی ذہن میں ہے تو مگر نہ تب بھی تھی نہ آج بے ربط سی تھی پھر سمجھ میں تو آئی نہیں کبھی باہر گلی میں جو پھیری والا نمکولے کر آتا ہے چار پانچ شعلے اکٹھے کر کے اسے دیے کہ نمکودے دو تیرہ ہنسنے لگا (باجی دس سال کی بچی اس آدمی کی باجی ہی تو تھی جیسے) میں وہ کتابیں نہیں لیتا جن میں اللہ کا نام ہو۔ میں نے کہا کہ بھائی پکیز لے لو اس میں نہیں ہے اللہ کا نام۔ اس نے کہا باجی بے ادبی ہوئی ہے نہیں لیتا میں میں نے کہا بچے نہ گرا نا آپ بس مجھے تھوڑی سی نمکودے دو۔ یعنی اتنے ترلے متیں کی کہ اس بے چارے کو نمکودیتے ہی رہی۔

بعد میں جب امی کو پتا چلا کہ میں نے شعلے لے لیا ہے۔ تو امی نے وہ صلو اتیں سنائیں اور مار لگائی کہ آج بھی یاد ہے اس کے بعد آٹھویں میں ناول پڑھا مکمل نام یاد نہیں پھر ناننتھ سے باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں اور اب چھ سال ہونے کو ہیں اور اسی طرح واقعات تو بہت سے ہیں۔ مگر اب اسی پہ اکتفا کریں یا رو!

(2) صبح ہمیشہ امی کی آواز سے آنکھ کھلتی ہے۔ آنکھ کھلتے ہی کبھی کبھار اٹھ جاتی ہوں کبھی سستی سی آڑے آجاتی ہے بستر چھوڑنے میں پھر آخر پانچ دس

و قریب موسم ہے کہ اف کی دسلاں۔؟ کیوں سدرہ
 مزے کا ہے نایا شادی سے پوچھوں۔ وہ بھی
 بے چارے پردیس میں تنہا صرف کام کام اور بس کام۔
 کیوں سدرہ تم سے بہتر اور کون سمجھ سکتا ہے جالی۔
 البتہ میری ایسی کوئی یاد نہیں جو مجھے یاد ہو جائے۔
 میری یادداشت (کدی غور ای نہیں کہتا)
 (6) پسندیدہ لطیفہ تو کوئی نہیں نہ (ای کدی غور کہتا
 اے) البتہ اشعار بہت سے ہیں کوئی ایک تو۔!
 سنو!
 تم مجھے دعا دیتے ہو نا کہ

خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے
 جہاں بھی رکھے جس کے ساتھ بھی رکھے
 پھر نہ جانے کیوں۔؟
 اس آخری جملے پر مجھے
 بد دعا کا سا گمان ہوتا ہے۔

(بقول شادی کے)
 کوئی اچھی تحریر پڑھتے ہوئے کئی اقتباس کئی اچھی
 باتیں اچھے جملے نظروں سے گزرتے ہیں جن میں اکثر
 پسل سے نشان لگا دیتی البتہ کوئی ایک۔!
 ”دوسروں کے تجربے سے ہمیشہ سیکھو کہ جب
 انسان خود تجربے سے گزرتا ہے تو نہ صرف سیکھتا ہے
 بلکہ روتا بھی ہے۔“ اور یہاں نہیں کسی ٹاول میں پڑھا تھا
 یہ بہت اچھا لگا اور میں نے لکھ لیا ڈائری میں۔
 ”تم نے کبھی موت کو دیکھا ہے۔ وہ بالکل ایسی ہی
 ہے جیسی زندگی میں تمہارے بغیر گزار رہا ہوں۔ اف
 اور پسندیدہ کتاب بہت سی ہیں۔
 مگر نسیم حجازی کی کتب بہت پسند ہیں پھر ہر اچھی
 اسلامک بک اور اپنی پسندیدہ راسخون کی تحاریر۔
 شازیہ الطاف ہاشمی۔۔۔ شجاع آباد

(1) شجاع سے وابستگی تب سے ہے جب سے میں
 نے پڑھنا شروع کیا۔ اپنی ستائیس سالہ زندگی میں
 میرے خیال میں زندگی کا کوئی لمحہ نہیں گزرا جب میں

کے نقش ہیں۔ جیسے سرسوں کا پھول اور اس میں آئینہ
 کا کردار ضبط حلق، مصحف، نمونہ کاجنت کے پتے
 بھی بہت فنکارانہ تھی اور یارم پھر نمل، من و سلوی
 یعنی کے اتنی تحریریں ہیں اچھی اچھی کہ لکھنے بیٹھوں تو
 کم از کم 2 صفحات تو کالے ہوں گے ہی مگر اب اسی یہ
 اکتفا کریں۔ کہانی پڑھتے ہوئے کوئی کوئی اپنے جیسا لگتا
 ہے کسی کی لہلہانگہ مگر مینوں یاد نہیں تے ہن میں کی
 لکھاں؟ اور میری یادداشت کو داد ملنی چاہیے کہ مجھے
 یہ بھی یاد نہیں کہ کون سی تحریر پڑھ کے میں ابھی ہوں
 خیر جان دے او۔

(4) ایسی بہت سی تعریفیں ہیں جنہیں سن کے خوشی
 ہوتی ہے جیسے کہ میری دادی مرحوم (اللہ انہیں غریق
 رحمت کرے آمین) بقول تم کھانا بہت اچھا بناتی ہو
 آگے جا کے یہی کام آتا ہے عورت کے یعنی گھرواری۔
 پھر میری کزن + دوست سدرہ کی دوست فریحہ ابھی کچھ
 دن پہلے ہی مجھے کہہ رہی تھی کہ آپ میں وفا بہت
 ہے۔ میں نے کہا یہ بات واقعی ٹھیک ہے۔ کوئی مخلص
 ہو تو مجھے دو گنا زیادہ مخلص پائے گا اور جب کوئی دھوکا
 دے تو کہاں کی وفا اور بے وفائی۔! پھر میں دوسروں پر
 جلد اعتبار کر لیتی ہوں جو ٹوٹ بھی جلدی جاتا ہے۔ اسی
 لیے تو اب تنہا پسند ہو گئی ہوں۔ غصہ بہت جلدی
 آجاتا ہے۔ وہ تو میں حج چلا کے نکال لیتی ہوں۔ جب
 غصہ کے ساتھ اور بھی جذبات ہوں دکھ اذیت تو چپ
 رہ کے جلتی کڑھتی رہتی ہوں بقول سدرہ ”تم دل کی
 بہت اچھی اور صاف ہو“ باقیوں کے ساتھ کیسی ہو پتا
 نہیں کیونکہ مجھے ہر بات صاف سچ بتا رہی ہو۔“ (تمہارا
 دیا اعتبار ہے یار! تھینکس) خامی ”تمہیں کوئی بات
 بتانے کا کوئی فائدہ نہیں کہ کوئی بھی بات میرے پیٹ
 میں زیادہ دیر نکلتی نہیں (یار ارج نہ آگے۔ میری بری
 عادت جلد اعتبار کرنے والی خوار کرتی ہے مجھے) بس
 آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ بہت ہو گیا بھئی۔!

(5) اب جب میں یہ جو بات لکھ رہی ہوں تب بھی
 ہلکی ہلکی سی بارش ہو رہی ہے۔ ٹھنڈی سی ہوا آتا

نے کچھ بڑھانہ ہو اور سوچا نہ ہو۔ میرے ابو علم دوست آدمی تھے وہ بھی رسالوں کے شوقین تھے مگر بعد میں نظر کمزور ہونے کی وجہ سے یہ عادت چھوٹ گئی ابو بہت بڑے لکھاری بن سکتے تھے مگر انہیں اس بات کا علم نہیں تھا وقت حالات نے بہت سے پالے پلٹے۔ ابو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے مگر ان کی پڑھنے کی عادت

میں آئی۔ انہوں نے کبھی میرے پڑھنے پر پابندی نہیں لگائی بلکہ وہ چاہتے تھے کہ میں بہت سا پڑھوں اور اچھی پوزیشنز بھی لوں مگر کبھی رفعت سراج، نہت شبانہ حیدر، راحت جبین، کو پڑھتے ہوئے کب سورج زردی میں تبدیل ہوتا تھا، پتا بھی نہیں چلتا تھا ہمارے گھر میں بے شمار جنگلی کتور اور طوطے وغیرہ رہتے تھے (پرانی حویلی کے چیموں میں گھونسلے بنا کر) تو میں ان کتوروں کو تکتی رہتی تھی۔

ایک مرتبہ ایک کتور بیلی سے ڈر کر زمین پر گر پڑا تھا جسے میں نے اٹھا کر پانی پلایا تھا اور پھر علی کو دکھایا تھا۔ ہم دونوں کتنی دیر کتور کو غور سے دیکھتے رہے تھے (علی نہیں یاد ہے) وہ دن وہ لمحے وہ فراغت، فرصت ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ امی کی پیار بھری ڈانٹ ابو کا صافہ اور لسی اور تندوری روٹیاں سب چھوٹا مگر شعاع کا ہاتھ آج تک تمام رکھا ہے۔ وقت ایک سا نہیں رہتا۔

میں جب بھی گاؤں جاتی ہوں ابو سے ملنے جاتی ہوں۔ وہ میرے سامنے مٹی کے ڈھیر کی صورت پڑے ہیں۔ کہنے کو وہ زندہ نہیں ہیں مگر وہ دلوں میں زندہ ہیں۔ کتنے لمحے ریت مٹی اور گرد کی طرح آنکھوں کے سامنے سے اڑ گئے۔ ابو مجھے رسالے لادیتے تھے چیدہ چیدہ سنتے بھی تھے۔ احادیث اقوال وغیرہ۔ گرمیوں کی بھری دوسروں میں پرانی حویلی کی کھوؤں میں کتور سے چھپے بیٹھے ہوتے اور نیچے نیم کی چھاؤں میں ہمیں رسالے پڑھتی رہتی تھی مجھے ہمیشہ سے پکوڑے پختیاں اور نئے نئے پکوانوں کے بجائے بڑھنا اور لکھنا پسند رہا ہے اور یہ شوق اور شہور مجھے شعاع ہی سے ملا

اور بے شمار بے حد و حساب ملا۔ اب بھی پڑھتے رہنے کی عادت باقی ہے اور نبھانے سفر کرتا باقی ہے۔ میکے میں رسالوں کا ڈھیر موجود ہے اور یہاں بھی سنبھل کر رکھا ہوا ہے، روٹی ادلی، فوفی میں بالکل خالی برتن جیسی تھی، مجھے اکثر یاد ہو سکتی تھی۔ میں اسے کہانیاں سننے کی اپنی سی کوشش کرتی تھی مگر وہ نظر انداز کرتی تھی۔ اس کا اپنا طریقہ تھا زندگی جینے کا

میرا اپنا مگر میری اور اس کی دوستی مثالی تھی۔ جو آج تک کسی ہی ہے اللہ اسے ہمیشہ آباد رکھے۔ (آمین)

(2) روز و شب کوئی خاص نہیں ہیں۔ صبح کی نماز پڑھنے کی پوری کوشش کرتی ہوں، کبھی کامیاب بھی ناکام۔ پھر ناشتہ، میاں ملتان اسپتال کورٹ میں ریڈر ہیں وہ دفتر روانہ ہوتے ہیں بڑی بیٹی فاطمہ زہرا ٹوٹیں ہے وہ اسکول روانہ ہوتی ہے پھر خود ناشتہ کرتی ہوں۔ چھوٹی بیٹی آمنہ الطاف کو کھانا کھلاتی ہوں پھر تھوڑی دیر لیٹ کر رسالے وغیرہ پچھلے دن کا اخبار پڑھتی ہوں۔ اس کے بعد صفائی شروع کرتی ہوں دونوں کمرے اچھی طرح صاف کر کے پونچھا گا کر برتن دھو کر تقریباً ڈھائی گھنٹے لگتے ہیں۔ کپڑے وغیرہ دھوئی ہوں، دوپہر کے لیے سالن چڑھا کر پھر رسالے سنبھال لیتی ہوں اتنی دیر میں فاطمہ زہرا واپس آ جاتی ہے۔ اور آتے ہی پیارا سا سلام بھاڑتی ہے اور بیگ پھینک کر ”چیم“ ”چیم“ والے ڈرامے کا پوچھتی ہے (چینی ڈرامہ) پھر جم کر ہاں بیٹیاں ڈرامہ دیکھتی ہیں کھانا کھاتی ہیں اور آمنہ اور فاطمہ بے چینی سے اپنے ابو کا انتظار کرتی ہیں، میاں صاحب کا خلوص بھرا سلام اور مسکراہٹ دن بھر کی تھکن غائب کر دیتی ہے، بچوں کی بھی اور میری بھی۔

(3) ”زرد موسمِ عمن و سلوی“ اور ”نمو بخاری کے شبلی جواد“ ایک تھی مثال کی بشری اور عدیل اور اب ”جب۔۔۔“ تجھ سے ناتا جوڑا ہے ”ساری بھول ہماری تھی دل کہاں نہیں الجھتا راستہ کانٹوں سے پر ہے اور دل رہی کپڑا۔ دل الجھتا ہے بہت بار الجھا ہے مگر اپنے ارد گرد کے ماحول کو دیکھ کر لوگوں کے رویے دیکھ کر۔

مڑے کی نیند آتی ہے ایسی کہاں آتی ہے مگر (میکے میں) جب بارش ہوتی تھی تو جھاٹو پکڑ کر بارش کے پانی سے فرش دھویا کرتے تھے بارش میں نہاتے تھے اب بھی نہا لیتی ہوں۔ میں اور بچیاں بہت خوش ہوتے ہیں بارش میں بھگ کر۔

(6) محسن نقوی، احمد فراز، مرزا غالب، پسندیدہ شعراء ہیں اور جاوید چوہدری اور اشفاق احمد (بابا جی) بہت پسند ہیں۔ اور یا مقبول جان اور جاوید چوہدری کے کالم شوق سے پڑھتی ہوں۔ پسندیدہ شخصیت رحمت عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ کے متعلق ہر جملہ ہر فقرہ پسند ہے اور کتابوں میں قرآن مجید میں سورۃ یسین بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ شراب کوئی یاد نہیں آ رہا اور نہ ہی اقتباس۔ ایک شعر یاد آ رہا ہے پیش خدمت ہے

جانتی ہے اک دنیا درد دل
جان کر وہ بے خبر ہونے لگے



مصحف

عمرہ و اکرم



قیمت - 350 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، ایڈو بازار، کراچی

ہر کردار جو حساس دل اور محبت سے بھرا ہو محبت کے بدلے محبت مانگتا ہوں وہ کردار میں ہوں۔

(4) ایک مرتبہ میاں کے منہ سے ”شازی تمہاری سوچ کتنی اچھی ہے“ سن کر خوش ہوئی اور ایک پار ابونے کہا تھا (جب 9th میں B گریڈ آیا تھا) شازی تم بہت آگے تک جاؤ گی۔ ”اور میڈم نے بھی تعریف کی تھی ”شازیہ نے محنت کی ہے“ اور میں خوشی سے پھول مٹی تھی۔

خوبی ”سادگی“ ہے جو عذاب بن گئی ہے دنیا میں دہرے چہرے چلتے ہیں اور ہم ایک چہرے کے ساتھ کیا کریں؟ جھوٹے اور گہرے لوگوں سے نفرت کرتی ہوں۔ چاہتے ہیں سب انصاف کریں اور انصاف ملے مگر دنیا شاید جنت نہیں بن سکتی (جنت تو اوپر ہے ناں) ایک اچھی بات یہ ہے پریشان نہیں ہوتی، گھبرائی نہیں اپنا مسئلہ خود حل کرتی ہوں اور کامیاب رہتی ہوں۔ خوش رہتی ہوں اور دوسروں کو بھی خوش رکھتی ہوں۔ حساس بہت بہت زیادہ ہوں۔ جہاں عام آدمی کی نظر نہیں جاتی میں وہاں سے بھی دکھ دھونڈ نکالتی ہوں۔ ایک تعریفی جملہ جو میری جھٹلانی نے کہا۔ (سن لیں جھٹلانی نے کہا ہے)

”شازی بہت سکھڑ ہو۔“ واہ واہ واہ۔

(5) بارش سے محبت کرتی ہوں۔ پہلی بوند گرنے سے لے کر آخری تک غور سے دیکھتی رہتی ہوں ایسا لگتا ہے جیسے دل میں بھی بارش ہو رہی ہو۔ بارش کے بعد کا منظر دل لبھانے والا ہوتا ہے اس موسم میں لوگ چائے کافی پکوڑے کھاتے پیتے ہیں مگر میں چکن پلاؤ بناتی ہوں۔ بارش میں گرما گرم پلاؤ کھانے میں جو مزہ ہے وہ نہ دہلی ہے نہ بخارے نہ چھجو کے چوبارے اور میاں چائے کی فرمائش کرتے ہیں۔ شام کو اکثر مجھے لگتا ہے کہ باہر بارش ہو رہی ہے۔ کن من کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میاں باہر جا کر پتا کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں ”کہاں بارش ہو رہی ہے“ پاگل تو نہیں ہو گئیں بارش کے بعد (اگر رات کو ہوئی ہو یا ہو رہی ہو) جو



کی جوڑی ایک مشہور ڈراما سیریل سے ہٹ ہوئی ہے۔ بھارتی فلم میں کام کرنے کے حوالے سے سب نے کہا کہ ”میری بھارتی فلم ”مام“ بھی شائقین کو بہت پسند آئے گی (اگر وہ ریلیز ہوئی تو کیوں کہ موجودہ حالات میں پاکستانی فنکاروں پر پابندی لگ گئی ہے۔) اس میں ان کا کردار مرکزی نوعیت کا ہے۔ لیکن ہیروئن بن جانا کوئی کمال نہیں (یعنی ہیروئن کوئی اور ہے؟) اگر آپ کی پرکار منس متاثر کن ہو تو کوئی بھی کردار پسند کیا جاسکتا ہے۔ (جی جیسے آپ کی فلم میں چھوٹے بچے کی پرکار منس کی وجہ سے فلم ہٹ ہوئی)

واپسی

پی ٹی وی دیکھنے والوں کو یقیناً ”وہ لڑکی یاد ہوگی جو سونمگ پول میں دوپٹہ پہن کر کود گئی تھی جو سوتے میں بھی سر پر دوپٹا اوڑھتی تھی۔ جی جی، ہم بات کر رہے ہیں عروسہ کا کردار ادا کرنے والی فنکارہ منشی خان کی جنہوں نے اور بہت سے ڈراموں میں کام کیا اور اپنی ایک شناخت بنائی پھر یکدم وہ غائب ہو گئیں پھر کچھ عرصہ قبل وہ واپس تو آئیں مگر ڈراموں میں دکھائی نہ

دیں۔ ان کے بارے میں مشہور کر دیا گیا کہ وہ اداکاری نہیں کرنا چاہتی (تو پھر واپسی۔؟) پھر یہ خبر پھیلی کہ وہ مارننگ شو تک محدود رہنا چاہتی ہیں۔ لیکن پھر اچانک وہ فلم ”جانان“ میں اداکاری کرنی نظر آئیں۔ منشی خان نے اس بارے میں بتایا کہ ”جانان کی ریلیز کے بعد انہیں پی ٹی وی کے ایک ڈرامے میں کاسٹ کر لیا گیا ہے۔ (ہاں جانان سے پہلے کیا پروڈوسرز منشی کو پہچانے نہیں تھے یا۔؟) اور کراچی اور لاہور کے کچھ پروڈیوسرز نے ان سے رابطہ بھی کیا ہے (بھئی ڈراموں)



پرکار منس

ایک ڈراما یا فلم اگر ہٹ کر ہو تو یقیناً ”ہٹ ہوتا ہے۔ سبیل علی نے بھی مختلف ڈراموں میں مختلف کردار ادا کرتے ہوئے اپنی خوب صورتی اور اداکاری سے لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ بیوسی ملک تک ان کی شہرت پہنچ گئی اور انہیں ایک فلم میں سری دیوی کی بیٹی کا کردار دے دیا گیا جس میں عدنان صدیقی سری دیوی کے شوہر بنے ہیں۔ خیر ہم بات کر رہے تھے سبیل کی تو سبیل کی حال ہی میں ریلیز ہونے والی پاکستانی فلم ”زندگی کتنی حسین ہے“ بھی لوگوں کو بہت پسند آئی۔ اب سبیل نے اس کا سہرا اپنی اور فیروز خان کی جوڑی کو دے دیا۔ سبیل کہتی ہیں کہ اس فلم کی کامیابی سے میرا حوصلہ بڑھا ہے (اب وزن مت بڑھا لیتا کیوں کہ۔؟) میری اور فیروز خان کی جوڑی بھی بہت پسند کی جا رہی ہے۔ (یہ تو حقیقت ہے لیکن آپ بھول رہی ہیں آپ دونوں



میں کاسٹ کرنے کے لیے اور کس لیے) اب ہا
نواب کے بعد آپ مشی کو بھی می یا اماں کے کردار
میں دیکھ سکیں گے۔ کیوں کہ۔۔ (خالی جگہ آپ خود پر
کریں ناں۔)

پابندی

لیجے جناب! ہمایوں سعید ایک اور فلم ”میں پنجاب
نہیں جاؤں گی“ کی عکس بندی کا آغاز رواں ہفتے سے شروع
کر رہے ہیں۔ یہ لاہور ٹوکراچی اور کراچی سے لاہور
اور اب پنجاب۔ کیا ہو گیا بھی ایک نام کیا ہٹ ہو گیا
سب ہی اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اور کاسٹ۔۔
مہوش حیات سہیل احمد احمد بٹ اور (اور کیا ہیرو تو
ہمایوں ہی ہوں گے بھی فلم بنانے کا اور مقصد بھی کیا
ہے؟) شامل ہیں بھارتی فلموں پر پابندی نے بارے
میں بات کرتے ہوئے ہمایوں سعید کا کہنا ہے کہ بس
بنیادی طور پر بھارتی فلموں پر پابندی کے حق میں نہیں
ہوں (وجہ۔؟) بلکہ مقابلہ بازی کے حق میں ہوں
(مقابلہ۔؟ کون سا۔؟) البتہ بھارتی فلم پروڈیوسر
ایسوسی ایشن کے پاکستانی فنکاروں پر پابندی عائد کرنے
کے فیصلے کی مذمت کرتا ہوں (کرتے رہیں انہیں کون
کچا روا ہے آپ کی۔ بھی مذمت کی ناں۔) اگر بھارتی
تنظیمیں تعصب پسندی کا مظاہرہ کر رہی ہیں تو ضروری
نہیں کہ ہم بھی ویسا ہی جواب دیں۔ (وجہ۔؟ بھی
جواب نہ دینے کی؟)

ترجیح

اداکارہ سہائے علی ابراہیم کا کہنا ہے کہ ”فلم میں کام
کرنے کے بعد مجھے ماڈلنگ میں جو پذیرائی ملی ہے (وہ جو
آپ نے کیا تھا وہ کام تھا؟) اس کا تصور کوئی آئٹم نمبر
کرنے والی اداکارہ نہیں کر سکتی (یعنی آپ خود کو اداکارہ
نہیں آئٹم نمبر کرنے والی سمجھتی ہیں؟) انہوں نے مزید
کہا کہ نئی فلموں کی آفرز موجود ہیں لیکن میں نے اس
کے باوجود ٹی وی ڈراموں کو ترجیح دینے کا فیصلہ کیا ہے
(بم کی کیا ہے یہ تو۔؟) سہائے ابراہیم نے مزید کہا کہ اب تو

مجھے ٹی وی ڈراموں میں بھی ڈانس پر فارمنس پر مجبور کیا
جاتا ہے۔ (ہائیں۔! ویسے ڈراموں اور پروڈیوسرز کا
نام بھی بتا دیتیں تو۔؟) اس لیے ڈراموں سے بھی دور
ہو گئی ہوں (ویسے مہوش حیات نے بھی آئٹم نمبر کیا تھا
مگر ڈرامے میں۔؟) لیکن ابھی تو آپ نے کہا کہ
ترجیح دی۔ (کیا یہ کھلا تضاد نہیں؟)

ادھر ادھر سے

میڈیا کی ”خدمات“ دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا
مشکل نہیں کہ ”وجہ“ کے آنے پر میڈیا اسے
”انسانیت کا نجات دہندہ“ سے کم لقب نہیں دے گا۔

(سوشل میڈیا)

اسی کے خلاف بات نہیں کرنا چاہنا لیکن سرف
میں جماعت اسلامی کی کردوں گا۔ بس کے خلاف
کریشن کا کوئی الزام تک نہیں ہے
سابق چیف جسٹس افتخار چودھری



WWW.PAKSOCIETY.COM

خالدہ جیلانی

دھجھٹیل چائینز چکن

ضروری اشیاء :

چکن ونگز	آدھا کلو
لسن اور کپا	ایک چائے کا چمچ
لیموں کا رس	ایک چائے کا چمچ
پے نمٹر	آدھا چائے کا چمچ
پسی سفید مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
پسی کالی مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت
گاجر	ایک عدد
شملہ مرچ	ایک عدد
ہری پیاز	ایک عدد
ٹماٹر	ایک عدد

ترکیب :

ایک برتن میں لیموں کا رس، لسن، اور ک، لیے ٹماٹر، سفید مرچ، کالی، نمک اور چکن ونگز ڈال کر اچھی طرح ملا کر۔ تیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ فرائی بین میں تیل گرم کر کے اس میں سبزی ڈال کر ہلکا سا مل کر نکال لیں۔ ونگز ڈال کر ڈھکن ڈھک کر ہلکی آگ پر پکائیں پھر اس کو بھون کر تلی ہوئی سبزی شامل کر کے ڈش میں نکال لیں۔ من پسند چٹنی اور چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

بیف اینڈ چلی

ضروری اشیاء :

گوشت	آدھا کلو
سویا ساس	ڈھائی کھانے کے چمچے
نمک	ایک کھانے کا چمچ
میدہ	ڈھائی کھانے کے چمچے

کٹی کالی سرچ

لسن

اور ک

ہری مرچیں

پیاز

تیل

ترکیب :

گوشت میں لسن، میدہ، سویا ساس، نمک، کٹی مرچ ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پٹیلی میں تیل گرم کر کے اس میں گوشت ڈال کر چند منٹ تک تیز آگ پر بھونیں۔ اس کے بعد دو کپ پانی ڈال کر دھیمی آگ پر گھنٹے دیں۔

جب گوشت گل جائے تو ایک گلاس پانی ڈال کر پیاز (جو کور کاٹ لیں) اور ک اور ہری مرچیں ڈال کر دس منٹ تک دھیمی آگ پر پکائیں۔ جب پانی خشک ہو جائے تو سارے چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

اسپیگٹھی میرینارا

ضروری اشیاء :

اسپیگٹھی

مرغی کا گوشت

مکھن

کارن فلور

انڈا

ٹماٹو پیسٹ

مٹر

گاجر

بند گوبھی

شملہ مرچ

ہری پیاز

دو سو گرام

ایک پاؤ

ایک کھانے کا چمچ

دو کھانے کے چمچے

ایک عدد

تین کھانے کے چمچے

ایک چوتھائی کپ

ایک عدد

آدھا کپ

ایک عدد

ایک عدد

دو پکٹ
آدھا کپ

بسکٹ
کریم

ترکیب :

سب سے پہلے ایک پین میں دیرھ کپ پانی گرم کر کے اس میں اسٹرابری جیلی ڈال کر اچھی طرح ملائیں محل ہو جانے پر ایک پیالے میں نکال کر جمائیں۔ اسی طرح بنانا جیلی بھی بنالیں۔ دونوں جیلیز کو فریزر میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔

ایک کپ ٹھنڈے دودھ میں اپنی پسند کے فلیوور کا کسٹرو ملا لیں۔ باقی بچے ہوئے دودھ کو ابال لیں۔ پھر آج بکلی کر کے اس میں چینی ملا دیں جب چینی اچھی طرح کھل جائے تو اس میں اگر چاہیں تو کریم ملا دیں۔ اب اس میں کسٹرو کو تھوڑا تھوڑا کر کے شامل کریں اور ساتھ ساتھ پیچھے سے چلاتے رہیں۔ جب آمیزہ گاڑھا ہو جائے تو چولہا بند کر دیں اور ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔

اب بسکٹ کا چورا کر کے اس میں مکھن ڈال کر اچھے طریقے سے ملا لیں کہ دونوں چیزیں یکجان ہو جائیں۔

اب کسی سانچے میں پہلے مکھن ہلکی سی تہ لگائیں۔ اور پھر مکھن اور بسکٹ کا آمیزہ اس میں جما دیں۔ اب

آدھا چائے کا چمچ
ایک چوتھائی چائے کا چمچ
ایک کھانے کا چمچ
دو کھانے کے چمچ
آدھا چائے کا چمچ
حسب ضرورت
حسب ذائقہ

پسی سفید مرچ
پسی کالی مرچ
چلی ساس
سویا سوس
چائینیز نمک
تیل
نمک

ترکیب :

اسپیکٹھٹی کو الگ سے — ابال لیں۔ گوشت دھو کر چھلنی میں خشک کر لیں۔ گوشت پہ اچھی طرح کارن فلور، مکھن، نمک، چائینیز نمک اور سفید مرچ لگا کر بیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ پین میں تیل گرم کر کے گوشت کے پارچوں کو اینڈے میں ڈبو کر مل کر نکال لیں۔

علیحدہ پین میں تیل گرم کر کے اس میں بے ہوئے ٹماٹر ڈال کر دو منٹ پکائیں۔ مٹر، شملہ مرچ، گاجر، بند گوبھی، (لمبائی میں کٹ لیں) ہری پیاز، (چو کور کٹ لیں) سفید مرچ، کالی مرچ، چائینیز نمک، نمک، اسپیکٹھٹی، تھلا ہوا گوشت، سویا ساس اور چلی ساس ڈال کر دو سے تین منٹ پکائیں ڈش میں نکال کر کچھ پ کے ساتھ گرم گرم نوش فرمائیں۔

کسٹرو کیک

اجزا :
کسٹرو کے لیے

ایک کلو
ایک کپ
ایک کپ
آدھا کپ

دودھ
چینی
کسٹرو پاؤڈر
کریم
سجانی کے لیے

دو سو گرام
ایک پکٹ
ایک پکٹ

مکھن
اسٹرابری جیلی
بنانا جیلی



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



وہاں جلدی میں سب سے نگاہیں بجا کر کیا گیا میک اپ بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ اگر آپ مصروف ترین خاتون ہیں تو آپ کے لیے جاذب نظر لگنا بہت ضروری ہے۔ اس کے لیے اگر آپ ذرا سی کوشش کریں تو پانچ منٹ میں قرینے سے میک اپ کر کے باہر نکل سکتی ہیں۔ اس کے لیے پہلے سے پلان بنائیں اور پھر کام کریں۔ اس کی پلاننگ یہ ہے۔

روز کا میک اپ ایک سا ہو گا نہ حیرت ناک اور نہ ہی عجوبہ، بس آنکھوں اور ہونٹوں کے لیے رنگوں میں سے مناسب چناؤ کر کے دوسرے کے ساتھ رنگ ملانے سے تھوڑی تبدیلی آ سکتی ہے۔

فاؤنڈیشن جلد کے رنگ سے ملتا جلتا لگائیں۔ کہیں داغ دھبے چھپانے ہوں تو نیچل شیڈ سے چھپائیں اور پھر فاؤنڈیشن کا مناسب رنگ لگائیں اور دونوں کو صفائی سے ملا دیں۔ بلش آن کا رنگ بھی ایک سا ہونا چاہیے۔ دن کے وقت ہلکے گلابی اور نیچل رنگ چنیں اور چوڑے برش سے اسے لگائیں، اس سے وہ قرینے سے لگے گا۔

آنکھوں کے لیے لائن اور شیڈ چاہیے۔ لائنویا کاجل کی ہلکی لکیر کھینچیں۔ اس کے بعد شیڈ لگانا چاہیں تو نیچل یا گلابی یا ہلکا سلیٹی رنگ چنیں اور اگر شیڈ نہیں لگائیں گی تو کوئی حرج نہیں۔ جب لب اسٹک لگائیں تو ہونٹوں کو خوب صورت اور پرکشش بنائیں۔ گہرا رنگ ہو یا ہلکا، لیکن بھڑکیے، زیادہ چمک دار رنگوں سے بچیں۔

دیکھا آپ نے ذرا سی دیر میں دن کا میک اپ ہو گیا اور آپ پہلے سے کہیں زیادہ جاذب نظر لگ رہی ہیں۔ اب ذرا جلدی سے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ بس پانچ منٹ ہی تو گزرے ہیں۔



میک اپ وہ بھی صرف پانچ منٹ

کم وقت میں میک اپ کرنے کا طریقہ ہر ملازمت پیشہ اور گھریلو خاتون کو آنا چاہیے۔ اس بارے میں کچھ ترکیباتیں پڑھیے۔

روزانہ صبح کام پر جاتے وقت جیسے تیسے شیشے میں دیکھ کر چہرے پر کچھ نہ کچھ لب لینا میک اپ نہیں نہ تو ایسی لپائی آپ کو خوب صورت بنائے گی اور نہ ہی سکون ملے گا، اگر گھر میں یا باہر کامیاب ہونا ہو تو چست، اسارٹ اور دلکش نظر آنا بہت ضروری ہے۔ جیسے تیسے الٹی سیدھی لب اسٹک رگڑ کر اور فاؤنڈیشن کے دھبے چہرے پر پھیلا کر یا مسکارا گہرے انداز سے پلکوں پہ لگا کر باہر جانا ٹھیک نہیں اور اسی طرح بغیر بنے سنورے باسی منہ یا سپاٹ چہرے لیے بھی باہر چلے جانا ٹھیک نہیں۔

کچھ لوگ دفتری کام کی جگہ پر تیار ہوتے ہیں، لیکن

